They Dare to Speak Out
اردو ترجمہ
شکنجۂ یہود
www.KitaboSunnat.com
پال فنڈلے

شکنجۂ یہود

(They Dare to Speak Out)

مصنّف

پال فنڈلے

مترجم

سعید رومی

ملّی پبلی کیشنز، نئی دہلی۔۲۵

سالِ اشاعت ۲۰۰۹ء

ISBN 81-87856-16-5

نام کتاب	: شکنجۂ یہود
تالیف	: پال فنڈلے
مترجم	: سعید رومی
تعداد اشاعت	: ۱۰۰۰ (ایک ہزار)
اشاعت سوم	: ۲۰۰۹ء
قیمت	: ایک سو ستر روپئے (Rs.170/-)
مطبع	: گلوریس پرنٹرس، دہلی ۔ ۹۲

ناشر

ملی پبلی کیشنز

ملی ٹائمز بلڈنگ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

Tel:. +91-11-26945499, 26946246

Fax: +91-11-26945499

Email:militime@del3.vsnl.net.in

millitimes@gmail.com

www.millipublications.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

ذرا سنبھل کر!

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے' انتہائی خطرناک ہے۔ اس وقت جو لوگ اس دنیا پر قابض ہیں انہیں یہ بات ہرگز پسند نہیں کہ اس جیسی کوئی کتاب لکھی جائے اور اس کی کھلے عام اشاعت ہو۔ لیکن اللہ کی دنیا کا بھی عجب نظام ہے' ازل سے ہر فرعون کے لئے موسیٰ کی پیدائش ہوتی رہی ہے۔ یہودیوں کے لئے اس کتاب کی اشاعت ایسی ہی ہے جیسے فرعون کے لئے موسیٰ کی پیدائش۔

اس کتاب کا مصنف پال فنڈلے امریکی سیاسی حلقے میں ایک معروف نام ہے۔ فنڈلے امریکی سیاست کا رازداں رہا ہے' اس نے بہت قریب سے امریکہ کے ذریعے موجودہ عالمی نظام پر یہودی تسلط کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ کتاب جسے سعید روی نے پہلی دفعہ اردو کا قالب عطا کیا ہے' انگریزی میں They Dare to Speak Out کے نام سے شایع ہو چکی ہے۔ کتاب شایع تو ضرور ہوئی لیکن بہت کم لوگوں تک پہنچ سکی۔ خفیہ یہودی تنظیموں نے راتوں رات اسے بازار سے غائب کر دیا۔ شاید ہی کسی قابل ذکر لائبریری میں اس کا نسخہ موجود ہو۔

گو کہ اس کتاب میں صرف امریکہ میں یہودی لابی کی سرگرمیوں کا تذکرہ ہے۔ البتہ یورپ کے دوسرے ممالک میں یہودی سرگرمیوں کا اندازہ بھی اس کتاب کی روشنی میں کسی قدر لگایا جا سکتا ہے۔ فنڈلے نے یہودی سرگرمیوں سے نقاب تو ضرور اٹھایا ہے لیکن بہت سنبھل سنبھل کر' اپنے آپ کو کسی قدر بچاتے ہوئے۔ یہ کتاب حقیقت کا انکشاف تو ضرور ہے لیکن اسی قدر جتنا کہ امریکی معاشرے میں برداشت کیا جا سکے۔ البتہ اہل نظر کے لیے اس کتاب کے بین السطور میں پڑھنے کے لئے بہت کچھ ہے۔

صیہونیت کی سرگرمیوں پر اردو کیا انگریزی زبان میں بھی بہت زیادہ نہیں لکھا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟ کہ جو شخص بھی بیباکی کا مظاہرہ کرتا ہے یہودیوں کی خفیہ تنظیمیں اسے بڑی خاموشی اور حکمت سے راستے سے ہٹا دیتی ہیں۔ اب تک جو کتابیں صیہونی فتنہ پر انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں ان میں Zionist Protocol (زائنسٹ پروٹوکول)' The International Jew (دی انٹرنیشنل جیو)' Powns in the Game (پونز ان دی گیم)' World Conqurors (ورلڈ کونکررز) اور Waters Flowing Eastward (وائرز فلوئنگ ایسٹ ورڈ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن یہ کتابیں بالعموم دستیاب نہیں ہوتیں۔ اب یہ نئی تصنیف جو انگریزی میں شائع ہوتے ہی غائب کردی گئی ہے اس کا ترجمہ اردو قارئین کے لئے ایک بہت قیمتی تحفہ ہے۔ توقع ہے آپ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اسے دوسروں تک بھی پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

——— ناشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلاَ النَّصَارى حَتّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ
قُلْ اِنَّ هُدَى اللهِ هُوَ الْهُدى، وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ
بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ، مَالَكَ مِنَ اللهِ
مِنْ وَّلِيِّ وَّلاَ نَصِيْرٍ.

تم سے نہ یہود راضی ہونے والے ہیں اور نہ نصاریٰ جب تک تم ان کی پیروی
نہ کرنے لگو' کہہ دو اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے' اور اگر تم نے
ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی اس امر کے بعد کہ حقیقی علم
تم کو پہنچ چکا ہے تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا تمہارے پاس
کوئی دوست ہوگا اور نہ مددگار۔ (البقرہ: ۱۲۰)

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

برائے نیا ایڈیشن

یہ کتاب ایک خطرے کی گھنٹی ہے۔ اسرائیل اپنی گہری اور ہمہ وقت لابی کے ذریعے امریکہ کی آزادی اظہار رائے اور انسانی حقوق و آزادی' تعلیم و تبلیغ جیسے بنیادی عناصر کی بیخ کنی کرنا چاہتا ہے۔

اس کتاب کو چودہ ماہ کے عرصہ میں کافی پذیرائی بخشی گئی ہے۔ کافی مؤثر اور غیر روایتی مخالف کوششوں کے باوجود یہ کتاب "مقبول ترین" (Best seller) کی لسٹ میں 9 ہفتے تک رہی۔ مثال کے طور پر واشنگٹن پوسٹ میں:

> "ناظرین کے جوش و خروش کی بدولت اب تک باون ہزار (52000) سے زائد نسخے بک چکے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے تھوک میں خریدی کہ اپنے احباب تاجر برادری اور پبلک لائبریری میں تقسیم کریں۔ کچھ اوروں نے کتب فروشوں کو یہ اسٹاک میں رکھنے کی ترغیب دی' باوجودیکہ ابتدائی مراحل میں تاثر اکثر منفی اور ناخوشگوار تھا۔ کسی نے یہ کہا کہ "ابھی شائع ہی نہیں ہوئی" اور کسی نے "ہمارے ناشر نہیں رکھتے" یا "بیحد باعث نزاع" وغیرہ وغیرہ۔ اس کی اشاعت کے دو ماہ بعد ایک بڑے کتب فروش (سپرنگ فیلڈ' الی نوائے میں) کے سیلز کلرک نے ایک گاہک کو گمراہ کن لہجے میں کہا: حکام اس کتاب سے خوش نہیں ہیں۔ کسی سے سنا ہے کہ حکومت اس کو نظر ثانی کرنے کے بعد شائع کرنا چاہتی ہے۔"

پٹسبرگ میں ایک کتب فروش کو بادل ناخواستہ اسے رکھنا پڑا' جب خواتین کے ایک گروہ نے اسٹور کو Picket کرنے کی دھمکی دی۔ کیلیفورنیا میں کئی شہریوں نے اس کی سپلائی متعدد

اسٹوروں پر بانٹنے کی کوشش کی کہ وہ چند جلدیں ہی رکھ لیں اور بکنے کے بعد رقم ادا کریں۔ پورٹ لینڈ اورے گن میں ایک ریٹائرڈ اکاؤنٹینٹ نے اس شرط پر اپنے کلب ممبران کو یہ خریدنے کی دعوت دی کہ اگر وہ کتاب پڑھ کر "ظلم کے خلاف جہاد" پر آمادہ نہ ہو سکے تو وہ اداشدہ رقم دے کر کتاب واپس لے لے گا۔

ایک اور دل خوش کن بات یہ ہوئی کہ ۶۰۰ سے زائد قارئین نے میرا فون نمبر یا پتہ دریافت کرنے کی زحمت کر کے مجھ سے یہ دریافت کیا ہے کہ اسرائیلی لابی کے پیدا کردہ اس نقصان کی تلافی کیونکر ممکن ہے۔ اس کے برخلاف کچھ ایسے واقعات بھی ظہور پذیر ہوئے ہیں جو کہ اس کتاب کے انتباہ کو مزید اہم بناگئے ہیں۔ حال ہی میں کیے گئے انکشافات اس تکلیف دہ حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اسرائیل جو مدت مدید سے ہمارا ایک وفادار حمایتی سمجھا جارہا تھا وہ امریکہ کے نظریات اور خود امریکہ سے غداری کا مرتکب ہوا ہے۔ اسرائیلی حکومت ہماری حکومت کی جاسوسی کرتی ہے اور اعلیٰ ترین سطح پر ہمارے سیاسی اداروں اور افسروں کو بگاڑ کر ہمارے قومی سلامتی کے مفادات کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے کے لیے نقصان پہنچاتی ہے۔

کانگریس اور انتظامیہ اس غداری کو صرف نظر کر کے اسرائیل کو زیادہ سے زیادہ ترفوجی' اقتصادی اور سیاسی امداد مہیا کرتی چلی جارہی ہیں۔ رچرڈلی سٹراس (سابقہ اسٹاف ممبر' امریکن اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی جو کہ اسرائیل کے مفادات کے تحفظ کے لیے رجسٹر شدہ لابی ہے) کا کہنا ہے "صرف اور صرف اسرائیل کے مفادات کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔" جب بھی مشرق وسطیٰ کے معاملات اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں زیر بحث آتے ہیں۔ مخالف ووٹ نہ ہونے کے کارن اس سال (۱۹۸۶) کانگریس نے 4.5 ارب ڈالر کا بے مثال عطیہ بطور امدادی گرانٹ کے اسرائیل کے لیے منظور کیا ہے۔

اسی لابی کے دباؤ نے ہمارے عرب ممالک کے ساتھ تعلقات میں نئے رخنے ڈالے ہیں۔ مئی ۱۹۸۶ء میں کانگریس کے دونوں ایوانوں نے ایک تاریخی دھتکار بہت بڑی اکثریت سے منظور کی۔ (۶۲٫۳۵۶ اور ۲۲٫۷۳) جس سے صدر امریکہ کے تجویز کردہ ۳۵۴ ملین ڈالر کے ہتھیاروں کے سودے کو سعودی عرب کے لیے نامنظور کیا گیا۔ ایسا تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا کہ کانگریس نے صدر کے کیے ہوئے کسی غیر ملک کو ہتھیار بیچنے کے سودے کو نامنظور کیا۔

عوامی طور پر تردید کرنے کے باوجود اسرائیل اور اس کی لابی نے سینیٹ پر اپنا بے پناہ دباؤ رکھا تاکہ صدر کے حق استرداد کو وہاں پر شکست دلوائی جائے۔ سینیٹر بیری گولڈ واٹر نے اسرائیلی مخالفت کی مذمت کی اور اس فروخت کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ "مجھے امید ہے کہ یہ آخری بار ہوگا کہ کوئی دوست ملک ہمارے معاملات میں پیسے اور دھونس کے زور پر اس قدر مخالفت کرے۔" جب اس بل پر رائے شماری ہوئے تو صدر ریگن کی سر توڑ کوششوں کے باوجود ۱۰۰ ممبران کے سینیٹ میں صرف ۳۴ ووٹ اس کے حق میں آئے' یعنی صرف ایک ووٹ سے صدر کا ویٹو برقرار رہا۔

اس لابی کے پریشر نے اُردن سے بھی تعلقات خراب کرائے۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء میں صدر ریگن نے اعلانیہ طور پر اردن کو 5.1 بلین ڈالر کے ہتھیار فروخت کرنے کی حمایت کی' لیکن 74 سینیٹرز نے فوراً ہی مخالفت میں بیان داغ دیا۔ چنانچہ صدر ریگن نے کانگریس میں یقینی شکست سے بچنے کے لیے شاہ حسین سے کیا گیا وعدہ توڑ دیا۔ بعد ازاں شاہ حسین نے کہا کہ "۳۰ سالہ انتہائی قریبی تعلقات" کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

اس عرب مخالف لابی نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی عزت و شہرت ہی نہیں اور بھی کچھ گنوایا ہے۔ اس نے امریکہ میں ہزاروں ملازمتوں کا خاتمہ کر دیا۔ سعودی عرب نے 4.5 بلین اور اردن نے 1.5 بلین ڈالر کے ہتھیاروں کے سودے برطانیہ کی طرف منتقل کر دیئے۔ لندن کے اخبار اکانومسٹ کے اندازے کے مطابق اس لابی کی وجہ سے امریکہ کو سال بھر میں 20 ملین ڈالرز سے زیادہ کا نقصان ہوا۔

ڈونلڈ میک ہنری جو .U.N میں امریکہ کا سفیر تھا' جمی کارٹر کے دور صدارت میں کہتا ہے "اس لابی کے زیر اثر ہماری گورنمنٹ مشرق وسطیٰ میں اپنے قومی مفادات کا تحفظ نہیں کر سکتی۔"

وسعت دانہ ودام

اسرائیل موافق قوتیں مختلف اور متفرق انداز میں اثر انداز ہوتی ہیں۔ بالٹی مور کی یہودی کمیونٹی نے Charles M. Mathais کو ایک ممتاز ریکارڈ برائے کارکردگی رکھنے کے باوصف مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔

امریکن یہودی کمیٹی نے واشنگٹن کے "WETA" اور نیویارک کے "WNET" ٹی وی اسٹیشنوں کو اپنا نیٹ ورک پروگرام "فلیش پوائنٹ" منسوخ کرنے پر مجبور کر دیا' کیونکہ اس میں دو عدد اسرائیل موافق فلموں کے ہمراہ ایک عدد فلم فلسطینیوں کی حمایت میں بھی دکھلائی جانی تھی' لیکن اس انتہائی دباؤ کے باوجود .P.B.S کے دوسرے اسٹیشنوں نے یہ مطالبہ مسترد کرتے ہوئے وہ فلم دکھلائی۔

امریکن عربوں نے جو زک اٹھائی وہ دہشت گردی کی ایک شکل تھی جو کبھی کبھار مہلک بن جاتی ہے۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء میں بحیرہ روم میں ایک اسرائیلی لیون کلنگ ہوفر کے ایک فلسطینی دہشت گرد کے ہاتھوں قتل ہونے کے ۴۸ گھنٹوں کے اندر اندر ایک فلسطینی نژاد امریکن کو قتل کر دیا گیا۔ الیکس اوڈھے جو کہ ایک عرب انٹی ڈسکر مینیشن کمیٹی کا علاقائی ڈائریکٹر تھا' ایک بم کے دھماکے میں مہلک طور پر زخمی ہوا جب کہ وہ اپنے سانٹا اینا' کیلیفورنیا کے دفتر میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ گذشتہ شب اس نے لاس اینجلیز کے ایک ٹی وی اسٹیشن پر یاسر عرفات کو ایک "آمادہ برامن" انسان قرار دیا تھا۔ اس سے گذشتہ ماہ دو پولیس والے اس وقت زخمی ہوئے جب کہ وہ ایک بم کو ناکارہ بنا رہے تھے جو کہ ADC کے بوسٹن آفس میں نصب کیا گیا تھا۔ اس کے ایک ماہ بعد ADC کے واشنگٹن آفس کو پراسرار حالات میں سپرد آتش کر کے 5 لاکھ ڈالر کا نقصان پہنچایا گیا۔

علاوہ ازیں ایک فلسطینی ضیاری فروش کو مل واکی میں قتل کر دیا گیا' اس واردات میں رقم لوٹی گئی نہ سامان۔ فلاڈلفیا میں ایک امریکن عربی اخبار کے اڈیٹر کو بری طرح زدوکوب کیا گیا۔ اسمٰعیل فاروقی اور ان کی اہلیہ Lois کو چھرا گھونپ کر ہلاک کر دیا گیا۔ فاروقی ایک مشہور مسلم اسکالر اور ان کی اہلیہ ایک مصنفہ تھیں۔ حکام نے نقب زنی کے امکانات کو رد کر دیا۔

اسرائیل کے ایک زر خرید جاسوس کا اقبال جرم

جون ۱۹۸۶ء میں Jonathan Jay Pollard (امریکی بحریہ کا ایک ملازم) کے اس اقبال جرم نے کہ وہ اسرائیل کا زر خرید جاسوس ہے' اس راز کو طشت از بام کیا کہ امریکی حکومت کے خفیہ راز چوری ہو رہے ہیں۔ پولارڈ کی بیوی نے جو کہ ایک مسروقہ دستاویزات سے بھرے صندوق کو

تباہ کرنے میں ناکام رہی' اس سے کمتر درجہ کے جرم کا اقبال کیا۔

پولارڈ نے بتایا کہ وہ ۴۵ ہزار ڈالر وصول کر چکا تھا اور اگلے دس سال میں اسے ۳ لاکھ ڈالر دینے کا وعدہ کیا گیا تھا' اس شرط پر کہ وہ خفیہ دستاویزات کو اسرائیل کے حوالے کرتا رہے گا۔ اسے ایک اسرائیلی پاسپورٹ ایک جعلی نام پر بنا کر دیا گیا تھا۔ اس کیس میں تین مزید اسرائیلی سرکاری کارندے بھی ملوث تھے جن کو اسرائیلی حکومت نے باوجود اس انکشاف کے ترقی سے نوازا۔ پولارڈ کے اعتراف جرم نے اسرائیل کو ایک خفت آمیز عوامی مقدمے سے بچالیا جو امریکی خفیہ سروس اور اسرائیل کے مابین ان خفیہ رابطوں کو جو ایران کو ہتھیار فراہم کرنے کے سلسلے میں تھے' منظر عام پر لے آتا۔ جون ڈیوٹ جو کہ امریکہ کے محکمہ انصاف میں ۳۰ سالہ پرانا ملازم تھا اور اس کے اندرونی سیکورٹی سیکشن کا سابقہ انچارج تھا' امریکہ میں اسرائیلی جاسوسی کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے "سب سے زیادہ فعال ماسواء (Soviet) کے جی بی کے۔"

فیڈرل بیورو آف انوسٹی گیشن (F.B.I.) نے درجن بھر سے زائد ایسے واقعات کی نشاندہی کی ہے جن میں امریکی حکومتی اہل کاروں نے غیر قانونی طریقوں سے امریکہ کے خفیہ راز اسرائیل تک پہنچائے' لیکن صرف پولارڈ کے کیس میں ہی چارہ جوئی کی گئی۔ اغلباً اس کی گرفتاری تب عمل میں آئی جب کہ ذمہ دار افسران محکمہ انصاف کے ہر مرتبہ اسرائیل کے لیے چوری کرنے والوں کو صاف نکل جانے کے مواقع دیے چلے جانے سے تنگ آگئے۔

امریکہ اسرائیل رابطہ برائے (امام) خمینی

امریکہ ۔اسرائیل کے ایران کو ہتھیار بیچنے کا اسکینڈل جو کہ آج کل زوروں سے منظر عام پر آرہا ہے اور صدر ریگن کی ایڈمنسٹریشن کے لیے دردِ سر ہے' وہ بھی اسرائیل کے فوجی ہتھیاروں کی کھیپ اس وقت تہران بھجوانے سے متعلق ہے' جب امام خمینی نے ۱۹۷۹ء میں اقتدار سنبھالا اور جو ان ۴۴۴ دنوں میں بھی جاری رہا جب کہ امریکی سفارت کار یرغمال بنا کر زیر حراست تھے۔

(Pierse Salinger on ABC Nightline Aug. 20, 1981)

یہ اس وقت سے پہلے کی بات ہے جب امریکہ نے خفیہ طور پر ایران کو اس لیے ہتھیار سپلائی کیے کہ وہ لبنان میں یرغمال بنے شہریوں کو خمینی کے حامیوں سے آزاد کروا سکے۔ اسرائیل

نے پولارڈ کو کہا کہ وہ امریکہ کی ان خفیہ دستاویزات کو مہیا کرے جو اس نے غیر ملکی میزائیل سسٹم کی ایران کو ممکنہ فروخت کے لئے تیار کئے تھے۔ اپریل ۱۹۸۶ء میں اسرائیل-امریکن رابطہ خمینی سے قائم ہوا۔ ایک اسرائیلی ریٹائرڈ جنرل (Abraham Bar-am) جو کہ اسرائیل سے بااختیار اسلحہ ڈیلر کا باضابطہ اجازت نامہ رکھتا تھا' کئی دوسرے لوگوں کے ایران کو 2.5 بلین ڈالر کا اسلحہ بیچنے کا الزام لگایا گیا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ اسرائیل کی دوستی دو مقاصد پورے کرتی ہے۔ اولاً یہ کہ تہران کو لمبے عرصہ سے مہیا شدہ اسرائیلی اسلحہ کے سودوں کو قانونی جواز مہیا کرنا اور ثانیاً امریکہ اور اعتدال پسند عربوں کے درمیان مزید عداوت پیدا کرنا' جو کہ زیادہ اہم بات ہے۔ عرب اس بات سے بیحد خائف ہیں کہ کہیں اسرائیلی-امریکن اسلحہ کے زور پر ایران اپنی جیسی انقلابی تحریکوں کی حمایت کر کے عراق میں صدر صدام حسین کی حکومت کا تختہ نہ پلٹ دے۔

عربوں پر بمباری

اسرائیل کے عربوں کے خلاف فوجی حملوں میں USA اس وقت ایک فعال اتحادی بن گیا جب اس نے اپریل ۱۹۸۶ء میں لیبیا کے پانچ ٹھکانوں پر بمباری کی۔ صدر ریگن نے پہلے تو لیبیا پر الزام لگایا کہ امریکہ کے پاس ناقابل تردید شہادت موجود ہے کہ لیبیا مغربی برلن اور کئی دوسری جگہوں پر دہشت گردی میں ملوث ہے لیکن بعد ازاں یہی الزام شام پر لگایا گیا۔

اس اعلان سے USA نے ایک ایسی حکمت عملی کو پہلی مرتبہ اختیار کیا کہ کسی جگہ انفرادی دہشت گردی کے واقعہ کا انتقام لینے کے لیے کسی غیر ملک پر فوجی چڑھائی کی جا سکتی ہے اور یہ ایک جائز دفاعی کاروائی متصور ہو گی۔

یہ چیز اگرچہ بین الاقوامی قانون کے خلاف ہے لیکن اسرائیل یہی حرکت مدت مدید سے بطور "انتقامی" حملوں کے لبنان' شام' تیونس اور عراق کے خلاف روا رکھ رہا تھا۔

ایک مقبول عام کتاب کے راستہ کے کانٹے

جن احباب نے مجھے یہ کتاب لکھنے اور شائع کرنے کا حوصلہ عطا کیا ہے وہ ایک اہم منزل

پالینے میں میرے ہمرکاب ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ کتاب امریکن عوام کو اس خطرہ سے آگاہ کرنے میں معاون ثابت ہوگی جو کہ امریکہ-اسرائیل کے گہرے گٹھ جوڑ میں مضمر ہے۔

اس کی اشاعت میں کئی کٹھن منزلیں آئیں۔ مثال کے طور پر صرف دو سال پبلشر تلاش کرنے میں لگے۔ دو پبلشروں Random House اور William Morrow and Co. نے مسودے کی تعریف کرتے ہوئے قابل اشاعت قرار دینے کے باوصف یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ اس کا تعلق ایک بہت حساس موضوع سے ہے۔ ولیم فیرو کے بروس لی نے کہا کہ ہماری فرم کو اس کی شاعت سے بہت سی "اندرونی اور بیرونی مشکلات" پیش آئیں گی، لہٰذا وہ اس مشکل میں نہیں پھنسنا چاہتے۔ بیسیوں جگہ پر انکار سننے کے بعد آخرکار ایک معتبر پبلشر "لارنس ہل اینڈ کمپنی" نے جولائی ۱۹۸۶ء میں یہ جواء کھیلنے پر رضامندی ظاہر کی۔

جن احباب نے اس مسودہ کے لیے معلومات اکٹھی کرنے میں مدد کی ان میں سے بیشتر نے رازداری کی درخواست کی۔ ان میں کئی وفاقی گورنمنٹ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ لیکن اس کتاب کے مندرجات کی افادیت کے پرجوش حامی ہونے کے باوجود انہیں اسرائیلی لابی کے مضرت رساں اثرات کا ڈر ہے جو ان کے ذاتی دور حکومت کا کباڑا کرسکتی ہے۔

چند ایک کا ذکر کرتا ہوں جن سے ازحد مدد ملی۔ Robert W. Wichser ایک نہایت قریبی دوست اور ۱۴ سال تک میرے کانگریس اسٹاف کا ڈائریکٹر رہا۔ (بصد افسوس کہنا پڑتا ہے کہ دسمبر ۱۹۸۵ء میں سیلاب کی لپیٹ میں آگیا) Neff Deonald جرنلسٹ اور "Warriers for Journalism" کا مصنف George Walter Pulitzer انعام یافتہ غیر ملکی وقائع نگار۔ سابقہ سینیٹرز James G. Abourezq اور James M. Ennes Jr. جنہوں نے "Assault on the Liberty" تصنیف کی۔ Sangamon St. Union نے نقد گرانٹ مہیا کی جو کہ American Mid-East Peace Reserch Institute نے فراہم کی تھی۔ اسی خرچ سے یہ مسودہ تیار ہوا۔

اس کتاب نے ذرائع ابلاغ کی کافی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ تیس سے زائد مؤقر جریدے اس پر تبصرہ شائع کرچکے ہیں۔ ۷۰ سے زیادہ ٹی وی اور ریڈیو کے پروگرام میں نشر کرچکا ہوں۔ NBC کا "Today Show"، PBS کا "America Late Night" اور CBS کا

"Charlie Rose Show" شامل ہیں۔ یہ مواقع خوش آیند اور روز افزوں ہیں۔

کئی ریڈیو اسٹیشنوں اور ٹی وی والوں نے البتہ اس کتاب کے لیے معاوضہ لے کر بھی اشتہار دکھانے سے انکار کیا۔ CNN البتہ ایک استثناء ثابت ہوا' اس کے مالک Mr. Ted Turner نے اپنے ماتحتوں کے فیصلے کو رد کرتے ہوئے جنوری ۱۹۸٦ء کے دوران انیس مرتبہ اس کتاب کا سلسلہ وار اشتہار دکھلایا۔ جوں ہی یہ سیریز شروع ہوا' CNN کے دوسرے اشتہاری گاہکوں نے زبردست احتجاجی مہم شروع کی لیکن مسٹر ٹرنر نے مردانہ وار اس دباؤ کا مقابلہ کیا اور سلسلہ کو جوں کا توں جاری رکھا۔

اس قصہ سے اسرائیل نواز حلقوں کا 8000 ڈالرز کا فائدہ ہوا۔ وہ یوں کہ CNN کو بلا معاوضہ ۸ عدد مساوی وقفے Anti-Defanation League کو بطور تاوان دینے پڑے۔

قارئین یہ پوچھیں گے "اب آیندہ کیا ارادے ہیں؟" ایک جواب تو اسی کتاب کے قارئین کی تعداد میں اضافہ کرنا ہے' یہ دیکھتے ہوئے کہ اس نقصان بے پایاں سے اب تک عوام کس قدر بے خبر ہیں جو ہمیں پہنچ رہا ہے۔ پہلے ایڈیشن کی 52000 کاپیوں کا بک جانا صرف ایک آغاز ہی کہلا سکتا ہے۔ اسی نکتہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب ناشر نے یہ نیا ایڈیشن شائع کیا ہے جو کہ عام کتب فروشوں کے ہاں میسر ہو گا۔

تعارف

مغربِ وسطیٰ کے کانگریس مین کا مشرقِ وسطیٰ سے ملاپ

لوگ پوچھتے ہیں "امریکہ کے وسطی اناج گھر کا نمائندہ کانگریس مین مشرق وسطیٰ کی سیاست میں کیسے الجھ گیا؟" بیشتر دیہاتی کانگریس ممبران کی طرح میرا بھی کوئی ایسا نسلی حلقہ انتخاب نہ تھا جو مجھے اپنے غیر ملکی مفاد کی طرف متوجہ کرتا۔ لہٰذا میں نے حسب توقع زرعی کمیٹی کی رکنیت اختیار کی اور زراعت' بجٹ اور رفاہی اصلاحات پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔

۱۹۷۲ء میں مجھے یورپ اور مشرق وسطیٰ کی ذیلی کمیٹی پر نامزد کیا گیا۔ اس سے پہلے میں ۱۲ سال تک سپرنگ فیلڈ' الی نوآئے کے حلقہ کی نمائندگی کرتا رہا اور مجھے ملک کے اندر اور باہر کبھی لائق توجہ نہ سمجھا گیا۔ مشرق وسطیٰ کے مسئلہ میں الجھنے سے مجھے ۸ سال کے مختصر وقفہ میں بیشتر امریکن یہودیوں میں نامقبولیت' اسرائیل میں بدنامی اور ساری دنیائے عرب میں پسندیدگی حاصل ہوئی۔

۱۹۸۰ء تک اسرائیل نواز شہری سرگرم حلقوں میں...... جو کہ ان مقامی یہودیوں سے دور دراز تھے جو کہ مجھے اچھی طرح جانتے اور بھروسہ کرتے تھے۔ مجھے ایک انتہائی مہنگے کانگریس انتخابی مقابلے کا سامنا ہوا جو کہ ریاستوں کی تاریخ میں اپنی مثال آپ تھا۔ نزدیکی شکاگو سے اور دور دراز مشرقی مغربی ساحلوں سے میری مخالفت میں اٹھ نے والی رقوم نے مجھے "اسرائیل کا نمبر ایک دشمن" بنوادیا اور اسرائیلی لابی کے لئے میری انتخاب مکرر کی مہم ایک اہم ہدف بن گئی۔

الی نوائے کالج کے ایک پروفیسر کی تحریک پر مجھے امریکہ کی مشرق وسطیٰ پالیسی پر پہلے ہی شک ہوا کہ یہ درست نہیں۔ پہلے تو میں نے یہ شکوک صرف اپنے آپ تک محدود رکھے' لیکن یہ کسی سیاسی ردعمل کے خوف سے نہ تھا۔ میری خوش فہمی تھی کہ میں اس پالیسی پر بغیر کسی مشکل کے تنقید کرسکوں گا۔ مجھے اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ اسرائیلی اثرات امریکی اداروں میں کس حد تک

سرایت کر چکے ہیں۔

کانگریس عام طور پر اسرائیل ہی کی کہانی سنتی ہے۔ عرب امریکنوں کی لابی جو کہ اب بھی محض طفل مکتب ہے پہلے ناپید تھی۔ عرب سفارت خانے پہلے بھی تعلقات عامہ کے ماہرین کی خدمات حاصل کرنے میں متذبذب تھے اور اب بھی "لابی" میں دلچسپی نہیں لیتے۔ اگر کوئی کانگریس ممبر عربوں کا نکتہ نظر سننا بھی چاہے تو اسے عربوں کا وکیل ڈھونڈھنا مشکل تھا۔

مشرق وسطیٰ میں میری ذاتی دلچسپی میرے ایک رائے دہندہ کے مسئلہ سے پیدا ہوئی۔ اس کا براہ راست کوئی تعلق عرب-اسرائیل تنازعہ سے نہ تھا۔ یہ ۱۹۷۳ء کے موسم بہار کی بات ہے' مجھے ایک دیہاتی جریدہ کی مقامی رپورٹر مسز ایوان فرینکلن سے ایک درخواست موصول ہوئی کہ میں اس کے بیٹے کی رہائی میں مدد کروں۔ اس کا بیٹا .Ed ایک دور افتادہ جیل میں تھا۔ اسے عدن میں جاسوسی کرنے کے الزام میں پانچ سال کی قید تنہائی دی گئی تھی۔ عدن مارکسی عوامی جمہوریہ جنوبی یمن کا دارالخلافہ ہے۔ اس کا خط پڑھ کر مجھے نقشہ استعمال کرنا پڑا۔ مجھے صرف اس قدر معلوم تھا کہ عدن کبھی ایک بڑا برطانوی اڈہ تھا۔

ایڈ فرینکلن کی ماں نے مجھے بتلایا کہ اگر یکے بعد دیگرے کئی پروازیں منسوخ نہ ہوتیں تو وہ شاید کبھی عدن میں قدم بھی نہ رکھتا۔ فرینکلن ایتھوپیا سے اپنی تدریسی ملازمت پر کویت واپس جارہا تھا۔ یہ فلائٹ عدن سے گزرتی تھی اور وہیں یہ پرواز پہلے تاخیر اور پھر منسوخی کا شکار ہوئی۔ یہیں سے اس کی بدقسمتی کا آغاز ہوا' وہ تصویریں اتارنے کا شوقین تھا اور مقامی قوانین سے ناواقفیت کے باعث اس نے ایک ممنوعہ علاقہ کی تصاویر لے لیں۔ عدن کے لوگ گورے اور بھورے سیاحوں کے بارے میں بہت حساس تھے۔ انہیں برطانیہ والوں کا چھ سال پرانا وہ کمانڈو حملہ یاد تھا جو کہ انہوں نے عدن چھوڑنے کے کچھ دیر بعد کیا تھا۔ فرینکلن کو فوٹو لیتے ہی گرفتار کر لیا گیا اور کئی ماہ تفتیشی مرکز میں رکھ کر سزا سنا دی گئی۔ میری کوشش اس بارے میں اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی مدد کے بغیر شروع ہوئی۔ جب ۱۹۶۹ء میں عدن میں کمیونسٹ انقلاب آیا تو اس کے بعد ہماری حکومت اور ان کے درمیان بالکل کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کچھ بھی براہ راست کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ میں نے واشنگٹن میں مصری سفارت خانے میں اپنے ایک دوست سے مدد طلب کی۔ فرینکلن کے غریب اور دیہاتی والدین نے سلیم ربیعہ علی' صدر یمن کو اپنی طرف سے رحم کی درخواست

بھیجی۔ میں نے بھی ایسی ہی درخواست بھجوائی۔

ہماری حکومت نے برطانیہ سے بھی درخواست کی کہ وہ اپنے عدن کے سفارت خانہ کے واسطہ سے مدد کریں لیکن صدائے برنخواست۔ دسمبر ۱۹۷۳ء میں میری ملاقات عدن کے سفیر برائے اقوام متحدہ جناب عبداللہ اشطال سے نیویارک میں ہوئی۔ میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آیا میں ذاتی طور پر عدن جاکر فرینکلن کی رہائی کی درخواست کرسکتا ہوں۔ عبداللہ اشطال نے جو نیویارک میں ایک گریجویٹ ایوننگ کورس کررہا تھا جلد ہی جواب دینے کا وعدہ کیا۔ دو ہفتے بعد مجھے پیغام ملا کہ "مجھے خوش آمدید کہا جائے گا۔"

مجھے اکیلے جانا پڑا۔ میں ۱۹۶۷ء میں جنوبی یمن کے جمہوریہ کے قیام کے بعد پہلا امریکی اہلکار یا ممبر کانگریس / سینیٹ تھا جو کہ ۱۹۶۹ء کے فوجی انقلاب کے بعد تعلقات منقطع ہونے کے بعد وہاں جارہا تھا' حالانکہ یہ ایک مہم جویانہ قدم تھا لیکن میرے دل میں وہم اٹھ رہا تھا' مزید بریں مجھے سفیر کا رتبہ بھی حاصل نہ تھا۔ جنوبی یمن کو (جسے عربوں کا "کیوبا" بھی کہا جاتا تھا) ہمارے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ والے سب سے زیادہ "انقلابی" عرب ریاست سمجھتے تھے۔

اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ والے ایک دوست نے یہ بتلاکر مجھے اور بھی متفکر کردیا کہ عدن کے وزیر خارجہ کی شہرت یہ تھی کہ اس نے سب سے زیادہ مخالفین کو قتل کیا تھا۔ ذہن میں وسوسے اٹھنے لگے۔ میرا استقبال کیسا ہوگا؟ میں نے مشرق قریب اور جنوبی ایشیا کے معاملات کے نگراں اسسٹنٹ سکریٹری آف اسٹیٹ Mr. Alfred L. Atherton سے اس بارے میں مشورہ کیا۔ میں نے پوچھا کہ "اگر وہ مجھے نظربند کردیں تو آپ سب سے پہلے کیا کریں گے؟" اس نے مسکراکر جواب دیا "اپنی رہائی کے لئے کسی دوسرے کانگریسی ممبر سے آس لگانا۔"

ایسا لگتا تھا کہ صرف میں ہی مدد پہنچا سکتا ہوں۔ فرینکلن کی ماں نے مجھے کہا کہ "مجھے یقین نہیں کہ فریڈ یمن میں پانچ سال کی جیل کاٹ سکے۔" میری اہلیہ Lucille نے بھی تشویش کا اظہار تو کیا لیکن اس پر اتفاق کیا کہ میرے جانے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔

میں نے بھی سوچا کہ سفر سے ایک دور افتادہ اور نامعلوم گوشے کے بارے میں اچھے تعلقات قائم کرنے کا باب کھلے گا۔ نہر سویز کے عنقریب کھل جانے کے بعد عدن کی اہمیت بحر ہند کے مفاد کے نکتہ نظر سے امریکہ کے لئے اور بھی بڑھ جائے گی۔ آخر کار عدن اور جبوتی (فرانسیسی

قبضہ میں) ایک مشہور عالم اور انتہائی اہم خلیج کے دہانے پر واقع تھے جو کہ باب نہر سویز کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر سوویت جو کہ پہلے ہی امدادی مشن اور فوجی مشیروں کے بھیس میں وہاں موجود تھے' عدن گورنمنٹ میں مؤثر غلبہ کر لیتے ہیں تو وہ نہر سویز کو جنوب سے کنٹرول کر لیں گے۔ صاف ظاہر تھا کہ فرینکلن کی رہائی کے علاوہ امریکہ کے لئے اچھے تعلقات کا قیام بھی اہم تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں ضرور جاؤں گا اور سفر کے لئے مارچ ۱۹۷۴ء کے اواخر کو منتخب کیا۔

مشرق وسطیٰ کے ماہرین سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہنری کسنجر کی عدن میں بہت عزت ہے۔ وہ ان دنوں اسرائیل اور مصر میں "شٹل سیاست کاری" شروع کرنے والا تھا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ مجھے ایک ایسا سرکاری خط دیا جائے جس میں امریکہ عدن تعلقات کی حدود واضح طور پر متعین ہوں۔ مجھے جانے سے تین دن پہلے ایک ذاتی خط ملا' اس میں کسنجر نے میری "انسانی ہمدردی کی مہم" کو سراہتے ہوئے کہا کہ "اگر موقع پڑے تو جن افسران سے تمہارا واسطہ پڑے انہیں ہمارے منصفانہ تصفیہ برائے مشرق اوسط امن اور عرب دنیا کے ساتھ تعلقات مزید استوار کرنے کی خواہش میں لگاتار دلچسپی رکھنے کا تاثر دینا۔" یہ خط میرے نام تھا نہ کہ عدن گورنمنٹ کے' یہ ایک سفارتی "نبض شناسی" کی کوشش تھی۔ مجھے امید تھی کہ جن افسران سے مجھے واسطہ پڑے گا یہ ان کو قائل کرنے کے کام آئے گا کہ حکومت امریکہ معمول کے تعلقات قائم کرنا چاہتی ہے۔

ایک اچھا مسافر ہمیشہ تحفے لاتا ہے۔ ایک مصری دوست کے مشورہ پر میں نے الی نوائے کے تین کالجوں سے تین وظیفے مخصوص کروائے جو کہ جنوبی یمن کے طالب علموں کو تحفہ میں پیش کئے جا سکیں۔ مزید برآں میں نے کارل سینڈ برگ کی صدر لنکن کی سوانح عمری کو عربی زبان میں ترجمہ کروا کر دو خاص جلدیں تیار کروائیں جس کا نام تھا "The Preirie Years"' دو چھوٹے مجسمے بھی لنکن کے بنوا کر ساتھ لئے۔ لنکن میرا مشہور ترین رائے دہندہ تھا۔ مجھے امید تھی کہ عدن والے بھی اس سے واقف ہوں گے۔

میں نے پہلے شام سے ہو کر جنوب کی طرف عازم عدن ہونے کے لئے واشنگٹن سے اپنے روانگی جلد رکھی۔ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے وقت سے شام کے ساتھ امریکہ کے سفارتی تعلقات منقطع تھے اور پچھلے پانچ سال سے کوئی بھی امریکی نمائندہ وہاں نہ گیا تھا۔ مجھے یہ جان کر قدرے حیرت ہوئی کہ شام کے صدر حافظ الاسد مجھ سے بغیر پیشگی وقت طے کئے ملاقات پر راضی

تھے۔ اغلباً انہیں ایک ایسے رکن امریکن کانگریس کے بارے میں تجسس تھا جو مشرق وسطیٰ کے بارے میں کھلے ذہن سے کام لیتا تھا۔

صدر اسد نے مجھے اپنے دوسری منزل پر واقع دفتر میں خوش آمدید کہا۔ وہ ایک طویل القامت' نمایاں پیشانی اور دھیمے مگر ملنسار مزاج کے آدمی تھے۔ اپنا نقطہ نظر نہایت پرزور لیکن بغیر کسی ذہنی عناد کے بیان کرنے پر قادر' شام کی روایتی کافی (قہوہ) کے چھوٹے چھوٹے پیالے چسکاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ شام کو دکھ ہے کہ امریکہ اسرائیل کے ہر عمل کی حمایت کرتا ہے۔ ہمیں رنج ہے کہ آپ انہیں توپیں اور اسلحہ مہیا کرتے ہیں اور کیوں نہ ہو؟ لیکن رنج اور دشمنی میں فرق ہوتا ہے۔ ہمیں امریکی عوام سے لگاؤ ہے' جنگ کے باوجود شام کے عوام امریکی عوام کے بارے گرمجوشی کے جذبات رکھتے ہیں اور سالہا سال سے ایسا ہی ہے۔

ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے میں نے پہل کی اور کہا کہ آپ کو پورے سفارتی تعلقات بحال کر کے اسرائیل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنا کیس براہ راست امریکی عوام کو خود آکر .T.V پر بتلانا چاہئے۔ صدر نے جواباً کہا "اغلباً ہم سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ ہمیں بہتر عوامی رابطہ رکھنا چاہئے تھا' میں آپ کے خیال سے متفق ہوں لیکن جانے کب میں امریکہ آسکوں۔"

جب میں رخصت ہونے کے لئے اٹھا تو صدر اسد نے کہا "میری طرف سے آپ کو پورا اختیار ہے کہ کانگریس کے ارکان کو جتنا بھی جلد ہو سکے شام مدعو کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ناقدین اور قدر دان دونوں ہی آئیں۔" بعد ازاں جب میں نے صدر اسد کی یہ دعوت ذاتی طور پر اپنے متعدد ساتھیوں کو دی اور پھر ایک سرکاری رپورٹ میں بھی سب کو مدعو کیا تو کسی نے بھی صاد نہ کیا۔ کانگریس کا پہلا وفد جو شام پہنچا وہ ۱۹۷۸ء میں گیا یعنی چار سال بعد۔

صدر اسد سے انٹرویو کے بعد مجھے رات گئے دمشق سے بیروت پہنچایا گیا جہاں سے مجھے عدن کی پرواز لینی تھی۔ شام لبنان سرحد کے قریب پہنچنے پر ہمیں ان اسرائیلی توپوں کی گھن گرج سنائی دی جو کہ لبنان کے کوہ ہرمن (Mt. Hermon) پر بم باری کر رہی تھیں۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ ختم ہونے کے سات سال بعد بھی آویزش جاری تھی۔

۱۹۷۴ء میں بیروت ابھی تک عروس البلاد مشرق وسطیٰ تھا۔ ایک مغرب زدہ اور شبانہ رنگینیوں و بھرپور تجارت سے لبریز شہر' بندرگاہ کے قریب ہی ایک نیا "ہالیڈے ان" ہوٹل ابھی

بھی ابھرا تھا۔ ہر راہگذر پر دو بین الاقوامی بنک' کم از کم تین کتب فروش اور درجن بھر ریستوراں تھے۔ سال بھر بعد یہ "ہالیڈے ان" فلانجسٹ ملیشیا اور لبنانی کمیونسٹ اتحادیوں کے مابین میدان کارزار بنا ہوا تھا۔ اوّل الذکر کو اسرائیل کی اور مؤخر الذکر کو عربوں' قرمطیوں اور ماسکو کی حمایت حاصل تھی۔ اس کی دیواریں گولوں سے چھلنی ہو چکی تھیں۔ چھت پر بنا کھلا پیویلین بندوقچیوں کی لاشوں سے اٹا پڑا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں جو خوں ریز خانہ جنگی شروع ہوئی اس نے بیروت کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا۔

۱۹۷۴ء میں بھی فلسطینی پناہ گزینوں کا بیروت کی امارت میں کچھ حصہ نہ تھا۔ مجھے صابرہ اور شطیلہ کے (Hovels) اندھیروں کے پاس سے بھی گذرنے کا موقع ملا جہاں نو سال بعد سیکڑوں شہریوں کے قتل عام نے دنیا کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔ میرے سفارتی رہبر نے کہا کہ یہ کیمپ ۲۰ سال سے اسی طرح ہیں۔

میرا گذر طل زطار (Tel Zaatar) کیمپ کے پاس سے بھی ہوا۔ یہاں کے بدنصیب مکینوں کو اس سے بھی بدتر مصیبت کا سامنا کرنا پڑا' جب سال بھر بعد اس کیمپ کا دائیں بازو کی عیسائی ملیشیا نے ۴۵ روز تک محاصرہ کئے رکھا۔ یہ اسرائیل کی لیبر حکومت کی انگیخت اور حمایت سے مسلح ہو کر کیا گیا۔ پندرہ ہزار فلسطینیوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے' بیشتر کو ہتھیار ڈال دینے کے بعد قتل کیا گیا۔ درحقیقت سب جوان مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ عالمی پریس نے اس قتل عام کا ذرہ بھر نوٹس نہ لیا' صرف فلسطینیوں کو ہی یاد ہے۔

اس ۱۹۷۴ء کے موسم بہار میں مجھے ان حادثوں کی پیش بینی نہ تھی۔ میرے ذہن پر صرف ایک ہی فرد کا المیہ سوار تھا' یعنی ایڈ فرینکلن کی قید۔

عدن کی مہم

عدن میں مجھے خوشگوار حیرت کا سامنا ہوا کہ میرا استقبال جن پانچ نوجوان عہدیداروں نے کیا ان میں سے تین وزیر تھے۔ میں ہی ان سب میں سفید ریش تھا۔ انہوں نے رات دو بجے تک میرے جہاز کا انتظار کیا تھا' انہوں نے مجھے خوش آمدید کہہ کر یہ خوش خبری سنائی کہ میرے لیے رہائش کا بندوبست ہو چکا ہے۔ یہ پروٹوکول کے چیف کا مجھے خوش آمدید تھا۔ کم از کم مجھے ہوٹل کے

کمرے میں رات نہ گزارنی پڑے گی۔ میری رہائش ایک بڑا سا محل سرا تھا جو کہ ماضی میں برطانوی فضائی کمانڈر کی رہائش گاہ تھا۔ ایک سایہ دار درختوں بھرا صحن جو کہ عدن میں نایاب شئ تھی جس پر سے آپ ایک عظیم بندرگاہ کا نظارہ کر سکتے تھے۔ یہ سولہویں صدی سے ہی ایک اہم فوجی ٹھکانہ تھا جبکہ راس امید کا چکر لگانا پڑتا تھا۔

مجھے اسی شام سوا سات بجے فرینکلن سے ملاقات کی اجازت مل گئی' وہ ایک چھوٹی سی ماڈرن بلڈنگ کی دوسری منزل پر قید تھا۔ جب میں داخل ہوا تو وہ صوفہ کے پاس کھڑا تھا' یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ "آپ ہی کانگریس مین فنڈلے ہیں؟" میں نے ضبط کا دامن تھامے رکھا اور مسکرا دیا۔ ڈیوڈ لونگسٹن (ایک مشہور غربی سیاح اور مہم جو جسے افریقہ کے اندرونی گھنے جنگلات اور دریائے نیل کا منبع تلاش کرنے کا سودا تھا اور جو کئی سال تک غائب رہا' اس کو تلاش کرنے میں کئی مہمات روانہ کی گئی تھیں) نے بھی ایسے ہی جذبات دل میں محسوس کئے ہوں گے افریقہ میں۔

سولہ ماہ کی قید نے فرینکلن کو لاغر کر دیا تھا' اس کی پتلون بیحد ڈھیلی' سنہری بال بنے ہوئے تھے اور کلین شیو چہرے کے ہمراہ وہ خوش رنگ سانولا لگ رہا تھا۔ وہ اپنی عمر یعنی ۳۴ سال سے کہیں زیادہ عمر رسیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

ہمیں تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے کہا "تم پتلے تو لگ رہے ہو لیکن صحت اچھی ہے۔" اس نے جواب دیا "مجھے آپ کے آنے سے بیحد خوشی ہوئی ہے' اچھا ہوا آپ آگئے۔ چند روز پہلے جب میں نے کئی ماہ بعد پہلی مرتبہ شیشہ دیکھا تو مجھے اپنا چہرہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔" شاس نے بتلایا کہ وہ روزانہ ورزش کرنے سے سانولا ہوا تھا اور اسے اس فلیٹ میں صرف دو دن پہلے منتقل کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ حکام اپنا جیل نہیں دکھانا چاہتے تھے۔ جب میں نے کہا "یہ اشیاء خوردنی کا ڈبہ تمہاری فیملی نے تمہارے لئے دیا تھا" تو اس کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے کہا "اس کا یہ مطلب ہوا کہ مجھے آپ کے ہمراہ گھر نہیں بھجوایا جارہا۔" میں یہی کہہ سکا کہ مجھے معلوم نہیں۔ فرینکلن نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "مجھے اپنی بائبل بادل نخواستہ چھوڑنی پڑی... مجھے روزانہ تلاوت پسند ہے۔" میں نے کہا "کئی لوگ تمہارے لئے دعا کرتے رہے ہیں۔" ہاں! مجھے فوراً محسوس ہو گیا تھا۔ گھر سے خطوط آنے سے پہلے ہی مجھے اس کا احساس ہو گیا تھا۔" اس نے جواباً کہا۔

فرینکلن نے مجھے بتایا کہ اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی روا نہیں رکھی گئی لیکن کھانا بے حد

خراب تھا اور کچھ قوانین۔ "مجھے کاغذ اور قلم رکھنے کی اجازت نہیں' مجھے لکھنا پسند ہے۔ ایک مرتبہ میں نے ایک بوری پر کچھ شعر لکھے لیکن پھر مجھ سے میری پنسل چھین لی گئی' جانے کیوں؟" اس کے باوجود اس کے ذہن میں اپنے صیادوں کے خلاف زہر نہ بھرا تھا۔ "مجھے عالم عرب پسند ہے' شاید جب کبھی یہاں امریکن سفارت خانہ دوبارہ کھل جائے تو مجھے یہاں کوئی نوکری مل جائے۔" اس نے کہا۔

اپنی قیام گاہ پر واپس آتے ہوئے میں نے اپنے افسر میزبان کو فرینکلن کی درخواست برائے تحریری مواد گوش گزار کی۔ اس نے صرف یہ جواب دیا کہ وہ حکام بالا تک یہ درخواست پہنچادے گا۔ جمعہ کا دن میں نے اطراف کے کھنڈر دیکھتے گزارا۔ بارش کے پانی کو ذخیرہ کرنے کا پتھروں کا ایک قدیم بند سیاحوں کے لئے خاص دلچسپی کا باعث ہے۔ اس شام فرینکلن کے ایک اور ہمدرد یعنی برٹش کونسل نے (جو کبھی کبھار اسے پڑھنے کے لئے مواد پہنچاتا رہا تھا) میرے ساتھ ڈنر میں شرکت کی۔ برطانیہ نے دوستوں کے علاوہ دشمنوں سے بھی سفارتی تعلقات قائم رکھنے کی اہمیت کا ہمیشہ احساس رکھا تھا۔ آزادی کے ہنگامہ خیز انخلاء کے فوراً بعد انہوں نے ایک سفارت خانہ قائم کر دیا تھا۔

ہفتہ کی صبح کو عدن کا وزیر خارجہ M.J. Motie مجھے ملنے آیا۔ ہم نے عدن-امریکہ تعلقات پر سیر حاصل بحث کی۔ فلسطینیوں کی یہودیوں کے زیر تسلط زبوں حالی اس میں سر فہرست تھی' جبکہ میری جانب سے فرینکلن کا معاملہ اہم ترین تھا۔ اس کا الزام تھا کہ امریکہ سعودی عرب کو ہمارے خلاف سرحدوں پر بغاوت بھڑکانے کے لئے مدد دے رہا ہے جبکہ میں نے کہا کہ مجھے ایسی کسی بات کا علم نہیں اور میں باہمی تعلقات میں بہتری کی کوشش کروں گا۔ Motie نے کہا کہ "ماضی تو تلخ ہے لیکن حال بہتر نظر آتا ہے' لیکن ہمیں دوستی کے واضح آثار نظر آنے چاہئیں۔ مثلاً ہمیں گندم خریدنے کے لئے امداد کی ضرورت ہے۔"

بحث و مباحثہ کے بعد میں نے بیکار محض شام گزاری اور کچھ وہ اشیاء خریدنے کی کوشش کی جو کہ میری فیملی نے مجھے لکھ کر تھمادی تھی۔ بازار میں صرف سستے جاپانی کھلونوں اور ٹرانسسٹر ریڈیو کے اور کچھ نہ تھا' گاہک اور بھی کم۔ جب میں مہمان خانے میں واپس پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میرے لئے کچھ تحائف پڑے تھے جن میں ایک خمیدہ یمنی خنجر اور روایتی پائپ بھی شامل تھے اور ساتھ ایک کارڈ تھا جس پر لکھا تھا "صدر کی طرف سے اظہار تشکر کے ساتھ۔"

دل میں سوال اٹھا کہ آیا یہ تحائف فرینکلن کو ہمراہ لے کر جانے کا نعم البدل تھے یا کہ نوید کامرانی؟ مؤخر الذکر بات پر یقین کرنا مشکل تھا۔ مجھے تو فرینکلن کی قید کا عرصہ کم کر دینے کا اشارہ تک بھی حکومت کی جانب سے نہ ملا تھا' البتہ اسے کاغذ قلم مہیا کر دیے گئے تھے۔

فرینکلن کے ساتھ میری دوسری ملاقات پہلی سے زیادہ پر سکون تھی۔ اس نے میرے ہاتھ سے کاغذ قلم لیتے وقت کہا "اغلباً مجھے ان کی صرف آج ہی ضرورت ہو گی۔" میں نے جواباً کہا کہ مجھے تو کوئی آثار اس بات کے نظر نہیں آئے کہ اسے میرے ساتھ جانے کی اجازت مل جائے گی لیکن میری چھٹی حس یہ کہہ رہی ہے کہ رہائی جلد ہی نصیب ہو سکتی ہے۔

میری صدر علی سے ملاقات روانگی کے ایک روز پہلے ہوئی۔ صدر کی رہائش ایک قلعہ بند جگہ تھی جو کہ اس کا دفتر بھی تھا۔ مجھے آراستہ کشادہ ہال میں بٹھایا گیا' تین اطراف نیلے پھولوں والے قالین اور سنہری پردے لٹک رہے تھے جبکہ چوتھی طرف ایک بڑا اور کھلا صحن تھا۔ چھت پر برقی پنکھوں کی دو قطاریں تھیں' اس کشادہ ہال کے وسط میں سنہری غلافوں والے صوفے اور کچھ کرسیاں تھیں۔

جونہی میں اس صوفے کے قریب پہنچا تو صدر علی' وزیر خارجہ عدن اور ایک مترجم کو اسی دروازہ سے داخل ہوتے دیکھا۔ صدر علی کی تصویر عدن میں جگہ جگہ دیکھ چکا تھا' لہٰذا رسمی تعارف کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ اپنی تصویر سے زیادہ پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ ایک دراز قد چالیس سالہ تنومند شخص' کالے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ سانولی رنگت اور رعب دار چہرہ' نرم گفتار' ہنستے وقت دو سنہری دانت جھلک مارتے تھے۔

سلام دعا کے بعد میں نے ان کی میزبانی اور تحائف کا شکریہ ادا کیا' بعد ازاں میں نے اپنے تحائف پیش کیے۔ پہلے لنکن کی کتاب اور مجسمہ اور پھر وہ اسکالر شپ۔ صدر کو ہنری کسنجر کے خط کا یقیناً انتظار ہو گا جس سے میرے مشن کی اہمیت آشکارا ہوتی تھی۔ میں نے جب وہ پیش کیا تو اس کی اہمیت اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر بتلائی "مجھے امید ہے کہ عزت مآب مجھے وضاحت کرنے کی اجازت دیں گے کہ یہ خط امریکہ کی اس خواہش کا باضابطہ اظہار ہے کہ وہ عدن سے سفارتی تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں تاکہ عدن کی پالیسیوں اور مسائل کو سمجھ سکیں۔ صدر امریکہ اور سیکریٹری داخلہ تعلقات خارجہ کے ضمن میں پورے پورے آزاد نہیں۔ انہیں آخر کار وہی کرنا پڑتا ہے جو

کانگریس منظوری دے اور اس لئے یہ اور بھی ضروری ہے کہ کانگریس کے ارکان عرب معاملات اور خصوصاً عدن کے معاملات کو بہتر طور پر سمجھیں۔"

صدر علی نے جواباً کہا "عدن ایک درخشاں مثال ہے ریپبلک کی' یہ ہمارے ملک کے دوسرے حصوں سے قطعاً مختلف ہے۔ ہمارے عوام بہت غریب ہیں۔" میں تو عدن کو ہی غریب سمجھ رہا تھا' اگر یہ "درخشاں مثال" ہے تو باقی جگہوں کا کیا حال ہو گا؟ میرے نوٹس لکھنے کے دوران صدر علی نے مجھے بتایا کہ اس کی حکومت کی غربت مٹانے کی کوششوں میں ہمسایہ ریاستوں کی دخل اندازی مانع تھی۔ اس نے زور دے کر کہا کہ ہمارے عوام میں یہ خیال راسخ ہے کہ ان تمام مصائب اور فتنہ کے پس پشت امریکن حکومت کا ہاتھ ہے۔ جو بھی فوجی اسلحہ ہم پکڑتے ہیں وہ ساختہ امریکہ ہوتا ہے۔ کچھ آپ کے ملاحظہ کے لئے باہر سجایا گیا ہے۔

میں نے دخل دیتے ہوئے کہا کہ ایسی اطلاعات امریکہ کے اندر میسر نہیں۔ سفارتی تعلقات کی بحالی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایسے واقعات نہ ہوں۔ صدر علی نے اقرار میں سر ہلایا اور کہا کہ میں تو امریکہ سے تعلقات کی بحالی کا خواہشمند ہوں' لیکن اس کی بنیاد ان مشکلات کا ازالہ ہونا چاہئے جو کہ ہمارے عوام کو ہیں۔ عدن تو امریکہ سے ترک تعلقات نہیں چاہتا۔

صدر نے میرے تحائف کا شکریہ ادا کیا جو کہ اس بات کا اشارہ تھا کہ انٹرویو تمام ہوا۔ اس موقع کا میں مدت سے منتظر تھا اور اب میری باری تھی فرینکلن کے بارے میں اپیل کرنے کی' لیکن اس کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ صدر نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "جہاں تک اس قیدی کا تعلق ہے تو مجھے جوں ہی آپ کی دلچسپی کا علم ہوا میں نے اس کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھنے کے احکام دیئے۔ میں نے آپ کی رہائی کی اپیل کا بغور مطالعہ کیا ہے' میری طرف سے اجازت ہے۔ آپ جب چاہیں اسے لے جا سکتے ہیں۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں جب چاہوں اسے لے جا سکتا ہوں۔ مارے خوشی کے میں واپسی پر کمرے سے نکلنے لڑکھڑا گیا۔ فرینکلن اب آزاد تھا' درحقیقت وہ میری قیام گاہ واپسی پر پہلے ہی وہاں میرا منتظر تھا۔ دوسری صبح ٦ بجے ہم بیروت جانے والی پرواز پر سوار تھے۔ ہمیں نیویارک سے ہو کر سینٹ لوئی پہنچنا تھا جہاں ایک خوش و خرم فیملی فرینکلن کی منتظر تھی۔

مجھے یقین ہے فرینکلن کی رہائی کی اصل وجہ عدن حکومت کا یہ فیصلہ تھا کہ امریکہ کے

ساتھ تعلقات کی بحالی کی چھوٹی سے چھوٹی کوشش کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ پھونک پھونک کر قدم رکھا جائے کیونکہ دونوں طرف "بی جمالو" قسم کے لوگ موجود تھے۔ عدن کے حکمرانوں کی "ٹکڑم" میں صدر علی سب سے کم مارکسی ذہنیت رکھتے تھے۔ ہمارے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں اب بھی ایسے ماہرین عرب موجود تھے جو سالہا سال پہلے کا اخراج عدن نہ بھولے تھے' ان کے خیال میں عدن اب صرف فلسطینی دہشت گردوں کی تربیت گاہ تھا اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ لیکن کچھ دوسرے اصحاب خصوصاً مسٹر کسنجر اس خیال کے حامی نہ تھے۔ ایڈ فرینکلن نے ہمیں اس بات کو پرکھنے کا موقع بہم پہنچایا۔

لیکن امریکی حکومت نے تین سال تک ٹال مٹول سے کام لیا۔ جمی کارٹر نے وائٹ ہاؤس میں جیرالڈ فورڈ کی جگہ لی اور سائرس وانس سیکریٹری آف اسٹیٹ بنا۔ ہماری حکومت نے عدن کی ادھار گندم خریدنے کی پیشکش ٹھکرادی اور اس کے بعد تین استعمال شدہ ہوائی جہاز خریدنے کے سودے کی بھی منظوری نہ دی۔ امریکہ نے ابتدائی گفت و شنید کو بھی ملتوی کئے رکھا۔ ستمبر ۱۹۷۷ء میں جب صدر علی اقوام متحدہ میں خطاب کرنے نیویارک آئے تو ان سے میری دوبارہ ملاقات ہوئی۔ انہوں نے تب بھی امریکہ سے تعلقات استوار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور مجھے کہا کہ میں سائرس وانس کو اپنی گفت و شنید کی براہ راست اطلاع دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا' چنانچہ سائرس وانس اور عدن کے وزیر خارجہ Mr. Motie میں ابتدائی گفت و شنید ہونا طے پا گئی۔ یہ ایک انقلابی اقدام تھا' گفت و شنید چند ہفتوں بعد عدن میں شروع ہونا تھی لیکن وائے افسوس کہ یہ پھر لیت و لعل کا شکار ہو گئی۔

اس میٹنگ کی تاریخ طے نہ پائی تھی کہ مجھے جنوری ۱۹۷۸ء میں مشرق وسطیٰ واپس آنا پڑا۔ میرے ساتھ کئی دوسرے کانگریس ممبران بھی تھے' میں نے اپنے پروگرام میں ترمیم کرکے عدن کے دورہ کے لئے وقت نکالا۔ اس دورہ سے قبل میری ملاقات سائرس وانس سے بھی ہوئی جو اتفاقاً ان دنوں ادھر ہی سے گزر رہے تھے۔ میری ملاقات سعودی عرب کے آئندہ بادشاہ بننے والے ولیعہد شہزادہ فہد سے بھی ہوئی۔ وہ ایک بھاری بھرکم رعب دار شخصیت کے مالک تھے' عمدہ انگریزی روانی سے بولتے تھے۔ شہزادہ فہد نے میری عدن کے بارے میں کوششوں کو سراہا اور مجھے کہا کہ میں عدن کے حکام کو یہ پیغام دوں کہ سعودی عرب ان کو اقتصادی امداد دینے پر رضا مند اور تیار ہے۔

نیک شگون

جب میں پہنچا تو عدن کے حالات کافی سدھر چکے تھے۔ عدن اپنے دیرینہ حریف سعودی عرب کے ساتھ سفاروں کاروں کا تبادلہ کرچکا تھا' حالانکہ دونوں ممالک کا سرحدی علاقوں پر جھگڑا باقی تھا۔اردن کے ساتھ بھی سفارتی تعلقات بحال ہونے طے پاچکے تھے۔ مقامی ریڈیو اسٹیشن اب پہلے کی طرح امریکہ اور سعودی امپیریلزم کے خلاف سرگرم نہ تھے۔اس دفعہ میری اہلیہ Lucille بھی میرے ہمراہ تھیں' ہمیں پھر اسی قیام گاہ میں ٹھہرایا گیا۔اب وہاں ایک بھرا بھرایا بڑا سا ریفریجریٹر بھی پڑا تھا۔

صدر علی نے گارڈ آف آنر کے ساتھ ہمارا اسی وسیع حال میں استقبال کیا۔ گو سعودی عرب کی امداد کا ذکر تو نہ آیا لیکن صدر علی نے شاہ فہد کے بارے میں گرم جوشی کے جذبات کا اظہار کیا' بعدازاں صدر نے کہا کہ وہ ماہ رواں کے اواخر میں امریکی سفارتی وفد کی آمد کے منتظر تھے۔ میرا چہرہ یقیناً لٹک گیا ہوگا۔ مجھے معلوم تھا کہ وفد اس ماہ نہیں آرہا بلکہ اس کی آمد غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کی جاچکی ہے۔ چند روز پہلے سائرس وانس نے مجھے یہ بری خبر سنائی تھی لیکن کوئی وضاحت نہ کی تھی۔ غالباً صدر علی کو اس سے مطلع کردیا گیا ہوگا۔

صدر علی کو ایک ایسے وفد کے انتظار میں رہنے دیا گیا جو کہ ملتوی ہوچکا تھا۔ مجھے مناسب نہ لگا تردید کرنا' لہٰذا میں نے سن کر امید افزا نگاہوں سے سر ہلادیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ التوا اس کے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کرے گا جو یہ نہیں چاہتے کہ عدن کے ساتھ امریکہ کے روابط ہوں۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا کہ ہمارے کچھ فوجی ماہرین کہتے ہیں کہ آپ نے روسیوں کو یہاں بحری اڈہ بنانے کی اجازت دے دی ہے' آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے شدید احتجاج کرتے ہوئے کہا "یہ سچ نہیں' ہم روسیوں یا کسی بھی غیر ملکی حکومت کو اپنی سرزمین پر اڈہ قائم کرنے کی اجازت نہیں دیں گے' البتہ ہم روسیوں سے تعاون ضرور کرتے ہیں کیونکہ وہ ہماری امداد کرتے ہیں۔" صدر علی نے بات چیت کے اختتام پر مجھے واشنگٹن کے لئے ایک پیغام دیا۔

"صدر کارٹر کو میری طرف سے بہت ہی مبارک باد ہو۔ برائے مہربانی انہیں یہ بتلادیا جائے کہ ہم امریکہ اور جمہوریہ یمن کے درمیان خوشگوار اور دوستانہ تعلقات کے پرجوش خواہشمند ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ صدر کارٹر تمام ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتے ہیں' ہم

اسے ایک مثبت پالیسی گردانتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے تعلقات مزید مضبوط ہوں گے۔"

الوداع کہتے وقت میں نے صدر علی کو اپنی بیٹی Diane کے ہاتھ کا بنا ہوا ایک گلدان دیا جو کہ اس نے ان کے لئے خود بنایا تھا۔ انہوں نے جواباً کہا "بہت عمدہ! میرا شکریہ اپنی بیٹی کو پہنچا دیں۔ مجھے یہ بہت اچھا لگا ہے۔" پھر انہوں نے دروازہ کے قریب جا کر ایک اور شئ کی تعریف کی جو کہ عدن میں بیحد نایاب ہے' یعنی بارش۔ "یہ ایک اچھا شگون ہے" انہوں نے کہا۔

میں عدن سے یہ یقین لئے رخصت ہوا کہ سفارتی تعلقات اس خطے میں امریکہ کے دوستوں کے لئے بہتر ثابت ہوں گے۔ سعودی عرب اور امریکہ دونوں کے مشترکہ مفاد میں تھا کہ جنوبی یمن میں روس کا اثر و نفوذ کم سے کم ہو۔ سفارتی مشن کا وہاں ہونا بہت اہم تھا۔ واشنگٹن واپسی پر میں نے یہ بات سائرس وانس اور وہائٹ ہاؤس اسٹاف کو باور کرانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مہینہ بھر بعد مجھے یہ پیغام صدر کارٹر کو دینے کا موقع ملا تو انہوں نے کہا کہ انہیں صدر علی کا پیغام سن کر حیرت اور خوشی ہوئی ہے۔ ان کے الفاظ بیحد گرمجوشی کے مظہر ہیں۔ ہمیں امید تھی کہ ہم اس خطے میں بہتر تعلقات قائم کر سکیں گے۔ میں نے فی الفور اس امید کا اظہار کیا کہ اب مزید التوا نہیں ہونا چاہئے۔ مزید التوا صدر علی کے لئے ناامیدی کا باعث ہوگا۔ صدر کارٹر نے میرا شکریہ ادا کیا اور جیسا کہ پہلے سائرس وانس نے بھی کہا تھا' انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں گے۔

صدر کارٹر نے اپنی بات کا پاس رکھا اور پانچ ماہ بعد اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے ماہرین کی ٹیم کا دورہ ۲۶ رجون ۱۹۷۸ء کو طے پا گیا۔ یہ صرف "ابتدائی بات چیت کے لئے" اور وہ بھی صرف اس موضوع پر یعنی "Non-Committal Way" میں سفارتی تعلقات کی بحالی پر مذاکرات۔ صدر علی نے وفد کا استقبال کرنا تھا۔ یہ تاخیر بہت مہلک ثابت ہوئی۔ انقلابی عناصر نے یہ دیکھتے ہوئے کہ صدر علی امریکہ اور سعودی عرب کے ساتھ بہتر تعلقات کے لئے کوشاں ہیں' فوجی جہاز چھین کر صدارتی محل پر حملہ کر دیا اور عین اس دن جبکہ امریکی وفد کو وہاں پہنچنا تھا' صدر علی کی حکومت کا تختہ الٹ کر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ صدر علی کو فائرنگ اسکواڈ نے گولی سے اڑا دیا۔ سفیر عدن جناب اشطل نے مجھے نیویارک سے فون پر بتایا کہ وفد کو اب بھی خوش آمدید کہا جائے گا' لیکن یہ مشن معطل کر دیا گیا۔ یہ وفد شمالی یمن کے دارالحکومت صنعاء تک جا کر واپس واشنگٹن لوٹ گیا۔ مجھے

صدر علی کی سزائے موت پر افسوس تھا۔ میں نے سفیر اشطل سے وضاحت طلب کی' اس کا جواب تھا "یہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے جس کا بیرونی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں۔"

صدر علی کے انجام نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ کہیں میری حمایت اور فرینکلن کے ساتھ رحم تو اس کے زوال کے باعث نہیں بنے؟ میری عدن کے سفر کی اہمیت ذات سے بڑھ کر تھی' حالانکہ مجھے آخرکار سفارتی تعلقات بحال کرانے میں ناکامی ہی ہوئی۔ دارالحکومت میں سالہا سال گزارنے کے بعد مجھے پہلی مرتبہ عربوں کے نکتہ نظر اور خصوصاً فلسطینیوں کی حالت زار کا پتہ چلا۔ میں نے مشرق وسطیٰ کے بارے میں کتب پڑھنا اور ماہرین سے تبادلہ خیالات کرنا شروع کیا اور یوں اس خطے کے سمجھنے کی ابتداء کی۔ آہستہ آہستہ عرب مجھے بنی آدم کا حصہ لگنے لگے۔

میرے تجربات کے بارے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور جلد ہی میرا دفتر ان اصحاب کے لئے ایک منزل راہ بن گیا جو مشرق وسطیٰ کو جا یا آ رہے ہوتے۔ ان میں اسکالر' تاجر' عمال' حکومت وغیرہ وغیرہ شامل تھے۔ کانگریس میں سے کسی کا عرب ممالک کو جانا اور ان کے مسائل میں دلچسپی لینا ایک عجوبہ تھا۔ میں نے کانگریس میں آواز بلند کی' میں اپنے تئیں امریکی نکتہ نظر کے مطابق دلیل دیتا تھا نہ کہ اسرائیل نواز یا عرب نواز نکتہ نظر سے۔ میرا کہنا یہ تھا کہ فلسطینیوں کی سیاسی قیادت سے گریز ہمیں اسی طرح امن کی تلاش سے محروم کرتا ہے جیسے یمن کے صدر علی سے بات چیت! سفارتی گفت و شنید چاہے مخاطب کیسا ہی ناواقف یا بونا ہو' ہر حال میں ہماری حکومت کے مفاد میں ہوتی ہے۔ یہ گفت و شنید دوسرے کے نکتہ نظر کی حمایت ظاہر نہیں کرتی۔ میرا سوال تھا کہ براہ راست یاسر عرفات سے جو P.L.O. کا چیئرمین اور فلسطینیوں کا مصدقہ سیاسی نمائندہ تھا' کیوں نہ بات چیت کی جائے؟ ایک وجہ جس کا مجھے پتہ چلا وہ یہ تھی اسی ہنری کسنجر نے جس نے کہ مجھے عدن کے لئے امدادی تھی' اسرائیل کے دباؤ میں آکر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ جب تک وہ اسرائیل کے زندہ رہنے کے حق کو تسلیم نہ کرے اس سے براہ راست بات چیت نہ کی جائے۔ یہ ایک مشکل مطالبہ تھا خاص طور پر جب کہ اسرائیل ایک فلسطینی ریاست کو بطور ہمسایہ منظور کرنے پر تیار نہ تھا۔

میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس جمود کو توڑنے کے لئے میں خود یاسر عرفات سے بات کروں گا۔

میں پہلی مرتبہ .P.L.O کے لیڈر سے جنوری ۱۹۷۸ء میں صدر یمن کے ساتھ آخری ملاقات کے دوران ملا تھا۔ کئی ساتھی ہمراہ تھے' ڈیموکریٹ Leo Ryan جو کہ بعد ازاں Jones Town/Guyana کے تشدد کے دوران ہلاک ہوا تھا اور Helen Meyner بھی تھی۔ ایک اور ریپبلکن کانگریس ممبر بھی موجود تھا لیکن اس نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اگر اس کا نام بتلا دیا گیا تو اس کے حلقہ انتخاب کے اسرائیل نواز سرگرم کارکن اس کے لئے مشکلات پیدا کریں گے۔ اس میٹنگ سے پیشتر میرے دل میں بھی وہی خدشات تھے جو چار سال پہلے عدن روانہ ہوتے وقت تھے۔ میں قدرے محتاط تھا کیونکہ عرفات سے ملاقات وہ حد پار کرنے کے مترادف تھی جو کہ ہنری کسنجر نے اسرائیل کے کہنے پر مقرر کر رکھی تھی۔

میں اپنے الفاظ پر قائم ہوں

جب میں نے حد پار کی تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جس عرفات نے میرا ایک زبردست پہرے والے دوسری منزل کے فلیٹ میں خیر مقدم کیا۔ کوئی اسلحہ لہرانے والا' وحشی نظروں والا نہ ہی دیوانہ ہر گز نہ تھا۔ جب وہ ہم سے ملا تو ہمیں حیرت ہوئی کہ یہ ہمیشہ فلسطینی ٹوپی یا فوجی ٹوپی پہننے والا تو تقریباً گنجا تھا' اس کے .P.L.O تشدد کے بارے میں جوابات وہی گھسے پٹے تھے' لیکن جو بات اس کے تجربے کی گہرائیوں سے ابھری وہ کچھ اس طرح تھی "میں ایک مجاہد آزادی ہوں۔ ہم اپنی قوم کے حق آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں' یعنی چالیس لاکھ فلسطینی جن کو تیس سالہ جنگ نے تتر بتر کر رکھا ہے۔"

میری اسی سال عرفات سے مزید ایک نتیجہ خیز ملاقات ہوئی' اس دفعہ میں اکیلا ہی تھا۔ ہم اسی فلیٹ میں ملے' اس کے ہمراہ اس کا محافظ دستے کا سردار ابو حسن تھا جو کہ جلد ہی ایک کار بم کے حملے میں بیروت میں ہلاک کر دیا گیا اور دوسرا شخص محمود لباوی تھا یعنی اس کا تعلقات عامہ کا آفیسر۔ لیکن وہ بھی بعد ازاں اسے دغا دے گیا اور شام کے شدت پسند مخالفین کے ساتھ جا ملا۔ اس اذیت یافتہ گروپ میں بیحد انتشار تھا۔ میں چاہتا تھا کہ عرفات وہ شرائط واضح کرے جن کے تحت وہ اسرائیل کے ساتھ امن سے رہنا چاہتا ہے۔ کیا وہ اسرائیل کو تسلیم کرنے پر تیار ہے؟ رات گئے تک جاری رہنے والی چار گھنٹے کی طویل گفت و شنید میں اس کا جواب ملا' بے حد احتیاط سے لفظ بہ لفظ اور

فقرہ بہ فقرہ ایک بیان ترتیب دیا گیا جس کو شائع کرنے کا مجھے اختیار دیا گیا۔

میں نے وہ الفاظ لکھے اور متعدد بار اسے پڑھ کر سنائے تاکہ وہ ان کے مطالب اور معانی پر پورا غور و خوض کر لے۔ جب یہ تمام ہوا تو میں نے عرفات سے پوچھا کہ کیا وہ اس پر اپنے دستخط ثبت کر دے گا؟ اس کا جواب تھا کہ نہیں' میرے لئے بہتر یہی ہے کہ میں دستخط نہ کروں لیکن میں اپنے الفاظ پر قائم رہوں گا۔ آپ میرا حوالہ دے سکتے ہیں۔ عرفات نے یہ اعلامیہ لکھوایا:

"P.L.O. ایک ایسی آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کو قبول کر لے گی جو مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر مشتمل ہو بمعہ درمیانی راہداری کے۔ اور اس صورت میں وہ اس ریاست کے پھیلاؤ کی ہر پر تشدد کوشش کو ترک کرنے کا عہد کرتی ہے' البتہ ہم یہ حق محفوظ رکھتے ہیں کہ عدم تشدد کے ذرائع مثلاً سفارتی اور جمہوری طریقوں کے استعمال سے تمام فلسطینیوں کو آخر کار متحد کر لیں۔ ہم اسرائیلی ریاست کو عملی طور پر تسلیم کر لیں گے' ہم اپنے تمام ہمسایوں کے ساتھ امن سے رہیں گے۔"

(دمشق ۳۰ر نومبر ۱۹۷۸ء)

میں اغلباً کچھ زیادہ ہی خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا۔ عرفات کا عہد قرمطیوں کے ان اعلانات سے بیحد مختلف تھا جن میں اسرائیل کی ریاست کو نیست و نابود کرنے کے دعوے تھے۔ گو اب بھی یہ امریکہ اور اسرائیل کی خواہشات سے پورا پورا ہم آہنگ نہ تھا لیکن پھر بھی یہ ایک حوصلہ افزا ابتدا تھی۔ اگر یہ سچ تھا تو یہ اس تصور کی تردید تھا کہ مقصد صرف تشدد سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس طویل گفت و شنید میں بہتیرے نکات زیر بحث آئے۔ میں نے عرفات سے خاص طور پر دریافت کیا کہ وہ کن نکات کو نشر نہیں کرنا چاہتے؟ میرا مقصد اپنی ساکھ قائم رکھنا تھا۔ مندرجہ بالا احتیاط سے تیار کیا گیا اعلامیہ ان نکات سے مبرا تھا۔ وہ دنیا کو بتانا چاہتے تھے اور صدر کارٹر سے ایک مثبت ردعمل کی توقع رکھتے تھے۔ .P.L.O لیڈر کی ایک پسندیدہ اصطلاح میں انہوں نے مجھے اپنا یہ بیان نشر کرنے کی اجازت دے کر ایک داؤں کھیلا تھا۔ یہ ان کی جماعت کے سرکاری تسلیم شدہ بیان سے ایک قدم آگے تھا۔

صد افسوس کہ امریکی حکومت نے کچھ بھی ردّ عمل ظاہر نہ کیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وانس (سیکریٹری آف اسٹیٹ) نے صرف ذاتی طور پر یہ صلاح دی تھی کہ انتظامیہ اس بیان کا نوٹس لے لیکن کوئی عام بیان نہ دیا۔ بعد ازاں عرفات نے کئی عوامی انٹرویوز میں اس علامیہ کے بارے میں اپنی

روایتی سبک روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوالات سے پہلو تہی کی۔

اس دوران رابرٹ سٹراس (جسے کارٹر نے تازہ تازہ سفیر برائے مشرق وسطیٰ نامزد کیا تھا) بھی میرے اور یاسر عرفات کے درمیان رابطہ میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ اکثر میرے دفتر آتا' وہ ایک امتیازی حیثیت کا ڈیموکریٹ تھا جو کہ ماضی میں ڈیموکریٹ نیشنل کمیٹی کا صدر رہ چکا تھا۔ مجھے اکثر یہ خیال آیا کہ عرفات اور سٹراس کو باہم اکٹھا کرنا امن کے عمل میں معاون ہو سکتا ہے۔

یہ امر کہ سٹراس خود یہودی تھا' اسرائیل کے ہزاروں لوگوں کو اپنی حکومت کی سخت گیر پالیسی کو نظرانداز کرنے میں معاون ثابت ہوتا۔ لیکن باوجود اس کے کہ سٹراس کے تعلقات کارٹر سے انتہائی قریبی تھے اور وہ پیچیدہ قومی اور بین الاقوامی مسائل کو گفت و شنید سے حل کرانے کے سلسلے میں مسلمہ اہلیت کا حامل مانا جاتا تھا۔ اس کو صدر کی پوری پوری حمایت مشرق وسطیٰ کے بارے میں حاصل نہ ہوئی۔ بعدازاں جبکہ سٹراس صدر کارٹر کی دوسری ناکام انتخابی مہم کے دوران مجھے ملا تو کہنے لگا: اگر مجھے اپنی مرضی کرنے دی جاتی تو میں عرفات سے کئی ماہ سے گفت و شنید کر رہا ہوتا۔

میں مشرق وسطیٰ کی سیاست میں مزید دھنستا چلا گیا۔ اگست ۱۹۷۹ء میں ایک اتوار کی صبح مجھے ہیرالڈ سونڈرز نے الی نوائے میں فون کیا اور امداد مانگی۔ عرفات کی طرف سے کویت یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ فلسطینیوں کی حمایت میں ایک یو۔این قرارداد پر غور کیا جائے۔ USA اس کی حمایت اس وجہ سے نہ کر سکتا تھا کہ اسرائیل معترض تھا اور مشکل یہ تھی کہ وہ اس کی مخالفت بھی نہ کرنا چاہتے تھے۔ اگلے منگل کو اس پر ووٹنگ تھی' سونڈرز کا خیال تھا کہ مزید مہلت مل جائے تو عربوں اور امریکہ کے لئے متفقہ طور پر قابل قبول قرارداد تیار کی جا سکتی تھی۔ اسے صدر کارٹر کی اس پالیسی کا علم تھا کہ P.L.O. سے بالواسطہ یا بلاواسطہ بات کرنا ممنوع تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ میں عرفات سے بات کروں۔ بہرحال مجھے سونڈرز کی کال کا مطلب سمجھنے میں دقت پیش نہ آئی' وہ چاہتا تھا کہ عرفات اس مجوزہ ووٹنگ کو منسوخ کروا دے۔

میری کال بیروت میں عرفات کے دفتر میں فوراً ہی مل گئی جو کہ بیروت جیسے تلپٹ ٹیلی فون نظام کے لئے ایک اچنبھا تھا۔ میں نے عرفات سے کہا کہ وہ یہ UN Confrontation ملتوی کروادے' اس سے اس کا کچھ نقصان نہ ہوگا اور امریکی حکومت اس کی احسان مند ہوگی۔ دو گھنٹے بعد عرفات نے کویت کو کہہ کر یہ ووٹنگ ملتوی کروادی۔ امریکہ کی اپنے عرب دوستوں کے ساتھ

ناراضگی اس طرح ٹل گئی۔ اسی اختتام ہفتہ کارٹر کے یو این سفیر اینڈریو ینگ نے سونڈرز سے کم احتیاط برتتے ہوئے .P.L.O کے یو این آبزرور زہدی ترمذی سے بات چیت کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو اپنے عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا۔ یہ تھی سختی امریکی موقف کی۔

میرا جلد ہی پھر اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے فون پر رابطہ ہوا۔ اب کی مرتبہ انہیں یاسر عرفات کی مدد میرے واسطہ سے درکار تھی تاکہ طہران میں امریکی مغویوں کو رہائی نصیب ہو۔ ۱۹۷۸ء کی میٹنگ میں مجھے عرفات نے ایران کے انقلابی رہنماؤں سے اپنے قریبی تعلقات کے بارے میں آگاہ کیا تھا اور اب اس بحران نے ایک موقع فراہم کیا تھا کہ وہ انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر ہماری امداد کرے اور شاید یونہی ایک وسیع البنیاد معاہدہ امن کی شروعات ہو سکے۔ اس مرتبہ وہ اپنے ہیڈ کوارٹر میں نہ تھا' لیکن اس کے نائب محمود لبادی سے میری تفصیلی بات چیت ہوئی۔ عرفات کے ساتھ میری دوسری ملاقات میں لبادی سے میری جان پہچان ہوئی تھی۔

محمود لبادی نے مجھے یاد دلایا کہ عرفات نے میرے مشورہ پر وہ UN مسابقہ ملتوی کروایا تھا لیکن بقول اس کے ہمیں معاوضے میں کچھ نہ ملا' وہ حقیقت بیان کر رہا تھا۔ نہ تو کوئی باہمی طور پر متفقہ قرارداد منظور کی گئی اور نہ ہی عرفات کا کوئی احسان مانا گیا۔ لبادی نے مجھے کہا کہ وہ میرے دلائل اور مشوروں کو نہیں مانتا لیکن وہ اپنے لیڈر کو یہ سب کچھ بہ احتیاط پہنچا دے گا۔ عرفات نے مزید ایک مرتبہ تعاون کیا اور اپنا سفیر امام خمینی کے پاس بھیجا اور بقول سونڈرز کے یہ سفیر پہلے گیارہ مغوی رہا کروانے میں کامیاب رہا۔

اس کے معاوضہ میں کارٹر انتظامیہ نے انتہائی رازداری سے ذاتی طور پر عرفات کا شکریہ ادا کیا' لیکن کھلے عام کارٹر کے نمائندے نے اشارتاً بھی اس بات کی تردید نہ کی کہ عرفات بھی ان مغویوں کے اغوا میں ملوث ہے۔ .C.B.S کے Kalb Marvin نے یہ کہا تھا کہ "کوئی" عربی بولتا سنا گیا ہے سفارت خانہ کے احاطہ کے اندر۔ (ایرانی فارسی زبان بولتے ہیں جو کہ عربی سے بالکل مختلف ہے) صرف اتنی بات سے یہ نتیجہ نکال لیا گیا کہ .P.L.O ملوث ہے۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ سیکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر وانس نے اپنا عہدہ چھوڑنے سے ذرا قبل مجھے بتایا کہ اس کا "تقریباً روزانہ" رابطہ قائم رہا' عرفات اور اس کے .P.L.O اسٹاف سے۔ وہ ایرانیوں کے ساتھ طویل مذاکرات میں مدد دیتے رہے ہیں لیکن وانس نے کبھی بھی اعلانیہ اس کا اقرار نہ کیا۔

میں نے کئی بار صدر امریکہ سے اپنی رازدارانہ ملاقاتوں میں یہ کہا کہ صدر کو اعلانیہ طور پر یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ عرفات کا رویہ مفاہمانہ اور معتدل ہے' بصورت دیگر یہ نہ کرنا مخالفانہ اور متشددانہ رجحانات کو تقویت پہنچانے کا باعث ہوگا۔ لیکن میری بات کو ہر مرتبہ ٹال دیا' بعد ازاں مجھے پتہ چلا کہ یہ نائب صدر والٹر مونڈیل کا کارنامہ تھا۔

محمود لبادی نے اس تعاون پر کبھی معاف نہ کیا۔ تین سال بعد اس نے .P.L.O لیڈر سے منحرف ہو کر ٹریپولی میں عرفات کے محاصرے میں باغیوں کے ساتھ حصہ لیا۔ لبادی نے اپنی منحرفی کی وجہ عرفات کا امریکیوں اور اسرائیل کے خلاف مسلح جدوجہد کو تیز تر کرنے کا مشورہ قبول نہ کرنا قرار دیا۔ لبادی اور منحرفین نے اپنے اسلحہ کا رخ عرفات کی طرف موڑ دیا۔ ان کا کہنا تھا (جو صحیح نہ تھا) کہ فلسطینی اسلحہ کے بل پر وہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں جو .P.L.O کا چیف اپنی حکمت عملی سے حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔

۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۰ء کے دوران میں نے فلسطینیوں کے تشدد کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ صدر کارٹر سے پرزور درخواست کی کہ وہ اسرائیل پر دباؤ ڈال کر اس کے لبنان پر حملوں کو رکوائیں۔ اسرائیل نے گاہے بگاہے گاؤں (دیہاتوں) پر بھاری بمباری شروع کر رکھی تھی اور بیروت تک کو نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ اس بمباری میں معصوم شہری مارے جا رہے تھے۔ یہ جہاز اور بم امریکہ نے مہیا کیے تھے۔ آخر کار سیکریٹری آف اسٹیٹ وانس نے ایک "غیر معمولی" اقدام کیا۔ اس نے کانگریس کو ایک سرکاری رپورٹ میں کہا کہ اسرائیل نے امریکن قانون کی اغلباً خلاف ورزی کی ہے' جس میں یہ کہا گیا ہے کہ امریکی اسلحہ صرف اپنے دفاع میں استعمال ہونا چاہئے۔۔۔ لیکن اگلا منطقی اقدام یعنی اسلحہ کی سپلائی اسرائیل کو منقطع کر دینا نہ اٹھایا گیا۔ لیکن "اغلباً خلاف ورزی" والے اعلان نے کچھ اثر دکھلایا۔ یہ ان نایاب مواقع میں سے ایک تھا جبکہ کسی امریکی انتظامیہ نے اسرائیل کی اعلانیہ مذمت کی۔

پس پردہ صدر کارٹر نے سخت رویہ اپنایا۔ لیکن تابہ کہ؟ ۱۹۸۰ء کے موسم گرما میں اس نے اسرائیلی وزیر اعظم مسٹر ماناخم بیگن کے دفتر میں ایک سفارتی نمائندہ بھجوا کر اسرائیل کو یہ تنبیہ کی کہ اگر اس نے لبنان پر ہوائی حملے جاری رکھے تو اس کی امداد بند کر دی جائے گی۔ اس انتباہ کا فوری اثر ہوا اور ماناخم بیگن نے ایئر چیف کو فون پر حملے بند کرنے کا حکم دے دیا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد ہی انتخاب کے قرب نے صدر کارٹر کا جوش ٹھنڈا کر دیا اور اسرائیل

ے دوبارہ امریکی اسلحہ لبنان کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا لیکن کارٹر نے چپ سادھے رکھی۔ میرے احتجاجات کیپٹل ہل (امریکی حکومت کا مرکز) پر صدا بہ صحرا ثابت ہوئے اور پالیسی ساز اداروں نے انہیں نظر انداز کیے رکھا' لیکن میری یہ تمام کوششیں ایک اور سمت میں اثر انداز ہوئیں۔ مجھے ایک عجوبہ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ قومی ریڈیو اور ٹی وی پر میرے انٹرویو نشر ہوتے اور اخباروں اور رسائل میں مجھے قومی اور عالمی سطح پر بطور حوالہ پیش کیا جانے لگا۔ بعض اوقات یہ بیحد نشہ آور معلوم ہوتا۔ ایڈ فرینکلن کی والدہ کو حیرانی ہوئی ہوگی کہ اس کے خط نے میری زندگی پر کس قدر اثر ڈالا۔

مشرق وسطیٰ میں کھلبلی

جس دوران میں اپنا امن مشن منظم کر رہا تھا' میرے معترضین مجھے میرے منصب سے ہٹانے کے لیے کوشاں تھے۔ میرے قومی مخالفین جنہوں نے یہ دیکھا کہ میں نے ۱۹۷۸ء میں اپنے مکرر انتخاب میں ۷۰ فیصد ووٹ لے کر ایک طوفانی کامیابی حاصل کی تھی' یہ اندازہ لگایا کہ میری امریکی خارجہ پالیسی کے بارے میں غیر معمولی اقدامات کی وجہ سے ان کو میری مخالفت کرنے سے زیادہ رقم وصول ہوگی۔ ۱۹۷۹ء کے موسم بہار میں ایک سابقہ جارحانہ انداز رکھنے والے قانون ساز نمائندے مسٹر ڈیوڈ رابسن نے' اسرائیل کے پر تشدد حامیوں کے اکسانے پر میرے خلاف ایک کل وقتی تحریک شروع کی تاکہ مجھے ڈیموکریٹ پارٹی کی نامزدگی برائے کانگریس کے لئے محروم کر دیا جائے جس پر میں پچھلے ۱۹ سال سے تعینات تھا۔ مارچ ۱۹۸۰ء کے پرائمری انتخاب سے تین ماہ پیشتر Quency کے مقبول عام ریپبلکن میئر نے پرائمری انتخاب میں شامل ہو کر میری نامزدگی کو چیلنج کیا۔ یہ مہم باقاعدہ پیشہ ورانہ طور پر چلائی گئی اور اسے اسرائیل نواز ایکشن کمیٹیوں اور افراد کی حمایت حاصل تھی۔ چندوں کی بارش نے میرے خلاف جو محاذ کھڑا کیا اس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ مجھے اس ریپبلکن پرائمری انتخاب میں صرف ۵۵ فیصد ووٹ ملے۔

یہ ایک حیرت انگیز سال تھا۔ سب سے عجیب بات میری نامزدگی پر ڈاکٹر آرتھر برنز کا ردعمل تھا۔ وہ فیڈرل ریزرو بورڈ کا سابقہ صدر اور حال سفیر برائے مغربی جرمنی تھا۔ اس پرائمری انتخاب کے کچھ عرصہ بعد میں نے ان سے فون پر کسی مسئلہ کے بارے میں بات کرتے کرتے اپنی دوران انتخاب

حالت کا ذکر کر دیا۔ برنز نے کھلے دل سے کہا کہ ہم کسی حالت میں آپ کو ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتے' تمہارا دوبارہ منتخب ہونا ساری قوم کے لئے بیحد اہم ہے۔ میں نے احسان تلے دبتے ہوئے ایک معمولی سی درخواست کی کہ اگر آپ یہ جذبات تحریری شکل میں مجھے بھجوادیں تو میں ان کو اپنی انتخابی مہم میں استعمال کر سکوں گا' آپ کی بڑی عنایت ہوگی۔

اس کی تصدیق میرے لئے کچھ اتنی اہم نہ تھی' درحقیقت اس کا تو مجھے خیال ہی تب آیا جب اس نے میرے ریکارڈ کی تعریف کی لیکن مجھے امید تھی کہ برنز بلا حیل و حجت میری بات مان جائے گا۔ بھلا کیوں نہ مانتا؟ یہ میرے جیسے سینیٹر ریپبلکن کے حق میں ایک معمولی سی اخلاقی امداد تھی اور پھر برنز میرا صرف عمر بھر کا ساتھی اور ایک بیباک ریپبلکن ہونے کے ساتھ ساتھ کانگریس میں میری پوری سیاسی زندگی کا ایک قریبی ساتھی بھی تھا۔ کئی سال پہلے اس نے میرے اپنے مادر علمی یعنی کالج آف الی نوائے میں میری حمایت میں تقریر کی تھی۔ اس کے اور میرے نظریات مالی اور اقتصادی معاملات میں ایک جیسے تھے۔ اس کا جواب میرے لئے اس سال کا سب سے گہرا زخم تھا۔ "اوہ! یہ میں نہیں کرسکتا' تمہارے .P.L.O پر خیالات کے باعث' معافی چاہوں گا۔" میں گنگ رہ گیا۔ مجھے حیرتوں اور مایوسیوں کا کافی تجربہ تھا لیکن یہ انکار مجھے سکتہ میں ڈال گیا۔

کیسا سبق حاصل ہوا مجھے' نہ اس سے پہلے اور نہ آئندہ کسی واقعہ نے مجھے اتنے بہتر انداز سے سمجھایا کہ امریکہ کے سیاسی میدان میں اسرائیلی لابی کا اثر و نفوذ کس قدر گہرا ہے۔ یہ عظیم رحمدل بزرگ یہودی سیاست داں جو کہ عرصہ بیس سال سے میرا دوست تھا' اس لابی کے ڈر سے میری نامزدگی کے حق میں چند الفاظ نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ میں اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ اگر آرتھر برنز جیسا عظیم انسان بھی اپنے خیالات کا برملا اظہار نہیں کرسکتا تو پھر کسی دوسرے عام آدمی کو کس قدر چیلنج درپیش ہوگا' اپنی رائے برملا ظاہر کرنے میں۔

دریں اثنا ڈیموکریٹ رابسن چندہ اکٹھا کر رہا تھا۔ امریکہ کے اس سرے سے اس سرے تک یہودی اخبارات و جرائد میں یہ مشتہر کر رہا تھا کہ میں "ایک ایسا عملی Anti-semite ہوں جو امریکی کانگریس کی پوری تاریخ میں اسرائیل اور یہودیوں کا بدترین دشمن رہا ہے۔" اسے پوری پچاس ریاستوں سے چندہ وصول ہو رہا تھا' اس ساری مہم میں بارہ لاکھ ڈالر خرچ ہوئے جو کہ الی نوائے کی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے۔ ہم دونوں نے تقریباً چھ چھ لاکھ ڈالر خرچ کئے۔ نیویارک اور کیلیفورنیا کے

علاوہ دوسری ریاستوں سے بھی طلباء نے سینٹرل الی نوائے آ کر رابسن کی مدد کی۔

"اوچھے ہتھیاروں" نے اس وقت بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا جبکہ میں اپنے ڈسٹرکٹ سے باہر ہوتا یا انتخابی مہم میں شامل نہ ہوتا۔ شکاگو کونسل برائے تعلقات خارجہ نے مجھے خارجہ پالیسی پر تقریر کی دعوت دی۔ اس تقریر کے دوران ایک شخص نے دروازے میں سے چلا کر کہا "ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس کمرے میں بم رکھا گیا ہے۔" 500 سامعین کا مجمع تتر بتر ہو گیا' بعدازاں تلاش کے دوران پولیس کو ایک پائپ کا ٹکڑا ملا جو کہ ببل گم سے بھرا ہوا اسٹیج پر رکھی پیانو پر پڑا تھا۔ اس کے بعد روبسن کے سرگرم کارکن سارا راستہ طے کر کے Detriot Michigan پہنچے جہاں پر میں ریپبلکن کنونشن میں نمائندہ تھا۔ وہ تماشائیوں کی تفریح طبع کے لئے یہ کورس الاپتے رہے:

"He supports the P.L.O

Paul! Paul! he must go"

پھنسنا ایک بس میں مسٹر پرسی (Percy) کے ساتھ

پہلے پہل میری حالت مسٹر ریگن کے صدارتی مہم والوں پر آشکارا نہ ہوئی۔ جب اس کے دفتر کو میرے سپرنگ فیلڈ میں چندہ جمع کرنے کے لئے لنچ کی میٹنگ کا علم ہوا تو اس کے منیجر نے دریافت کیا کہ آیا وہ اس میں شمولیت کر سکے گا۔ قریب سے تو گذر ہی رہا تھا لیکن جب اس کے دورہ میں الی نوائے شامل کیا گیا تو اس کے نیویارک کے منتظمین نے انتباہ کیا کہ فنڈلے کی حمایت کا مطلب نیویارک سے محرومی ہو گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے بیحد غیر معمولی اقدام کئے تاکہ وہ مجھ سے دور رہے۔ سپرنگ فیلڈ جو کہ میرے ڈسٹرکٹ کے قلب میں تھا ایک مسئلہ تھا۔ کیونکہ یہ پہلے ریپبلکن صدر ابراہیم لنکن کا جائے پیدائش بھی تھا اور اسی وجہ سے یہ ریپبلکن والوں کا مکہ تھا۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ ریپبلکن امیدوار الی نوائے میں دن گزارے اور سپرنگ فیلڈ نہ آئے؟ ریگن کے کارپردازوں کے لئے یہ ایک دردسری تھی کہ وہ کس طرح یہ زیارت بھی کر لے اور مجھ سے دور بھی رہے۔

پہلے تو اس کے منتظم Mr. Greg Newell نے مسئلہ کا یہ حل نکالا کہ ریگن عین اس وقت لنکن کی رہائش گاہ سے ایک بڑے جلسے سے خطاب کرے جبکہ شہر میں قریب ہی میرا Fund

Raising لنچ ہو رہا ہو۔ مزید احتیاط کے طور پر اس نے ریگن کا سپرنگ فیلڈ کا دورہ بجائے لنکن کے گھر کے اس کے مزار کے قریب رکھوا دیا تاکہ فاصلہ مزید بڑھ جائے۔ ریگن کی تقریر کو بھی گول کر دیا گیا تاکہ پریس والوں کا دھیان ہی نہ جائے ادھر۔

مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے بہت سے حامی ریگن کو دیکھنے کے مشتاق ہوں گے جب وہ ادھر سے گزرے تو' لہٰذا ان کی سہولت (اور اپنے جلسے میں بہتر حاضری کے لئے) میں نے اپنے فنکشن کا وقت تبدیل کر کے اس قدر صبح کر دیا کہ میں اور وہ سب بھی ریگن کے مزار لنکن والے جلسہ میں شرکت کر سکیں۔ ریگن کے منیجر نے خفیہ طور پر (اپنی دانست میں) یہ حکم جاری کیا کہ مسٹر فنڈلے کو ہر حال میں ریگن کے قریب پہنچنے سے روکنا ہو گا' حالانکہ Illinois میں دوسری جگہوں پر کانگریس کے امیدواروں نے اس کے ساتھ اسٹیج پر شامل ہونا تھا۔ جب میرے منیجر ڈون نارٹن کو اس کا علم ہوا تو اس نے ریگن کے .H.Qs میں شکایت کی۔ اب کے ریگن کے منتظمین نے پھر پینترا بدلا اور یہ حکم جاری کیا کہ کوئی بھی کانگریس کا امیدوار ریگن کے ساتھ اسٹیج پر نہ بیٹھے گا۔ کانگریس مین Ed Madigan کو جب یہ بتلایا گیا کہ وہ Bloomington میں اس دن یا تو ریگن کی آمد سے قبل تقریر کر لے یا پھر اس کی روانگی کے بعد تو اس نے جھلا کر تقریر ہی نہ کی۔

سپرنگ فیلڈ میں ریگن کی صدارتی مہم کے کارپرداز مسٹر پال روسو کو صرف یہی ایک اہم فرض سونپا گیا تھا کہ وہ مجھے اس وقت کیمرہ کی رینج سے دور رکھے' جب ریگن قریب ہو۔ مجھے معنوی طور پر پچاس فٹ والی رسی کے پیچھے جکڑ کر رکھا گیا۔ اس وقت ریگن لنکن کے مجسمے کے ساتھ روایتی انداز میں ناک رگڑ رہا تھا' یہ جگہ مزار کے دروازہ پر تھی۔

اس سے اگلے اسٹاپ پر جو کہ سپرنگ فیلڈ کے قریب ایک کوئلے کی کان تھی' روسو کے ساتھیوں نے مجھے ایک بس میں محبوس رکھنے کی کوشش کی۔ اس بس میں میرا ایک دوست سینیٹر چارلس ایچ پرسی بھی میرے ہمراہ پھنس گیا۔ مقصد تو صرف مجھے دور رکھنا تھا' وہ بھی عین اس وقت جبکہ ریگن مجمع سے خطاب کر رہا ہو۔ یہ پرسی کی بدقسمتی تھی کہ وہ بھی بس میں میرے ہمراہ تھا' لہٰذا اسے بھی رکنا پڑا۔ ہم دونوں نے مل کر دروازہ کھول تو لیا بس کا' لیکن اس دوران ریگن خطاب کر کے جا چکا تھا۔

بوب ہوپ (Bob Hope) بھی پسپا

یہ دہشت ہالی وڈ تک پھیل گئی۔ بوب ہوپ جو دوسری جنگ عظیم اور کوریا کے محاذ جنگ پر بھی دشمن کی فائرنگ سے کبھی نہ گھبرایا تھا' جس نے صدر نکسن کی ویتنام کی حمایت کر کے مخالف کے طوفان کا سامنا کیا تھا' وہ یہاں پر "وکھرے ٹائپ" کی چاند ماری کا شکار ہوا جو کہ زیادہ تباہ کن تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے سپرنگ فیلڈ میں میری خاطر چندہ جمع کرنے کیلئے ایک جلسہ میں شمولیت منظور کر لی۔

دو سال پیشتر میں نے ہوپ کی ۷۵ ویں سالگرہ ایوان نمائندگان میں منانے کا اہتمام کیا تھا' یہ ایک انتہائی دلچسپ تقریب تھی۔ ہوپ اور اس کی بیگم گیلری میں بیٹھے تھے اور یکے بعد دیگرے کانگریس کے ارکان اس عظیم مزاحیہ اداکار کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ کانگریس ریکارڈ کے صرف چودہ صفحے بھرے اس دن کی کاروائی سے۔

اس لاثانی پارٹی کی تشکرانہ یاد نے اسے میرے لئے ۱۹۸۰ء کی انتخابی مہم میں مدد دینے پر آمادہ کیا۔ اس کے منیجر Ward Grant کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اسرائیل نواز سرگرم کارکن میرے مشرق وسطیٰ کے کام کی وجہ سے میرے خلاف تھے' پھر بھی اس نے کہا کہ "ہمیں کانگریس میں ایسے آدمی چاہئیں جو صاف اور ستھری بات کریں۔" ملک گیر دباؤ نے جلد ہی یہ صورت حال بدل دی۔ Don Norton کو ہوپ کے منیجر کا ایک فوری ٹیلیفون پیغام یاد ہے' وہ یوں تھا "گرانٹ نے مجھے بتلایا کہ ہوپ پر ہر طرف سے یہودیوں اور غیر یہودیوں کا زبردست دباؤ پڑ رہا ہے۔ نوبت بایں جا رسید کہ ہوپ کے ۳۵ سالہ پرانے یہودی وکیل نے چھوڑ جانے کی دھمکی دی ہے۔ یہ دباؤ اس قدر شدید تھا کہ اب تک ایسا دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ ہوپ کی معذرت قبول کریں' وہ نہ آسکے گا۔" نورٹن کی سٹی گم ہو گئی۔ اس نے بہتیرا کہا کہ اس بات کو مشتہر کیا جا چکا ہے' تمام انتظامات مکمل ہیں' ٹکٹ بک چکے ہیں اور جوش و خروش انتہا پر ہے لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ جب نورٹن نے مجھے اس بحران سے آگاہ کیا تو میں نے فون پر براہ راست ہوپ سے بات کرنے کی انتہائی کوشش کی تاکہ اسے نظر ثانی پر آمادہ کر سکوں۔

جب مجھے فون پر رابطہ میں ناکامی ہوئی تو میں نے ہوپ کو ایک خط بصیغہ راز لکھا۔ میں نے اس میں اپنے سال بھر پہلے کی ان تمام غیر مشتہر شدہ کوششوں کی جو میں نے یاسر عرفات اور صدر کارٹر کے نمائندہ خاص برائے مشرق وسطیٰ مسٹر رابرٹ سٹراس کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کے لئے

کی تھیں ان کی تفصیل درج کی۔ میں نے ان تمام پیغامات کی نقول بھی بھجوائیں جو کہ میں نے ان دونوں لیڈروں کی درخواست پر بھجوائے تھے۔ آج کل بھی اور اس وقت بھی ہماری حکومت کا موقف ظاہراً یہ تھا کہ وہ .P.L.O کے ساتھ رابطہ نہیں رکھیں گے۔ اس خط کا نہ کوئی جواب ملا اور نہ میری فون کال کا جواب دیا گیا۔

اچنبھا تو یہ ہوا کہ مسٹر سٹراس جو کہ خود ایک یہودی اور ڈیموکریٹ تھا امداد پر رضامند ہو گیا۔ ایک روز جب میرا سٹراس سے ایوان نمائندگان کی سیڑھیوں پر سامنا ہوا تو میں نے اس کو اپنا مسئلہ بتایا اور پوچھا کہ آیا وہ Mr. Hope سے بات کر کے اس کو سمجھانے کی کوشش کرے گا کہ میں نے بعض یہودیوں کی ناراضگی صرف اس لئے مول لی تھی کہ میں اپنے ملک کے لئے اور مشرق وسطیٰ میں امن کی خاطر کام کر رہا تھا۔

اس وقت سٹراس اپنی سفارتی ذمہ داری سے فارغ ہو کر کارٹر کی انتخاب مکرر کی مہم میں کام کر رہا تھا (جو کہ ناکام رہی)۔ ایک سخت الیکشن مہم کے دوران ایک ڈیموکریٹ کی طرف سے ایک ریپبلکن امیدوار کے لئے حمایت بڑے جگرے کا کام تھا۔ اس نے کہا کہ "شاید میں ہوپ کو سمجھا سکوں کہ یہ دیوانہ وار دباؤ کیوں؟ اس نے مجھے اپنے دو فون نمبر دیئے جن پر ہوپ اس سے رابطہ کر سکتا تھا، لیکن اس وقت تک یہ دیوانہ وار دباؤ اپنا کام دکھا چکا تھا۔ ہوپ نے سٹراس کو فون ہی نہیں کیا۔ میں نے آج تک مسٹر سٹراس کا پیغام اور فون نمبر بطور یادگار سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ "بہترین تمناؤں کے ساتھ، مجھے امید ہے کہ ہم دونوں ۴/ نومبر کو کامیاب رہیں گے کیونکہ ہمیں بقیہ مسائل پر کام کرنا ہے۔"

چند دن بعد میرا فون پر ہوپ سے رابطہ ہو ہی گیا۔ وہ حسب معمول مزاحیہ موڈ میں نہ تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ مجھے قطعاً یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کو اس طرح کی اجتماعی فون کالوں کی بھرمار کا سامنا ہو گا، لیکن اب جبکہ یہ جلسہ مشتہر کیا جا چکا ہے تو اس کے نہ آنے سے میرا نقصان ہو گا۔ ہوپ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "تمہارے بھجوائے ہوئے خطوط میں نے پڑھ لئے ہیں۔ تمہیں اس کا اعلان کر دینا چاہیئے تھا، اپنا دفاع حقیقت سے کرو۔" میں نے کہا کہ میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا، یہ انتہائی رازداری والا معاملہ ہے۔ اس کی تشہیر سے کارٹر کی قیام امن کی کوششوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ہوپ نے کہا "یہ میرا مسئلہ نہیں، مجھے بے انتہا احتجاجی کالز آتی ہیں۔ یہ ناقابل برداشت دباؤ

ہے' میں اس میں الجھنا نہیں چاہتا۔"

مسٹر ہوپ تو نہ آیا البتہ خوشی کی بات یہ ہوئی کہ صرف ایک آدمی نے اپنی ٹکٹ کی رقم واپس مانگی۔ اس بھرے جلسے نے کانگریس کے ممبر Guy Vander Jagt کی پر جوش تقریر سنی۔ اسے عین وقت پر ہوپ کی جگہ بلایا گیا تھا۔

یہ لابی دباؤ اس وقت بھی سرگرم رہا جب جیرالڈ فورڈ نے میرے Illinois Alton والے جلسے میں حاضری کی حامی بھری' اس کا پہلا آثار ایک فون کال تھی۔ فورڈ کے سیکریٹری نے کہا کہ ہم نے غلطی سے اس دن کی دوہری بکنگ کر لی تھی اور انہیں افسوس ہے کہ فورڈ الیکشن کے دن تک مجھے کوئی وقت نہ دے سکے گا۔ لیکن جب میرے سیکریٹری نے اس دوسرے جلسے والوں کو فون کیا تو یہ بات جھوٹ نکلی۔ اس دن کوئی دوسرا جلسہ نہ تھا۔

مجھے بیحد حیرانی ہوئی' میں نے فورڈ کے ہمراہ اس وقت کام کیا تھا جبکہ وہ ریپبلکن "لیڈر آف دی ہاؤس" تھا اور مجھے معلوم تھا کہ کسی ریپبلکن کے انتخاب مکرر میں امداد کرنے میں وہ کسی بھی اختلاف رائے کو آڑے نہیں آنے دے گا۔ جب میری آخر کار فورڈ سے فون پر بات ہوئی تو اس نے کہا "پال! تمہارے ساتھ میں صف اول میں ہوں گا لیکن میں لگی لپٹی نہ رکھوں گا۔ میرا مسئلہ تمہارا فلسطینیوں اور عرفات سے رابطہ ہے۔" ایک ہی دن پہلے ریگن نے اس بات پر کارٹر کے لتے لئے تھے کہ اس نے P.L.O. کو ایک دہشت گرد تنظیم قرار دیا تھا۔ فورڈ نے کہا کہ "یہ میرے لئے بہت مشکل ہے' میں ریگن کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میں ہر پریس کانفرنس میں تمہاری حمایت کروں تو میرا ناک میں دم کر دیا جائے گا کہ ایک طرف تو میں ریگن کی حمایت کرتا ہوں اور دوسری طرف فنڈلے کے زاویہ نگاہ برائے P.L.O. کی بھی۔"

میں ۱۹۸۰ء میں ۵۶ فیصد ووٹ لے کر جیت گیا' حالانکہ مجھے ان تمام ناکامیوں اور ملک گیر تحریک مخالفت کا سامنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب حد ہو چکی ہے' اسرائیل نواز شدت پسند اس سے بڑھ کر اور کیا کریں گے؟ چنانچہ میں نے اپنی مساعی امن جاری رکھی' لیکن میں ان نئے چیلنجوں کی پیش بینی میں ناکام رہا جو عرب اسرائیل تنازعہ کے بارے میں مجھے پیش آنے تھے۔ ۱۹۸۱ء کے اواخر میں آبادی کے تبادلہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک وفاقی عدالت نے میرے حلقہ انتخاب کی نئی حد بندی کی۔ اس طرح میرا آبائی حلقہ جیکسن ول خارج ہو گیا اور Decatur شامل ہو گیا جو کہ اس وقت بیروزگاری

میں امریکہ بھر میں سر فہرست تھا۔ میرا حلقہ جو کہ پہلے قدرے ڈیموکریٹ تھا اب پورے طور پر ڈیموکریٹ ہو گیا۔ ان دنوں کساد بازاری کا دور دورہ تھا اور کسانوں میں بے چینی عام تھی۔

جب الیکشن کا وقت آیا تو گو پرائمری میں میرا مدمقابل کوئی نہ تھا لیکن عام انتخابات کے وقت ایک مضبوط ڈیموکریٹ Richard Durbin ابھر کر سامنے آیا۔ وہ مقبول عام اور جہاندیدہ تھا' اس نے رابسن کے جمع شدہ ذرائع پر قبضہ کیا مع تفصیلی فہرست کے جس میں تمام چندہ دینے والوں کے نام تھے۔ ایسوشی ایٹیڈ پریس نے رپورٹ دی کہ اسرائیل کے امریکی حامی دوبارہ خزانوں کے منہ کھول رہے ہیں تاکہ مرکزی الی نوائے کے نمائندے پال فنڈلے کو ہٹایا جاسکے۔ مثبت پہلو میری حمایت میں یہ تھا کہ اس مرتبہ ریگن کے حواری میری مدد کر رہے تھے۔ نائب صدر جارج بش (ٹیکساس) نے اسرائیل نواز شکایات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سپرنگ فیلڈ میں میرے ایک جلسہ میں شمولیت کی۔

اس مرتبہ مجھے منتخب نہ ہونا تھا سو میں ۱۴۰۷ ووٹوں سے ہار گیا۔ یہ کل ڈالے گئے ووٹوں کے ایک فیصد سے بھی کم تھے۔ ایسے سخت مقابلے میں تو کوئی بھی منفی بات اس فرق کا باعث بن سکتی تھی۔ اسرائیل نواز شدت پسندوں کے حملے ان کئی عوامل میں سے ایک تھے۔ بایں ہمہ واشنگٹن میں اسرائیل کی سب سے بڑی لابی یعنی (AIPAC) امریکہ اسرائیل عوامی رابطہ کمیٹی نے میری اس شکست کا سہرا اپنے سر باندھا۔ آسٹن' ٹیکساس میں الیکشن کے چند روز بعد ایک جلسے میں اس تنظیم کے انتظامی ڈائریکٹر مسٹر تھامس اے ڈائن نے کہا کہ اس کے جتھوں نے یونیورسٹی آف الی نوائے سے ۱۵۰ طالب علموں کو جمع کیا تاکہ وہ در در دستک دیں اور سڑکوں پر مارچ کریں۔ بات اس پر ختم ہوئی کہ یہ ایک ایسا کیس ہے جہاں یہودی لابی نے پانسہ پلٹ دیا اور فنڈلے کو شکست دی۔ اس کے اندازے کے مطابق ڈربن کے جمع شدہ 7.5 لاکھ ڈالروں میں سے 6.85 لاکھ ڈالر یہودیوں نے دیئے تھے۔ دوسری طرف میرے حامیوں نے بھی تقریباً اتنی ہی رقم اکٹھی کی تھی' لہٰذا اس دفعہ پھر ایک مرتبہ ساری ریاست میں انتخابی اخراجات کا نیا ریکارڈ قائم ہوا۔

جواب آں غزل

مجھے کانگریس سے ہٹانے کی مہم ۱۹۷۹ء کے اوائل میں شروع ہوئی اور کوئی چار سال جاری

رہی۔ امریکہ کے کونے کونے سے عوام نے اس میں دلچسپی لی۔ احباب کی رپورٹوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ملک گیر ہے۔ Kansas کے سینیٹر بوب ڈول نے جو چھ سال تک ہاؤس ایگریکلچر کمیٹی میں میرا ساتھی رہا تھا' مجھے بتلایا کہ اس نے اسرائیل نواز لیڈروں کو میری امیدواری کے بارے میں بیحد جذباتی تقاریر کرتے سنا' میرے انتخاب سے پہلے اور بعد میں بھی۔ Clarence Palmly سابقہ انڈر سکریٹری برائے زراعت' نے سنا کہ ۱۹۸۲ء میں میری شکست نیویارک سٹی کی ایک لاء فرم کے لئے ہدف اوّل کی حیثیت رکھتی تھی۔ کانگریس میں ۲۲ سال گزارنے کے بعد شکست سے دوچار ہونا ایک حوصلہ شکن بات تھی لیکن مجھے حیرت بھی ہوئی۔ اسرائیل نواز شدت پسندوں کا رویہ میرے لئے حیران کن تھا' آخر انہوں نے میری ہار کے لئے اس قدر زور کیوں لگایا؟ ملک بھر کے کونے کونے سے ان لوگوں نے جو مجھے جانتے نہ تھے کیوں اس قدر رقم میرے مخالفین کو دی؟ بعض نے تو 1000 ڈالر دیئے۔ کس چیز نے ۴ سال تک اس لگن کو زندہ رکھا؟

اسرائیل نواز شدت پسند میرے ووٹنگ ریکارڈ میں کچھ زیادہ سقم نہ نکال سکے۔ میں نے سالہا سال اسرائیل کو امداد کے حق میں لگاتار ووٹ دیا تھا۔ کبھی کبھار میں نے مصر اور دیگر عرب ممالک کے لئے لئے تھے۔ جب میں نے صدر کارٹر سے کہا تھا کہ وہ اسرائیلی امداد عارضی طور پر بند کردیں تاکہ اسے لبنان پر حملہ آور ہونے سے باز رکھا جاسکے' اس وقت بھی میں نے اس بات کے حق میں ووٹ دیا تھا کہ مستقبل میں اسرائیل کی اقتصادی اور فوجی امداد بحال رکھی جائے اور کانگریس کو اس کا پورا اختیار ہوگا۔ بہت سے اسرائیلی اس بارے میں مجھ سے متفق تھے۔ رائے عامہ کے جائزے امریکن یہودیوں کے بارے میں بھی یہی ظاہر کرتے تھے۔ میں نے ان مقاصد کی حمایت کی تھی جو بیشتر یہودیوں کو بھی عزیز تھے۔ مثلاً شہری حقوق' کمیونٹی ایکشن پروگرام' مساوی حقوق نسواں' جوہری ہتھیاروں کو منجمد کرنا اور چین کے ساتھ تعلقات کی بحالی۔

علاوہ ازیں میں ایوان نمائندگان کے ۴۳۵ ممبران میں سے صرف ایک تھا۔ باوجودیکہ میں ایک سینئر ریپبلکن ممبر تھا لیکن ایوان کی مشرق وسطٰی سے تعلق رکھنے والی ۱۹ خارجہ تعلقات کمیٹیوں میں سے صرف ایک کا سربراہ تھا۔ میں اسرائیل پر نکتہ چینی کرتے وقت اکثر بالکل تنہا ہوتا' چاہے میں ایوان نمائندگان میں ہوتا یا کسی کمیٹی میں۔ یقیناً انہیں بھی معلوم ہوگا کہ میں کوئی اہم خطرہ نہیں' کیا اسرائیل نواز حلقے ایک بھی اختلافی آواز برداشت نہیں کرسکتے؟

کیا اس لابی کا مقصد مجھے بطور عبرت پیش کرنا تھا؟ (ملکہ الزبتھ کی طرح جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک آدھ امیر البحر صرف دوسروں کے لئے بطور عبرت پھانسی پر لٹکا دیا کرتی تھی) کیا مجھے سیاسی پھانسی دینے کا مقصد دوسرے نمائندوں کی زبان بندی تھی؟ ان سخت مزاحمتی حربوں اور اہل یہود کی رسمی حقوق کی پاسداری کو میرا ذہن بیک وقت قبول کرنے سے قاصر تھا اور یہی ان کی پسندیدہ صفت تھی جو میری زندگی بھر کے مشاہدہ کے مطابق تھی۔ میں نے کانگریس میں ہمیشہ حقوق انسانی کے لئے اسٹیفن سولارز اور بین گل مین کے ساتھ قریبی تعاون کیا تھا۔ میں نے اس حیرت کا راز پانے کے لئے AIPAC والے دوست Doug Bloomfield سے بات کی، لیکن اس نے صرف یہ جواب دیا کہ "تم اسرائیل کی پالیسی پر نکتہ چینی کرنے والے سب سے نمایاں نقاد ہو، میں تو یہی جواب دے سکتا ہوں۔" یہ قطعاً تشفی آمیز نہ تھا، اس لاجواب سوال نے کئی دوسرے سوالوں کو جنم دیا۔ کیا دوسرے کانگریس ممبران بھی ایسے تجربوں سے گزرے ہیں؟ یقیناً ایک قلیل تعداد تھی جو کہ صاف گوئی سے کام لیتی تھی۔ لیکن اس لابی کا صرف مجھے نشانہ بنانا بعید از قیاس تھا۔ مجھے حقیقت کی جستجو تھی۔

کانگریس ممبران اور صدر کے علاوہ بھی ارباب حل و عقد کا ایک جم غفیر تھا۔ کیا انہیں بھی اس طرح کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ ایک ایسی لابی جو کہ صدر اور پوری صدارتی مہم کی ٹیم کو خوف زدہ کر سکتی ہے۔ جیسا کہ ۱۹۸۰ء میں فورڈ اور ریگن کے ساتھ ہوا، میری الیکشن مہم کے دوران، تو اس کا اثر و نفوذ اعلیٰ سرکاری حلقوں میں کس قدر ہوگا؟

دیگر پیشوں کا کیا حال ہے؟ اس لابی نے بوب ہوپ کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ کیا دوسرے پیشہ وروں پر بھی اس کی اتنی دہشت ہے؟ مثال کے طور پر کیا علمی اداروں میں آزادی اظہار کی روایت اساتذہ اور ایڈمنسٹریٹروں کو اس دباؤ سے جو اسرائیل نواز لابی کی طرف سے مجھ پر ڈالا گیا تھا، استثناء فراہم کرتی ہے؟ کیا مذہبی رہنماؤں کو بخشتی ہے؟ کاروباری طبقے کا کیا حال ہے؟ چھوٹے یا بڑے اور ہمارے آزاد معاشرہ میں جو سب سے اہم چیز تھی کہ آیا رپورٹروں، کالم نگاروں، اداریہ نگاروں، ناشروں، ریڈیو اور ٹی وی کے تبصرہ نگاروں کو بھی ڈرایا دھمکایا جاتا ہے؟ میرے نزدیک یہ بیحد اہم اور گہرے سوالات تھے، ان کے جوابات میسر نہ تھے۔ چنانچہ میں نے کھوجنے کی ٹھانی، میں نے اپنی جستجو کا آغاز امریکن اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی کے کیپٹل ہل دفاتر پر جا کر ملاقات سے کیا۔

شاہِ دماوند

واشنگٹن مخفف ناموں کے لئے شہرت رکھتا ہے اور کانگریس میں "AIPAC" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کا ذکر ہی ان لوگوں کو چونکا دینے اور متوجہ کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے جو کہ کیپٹل ہل پر مشرقِ وسطیٰ کی پالیسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ "AIPAC" یعنی امریکن اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی اب واشنگٹن میں اہم ترین لابی ہے۔

۱۹۶۷ء میں جبکہ میں چوتھی مرتبہ منتخب ہو کر کانگریس کا ممبر تھا تو مجھے "ہاؤس فارن افیئرز کمیٹی" میں نامزد کیا گیا۔ اس وقت میں نے اس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ ایک دن میں نے کمیٹی روم میں ذاتی گفتگو کے دوران اسرائیل کے شام پر حملہ کرنے کو نامناسب کہا۔ ایک سینئر ریپبلکن...... مشی گن کے ولیم۔ بروم فیلڈ نے مسکراتے ہوئے مجھے کہا "ذرا AIPAC کے Si Kenan تک تمہاری اس رائے کی خبر پہنچنے دو پھر دیکھنا۔" اس کا اشارہ I.L. Kenan کی طرف تھا جو کہ AIPAC کا ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھا۔ میں اس کے نام سے بھی اتنا ہی ناشناسا تھا جتنا کہ اس تنظیم کے نام سے جس کا وہ سربراہ تھا۔ بعد میں یہ ثابت ہوا کہ بروم فیلڈ ہنسی مذاق نہیں کر رہا تھا۔ AIPAC کو اس ذاتی گفتگو کی بھنک بھی پہنچ جاتی تھی جو کہ ایک کانگریس ممبر مشرقِ وسطیٰ پالیسی کے بارے میں کرے۔ اسرائیل پر نکتہ چینی کرنے والے سیاسی خطرات کو دعوت دیتے ہیں۔

AIPAC اسرائیلی لابی کا ایک حصہ ہے لیکن اثراندازی کے لحاظ سے یہ اہم ترین حصہ ہے۔ یہ تنظیم پچھلے چند برسوں میں بہت گہرائی اور گیرائی حاصل کر چکی ہے۔ یہ کہنا قطعاً مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ مشرقِ وسطیٰ پالیسی کے بارے میں یہ تنظیم کیپٹل ہل کے ہر اہم پہلو پر چھا چکی ہے۔ ہاؤس اور سینیٹ کے ممبران تقریباً بلااستثناء اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں کیونکہ انہیں علم ہے کہ یہ تنظیم کیپٹل ہل پر ایک ایسی سیاسی قوت کی براہ راست نمائندہ ہے جو ان کے الیکشن کے وقت ان کے امکانات کو بنا اور بگاڑ سکتی ہے۔

یہ بات چاہے حقیقت پر مبنی ہو یا فسانے پر لیکن یہ بات اہم ضرور ہے۔ AIPAC نام ہی ایک قوت...... یعنی ایک دہشت زدہ کر دینے والی قوت کا ہے۔ اس کا جو شائع شدہ مواد ملتا ہے اس میں نیویارک ٹائمز اخبار کا یہ جملہ ہمیشہ بطور حوالہ درج ہوتا ہے کہ یہ تنظیم مضبوط ترین، منظم ترین اور مؤثر ترین گروپ ہے جو واشنگٹن میں خارجہ پالیسی پر اثرانداز ہوتا ہے۔ Paul N. "Pete"

McClloskey۔

سابقہ کانگریس ممبر نے تو یوں صاف صاف کہا ہے کہ کانگریس پر AIPAC کی دہشت چھائی ہوئی ہے۔ دوسرے کئی کانگریس ممبران نے اپنے عوامی بیانات میں اس قدر صاف گوئی سے کام نہیں لیا، لیکن ذاتی گفتگو میں وہ اس سے متفق ہیں۔

AIPAC کا یہ اثر و نفوذ کچھ زیادہ پرانی بات نہیں، صرف چند سال پیشتر "Conf. of Presidents of Maj. Jewish Organisations" کو واشنگٹن میں سب سے اہم اسرائیل نواز گروپ سمجھا جاتا تھا کیوں کہ یہ ۳۸ مختلف یہودی گروپوں کی نمائندگی کا دعویدار تھا۔ Anti-Defamation League امریکن جیوش کمیٹی اور AIPAC اس کی حاشیہ بردار تھیں۔ مؤخر الذکر دو تنظیموں کے الگ الگ 50,000 ممبران ہیں۔ انٹی ڈی فیمیشن لیگ تکنیکی طور پر "Bnai Brith" کی ایک ذیلی تنظیم ہے جس کے دنیا بھر میں تقریباً 500000 ممبران ہیں، لیکن یہ اپنے فنڈ خود اکٹھا کرتی ہے اور کافی حد تک خود مختاری حاصل کر چکی ہے۔

واشنگٹن کے دو نمائندے American Jewish Committee کے Hyman Bookbinder اور Anti Defam. League کے Dave Brody جو کہ اپنے اوائل عمر میں خاصے ممتاز تھے، اب AIPAC سے گہنا چکے ہیں۔ واشنگٹن میں جو لابی ہے وہ تو برفانی تودے کی نظر آنے والی چھوٹی سی چوٹی ہے۔ اس کے اثر و نفوذ کا دارومدار امریکن یہودیوں کے ان دو سو سے زائد گروپوں پر ہے جو کہ انہوں نے قومی پیمانے پر قائم کر رکھے ہیں۔ AIPAC کے ایک ذمہ دار اسٹاف کا کہنا ہے کہ میرے خیال میں تقریباً ۲۰ لاکھ یہودی سیاسی یا فلاحی طور سے دلچسپی لیتے ہیں، بقیہ ۴۰ لاکھ نہیں۔ ان بیس لاکھ میں سے اکثریت کا تعلق بھی کسی حد تک رقم دینے سے زیادہ نہ ہو گا۔

دراصل وہ لوگ جو امریکہ میں یہودیوں کی تمام سیاسی تحریکات میں حصہ لیتے ہوں گے وہ اغلباً 250000 سے زیادہ نہ ہوں گے۔ اس لابی کا مقبول ترین نیوز لیٹر بنام "Near East Report" تقریباً ساٹھ ہزار افراد کو بھیجا جاتا ہے۔ اس تنظیم کے خیال میں ان تمام امریکی شہریوں کو جن کی کسی بھی قسم کی ذمہ داری ہے، اسرائیل نواز سیاسی مفادات کی حفاظت کرنی چاہئے۔ وہ AIPAC میں دلچسپی رکھتے ہوں یا Bnai Brith امریکن جیوش کمیٹی، انٹی ڈی فیمیشن لیگ، جیوش نیشنل فنڈ، متحدہ جیوش اپیل یا اور کوئی بھی قومی گروپ ہو وہ اس کو پڑھتے ہیں۔ یہ نیوز لیٹر اعزازی طور پر تمام ذرائع

ابلاغ، کانگریس اراکین، اہم سرکاری عہدیداروں اور دوسرے خارجہ پالیسی میں ممتاز افراد کو بھیجا جاتا ہے۔ AIPAC کے ممبران کو یہ نیوز لیٹر ان کے 35 ڈالر چندہ کے عوض بھجوایا جاتا ہے۔

عملی طور پر تمام گروپ اسرائیلی حکومت کے اعزازی نمائندوں کے طور پر کام کرتے ہیں۔ یہ اس بات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ۱۹۸۱ء میں جب کہ عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کو اسرائیل نے بمباری سے تباہ کیا تو AIPAC نے وہ سرکاری اعلان ڈرافٹ کرنے میں امداد کی جس میں اس حملہ کا دفاع کیا گیا تھا۔ یہ اعلامیہ امریکی حکومت اور اسرائیلی سفارت خانے کی طرف سے بیک وقت جاری کیا گیا۔

یہودیوں کی کوئی بھی قابل ذکر تنظیم اعلانیہ طور پر کسی ایسے مسئلہ کی مخالفت نہیں کرتی جو اسرائیل کی حکومتی پالیسی کے مطابق ہو۔ Thamas A. Dine ایگزیکٹو ڈائریکٹر (AIPAC) پہلے تو ستمبر ۱۹۸۲ء میں صدر ریگن کے امن پلان کے بارے میں رطب اللسان تھا لیکن جونہی اسرائیل حکومت نے اسے مسترد کیا وہ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھ گیا۔

اس قدر ہم آہنگی بعض مرتبہ حکومتی سطح پر مزاح کا باعث بنتی ہے۔ "اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں ہم لوگ یہ پیش گوئی کیا کرتے تھے کہ اگر اسرائیلی وزیراعظم یہ اعلان کر دے کہ زمین چپٹی ہے تو امریکن کانگریس چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ایک مبارک باد کا ریزولیشن پاس کر دے گی۔" یہ الفاظ سوڈان کے سابقہ سفیر اور سفارتی اہل کار ڈان برگس کے تھے۔

یہودی تنظیموں کے لئے واشنگٹن میں لابی کرنا ایک بیحد سنجیدہ کام ہے۔ ان کا اب اپنی سیاسی راہنمائی کے لئے AIPAC پر انحصار روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ واشنگٹن پوسٹ اخبار کے ڈپٹی ایڈیٹر Stephen S. Rosenfeld کے بقول AIPAC اب "واضح طور پر امریکہ میں ایک اہم ترین یہودی سیاسی قوت ہے۔"

AIPAC کے منشور میں اس کا مقصد قانون سازی درج ہے لیکن اب یہ ہر اس بات میں اسرائیلی مفادات کا تحفظ کرتی ہے جو اسے اپنے نکتہ نظر سے امریکی ذرائع ابلاغ میں، مذہبی محاذ پر یا امریکی کالج کیمپسوں میں الغرض ہر جگہ اسرائیل مخالف نظر آئے۔ چونکہ AIPAC کے ملازمین کو تنخواہ امریکن لوگوں سے جمع شدہ چندہ سے ادا کی جاتی ہے اس لئے اسے غیر ملکی رجسٹریشن ایکٹ کے ماتحت رجسٹر کرانے کی ضرورت نہیں، لیکن کام وہ غیر ملکی ایجنٹوں والا کر رہے ہوتے ہیں۔

ان سالہائے گذشتہ میں اسرائیل لابی امریکی نظام حکومت میں اچھی طرح گھر کر چکی ہے اور مؤثر ترین گروپ AIPAC ہے۔ امریکی صدر کو بھی جب عرب اسرائیل تنازعہ میں کوئی نازک موڑ آجائے تو اس کی طرف ہی رجوع کرنا پڑتا ہے۔

تھامس .اے. ڈائین کا عروج

اکتوبر ۱۹۸۳ء میں امریکی Marines کی لبنان میں موجودگی کے خلاف بڑھتے ہوئے عوامی احتجاج کے پیش نظر صدر ریگن نے AIPAC سے مدد طلب کی۔ دو سو سے زائد Marines کا بیروت ایرپورٹ پر واقع بیرک میں شدت پسندوں کے بم سے ہلاک ہونے کا واقعہ ابھی وقوع پذیر نہ ہوا تھا پھر بھی چار میرین اس وقت تک ہلاک ہو چکے تھے، جن میں سے تین چاندماری کی زد میں آکر ہلاک ہوئے اور کانگریس کی تشویش روز افزوں تھی۔ نیویارک کا ڈیموکریٹ کانگریس ممبر Sam Satratton جو کہ ایک جہاندیدہ اور جارحانہ رویے والا تھا' ان میرین کو Sitting Ducks (آسان نشانے) قرار دے کر بھاری نقصانات کی پیشین گوئی کر رہا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ ان کو ہٹالیا جائے۔ دوسرے War Power Resolution کا حوالہ دے کر معترض تھے کہ صدر کس طرح فوج کو بیروت جیسے خطرناک ماحول میں کانگریس کی حتمی منظوری کے بغیر 90 دن سے زائد رکھ سکتا ہے۔ کچھ ممبران نے تو لبنان میں میرین کی موجودگی کو ویتنام میں امریکہ کے تباہ کن تجربے کے آغاز پر منطبق کرنا شروع کر دیا تھا۔

صدر ریگن نے بھی اپنے پیش رؤوں کی طرح اس قانون کی پابندیوں کو ناجائز کہا۔ اگر وہ اس کو مان لیتا تو اسے نوے دن کے بعد یہ فوج ہٹالینی چاہئے تھی یا پھر کانگریس سے اس کے مزید التواء کی منظوری لیتا۔ اگر وہ اس بات پر مصر رہتا کہ یہ قانون یہاں لاگو نہیں ہے کہ حالات اتنے خطرناک نہیں تو حالات کے کسی ناموافق موڑ کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اسے ایک باغی کانگریس کا سامنا ہوتا۔

اس نے اس بات کی پیش بندی کرنے کا فیصلہ کیا۔ کانگریس سے اس نے یہ قانون منظور کرنے کے لئے کہا کہ موجودہ میرین لبنان میں اٹھارہ ماہ تک رکھنے کی اجازت دی جائے۔ مقصود یہ تھا کہ جو لوگ یہ "قانونی موشگافی" کر رہے ہیں کہ صدر War Power Resolution کی لفظ بلفظ تعمیل کرے وہ مطمئن ہو جائیں۔ صدر کا اپنا مطمح نظر بھی یہی تھا کہ بارہ ماہ کے اندر اندر یہ فوج لبنان

سے بتدریج واپس نکالنی ممکن ہو جائے گی۔ ایک غیر متوقع ذریعہ کی امداد کا بھلا ہو کہ یہ قانون ایوان نمائندگان سے بغیر کسی حیل و حجت کے پاس ہوگیا۔ اسپیکر تھامس پی (ٹپ) اونیل نے جو کہ نمایاں ترین ڈیموکریٹ نمائندہ تھا' اس بل کی پرزور حمایت کی۔ اونیل کے لئے یہ ایک تقاضائے حب الوطنی تھا اور بہت سارے ڈیموکریٹس نے لبیک کہہ کر اس کو منظور کروایا' حالانکہ یہ ایک ایسا ایوان تھا جہاں ڈیموکریٹس کا مکمل کنٹرول تھا اور صدر ریپبلکن! لیکن سینیٹ نے جہاں صدر کی اپنی ریپبلکن پارٹی کا کنٹرول تھا' ایک مسئلہ کھڑا کر دیا۔ ایک "سرسری اندازہ" کے مطابق مقابلہ کانٹے کے تول تھا اور شکست بھی ممکن تھی۔ صدر نے فیصلہ کیا کہ یہ امداد طلب کرنے کا وقت ہے لہٰذا تھامس. اے. ڈائن کو (جو کہ ایک چھریرا بدن' جارحانہ رویہ اور گھنے بالوں والا جہاں دیدہ شخص اور ۱۹۸۱ء سے مسلسل AIPAC کا سربراہ تھا) کو مدد کے لئے کیپٹل ہل بلایا گیا۔

ریگن کا تھامس ڈائین کو مدد کے لئے پکارنا ایک ایسی بات تھی جس کی نظیر اس سے پیشتر نہیں ملتی۔ اس مجوزہ قانون میں اسرائیل کے لئے کوئی رقم نہ تھی اور لبنان کے معاملہ میں AIPAC اور دیگر لابی گروپوں نے لاتعلقی اختیار کر رکھی تھی۔ اسرائیل نواز قوتیں یہ نہیں چاہتی تھیں کہ اگر میرین پر کچھ افتاد پڑے تو الزام اسرائیل کے سر آئے۔ اسرائیل تو پہلے ہی کافی حد تک ذمہ دار تھا لبنان میں امریکی مسائل کے لئے' اس نے تو بالواسطہ اور مؤثر طریقہ سے امریکی میرین کی لبنان میں موجودگی کے لئے زمین ہموار کی تھی۔ اسی کا اسرار تھا کہ ایک بین الاقوامی فوج وہاں تعینات کی جائے تو وہ اپنی فوج کا انخلاء کرلے گا بشرطیکہ اس میں امریکی فوجی دستہ بھی شامل ہو۔ (اگر اسرائیل لبنان پر حملہ ہی نہ کرتا تو اس بین الاقوامی فوج کی ضرورت کہاں تھی؟) گو AIPAC ذاتی طور پر تو خواہشمند تھی کہ میرین لبنان میں رہیں لیکن اندریں حالات اس کی قیادت نے پس پردہ رہنا مناسب جانا۔

ایک اور وجہ سے بھی وہائٹ ہاؤس کا تھامس اے ڈائیں کو کال کرنا غیر معمولی بات تھی۔ ریگن کو ان سینیٹرز کی حمایت درکار تھی جو عام طور پر اس کے حواری شمار ہوتے تھے۔ جن بارہ سینیٹرز کے ووٹ کے بارے میں صدر کو ابہام تھا ان میں ورجینیا کے جان وارنر' ڈین کوئیل انڈیانا سے' Maine ریاست کے ولیم کوہن اور Idaho کے جیمز اے میک کلیور شامل تھے۔ ان سب کی شہرت فوجی معاملات میں بطور "جنگجویانہ" تھی اور ماسوا میک کلیور کے یہ سبھی اسرائیل نواز تھے۔ AIPAC کے ایک اسٹاف ممبر کا اس بارے میں یہ تبصرہ تھا کہ اگر وہائٹ ہاؤس ان ووٹوں کے لئے پریشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ یہ بل نامنظور ہو جائے گا۔ باوجودیکہ AIPAC اس معاملے میں اعلانیہ ملوث نہ ہونا چاہتا تھا' اس نے مدد کی اپیل کی۔ مندرجہ بالا بارہ میں سے نو سینیٹرز نے صدر کی حمایت میں ووٹ دے کر اس بل کو 54-46 کے معمولی فرق سے پاس کروایا۔

ذرائع ابلاغ نے اس بل کے پاس کروانے میں AIPAC کے رول پر اعلانیہ تبصرہ کرنے سے گریز کیا' لیکن ایک احسان مند صدر ریگن نے تھامس اے ڈائین کو بلا کر ذاتی طور پر شکریہ ادا کیا۔ مائیکل گیل نے جو وہائٹ ہاؤس اور یہودی کمیونٹی کے درمیان رابطے کا ذمہ دار تھا' اس بات چیت کی ایک ٹیپ برائے پروپیگنڈہ AIPAC کے حوالے کی۔ لیکن انہوں نے اس معاملے کو زیادہ نہ اچھالنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ گیل نے یہ مسودہ Mr. Wolf Blitzer of Jerusalem Post کو دے دیا جو کہ پیشتر ازیں AIPAC کے جریدے (Near East Report) کے لئے لکھتا تھا۔ "The Post" کے مطابق ریگن نے ڈائین سے کہا کہ "میں صرف شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا' تمہارا اور تمہارے سارے اسٹاف کا اس شاندار امداد کے لئے جو وار پاورز ایکٹ ریزولوشن کے سلسلے میں مجھے ملی' مجھے علم ہے کہ آپ نے کیسے نچلی عوامی سطح پر اپنی تنظیموں کو اس مدد کے لئے متحرک کیا۔"
"جی ہاں! ہم ٹیلیفون کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔" ڈائین نے جواباً کہا۔ "یہ تو ہمارا فرض تھا' یہ ہماری بھی خواہش تھی اور آئندہ بھی ہم ایسا کریں گے۔ ظاہر ہے کہ ہم اکٹھے کام کرنا چاہتے ہیں۔"

اور بھلا اکٹھے کام کرنے کی کوئی حد بھی ہے؟ ریگن انتظامیہ نے تو AIPAC کے ساتھ باہمی اتحاد کو ناقابل یقین بلندیوں تک پہنچادیا۔ یہ کوئی پہلا موقع نہ تھا جو کسی لابی گروپ کو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے مدد کے لئے پکارا ہو۔ یہ اعلیٰ سطحی رابطے گو کیپٹل ہل پر نظروں سے اوجھل رہتے ہیں لیکن ہر بار جب خارجی امداد کا قانون زیر بحث آتا ہے تو یہ جوبن پر ہوتے ہیں۔ وہائٹ ہاؤس کا کنٹرول جس کے بھی ہاتھ میں ہوتا ہے اسے جلد ہی اس کا ادراک ہو جاتا ہے۔ کانگریس سے خارجی امداد کا قانون پاس کروانا ایک چیلنج ہے اور چونکہ اس میں اسرائیل کو دی جانے والی اقتصادی اور فوجی امداد بھی شامل ہوتی ہے' لہٰذا AIPAC کو مدد کے لئے پکارنا ایک قدرتی امر ہے۔ چند انسانی ہمدردی اور چرچ سے متعلقہ تنظیموں کو چھوڑ کر خارجی امداد کا بل پاس کرانے کے لئے AIPAC ایک قومی حلقے کا کام دیتی ہے۔

AIPAC کی مدد کے بغیر ۱۹۸۳ء کا سات ارب ڈالر سے زائد کا خارجی امداد کا قانون پاس

نہیں ہوسکتا تھا اور نہ ہی یہ اس کے بغیر شاید زندہ رہ سکے۔ اس لابی کو ایک واضح خراج تحسین John K.Wilhelm نے دیا جو کہ ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھا' اس صدارتی کمیشن کا جس نے اواخر ۱۹۸۳ء میں خارجہ امداد کی آئندہ سمت متعین کرنے کے لئے سفارشات مرتب کی تھیں۔ اس نے جنوری ۱۹۸۴ء میں World Hunger Board کو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسرائیل نواز لابی کی مثبت امداد کانگریس سے خارجہ امداد کا قانون منظور کروانے کے لئے ناگزیر تھی۔ خیال رہے کہ مسٹر ولیم .A.I.D کا ایک آزمودہ کار آفیسر تھا۔

۱۹۶۰ء کے عشرہ کے اوائل میں جبکہ اسرائیل کو امداد قدرے معمولی تھی' یعنی 100 ملین ڈالر سالانہ سے بھی کم۔ ایک خارجی امداد کا قانون صرف پانچ ووٹوں کی اکثریت سے ایوان نمائندگان سے پاس ہو کر نکل گیا۔ اس وقت AIPAC اپنے زمانہ طفلی میں تھی۔ AIPAC نے ہی وہ حکمت عملی ترتیب دی تھی جس کے سبب ۱۹۸۳ء میں اسرائیل کی امداد میں 510 ملین ڈالر کا اضافہ کر دیا گیا۔ یہ اس لئے بھی حیران کن تھا کہ یہ عین بیروت پر اندھادھند بمباری کرنے اور اسرائیلی فوج کی صابرہ اور شطیلہ پناہ گزیں کیمپوں میں فلسطینیوں کا قتل عام روکنے میں ناکام رہنے کے بعد کیا گیا۔ ان واقعات پر اسرائیلی پالیسی کے خلاف عوامی غم و غصہ کے اظہار کی مثال نہیں ملتی۔

انتظامیہ نے مخالفت تو کی اس اضافے کی لیکن مات کھا گئی۔ جب تک جج ولیم کلارک (جو کہ اس وقت صدر ریگن کا نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر تھا) سینیٹر مارک ہیٹ فیلڈ کو یہ اضافہ معطل کرنے کے لئے ایک فوری اپیل بھیجے معاملہ طے پاچکا تھا۔ AIPAC نے پہلے ہی حمایت پکی کر چھوڑی تھی۔ Appropriation Committee کے ارکان کی اکثریت کو یہ باور کروادیا گیا تھا کہ اس اضافے کی حمایت یا مخالفت کو اسرائیل کی حمایت یا مخالفت تصور کیا جائے گا۔ کوئی بھی اس ہارنے والے مقصد کا بیڑہ نہ اٹھانا چاہتا تھا۔

AIPAC والے انتظامیہ کو پہلے ہی شہ مات دے چکے تھے۔ ایوان نمائندگان میں وہائٹ ہاؤس نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اسرائیل کو امداد بڑھانا کئی دوسرے مستحق و ضرورت مند ملکوں کی امداد میں کمی کا باعث ہوگا' لیکن AIPAC لابی نے اس دلیل کو تفصیلی اعداد و شمار پیش کر کے چاروں خانے چت کر دیا اور ثابت کر دیا کہ اسرائیل کو امداد بڑھائی جا سکتی ہے بغیر کسی دوسرے ملک کی امداد کی کٹوتی کئے۔ ایک AIPAC لابسٹ نے دلیل سمیٹتے ہوئے کہا کہ "انتظامیہ کے لابسٹ نے اپنا ہوم ورک

پورا نہ کیا تھا۔ انہوں نے مشترکہ کوشش نہ کی۔" ۱۹۸۴ء تک اس غیر ملکی امداد کی سطح دو ارب ڈالر سالانہ تک تجاوز کر چکی تھی اور یہ سب کی سب ناقابل واپسی امداد کی صورت میں تھی اور اس کا پاس ہونے کا تناسب 112 تھا۔

فروری ۱۹۸۳ء میں جارج شلز (سیکریٹری آف اسٹیٹ) نے ایک نامور شہریوں پر مشتمل "بلیورین" پینل تجویز کیا جسے غیر ملکی امداد پر اپنی سفارشات پیش کرنی تھیں' اس کے 42 ناموں میں 27 ایسے سینیٹرز نمائندے تھے جن کی اولین ذمہ داری غیر ملکی امداد کا قانون منظور کرنا تھا' بقیہ ایسے تھے جو کہ انتظامیہ میں سالہائے گذشتہ میں غیر ملکی امداد کے سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دے چکے تھے۔

صرف اور صرف ایک ہی کل وقتی لابسٹ اس پینل میں شامل تھا اور وہ AIPAC کا ایگزیکٹیو ڈائریکٹر تھامس اے ڈائین تھا۔ میرے علم کے مطابق یہ پہلا موقع تھا کہ ایک لابسٹ کو اتنے ممتاز سرکاری عہدے پر نامزد کیا گیا اور تھامس ڈائین کی نمائندگی تو اس لحاظ سے بھی حیران کن تھی کہ اس حیثیت میں اسے ان معدودے چند پالیسی ساز اداروں کے اراکین سے بہت قریبی روابط حاصل ہو گئے جو AIPAC کے قیام کی بنیادی وجہ تھے' یعنی اسرائیل کو امداد۔

ایک لابسٹ کے لئے اس سے بہتر پوزیشن احاطہ خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ ایک سابقہ سینیٹر ابورزق (جو کہ امریکن عرب اینٹی ڈس کریمیشن کمیٹی کا صدر تھا) کے الفاظ میں "یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہوئی کہ لاک ہیڈ کارپوریشن کے صدر کو ایک ایسے وزارت دفاع کے بورڈ پر نامزد کیا جائے جو اس بات کا فیصلہ کرے کہ ہماری ایئر فورس کس قسم کے ہوائی جہاز خریدے گی؟"

نومبر ۱۹۸۳ء میں تھامس نے واشنگٹن کی اثر و نفوذ کی سیڑھی پر ایک اور زقند بھری۔ اسے رابرٹ سی. میکفارلین (مشیر قومی سلامتی) کے ساتھ ایک ذاتی ملاقات کے لئے وہائٹ ہاؤس مدعو کیا گیا۔ یہ حضرت مشرق وسطیٰ کی روزمرہ پالیسی طے کرنے پر صدر ریگن کے قریب ترین مشیر تھے۔ ایجنڈے پر دو نہایت ہی حساس خارجہ پالیسی کے معاملات تھے۔ اولاً لبنان کی صورت حال اور ثانیاً شرق اردن کو ایک سریع الحرکت فوجی دستہ قائم کرنے میں امداد' یہ دونوں معاملات اسرائیل کے لئے بیحد اہمیت رکھتے تھے۔ ڈائین کو یہ دعوت اس پر مسرت فون کال کے ہفتہ بھر بعد ملی جو کہ صدر ریگن نے اسے کی تھی۔ جنوری ۱۹۸۴ء میں جریدہ Washingtonian نے مسٹر تھامس ڈائین کو دار

الحکومت میں ممتاز ترین اصحاب میں شامل قرار دیا۔

ڈائین کی شہرت عرب دارالخلافوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ مارچ ۱۹۸۴ء کے وسط میں اردن کے شاہ حسین نے اعلانیہ AIPAC پر الزام دیا کہ وہ جزوی طور پر امریکن اثر و نفوذ اور مشرق وسطی میں قیام امن کی کوششوں میں کمی کا باعث تھی۔ انہوں نے اسرائیل نواز لابی کے امریکی صدارت کے امیدواروں پر ناجائز دباؤ کی بھی مذمت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ امیدواروں کو "AIPAC' اسرائیل اور صیہونیت سے امداد کی اپیل کرنی پڑتی ہے۔"

ایک صورت حال جس نے شاہ حسین کو خاص طور پر مشتعل کیا وہ یہ تھی کہ مارچ ۱۹۸۴ء کے وسط سے دس دنوں کے لئے ڈائین نے ذاتی طور پر براہ راست خارجہ پالیسی کے مذاکرات میں حصہ لیا۔ لارنس ایس ایگل برگر' انڈر سیکریٹری آف اسٹیٹ اور جوزف میک فارلین' نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر کے ہمراہ' ایک نشست کے دوران ایگل برگر نے یہ پیشکش کی کہ اگر AIPAC اس قانون کی حمایت سے دست کش ہو جائے جس میں امریکہ کو اپنا سفارت خانہ تل ابیب سے یروشلم منتقل کرنے کو کہا جا رہا ہے تو وہ اردن کو انٹی ایر کرافٹ میزائل فروخت کرنے کا مشہور عالم Proposal واپس لینے کو تیار ہے۔ اس وقت تک شاہ حسین کی سخت نکتہ چینی AIPAC اور امریکن حکومت کے بارے میں امریکہ کے اخبارات کی زینت بن چکی تھی اور ڈائن کو علم تھا کہ کانگریس مین اس منصوبے کے خلاف مزاحمت پہلے سے بڑھ چکی ہے۔ اس وقت جب ایگل برگر نے مشورہ دیا تو AIPAC کے پاس اس منصوبے کی مخالفت میں 48 سینیٹرز کے ووٹ تھے جن میں اگلے دن مزید 6 کا اضافہ ہوگیا۔ نتیجتاً AIPAC کو یہ منصوبہ رد کروانے کے لئے کسی بھی سودے بازی کی ضرورت نہ پڑی۔

ایگل برگر کی پیشکش رد کرنے کے بعد ڈائن نے یہ وعدہ کیا کہ AIPAC اپنی مخالفت اس اسکیم کے بارے میں ختم کر دے گی جس کی روح سے اردن میں سریع الحرکتی فوج کا قیام عمل میں آنا تھا۔ بلکہ لابی اس بات کے لئے افہام و تفہیم کی فضا پیدا کرے گی جس کے تحت امریکی سفارت خانہ تل ابیب سے یروشلم منتقل ہونا تھا' بشرطیکہ انتظامیہ یہ دو ضروری اقدام کرے۔ ایک تو یہ کہ سعودی عرب کو Stinger Anti Aircraft Missile فروخت نہ کرے اور دوئم یہ کہ PLO سے مزید بالواسطہ مذاکرات نہ کرنے کا اعلانیہ اظہار کرے۔ گو اس بارے میں سرکاری اعلامیہ تو نظر نہ آیا لیکن

انتظامیہ نے سعودی عرب اور اردن دونوں کو اسٹنگر میزائل بیچنے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔

ان مذاکرات کے نتیجے میں ڈائین کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ رچرڈ مرفی کو جو کہ بطور اسسٹنٹ سیکریٹری آف اسٹیٹ برائے مشرق قریب اور جنوبی ایشیا اس بات کا ذمہ دار تھا کہ مشرق وسطیٰ کے بارے میں امریکن حکومت کیا پالیسی بنائے اور اقدامات کرے۔ اس کو ایگل برگر' میک فارلین' ڈائین مذاکرات کے لئے مدعو ہی نہ کیا گیا' نہ ہی اسے حکومت کے اسٹنگر میزائل فروخت منسوخ کرنے کے فیصلہ سے آگاہ کیا گیا۔ جب کہ AIPAC کو یہ اطلاع ملے بارہ گھنٹے سے زائد گزر چکے تھے۔

"واشنگٹن پوسٹ" نے لکھا کہ یہ داستان "انتظامیہ کے اس رویہ کے بارے میں سوالات پیدا کرنے کا موجب ہے جس کے تحت ایک نجی' خصوصی مفاد پرست تنظیم کو خارجہ معاملات طے کرنے میں دخیل ہونے دیا گیا۔" ڈائین کا ردعمل فوری طور پر یہ تھا کہ "مضبوط ہونا اور نکتہ چینی کا سامنا کرنا اس سے بہتر ہے کہ کمزور ہو کر نظر انداز اور بے تحقیر ہوں۔"

مختصراً یہ کہ یہ بے مثال صدارتی رعایت ڈائین کے دل میں گھر کر لینے والے رویہ' مضبوط انتھک جذبے اور متحرک طبیعت کو ایک خراج تحسین تھا۔ ڈائین کے دور میں AIPAC کے ممبران کی تعداد 11000 سے بڑھ کر 50000 سے زائد ہو گئی تھی اور اس کا سالانہ بجٹ جو کہ پہلے 7.5 لاکھ ڈالر تھا اب تیس لاکھ ڈالر سے تجاوز کر چکا تھا۔

ڈائن کا حلقہ اثر اوول آفس کے ماوراء بھی اقتدار کے مرکزوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اسے صدارتی امیدواروں اور صدر کے فون کال موصول ہوتے ہیں۔ خود اس کے کہنے کے مطابق سابقہ نائب صدر والٹر مونڈیل مشرق وسطیٰ پالیسی کے بارے میں کوئی بیان جاری کرنے سے پہلے اسے ہمارے اوپر آزما کر دیکھتے ہیں۔

کانگریس کی بیشتر تجاویز جو مشرق وسطیٰ پالیسی پر اثر انداز ہوتی ہیں وہ یا تو AIPAC کی منظور شدہ ہوتی ہیں یا پھر انہی کی تجویز کردہ۔

توسیع دام

اسرائیل کے لئے یہ کارنامے انجام دینے کے لئے کبھی صدر امریکہ کی معاونت اور کبھی مخالفت کے لئے AIPAC کا ڈائریکٹر مسٹر ڈائین قابل پیشہ وران کی انتھک جدوجہد کرنے والی ٹیم کو استعمال میں لاتا ہے اور ہم آہنگی سے چلاتا ہے۔ وہ پالیسی لائن کو واضح اور کارندوں کو منظم رکھتا

ہے۔ AIPAC کا کام اسرائیل کی پالیسیوں کی حمایت کرنا ہے نہ کہ ان کو مرتب کرنا' لہٰذا AIPAC روزانہ اسرائیلی سفارت خانہ سے رابطہ رکھنے کا پابند ہے اور ڈائین ہفتہ میں کم از کم ایک بار ضرور سفارت خانے کے عملے سے ذاتی طور پر ملاقات کرتا ہے۔

حالانکہ AIPAC کا عملہ صرف ۶۰ افراد پر مشتمل ہے جو کہ دوسری کئی بڑی یہودی تنظیموں سے کہیں کم ہے' لیکن پھر بھی اسے قومی پیمانہ پر ایک رضاکار اور شدت پسند گروپ کی خدمات سے بلامعاوضہ استفادہ کرنا میسر ہے۔ واشنگٹن میں سالانہ ممبرشپ اجلاس ان دستوں کو متحرک رکھنے کا کام دیتے ہیں۔ حاضرین ان میں مشہور امریکی اور اسرائیلی مقرروں کو سنتے ہیں۔ ورکشاپ اور سیمینار میں حصہ لیتے ہیں اور اپنے مقصد کے لئے رقم اکٹھی کرتے ہیں۔ یہاں پر چوٹی کے سیاسی ماہرین کو بلایا جاتا ہے۔ اسرائیل کا سفیر' وہائٹ ہاؤس اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے سینئر اہل کار' نامور سینیٹرز اور ایوان نمائندگان کے ممبر مدعو کئے جاتے ہیں۔ ان کانفرنسوں میں وہائٹ ہاؤس کی بھی معتدبہ نمائندگی ہوتی ہے۔ نائب صدر جارج بش (جو کہ بعد میں صدر بنا) نے AIPAC کے نمائندوں کو حال ہی میں یہ یقین دہانی کروائی تھی کہ ریگن انتظامیہ Anti Semitism کے خلاف UN میں اپنی بھرپور جنگ جاری رکھے گی اور تینوں ڈیموکریٹ صدارتی امیدواروں یعنی والٹر مونڈیل' گیری ہارٹ اور جیسی جیکسن پر یہ نکتہ چینی کہ وہ Anti Semitism کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔

۱۹۸۳ء کے قومی اجتماع میں 41 ریاستوں کے 1200 سے زائد نمائندوں نے حصہ لیا۔ اس میں ایوان نمائندگان کی ریپبلکن اقتدار اعلیٰ کے چیئرمین نیویارک کے کانگریس ممبر جیک کیمپ نے تقریر کرتے ہوئے اپنے آپ کو عملی طور پر AIPAC کا ممبر قرار دیا۔ اس جلسہ میں 43 کانگریس ممبران اور 16 سینیٹرز نے کانفرنس کے عشائیے میں شرکت کی۔

AIPAC کے ڈپٹی ایگزیکٹیو ڈائریکٹر Art Chotin نے گروپ کو رپورٹ پیش کی اور بتایا کہ سال گذشتہ دس مختلف ریاستی ورکشاپوں "برائے سیاسی دخل اندازی" نے اسرائیل نواز کمیٹی کو وہ ہنر عطا کیا جو مؤثر ہونے کی ضمانت ہے' دس مزید ۱۹۸۴ء میں منعقد کرنے کی تجویز تھی۔ Chotin نے مثال دے کر اس مقامی واقعات کا قومی اثر واضح کیا۔ ۱۹۸۲ء کی نیو میکسیکو ورکشاپ کے نتیجے میں ڈیموکریٹ Jeffrey Bingaman کو سینیٹ میں منتخب کروانے میں مدد ملی۔ سینیٹر Bingaman بقول Chotin کے "واشنگٹن میں ایک مضبوط اسرائیل نواز صدا تھی" اور وہ ان سو اسرائیل نواز

شہریوں میں شامل تھا جنہوں نے ۱۹۸۳ء میں ورکشاپ میں شمولیت کی۔

اسی طرح کی قومی کانفرنسیں ایک انتہائی مربوط اور مؤثر پروگرام کے تحت پانچ مختلف حلقوں میں منعقد کی جاتی ہیں۔ یہ صدور مقام ہیں اٹلانٹا' فورٹ ورتھ' ہالی ووڈ' Des Moines اور شکاگو اور ان تمام جگہوں سے ایک ایک چیئرمین AIPAC کی تمام مقامی حلقوں کی سرگرمیوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ ان Outreach پروگراموں کے لئے AIPAC نے اب کل وقتی اسٹاف نیویارک' نیو جرسی اور کیلیفورنیا میں رکھا ہوا ہے۔

Chotin نے کانگریس کو بتایا کہ ۱۹۸۲ء کے کانگریس الیکشنوں کے دوران ۳۰۰ اُمیدواروں نے "AIPAC کا دورہ" کیا تاکہ وہ اپنے خیالات "خارجی امداد عرب قوموں کو ہتھیاروں کی فروخت اور عمومی تعلقات عرب امریکہ کی نوعیت" کے بارے میں وضاحت کر سکیں۔

دوسرے ہم خیال گروپوں کے ساتھ باہمی ربط کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ عیسائیوں کے ساتھ روابط بڑھانے کا پروگرام AIPAC کا تازہ ترین قومی پروگرام ہے۔ Merrie White کو (جسے ایک "نیا پیدا شدہ عیسائی" کہہ کر متعارف کروایا گیا تھا) عیسائیوں کے ساتھ رابطہ کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ بقول Chotin منزل زیر نظر اس طبقہ کو AIPAC میں شامل کرنا سے کم ہرگز نہ تھی۔ اس سلسلے میں ۳۵ ریاستوں کے ۵۰ مسیحی نمائندوں کی شمولیت اس منزل کی طرف ایک قدم کا واضح ثبوت تھی۔ White نے آئندہ فروری میں "مذہبی گول میز دعائیہ ناشتہ برائے اسرائیل" بھی منعقد کیا۔ (دیکھئے باب نمبر ۹) Chris Gersten بطور AIPAC پولیٹکل ڈائریکٹر بھی شامل ہوا۔ سات سال تک International Union of Operating Engineers کا خصوصی نائب صدر رہ چکا تھا۔

AIPAC کا ساحل سے ساحل تک "Outreach" پروگرام تقریروں سے مزید مؤثر ہو جاتا ہے۔ صرف ۱۹۸۲ء میں ۹۰۰ سے زیادہ موقعوں پر اس کے افسران' اسٹاف اور نمائندوں نے تقاریر کیں۔ چھوٹے شہروں میں بھی استقبالیے منعقد کیے جاتے ہیں۔ "Parlor Briefings" جو یہودی لیڈروں کے گھروں میں منعقد کی جاتی ہیں۔ قومی پیمانے پر آمدنی کا ذریعہ ہیں جو کہ ممبر شپ چندہ کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ کیپٹل ہل پر جو سماجی تقریبات منعقد ہوتی ہیں ان کے باعث بھی ان ہزاروں ہائی اسکول بچوں اور کالج طلباء کو پیغام رسانی کا موقع ملتا ہے جو کہ سینیٹرز اور کانگریس ممبران

کے کمیٹی دفاتر میں بطور Interns (داخلی رضاکار) کام کرتے ہیں۔ AIPAC کے بنیادی عناصر کو ان دوروں سے بھی مدد ملتی ہے جو دوسرے یہودی گروپ اسرائیل یاترا کے لئے منظم کرتے ہیں۔ مثلاً اپریل ۱۹۸۲ء میں "ینگ لیڈر شپ مشن" نے جو "متحدہ جیوش اپیل" کی ایک سرگرمی ہے' 1500 امریکی یہودیوں کو اسرائیل کا ہفتہ بھر کا دورہ کروایا۔ AIPAC کے ایک اسٹاف رکن کے بقول ان مہمانوں کو وہ عظمت دکھلائی گئی جو کہ آپ کسی ملک میں پائیں گے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس سیاحت سے بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اس سے ہمارے مقصد کے لئے جذبہ پیدا ہوا اور رقم بھی اکٹھی ہوئی۔ آخری Event فنڈ اکٹھا کرنا تھا' جونہی یہ لوگ Holocaust Memorial سے باہر نکلے فنڈ کی اپیل کی گئی۔ اس کا پر جلال اثر ہوا' ٹور ڈائریکٹر نے اس کو باقاعدہ سائنس بنادیا ہے۔ انہیں تمام اثرات کو بیک وقت پیدا کرنا آتا ہے۔ اس آمدنی میں "متحدہ جیوش اپیل" اور اسرائیل کا حصہ ہوتا ہے۔ بقول Larry Kraftwitz (ایک واشنگٹن صحافی) ایسے دورے بیحد اثر انگیز ہوتے ہیں اور کہا "میں اپنے آپ کو نئے یہودی مقاصد سے زیادہ ہم آہنگ پاتا ہوں' بجائے موجودہ اسرائیلی حکومتی پالیسی کے مجھ پر بہت اثر ہوا۔"

یہ دورے صرف یہودیوں کے لئے ہی نہیں ہیں۔ گورنر' ریاستی ممبران' قانون ساز اسمبلی' کمیونٹی لیڈر اور ذرائع ابلاغ کے کارکن' ان سب کو بھی اسرائیل کا مفت دورہ کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ قومی سطح پر بھی لیڈر حضرات خصوصاً کیپٹل ہل والوں کو بھی یہ دورے کروائے جاتے ہیں۔ AIPAC خود براہ راست یہ دورے نہیں کرواتی لیکن اس بارے میں مدد کرتی ہے۔ کانگریس کے آدھے سے زائد ارکان اسرائیل کا دورہ کر چکے ہیں اور ان میں سے تقریباً نصف سرکاری دورہ بنا کر امریکی انتظامیہ کے خرچ پر گئے' بقیہ تقریباً سبھی ماسواء چند استثناء کے یہودی تنظیموں یا افراد کے خرچ پر گئے۔

ایک اور گروہ جسے اکثر سبھی نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن AIPAC جس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتی ہے وہ کانگریس کے اسٹاف ممبران کا ہے۔ AIPAC اسرائیلی یونیورسٹیوں کے تعاون سے کلیدی عہدوں پر تعینات اسٹاف ممبران کا مفت دورہ لگانے کا بندوبست کرتی ہے۔ ان سالانہ دوروں کو Hal Rosenthal پروگرام کا نام دیا گیا ہے۔ ہال روزنتھال ریپبلکن سینیٹر Jacob Javite کا معاون تھا جسے اس طرح کے دورہ کے دوران ایک فلسطینی دہشت گرد نے گولی سے اڑا دیا تھا۔ ۱۹۸۴ء تک ۵۰ سے زائد اسٹاف اس میں شمولیت کر چکے تھے۔

AIPAC قانون ساز ممبران کو عرب ممالک کا دورہ کرنے سے روکنے میں بھی اتنی ہی کامیاب ہے جتنی کہ صرف اسرائیل کا نقطہ نظر پیش کرنے میں۔ جب امریکی عربوں کی قومی ایسوسی ایشن نے عمان کی ورلڈ افیئرز کونسل کے زیر اہتمام تمام ممبران کانگریس کو بمعہ ان کی ازواج کے اردن کا مفت دورہ کرنے اور بطور ایک Side Trip کے West Bank کو بھی دیکھنے کی ۱۹۸۳ء میں دعوت دی تو AIPAC کے جریدہ "Near East Reveiw" کے ایک نوٹس نے فوراً ہی اس پر سرد مہری طاری کر دی۔ اعتراض یہ کیا گیا کہ عمان کیسے دریائے اردن کے پاس غربی کنارے میں ان سیاحوں کے لئے یہ پروگرام ترتیب دے سکتا ہے جبکہ اسرائیل نے تعاون نہیں کیا۔ Don Sund Quist (ریپبلکن کانگریس ممبر) کے منہ سے کہلوایا گیا کہ اگر اس کے ساتھیوں نے یہ دعوت قبول کرلی تو اسے ڈر ہے کہ یہ دورہ اینٹی اسرائیل پروپیگنڈہ کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ صرف تین کانگریس ممبران نے یہ دورہ کیا۔ ۱۹۸۴ء کا ایسا ہی دورہ اس لئے منسوخ کر دیا گیا کہ شرکت کے لئے کوئی بھی راضی نہ تھا۔

AIPAC کے دوررس پروگرام کو مسلسل تصنیف و تالیف سے سہارا ملتا ہے۔ "Action Alerts" کی اشاعت کے علاوہ ہفتہ وار "Near East Report" دیگر معلوماتی پمفلٹ اور مونوگرام شائع کئے جاتے ہیں جن کا مقصد اعتراضات کے جواب دینا' معترضوں کو بے وقعت کرنا اور اسرائیلی مقاصد کی آبیاری کرنا ہوتا ہے۔

سب سے متنازعہ اشاعت ایک فہرست دشمناں ہے جس کا پہلا شمارہ ۱۹۸۳ء کے موسم بہار میں جاری کیا گیا تھا۔ ایک دیدہ زیب' ۱۵۴ صفحات پر مشتمل کتابچہ بعنوان "اسرائیل مخالف طومار" میں ایک فہرست کارکنان دی گئی ہے' اس میں AIPAC نے ۲۱ تنظیموں اور ۳۹ افراد کو اسرائیل کا دشمن قرار دیا ہے۔ اس میں سابقہ انڈر سیکریٹری اسٹیٹ جارج ڈبلیو بال' سابقہ سفیر Talcott Seelye' Killgore Andrew' John C. West' James Akin' سابقہ سینیٹر Andrew Abourezk جیسے مشہور و معروف لوگ شامل ہیں' مزید برآں ۵ عدد یہودی منحرفین اور کئی دانشور بھی اس میں شامل کئے گئے ہیں۔

بظاہر AIPAC کے پراجیکٹ سے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے اینٹی ڈیفیمیشن لیگ آف B'nai B'rith نے خود اسرائیل کے دشمنوں کی ایک فہرست شائع کی جس کا عنوان تھا "Pro-Arab

"Propaganda in America, Vehicles and Voices" اس کو بھی بطور "اشاعت اول" شائع کیا گیا ہے۔ اس میں ۳۱ تنظیمیں اور ۳۴ افراد درج ہیں۔ یہ کتب ماسواء "بلیک لسٹ" کے اور کچھ نہیں ہیں اور یہ میکارتھی کے زمانہ کی بدترین یادگاروں کی طرح ہیں۔ ایسی ہی ایک "فہرست دشمناں" AIPAC اپنے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروگراموں کے سلسلے میں استعمال کرتی ہے۔ (ملاحظہ کیجئے باب نمبر ۷)

ان کی سرعت گفتار

"Action Alert" کے ذریعے ایک ہزار سے زائد یہودی لیڈروں کو امریکہ کے طول و عرض میں حالات حاضرہ سے مطلع رکھا جاتا ہے۔ "Alert" موصول ہونے کا مطلب عموماً کیپٹل ہل پر کسی متوقع قانون سازی کے چیلنج کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ مقصد فون کال کر کے تار دے کر یا بشرط ضرورت ذاتی ملاقات کر کے ناموافق کانگریس ممبر کو قائل کر کے حاصل کرنا ہوتا ہے۔

اس نیٹ ورک (جال) کا اثر بیحد سرعت انگیز ہوتا ہے۔ ایک روز میں نے اپنے خارجہ معاملات کمیٹی کے ساتھی کو کانا پھوسی کر کے بتلایا کہ میں شاید زیر غور بل میں اسرائیل کی مدد کم کرنے کی ترمیم پیش کروں۔ ۳۰ منٹ کے اندر اندر دو عدد کانگریس ممبران متوحش چہروں کے ساتھ میرے پاس آئے کہ انہیں اپنے حلقہ ہائے انتخاب سے شہریوں کے فون کال موصول ہوئے ہیں۔ وہ میری مجوزہ ترمیم کے بارے میں تشویش کا شکار ہیں۔

Paul Weyrich جو کہ سیاسی تجزیہ نگار بننے سے پہلے سینیٹ میں ایک مددگار کا کام کرتا تھا' AIPAC کی اثراندازی کا نقشہ یوں کھینچتا ہے:

"ان کا سسٹم حیرت انگیز ہے۔ اگر آپ ان کے حق میں ووٹ دیں یا ان کا پسندیدہ عوامی بیان دیں تو یہ اس کی سرعت انگیز تشہیر کرتے ہیں۔ اپنی مطبوعات میں بھی اور ملک بھر کے مدیران جرائد کے واسطہ سے بھی جو کہ ان کے حمایتی ہوتے ہیں۔ یہ سسٹم الٹی سمت میں بھی اتنی ہی سرعت سے چلتا ہے۔ اگر آپ کوئی ایسی بات کہیں جو انہیں ناگوار ہو تو یہی سسٹم آپ کی مذمت اور تردید بھی کرتا ہے اس قسم کا دباؤ سینیٹرز پر یقیناً اثرانداز ہوتا ہے' خصوصاً جبکہ وہ ڈھلمل یقین ہوں یا وہ امداد کے محتاج ہوں۔"

یہ سرگرمی ایک وسیع جال کے ذریعے برقرار رکھی جاتی ہے۔افسران کمیٹیوں اور کونسلوں کے ایک وسیع جال کے ذریعے AIPAC یہ سیاسی مقصد ساحل تا ساحل حاصل کرتی ہے۔اس کے ۱۹ (انیس) افسران مہینہ میں ایک بار ڈائین سے ملاقات کر کے تنظیمی اور انتظامی امور پر تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔اس کے پانچ نائب صدور میں ہر ایک آخر کار صدر بن سکتا ہے۔۱۳۲ ممبران پر مشتمل ایک بڑی ایگزیکٹیو کمیٹی کا اجلاس بریفنگ کے لئے ہر سہ ماہی واشنگٹن میں ہوتا ہے۔۲۰۰ ناموں پر مشتمل ایک قوی کونسل بھی ہے۔یہ تمام ذیلی گروپ تقریباً سبھی امریکی یہودی تنظیموں کی لیڈر شپ کا احاطہ کر لیتے ہیں۔

AIPAC اسٹاف نہ صرف انتہائی پیشہ ور اور تحریک انگیز بلکہ انتہائی تجربہ کار بھی ہوتا ہے۔ ڈائریکٹر ڈائمین نے کیپٹل ہل پر کئی مختلف حیثیتوں میں کام کیا ہے۔پہلے ڈیموکریٹ سینیٹر ایڈورڈ کینیڈی کے اسٹاف پر' پھر ڈیموکریٹ سینیٹر فرینک چرچ کے ہمراہ تعلقات خارجہ کمیٹی میں اور آخر کار بطور اسٹاف ڈائریکٹر برائے خارجہ پالیسی سینیٹ کی بجٹ کمیٹی کے لئے۔

AIPAC کے چار لابسٹ (Lobbyist) ڈوگلس بلوم فیلڈ' ٹرنبرگر' ایستھر کرز اور ایل ایل لیوی ہیں۔ صرف لیوی بطور اسٹوڈنٹ انٹرن کے آیا ورنہ بقیہ سب نے کسی نہ کسی کانگریس ممبر یا سینیٹر کے ساتھ خارجہ پالیسی پر کام کیا۔یہ چاروں آپس میں ہاؤس اور سینیٹ کے تمام ممبران کو تقسیم کر لیتے ہیں۔درحقیقت صرف مٹھی بھر قانون ساز ہی کلید کامیابی ہوتے ہیں۔لہٰذا ہر ایک لابسٹ کو تقریباً ۳۰ قانون ساز ممبران پر نظر رکھنی پڑتی ہے' وہ اپنی توجہ اس بارہ ریاستوں کے نمائندوں پر مرکوز رکھتے ہیں جن میں یہودی آبادی کم از کم تین فیصد ہے۔یعنی نیویارک' نیوجرسی' کیلیفورنیا' میسا چوسیٹس' اوہایو' الی نوائے' مشی گن' پنسلوینیا' میری لینڈ' ڈیلاویئر' فلوریڈا اور کنیکٹی کٹ۔

کانگریس میں اسٹاف جاب سے AIPAC میں تقرری یکطرفہ عمل نہیں' اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ جیسے لیری سمتھ اور اسٹیفن سولارز کے اسٹاف ممبر جوناتن سلیڈ اور مارون فیور ورجر۔یہ دونوں سینیٹر اسرائیل کے سرگرم حامی ہیں۔AIPAC کے لابسٹوں کو ممبران اور سینیٹرز کے پاس فوری رسائی میسر ہے بلکہ وہ ان کے گھروں پر بھی شام کو جا ملتے ہیں۔ریپبلکن کانگریس ممبر Douglas Bereuter of Nebraska میرے علم میں وہ واحد استثناء ہے جو کسی بھی لابسٹ کو نہیں ملتا' بقیہ سب کے دروازے AIPAC کے نمائندوں کے لئے کھلے ہیں۔ایک کانگریس مددگار نے وضاحت

کرتے ہوئے کہا:

"پیشہ ورانہ مہارت ایک وجہ ہے۔ انہیں پتہ ہوتا ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہیں اور چلتے بنتے ہیں۔ وہ مفید معلومات حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہیں' وہ قابل اعتماد اور دوستانہ ہوتے ہیں۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ کانگریس کے ممبران یہ جانتے ہیں کہ ان کے اہم شخصیات سے براہ راست اور مضبوط روابط ہوتے ہیں۔"

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قانون ساز ممبر اور لابسٹ کے درمیان حیرت انگیز باہمی ربط اور ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک AIPAC لابسٹ نے کیپٹل ہل کے برآمدے میں کہا کہ "کل میں پانچ ممبران کو ملنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے آج صبح پانچوں سے فون پر رابطہ کر کے ملاقات طے کر لی ہے' لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے انتظار نہ کرنا پڑے گا۔" دو دن بعد وہ خود بھی AIPAC کے اثر و نفوذ کا بیحد مرعوب پایا گیا۔ اس کا بیان تھا "میں پانچوں کو ملا' ذرہ بھر انتظار نہ کرنا پڑا۔ کیا حیرت انگیز کامیابی ہے ہماری۔"

یہ صورت حال اس کے برعکس ہے جو کسی دوسرے لابسٹ کو درپیش ہوتی ہے۔ ایک جہاندیدہ لابسٹ نے AIPAC کی رسائی پر اس طرح تبصرہ کیا "اگر میں ایک طویل دن بھر کی جدوجہد کے بعد صرف دو عدد کانگریس ممبران یا سینیٹر سے ملاقات حاصل کر پاؤں تو یہ بڑی کامیابی ہوتی ہے۔"

AIPAC کے انکار کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ وہ ہر ممبر کانگریس اور سینیٹر کے بارے میں ایک تفصیلی فائل مرتب کئے رکھتی ہے' دوسری لابیوں کی طرح نہیں جو صرف چند کلیدی معاملات کے اوپر سینیٹ یا ہاؤس کی ووٹنگ کا خیال رکھتی ہیں۔ AIPAC دیگر سرگرمیوں کا بھی ریکارڈ رکھتی ہے۔ مثلاً کمیٹیوں میں ووٹ' قانون کے مسودے میں شراکت' خطوط کا اجراء اور یہاں تک کہ آیا تقاریر کی بھی گئیں؟ ایک کیپٹل ہل اسٹاف ممبر نے تعریف کے لہجے میں کہا "اسے کہتے ہیں گہرائی۔"

اس لابی قوت کا ایک مظاہرہ ۳/اکتوبر ۱۹۸۴ء کو دیکھنے میں آیا جب ایوان نمائندگان نے اسرائیل اور امریکہ کے درمیان تمام تجارتی پابندیاں ختم کر دینے کا قانون پاس کیا۔ 98.5 فیصد (۴۱۶) نے حمایت میں ووٹ دیا جبکہ AFL-C10 اور امریکن فارم بیورو فیڈریشن نے اس کی شدید مخالفت کی تھی' صرف چھ ووٹ مخالفت میں ڈالے گئے۔ حالانکہ یہ ایک ایسی بات تھی جس پر زبردست ردعمل متوقع تھا کیونکہ اس کا اثر ان اشیاء صرف پر تھا جو کہ .U.S.A کی پیداوار ہیں۔

اس ووٹ کے دوران بیشتر ممبران محکمہ تجارت کے اس "مطالعے" سے لاعلم تھے جس میں کہا گیا تھا کہ اس قانون کے ماتحت ڈیوٹی فری درآمدات سے امریکہ کے سبزیاں اگانے والوں کو قابل ذکر مضرت رساں اثر کا سامنا ہوگا۔ لیکن وہائٹ ہاؤس کی منشاء یہ تھی کہ یہ قانون پاس ہو کر رہے چاہے اس سے ملازمت کے مواقع اور مارکیٹ پر کیسے ہی اثرات مرتب کیوں نہ ہوں' لہٰذا اس "مطالعے" کو صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ ایک ممبر کانگریس نے بصد مشکل ایک کاپی اس کی حاصل کر ہی لی۔ وہائٹ ہاؤس سے سخت شکایت...... اور صحیح شکایت...... کے بعد کہ AIPAC اپنے استعمال کے لئے اس کی کاپی حاصل کر چکی ہے۔

میں نے یہ AIPAC سے منظور کروالیا ہے

۷۴ سالہ کانگریس ممبر Clarence D. "Doc" Long جسے ۶/نومبر ۱۹۸۴ء کو اچانک شکست کا سامنا ہوا' کیپٹل ہل اور AIPAC کے مضبوط باہمی روابط کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ بطور چیئرمین House Appropriation Sub-Committee اس نے اسرائیل کا حق بطور احسن ادا کیا۔ سرو قد سفیدی مائل سر والے جان ہاپکنز یونیورسٹی کے اس پروفیسر اقتصادیات نے فخراً کہا "AIPAC نے میرے حلقہ انتخاب کو توجہ میں اولیت دی۔" AIPAC نے مسٹر لونگ کو امداد بلاوجہ نہیں دی تھی' اس کے ہاتھ میں قسمت کا فیصلہ ہوتا جب بھی اسرائیل کو امداد کی منظوری زیر بحث آتی۔ چیئرمین شپ کا فیصلہ عموماً سینیارٹی پر ہوتا ہے اور لونگ کے بعد David Obey of Wisconsen تھا جس نے ۱۹۷۱ء میں اس لابی کا عناد کمایا تھا۔ اسرائیل کی امداد میں ۲۰۰ ملین ڈالر کٹوتی کی تحریک پیش کر کے Mr. "Doc" Long نے یہ ترمیم ۳۴۲ (صرف ۳۲ خلاف) ووٹوں کی اکثریت سے منظور کروائی تھی۔

ایوان نمائندگان کے ریستوران میں ایک میز پر بیٹھے (۱۹۸۲ء کے اواخر سیشن میں) مسٹر لونگ نے یوں وضاحت کی:

"مدت گزری میں نے یہ طے کیا تھا کہ جو بھی AIPAC چاہے گی میں اس کے حق میں ووٹ دوں گا۔ میں ان کو اپنے اوپر سوار نہیں کروانا چاہتا تھا۔ میرا حلقہ انتخاب بیحد دشوار ہے' مجھے مزید دشواری کی ضرورت نہیں اس اسرائیل نواز لابی کی طرف سے۔ میں نے یہ ٹھان لی تھی کہ میں ان کی امداد حاصل کروں گا اور ہمیشہ رکھوں گا۔"

بات چیت کا رُخ اس ایک سوال کی طرف مڑ گیا جو کہ Mr. Obey نے اٹھایا تھا کہ اسرائیل کی امداد کی سطح کے بلند ہونے کے بارے میں' جانے Dave کیوں ایسی باتیں کرتا ہے؟ لونگ نے کہا "ہوسکتا ہے وہ ہمارے اپنے قومی مفاد کے بارے میں سوچ رہا ہو۔" ایک ساتھی نے طنزاً کہا۔

ستمبر ۱۹۸۳ء میں لونگ نے ایک طویل جنگ لڑی کہ امریکن میرین دستوں کو لبنان سے فارغ کیا جائے۔ اس نے ایک ترمیم پیش کی جس کے نتیجہ میں ۶۰ دن کے بعد اس پراجیکٹ کے فنڈ ختم کر دیئے جاتے۔ Mr. John Hall (ایک رپورٹر جو جانتا تھا کہ لونگ کے اس لابی سے کتنے گہرے روابط ہیں) نے سوال کیا "آپ کو یقین ہے اس ترمیم کی وجہ سے آپ کو کوئی مشکل پیش نہیں ہوگی؟" تو مسٹر لونگ نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے معاً جواب دیا کہ "میں نے AIPAC کی منظوری حاصل کر لی تھی۔" ......اور وہ یہ مذاقاً نہیں کہہ رہے تھے۔ گو یہ پہلا کانگریس کا پروپوزل نہ تھا جس کے لئے AIPAC کی پیشگی منظور حاصل کی گئی ہو لیکن یہ بات اعلانیہ اقرار کے طور پر پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ لبنان کو امداد منقطع کرنے کے پروپوزل پر گرما گرم بحث و مباحثہ ہوا لیکن اسپیکر "Tip" O Neil اور یورپ و مشرق وسطیٰ کی سب کمیٹی کے چیئرمین انڈیانا کے Lee Hamiltion جیسے ممبران کی مخالفت کے باعث اسے ۲۷۴ بمقابلہ ۱۵۸ ووٹ سے نامنظور کیا گیا۔

اسرائیل نواز لابی کی خطیر رقم کی امداد ۱۹۸۲ء میں ۱۸ ممبران پولیٹکل کمیٹی نے Mr. Long کی ری الیکشن مہم میں صرف 31250 ڈالر دیئے' اس کے باوجود مسٹر لونگ کہتے ہیں "اسرائیل کی امداد کے لئے حمایت کرنے پر کسی کو مجھے رقم دینے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو میں ۲۰ سال سے کر رہا ہوں اور اکثر بغیر کسی معاوضہ کے۔"

۱۹۸۴ء میں اسرائیلی حمائیتیوں کے ووٹ اور رقم ناکافی ثابت ہوئے' باوجودیکہ اسرائیلی پبلک ایکشن کمیٹیوں نے اسے 155000 ڈالر دیئے جو کہ کسی بھی دوسرے امیدوار سے چار گنا تھے۔ پھر بھی Mr. Long صرف 5727 ووٹوں کی کمی سے شکست کھا گیا۔ یہ ڈالے گئے ووٹوں کا ۳ فیصد سے بھی کم تھے۔ اس شکست میں نیشنل ایسوسی ایشن آف عرب امریکن کے معروف افراد کے ایک اشتہاری مہم چلانے کا ہاتھ تھا جس میں مسٹر لونگ کی اس بات پر نکتہ چینی کی گئی تھی کہ وہ اسرائیل کی ہر جائز و ناجائز مانگ کی حمایت کر دیتے تھے۔ مسٹر لونگ کے متوقع جانشین Mr. Obey وہ واحد ڈیموکریٹ تھے پینل پر جنہوں نے اسرائیل نواز پبلک ایکشن کمیٹیوں سے کوئی رقم نہیں لی تھی۔

بین الاقوامی پیمانے پر فروغ تعاون

AIPAC نہ صرف امریکہ میں ہی اسرائیل کے مفادات کی نگہبانی کرتی ہے بلکہ اس کے بین الاقوامی مفادات کی دیکھ بھال بھی کرتی ہے۔ اس لابی نے پچھلے دنوں ایک بین الاقوامی فروغ تعاون پروگرام شروع کیا جس میں دوسرے ممالک کو امداد اسرائیل کے مفاد کو مدنظر رکھ کر دی جاتی ہے۔ ۱۹۸۳ء میں اسرائیل کے نئے دوست زائیرے کو امداد کی کوشش کی گئی۔ اسرائیل چاہتا تھا کہ زائیرے کو وہ ۲۰ ملین ڈالر کی فوجی امداد دے دی جائے جو کہ صدر ریگن نے مانگی تھی۔ لیکن AIPAC نے یہ طے کیا کہ یہ پروپیگنڈا اس کا اسٹاف نہیں کرے گا۔ اس سلسلے میں ایک مشاورتی ادارے کی خدمات عارضی طور پر حاصل کی گئیں جس نے ہاؤس کمیٹی برائے خارجہ امور کے ممبران کا ناطقہ بند کئے رکھا۔ یہ ترمیم تو منظور نہ ہو سکی لیکن زائیرے نے اس احسان کا بدلہ یوں چکایا کہ پچھلے سال اسرائیل کو پورے طور پر تسلیم کر لیا۔

Rowland Evans اور Robert Novak جیسے کالم نگاروں نے اس کا یوں تجزیہ کیا کہ یہ اسرائیلی پیش قدمی کا پہلا مرحلہ ہے جس میں ایسی اچھوت اقوام جو کانگریس کی ہٹ لسٹ پر ہیں کو امداد دلوا کر ان میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کیا جائے۔ انہوں نے اس اسرائیلی اقدام کو قومی سیاسی اقتدار میں ایک غیر ملکی قوم کی شرکت جس سے کئی گمبھیر مسائل جنم لیتے ہیں قرار دیا۔

AIPAC اپنی بین الاقوامی شاخیں قائم کرنے کے ساتھ ساتھ داخلی سیاسی مہموں میں بھی حصہ لیتی ہے۔ ۱۹۸۴ء میں اس نے نارتھ کیرولینا کی سینیٹ کی سیٹ کے انتخاب میں بھرپور حصہ لیا۔ اس انتہائی بیش قیمت مقابلے میں ایک طرف تو Jesse Helms اور مقابلہ میں گورنر Jim Hunt تھا۔ اوّل الذکر ریپبلکن موجودہ نمائندہ جسے اپنی قدامت پرستی پر ناز تھا اور مؤخر الذکر اپنے آپ کو "New South" ترقی پسند سیاست کا نمائندہ متصور کرتا تھا۔ ان دونوں حریفوں میں البتہ ایک بات مشترک تھی' دونوں ہی اسرائیل نواز ووٹ کے طلب گار تھے' جیسی ہیلمز کو بطور ایک ثانوی ریپبلکن کے خارجہ امور کی کمیٹی میں ایک حیرت انگیز صورت حال کا سامنا تھا۔ مسٹر ہیلمز کو یہ موقع حاصل تھا کہ وہ چارلس پرسی کی شکست کے بعد اس کمیٹی کی صدارت اختیار کریں۔ (دیکھئے باب ۳)

اسرائیل نواز لابی کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ہیلمز کو کئی اہم رکاوٹیں عبور کرنی پڑیں۔ ۱۹۷۹ء میں ہیلمز نے ایک تقریر میں یہ کہا تھا کہ اسرائیلی پالیسی برائے غربی کنارہ تفصیلی مفاہمت میں

ایک رکاوٹ ہے۔ عربوں اور اسرائیلیوں کے مابین ۱۹۸۲ء میں اسرائیل کے لبنان پر حملہ کے دوران ہیلمز نے کہا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ امریکہ کو آخرکار اسرائیل کے ساتھ تعلقات منقطع کرنے پڑیں۔

ہیلمز کی "Hate List" پر غیر ملکی امداد ہے جسے وہ سب سے بڑی لعنت قرار دیتا تھا "میں نے ایک پیسہ بھی ان پروگراموں پر دساور بھیجنے کے لئے ووٹ نہیں دیا" اس کا بیان تھا۔

اسرائیل کو امداد چونکہ خارجہ امداد کا حصہ تھی اور ہیلمز خارجہ امداد کا مخالف' لہٰذا Hunt نے یہ الزام دھرا کہ ہیلمز نے ۲۵ مرتبہ اسرائیل کے خلاف ووٹ دیا ہے۔ اس نے ہیلمز کے اس ووٹ پر بھی کڑی تنقید کی جو اس نے سعودی عرب کو متنازعہ فوجی سودے کے حق میں ڈالا تھا۔ Hunt کی ٹیم نے ان غلطیوں سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی' انہوں نے اسرائیل نواز آسامیوں کو ایک لفافہ بذریعہ ڈاک بھجوایا جس پر جلی حروف میں درج تھا "خبردار! اس کے اندر جو اطلاع بند ہے وہ اسرائیل کے لئے انتہائی مہلک ہے" اندر یہ نقصان دہ اطلاع درج تھی کہ Mr. Helms خارجہ تعلقات کمیٹی کا انٹی اسرائیل چیئرمین بن سکتا ہے۔ یہ طریقہ عمل خاصا سودمند ثابت ہوا۔ ہیلمز کے اسٹاف ممبران نے کہا کہ ہمارے حساب کے مطابق Hunt کی ۲۰ فیصد رقم یہودی فرقہ سے ملی تھی۔ وسط اگست تک Hunt کو اسرائیل نواز پولیٹیکل ایکشن کمیٹیوں کی طرف سے 130350 ڈالر موصول ہو چکے تھے اور ہیلمز کو صفر۔ ہیلمز نے ایک جوابی حملہ کیا تاکہ وہ اسرائیل کے حامیوں سے اپنے تعلقات درست کرسکے۔ مئی میں اس نے اسرائیل کے ایک Likud پارٹی ممبر کو سینیٹ کے روبرو ذاتی طور پر متعارف کروایا اور اس مہمان کے خارجہ پالیسی کے بارے میں بیان کو کانگریس کی کاروائی میں درج کروایا۔ اس سے ایسے لگتا تھا کہ جیسے پہلے بیان کی تردید ہوئی ہے۔ جب اس نے کہا کہ مقبوضہ علاقے میں امریکہ کو کبھی بھی ایسی پلان نہیں بنانی چاہئے جس میں غربی کنارے کو اسرائیل سے علیحدہ کرنے کا منصوبہ ہو۔ ہیلمز کا دونوں کشتیوں میں پاؤں رکھنا اس بل سے بھی ظاہر تھا جو اس نے امریکی سفارت خانے کو تل ابیب سے یروشلم منتقل کرنے پر پیش کر رکھا تھا' باوجودیکہ اس نے اس بل کو Co-sponser کرنے سے یہ کہہ کر گریز کیا کہ اس سے گہرے قانونی نکات پیدا ہوئے ہیں اور یہ کہ اس کی دستوری حیثیت مشکوک تھی۔ ایک مثالی جوابی حربہ کے طور پر ہیلمز کے انتخابی کارندوں نے یہودی شہریوں کو چندہ کی اپیل بھیجی جس میں اس دکھ کا اظہار تھا کہ کوئی بھی یہودی اس کی اسرائیل دوستی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی مخالفت کرے گا۔

یہ مقابلہ امریکی تاریخ کا مہنگا ترین Non-Presidential Compaign تھا۔ ہیلمز نے ۱۳ ملین اور Hunt نے ۸ ملین سے زائد ڈالر خرچ کیے۔ جب رائے شماری ختم ہوئی تو ہیلمز ایک نہایت معمولی اکثریت سے جیت گیا۔

AIPAC سے ماوراء P.A.C. تک

AIPAC دوسری بیشتر لابیوں سے یوں مختلف ہے کہ یہ ممبران کی پالیسی پر عوامی طور پر صاد نہیں کرتی اور نہ ہی براہ راست پارٹی مہم میں رقم جمع یا خرچ کرتی ہے۔ یہ کام یعنی براہِ راست حصہ لینا اسرائیل نواز پولیٹکل ایکشن کمیٹیوں (PACs) پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وفاقی قانون کے ماتحت 3000 سے زائد PAC رجسٹرڈ ہیں اور تقریباً سبھی کا الحاق Special Interest Lobbies کے ساتھ ہے۔ 75 PAC ایسی ہیں جو کہ اسرائیل کی امداد پر توجہ مرکوز کرتی ہیں گو ان میں سے ایک بھی اپنا الحاق AIPAC یا دوسری یہودی تنظیموں کے ساتھ ظاہر نہیں کرتی۔

۱۹۷۹ء سے پیشتر ممبران اور جماعتی تنظیموں کو اسرائیل نواز اقتصادی امداد صرف افراد کے ذریعے ملتی تھی، ایسے ہی کچھ افراد نے ۱۹۷۶ء کے ریاست OHIO کے ممبر کانگریس کے انتخاب پر پوری پوری توجہ مرکوز کی۔ یہاں امیدوار Mary Rose Oakar تھی جو کہ پہلی شام نژاد شخصیت تھی جس کا مقابلہ ۱۲ عدد مرد ڈیموکریٹ حضرات اور یہودی سرمایہ کے ایک سیلاب عظیم سے ہوا، اس پرائمری الیکشن میں۔ اسرائیل نواز حلقوں نے OHIO کے سینیٹر Tony Celebreze کو چنا جسے ریاستی سیاست میں ایک ابھرتا ہوا ستارہ خیال کیا جاتا تھا۔ امید یہ تھی کہ وہ اسے نامزدگی سے خارج کروانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اس مہم کے دوران Celebreze کے ایک رفیق کار Don Haffernan سے جو کہ چندہ جمع کر رہا تھا۔ ایک حیران پریشان ساتھی نے یہ پوچھا کہ ۳۰ سے زائد یہودی نماناموں نے ہی فی کس ہزار ڈالر چندہ کیوں دیا؟ یہ کیا گھپلا ہے؟ یہ اس حیرت کا برملا اظہار تھا کہ Celebreze نے کہیں کسی خاص مفاد کے گروپ کے سامنے گھٹنے تو نہیں ٹیکے۔ اس نے بغیر لگی لپٹی رکھے پوچھا کہ کیا ٹونی نے اپنے آپ کو فروخت کردیا ہے یا کہ یہ رقم کسی نیک مقصد سے دی گئی ہے؟ Don Hafferenan کا جواب تھا "تو کیا اسرائیل ایک نیک مقصد نہیں؟"

Oaker کو اسرائیل نواز قوتوں کا یہ توجہ مرکوز کرنا خاصا پریشان کن لگا۔ اس نے کہا "میں

نے مشرق وسطیٰ کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں کہا' لہٰذا اس کا تعلق میرے نسلی پس منظر سے ہو سکتا ہے۔ میرے والد نے WW-II میں خدمات انجام دیں اور بعد ازیں برادر نے فوج میں' لیکن خیال یہ تھا کہ ہم اتنے امریکن نہیں۔"

اس مالی امداد نے Celebreze کو بقیہ گیارہ امیدواران کو ہرانے میں تو مدد دی لیکن وہ Oaker کو نہ ہرا سکا۔ یہ دیکھ کر کہ یہ حلقہ ڈیموکریٹس کی کثیر اکثریت پر مشتمل ہے' اسرائیل نواز گروپ نے ہمت ہار دی اور آئندہ انتخابات میں Oaker کی مخالفت نہ کی۔

۱۹۷۹ء کے اس یہودی نمانا موں کی لسٹ نے جو OHIO کے انتخابات میں منظر عام پر آئی یقیناً یہودیوں کو یہ حوصلہ دیا ہو گا کہ وہ قومی پیمانے پر ایسی ہی اسرائیل نواز پولیٹکل ایکشن کمیٹیاں (PAC) منظم کریں۔ ۱۹۸۲ء تک ان کی تعداد ۳۱ تک پہنچ چکی تھی۔ اسرائیل نواز PACs نے ۸۲-۱۹۸۱ء کے ۲۶۸ مختلف الیکشن معرکوں میں کل ملا کر 1.8 ملین ڈالر خرچ کئے۔ یہ سب سے خطیر سیاسی خرچ تھا۔ وسط اگست ۱۹۸۴ء تک ان PACs کی تعداد ۷۵ ہو چکی تھی اور ان کا جمع شدہ سرمایہ برائے ۱۹۸۴ء وفاقی انتخابات 4.25 ملین ڈالر تک پہنچ چکا تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی اپنا نام یا اور کوئی اطلاع نہ دی تھی جس سے ان کا اسرائیل نواز جھکاؤ ظاہر ہو سکے' حتیٰ کہ کسی نے بھی اپنی وابستگی AIPAC یا کسی اور یہودی تنظیم سے منسلک نہیں کی تھی۔ ہر ایک نے اپنا اسرائیل نواز جھکاؤ دوسروں سے اوجھل رکھنے کے لئے مبہم قسم کے عنوان رکھے تھے۔ مثلاً "اٹھارہ کی کمیٹی" یا "ایری زونا کے سیاسی دلچسپی رکھنے والے شہری" یا "متحدہ عمل محاذ برائے سیاسی امور" یا پھر "حکومت ایکشن کمیٹی" لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک تھی اور وہ تھی اسرائیل۔

مارک سیگل کا کہنا ہے کہ کوئی بھی کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کر رہا۔ یہ حضرت اسرائیل نواز نیشنل بین الجماعتی پولیٹکل ایکشن کمیٹی کے ڈائریکٹر اور یہودیوں کے ساتھ رابطہ رکھنے کے لئے وہائٹ ہاؤس کے سابقہ لیزان آفیسر' ان کا اصرار تھا کہ یہ بے ضرر قسم کے نام اس لئے چنے گئے تھے کہ سیاست میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہ یہودی سرمایہ کے استعمال کو منفی رنگ دیں گے۔ جناب سیگل صاحب کو اس PAC کے لئے سربراہ مقرر کیا گیا تھا جو ۱۹۷۸ء میں سینیٹر ہنری جیکسن کی صدارتی امیدواری میں امداد کے لئے معرض وجود میں آئی تھی۔

نارمن سلورمین جس نے Denver میں "کمیٹی برائے اٹھارہ" قائم کی' زیادہ صاف گوئی سے

کام لیتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ کمیٹی کا نام رکھنا ایک جذباتی مسئلہ بن گیا تھا۔ منتظمین میں سے نسبتاً نوجوان گروپ کا اصرار تھا کہ یہودی شناخت واضح طور پر نام سے جھلکے جبکہ دوسروں کا کہنا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ شرکت نہیں کریں گے۔

نام چاہے کچھ بھی ہو اسرائیل نواز PAC کی وجہ سے انفرادی مددگاروں کا حلقہ اثر وسیع ہو کر امیدواروں کے لئے زیادہ مؤثر ہو جاتا ہے۔ کسی ایک فرد کو PAC کو ۵۰۰۰ ڈالر تک چندہ دینے کی اجازت ہے جبکہ کسی ایک امیدوار کو وہ صرف ۱۰۰۰ ڈالر فی الیکشن چندہ دے سکتا ہے۔ یہ PAC ہر الیکشن میں کسی بھی امیدوار کو ۵۰۰۰ ڈالر تک دینے کے مجاز ہیں۔ افراد اکثر انفرادی طور پر ۱۰۰۰ ڈالر براہ راست اپنے امیدوار کو چندہ دیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ۵۰۰۰ ڈالر اُس PAC کو بھی چندہ دیتے ہیں جو کہ پھر اسی امیدوار کو امداد دے رہی ہوتی ہے۔ "وال اسٹریٹ جرنل" نے اگست ۱۹۸۳ء میں ان اسرائیل نواز PAC کے پھیلاؤ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ بیورلے ہلز کی بار براوائین برگ اور لارنس نے Organised P.A.C. Citizens کو ۲۰۰۰۰ ڈالر دیئے۔ یہ PAC لاس انجلز میں قائم ہے اور یہ رقم ۱۹۸۲ء کے پرائمری اور جنرل الیکشن کے دوران دی گئی اور مزید ۲۰۰۰ ڈالر ڈیموکریٹ رچرڈ جے۔ ڈربن کو دیئے گئے اور یہ وہی حضرت ہیں جنہوں نے مجھے ۱۹۸۲ء میں شکست دی تھی۔ PAC نے بھی ڈربن کو ۵۰۰۰ ڈالر دیئے۔ اس قسم کی فیاضی کو ہمارا اوسط سیاست داں نظر انداز نہیں کر سکتا۔

سب سے بڑی PAC نیشنل پولیٹکل ایکشن کمیٹی ہے (NAT, PAC) جس کا صدر مقام نیویارک ہے۔ Marvin Josephson جو کہ ایک تھیٹریکل اور ادبی مہارت ایجنسی کا سربراہ ہے' اس کا چیئرمین ہے۔ واشنگٹن میں اس کا ایگزیکٹیو ڈائریکٹر مسٹر رچرڈ ایلمین ہے جو کہ پیشتر ازیں AIPAC کے پولیٹکل ڈائریکٹر کے طور پر کام کر چکا ہے۔ یہ کمیٹی ۱۹۸۲ء میں طوفانی رفتار سے بڑھی کیونکہ اس کو بے تحاشہ رقم تفریحی اداروں سے حاصل ہوئی۔ یہ Woody Allen کی پہلی قومی اپیل برائے چندہ کا نتیجہ تھا۔ "نیشنل جرنل" اس کو امریکہ کی سب سے بڑی "Non Business" اور Non-Labour PAC قرار دیتا ہے۔

۱۹۸۲ء میں NAT. PAC نے 1.04 ملین ڈالر اکٹھے کئے جن میں سے ۵۴۷۵۰۰ ڈالر اس نے کانگریس کے ۱۰۹ اُمیدواروں پر خرچ کئے۔ ۳۱ اُمیدواران سینیٹ کو فی کس ۵۰۰۰ ڈالر دیئے

گئے جو کہ قانونی حد کے مطابق تھے' اس میں سے ۲۸ کامیاب ہوئے۔ دوسری طرف ایوان نمائندگان میں جن ۷۳ اُمیدواروں کو پشت پناہی حاصل تھی ان میں سے ۵۷ کامیاب ہوئے۔ ان کامیابیوں کے جلو میں NAT, PAC نے نیویارک ٹائمز میں صفحے بھر کا اشتہار دیا کہ انہیں مزید امداد درکار ہے اور یہ کہ تمام پچاس ریاستوں میں ایسے امیدواروں کو منتخب کروانے میں مدد کرے گی جو اسرائیل کی بقاء کو ہماری اپنی بقاء سمجھتے ہوں۔

حال ہی میں ایک چندہ جمع کرنے کی اپیل ریپبلکن سینٹر رابرٹ پیکوڈ (Dragon) اور ڈیموکریٹ سینٹر پیٹرک موئین ہان (نیویارک) نے جاری کی۔ یہ دونوں حضرات انتہائی اسرائیل نواز ہیں۔ خط میں درج تھا کہ اگر آپ بھی ہماری طرح یہ ایمان رکھتے ہیں کہ اسرائیل امریکہ کے لئے ایک انتہائی اہم مورچہ ہے دنیا کے اس حصہ میں تو برائے مہربانی یہ خط پڑھیے۔ اس خط میں NAT, PAC کے لئے امداد کی اپیل تھی تاکہ پیٹرو ڈالرز کا توڑ کیا جاسکے۔

پانچ ساتھی Josephson کو یہ فیصلہ کرنے میں مدد دیتے ہیں کہ کس امیدوار پر رقم لگائی جائے۔ ان کے نام یہ ہیں: بیری ڈلار' صدر پیرااماؤنٹ پکچرز کارپوریشن' جارج کلین نیویارک کا ایک ڈیولپر' جیمز ولفنسن نیویارک کا ایک انوسٹمنٹ بینکر' مارٹن پیریز "دی نیو ریپبلک" کا مدیر اور ریٹا ہوسر نیویارک کی ایک وکیل جو امریکن جیوش کمیٹی کی سرگرم رکن ہے۔ (موجودہ صدر ورلڈ بنک' مترجم)

ایگزیکٹو ڈائریکٹر رچرڈ المن "NAT, PAC" کو "عوامی سطح کی سرگرمی" کہتا ہے۔ ۱۹۸۳ء کے اواخر تک وہ ۲۰۰۰۰ (بیس ہزار) سے زائد ممبر بنا چکا تھا جبکہ ۱۹۸۴ء کا ہدف اس کو ایک لاکھ تک وسعت دینا تھا۔ NAT, PAC کی کوشش اس کے کہنے کے مطابق مذہبی چندہ جمع کرنے کی ہے اور وہ ایک سو ممتاز امریکیوں کے ناموں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کہ اس کے بنیادی اراکین ہیں اور جن میں ایک میتھوڈسٹ Boh Hope بھی شامل ہے۔ وہ صاف گوئی سے کہتا ہے: سیاست کا گھوڑا پیسے سے دوڑتا ہے۔ اپنے حمایتی کو الیکشن جتوانے کے لئے گرہ سے مال خرچ کرنا پڑتا ہے ...... اور یہ صرف ہم ہی نہیں جو یہ جانتے ہیں۔

المین کا اعلان ہے کہ PAC میں شمولیت بنیادی طور پر امریکن د جیوش دونوں لحاظ سے ہے اور اس سے ہماری سیاسی معاملات میں دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ بعض دفعہ ایک چھوٹی PAC اپنے علاقے سے دور دراز کے امیدواروں پر بھی توجہ مرکوز کرتی ہے۔ رابرٹ بی گولڈر نے جو کہ فلاڈلفیا

کا ایک تاجر ہے' ایسی ہی ایک کمیٹی ۱۹۸۱ء میں قائم کی جس کا نام ڈیلاویئر ویلی PAC (DEL-VAL-PAC) تھا۔ اس نے ۱۶۰ ممبر بھرتی کئے اور ۳۲ متفرق ذیلی امیدواروں میں ۵۸۰۰۰ ڈالر تقسیم کئے' ان میں سے ۲۸ کامیاب ہوئے۔ گولڈر نے بتایا کہ اس کا کام اسرائیل نواز امیدواروں کو ایسی دور دراز جگہوں میں کامیاب کروانا ہے جہاں یہودی انتخابی حلقے نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر اس کی PAC نے جیفری بنگامین کو (جو ۱۹۸۲ء میں نیومیکسیکو سے بطور ڈیموکریٹ امیدوار سینیٹ میں چنا گیا تھا) ۱۵۰۰ ڈالر بھجوائے۔ ۱۹۸۳ء کے اواخر میں اس نے ۵۰۰۰ ڈالر Tom Corcoren کو بھجوائے جو کہ الی نوائے کے چارلس پرسی کو شکست نہ دے سکا۔ بارہ ممبران پر مشتمل ایگزیکٹو کمیٹی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ رقم کہاں خرچ کرنی ہے۔

سان فرانسسکو میں قائم ایک PAC کیلیفورنیا سے باہر ہونے والے مقابلوں پر توجہ مرکوز کرتی ہے۔ Bay Area Citizens PAC کے صدر Melvin Swing کا بیان ہے "یہاں پر کافی لوگ ہیں جو کہ اس حلقہ انتخاب کا بیشتر کام کر دیتے ہیں۔ ہم توجہ ان علاقوں پر دیتے ہیں جہاں یہودیوں کی آبادی کم ہے اور وہ زیادہ مؤثر نہیں ہیں۔" گولڈر ایسے گروپوں کا ہدف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"ہم مزید یہودیوں کو شامل کر رہے ہیں...... آپ ملاحظہ کریں ہم سیاسی تحریک کے ذریعے امریکی حکومت سے کس قدر حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ PACs کا ایک کلیدی نکتہ ہے۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسے امیدواروں کو کامیاب کروائیں جو کہ غیر ملکی امداد پر مثبت ووٹ دیں۔"

گولڈر' Swig اور دوسرے PAC لیڈران براہِ راست AIPAC سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ انہیں تمام ووٹ جو ڈالے گئے اور بیانات جو سینیٹ اور ایوان نمائندگان میں دیے گئے اور مشرق وسطیٰ کے بارے میں ان امیدواروں کے رویے سے باخبر رکھا جاتا ہے جو کہ پہلی مرتبہ انتخابات میں حصہ لے رہے ہوتے ہیں۔ بعض مرتبہ AIPAC اپنے مال جمع کرنے کے عمل کو پوشیدہ نہیں رکھتی۔ مثلاً ۱۹۸۳ء میں ورجینیا میں ایک اسرائیل نواز PAC قائم کی گئی تھی جو کہ AIPAC کی ایک ورکشاپ کے دوران بنی۔

مالی امداد صرف امریکہ کی حدود تک محدود نہیں رہتی۔ امریکن یہودی جو اسرائیل میں مقیم ہیں ان سے امریکہ میں سیاسی امداد کی درخواست کی جاتی ہے۔ نیوٹن فرولک جو کہ پیشتر ازیں

واشنگٹن میں وکالت کرتا تھا لیکن ۸ سال سے اسرائیل منتقل ہو چکا تھا' یروشلم میں قائم کردہ PAC کا سربراہ ہے۔ جون ۱۹۸۴ء میں اس کی PAC نے تقریباً ۱۱۰۰۰ امریکن خاندانوں کو جو اسرائیل میں مقیم تھے بذریعہ ڈاک درخواستیں ارسال کیں۔ اس طرح وہ ۵۰۰۰۰ کے لگ بھگ ان امریکی شہریوں کو متاثر کر سکیں گے جو کہ وہاں رہ رہے تھے اور ان میں سے بیشتر اسرائیلی شہریت کے بھی حامل تھے۔ اس کی تنظیم اسرائیل میں امریکی PAC کہلاتی ہے' اس کے بیان کے مطابق اس کمیٹی کے ذریعے اسرائیل میں رہائش پذیر امریکی اپنا "حصہ رسدی لگاتار" امریکہ کے سیاسی عمل میں شامل کرتے رہتے ہیں۔ یہ چندہ صاف ظاہر ہے کہ مع سود واپس آجاتا ہے...... اسرائیل کو امریکی امداد کی صورت میں جو کہ دنیا کے کسی بھی اور ملک سے زیادہ ہے۔

اس لابی کا پیشرو جو کہ اب چندہ جمع کرنے میں ہمہ وقت مصروف ہے' اس کے ظاہری اطوار کے بارے میں مشوش ہے۔ AIPAC کے سابقہ ایگزیکٹو ڈائریکٹر J. Amitay Morris کا خیال ہے کہ چھوٹی چھوٹی مقامی PAC بہتر ہیں بہ نسبت بڑی قومی PAC کے جن سے یہ عندیہ مل سکتا ہو کہ یہودیوں کو بہت زیادہ سیاسی اثر و رسوخ حاصل ہو گیا ہے۔ وہ واشنگٹن کی ایک نسبتاً چھوٹی سی PAC کو چلاتا ہے جس نے ۱۹۸۲ء میں ۱۵۸ امیدواروں میں صرف ۸۹۰۷۵ ڈالر تقسیم کئے۔

زیادہ ہو یا تھوڑا' یہودیوں کے چندہ جمع کرنے کے اثر و رسوخ کو سبھی مانتے ہیں۔ اگست ۱۹۸۳ء میں "وال اسٹریٹ جرنل" نے لکھا:

"بیشتر بارسوخ کانگریس ممبران جن کی اکثریت اس بات پر تبصرہ کرنے سے گریزاں تھی' یہ کہتے ہیں کہ ان کے خیال میں یہودی PAC کے مال کا سیاسی اثر دوسری تمام لابیوں سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ اس کو بیحد چابک دستی سے خارجہ پالیسی کے صرف ایک مسئلہ پر مرکوز کر دیا جاتا ہے۔"

مرکوز یہ یقیناً ہوتا ہے۔ یہ اسرائیل نواز PAC صرف اور صرف وفاقی انتخابات پر توجہ مرکوز کرتی ہیں۔ سینیٹ اور کانگریس کے ان ارکان کے گرد گھیرا تنگ کرتی ہیں جو خارجہ پالیسی کی کلیدی آسامیوں پر تعینات ہونے والے ہوتے ہیں۔ PAC کے لیڈر مارک سیگل کا کہنا ہے کہ PAC اپنی توجہ سینیٹ پر مرکوز کرتی ہیں کیونکہ اصلی "محاذ جنگ" وہی ہے جہاں خارجہ معاملوں کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں انہوں نے سینیٹ کے انتخاب میں ۹۶۶۶۹۵ ڈالر کی سرمایہ کاری کی اور ۳۵۵۵۵۰ ڈالر کی سرمایہ کاری کلیدی ایوان نمائندگان کے مقابلوں میں کی۔

AIPAC کی راہنمائی سے PAC اپنے ہدف احتیاط سے چنتی ہیں۔ جب ۱۹۸۲ء میں Wisconsin کے یہودی سینیٹر Lynn Adelmar نے ڈیموکریٹ Clevent J. Zablocki کو ۳۰ سال میں پہلی بار انتخاب میں للکارا تو AIPAC نے تجویز کیا کہ مقابلہ پوری قوت سے نہ کیا جائے کیونکہ Zablocki گو منظور نظر نہ تھا لیکن راہ کا روڑہ بھی نہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ Adelmar کے جیتنے کے امکانات بہت کم تھے' لہٰذا اسے صرف ۹۳۵۰ ڈالر دیئے گئے۔ اس مقابلے کا شہرہ قومی سطح پر ہوا کیونکہ Zablocki خارجہ امور کی کمیٹی کا چیئرمین تھا اور اسرائیل کی تمام امداد کا اس واسطے سے جانا ضروری تھا۔ AIPAC نے دھیمے طور پر حمایت کے باوجود جو درخواست چندہ کے لئے بھیجی اس میں Adelmar کے جیتنے سے دو فائدے گنوائے گئے تھے۔ پہلا یہ کہ ایک اسرائیل نواز ممبر کانگریس میں ہوگا اور دوسرا یہ کہ اس کے جیتنے سے خارجہ امور کمیٹی کا نیا چیئرمین اسرائیل کا دوست ہوگا۔ یہ فلوریڈا کے Dante Fascell کی طرف اشارہ تھا جو کہ ایک اور ڈیموکریٹ Zablocki کے بعد اگلا چیئرمین بنتا۔ Zablocki اس انتخاب میں دو تہائی ووٹ لے کر جیت گیا۔

دریں اثناء Fascell (جو اس چندہ والی درخواست میں "ایک اور دوست" قرار دیا گیا تھا) کو اپنی اس انتخابی مہم میں اسرائیل نواز PAC کی زبردست حمایت حاصل تھی۔ فلوریڈا ڈسٹرکٹ (جس میں میامی کا کچھ حصہ بھی شامل تھا) میں 22 PACs نے کل ملاکر ۱۰۳۳۲۵ ڈالر دیئے۔ دوسرے امیدوار جن کو ۱۰۰۰۰ ڈالر سے زائد کی رقم ملی وہ یہ تھے Connecticut کا Sam Gejdenson 30175 ڈالر میری لینڈ کا Clarence Long 29250 ڈالر مسوری کا Ike Skelton 20000 ڈالر ٹیکساس کا Martin Frost 18300 ڈالر اور کیلیفورنیا کا Lantos Thomas 15500 ڈالر۔ زیادہ رقوم سینیٹ کے انتخابات میں جھونکی گئیں۔ ۱۸ سینیٹرز جو کہ ۱۹۸۲ء میں جیتے ان کو ۱۰۰۰۰ ڈالر سے زائد دیئے گئے۔ ۵ کو کانگریس ممبر Fascell سے زیادہ رقم ملی۔ پہلے دس یہ تھے:

(۱) George Mitchell D, Maine 77400

(۲) James Sasser D, Tennessee 58250

(۳) David Durenberger R, Minn. 56000

(۴) Robert Byrd D, W. Virginia 55500

(۵) Paul Sarbanes D, Maryland 48500

(۶) Chic Hecht R, BNevada 46500

(۷) Quentin Burdieh D, N. Dakota 44775

(۸) Lowell Weicker R, Connectieut 42075

(۹) Jeffrey Bingaman D, N. Mexico 36575

(۱۰) Howard Metzenbaum D, Ohio 35175

اس کے علاوہ مزید آٹھ کو بھی فی کس 10000 ڈالر سے زائد ملے۔

۱۹۸۴ء میں یکم جولائی تک اسرائیل نواز PAC 1.49 ملین ڈالر سینیٹ کے امیدواروں میں اور 684465 ڈالر ایوان نمائندگان میں تقسیم کر چکی تھیں۔ اس سال ریپبلکن سینیٹر چارلس پر سی کے حریف ڈیموکریٹ Paul Simons ۱۴۷۸۷۰ ڈالر حاصل کر کے اول نمبر پر رہا۔ دوسرے نمبر پر ۱۴۰۰۴۳ ڈالر لے کر مشی گن کا Carl Levin آیا۔ نارتھ کیرولینا کے جیمز لی بینٹ نے ۱۳۰۳۵۰ ڈالر' منی سوٹا کے Rudalph E. Baschwitz نے ۹۵۱۰۰ ڈالر' میامی کے جارج جے مچل نے ۷۷۴۰۰ ڈالر' Tennescore کے جیمز ساسر نے ۵۸۲۵۰ ڈالر اور وہیں کے البرٹ گور نے ۵۷۴۵۰ ڈالر' IOWA کے تھامس ہارکن نے ۵۷۲۵۰ ڈالر' منی سوٹا کے Durenburger David نے ۵۶۷۵۰ ڈالر' ویسٹ ورجینیا کے رابرٹ بائیرڈ نے ۵۵۵۰۰ ڈالر حاصل کئے۔ ان میں سے Boschwitz اور Durenburger کے ماسواء سب ڈیموکریٹ تھے۔ سولہ مزید سینیٹرز کو ۳۰۰۰۰ ڈالر فی کس سے زائد رقم ملی۔

ایوان نمائندگان کے ان ۱۷ ممبروں میں سے جن کو ۱۰۰۰۰ ڈالر یا زائد رقم ملی تھی۔ 11 ایسی پینل پر تھے جہاں خارجہ امداد کا انتظام ہوتا ہے۔ ان میں سے اکیلے انڈیانا کے Lee Hamiltion (مشرق وسطیٰ ذیلی کمیٹی کا صدر) کو ۱۴۰۰۰ ڈالر دیئے گئے جبکہ انڈیانا ریاست میں اسرائیل نواز PAC کا کل خرچہ ۱۴۵۰۰ ڈالر تھا۔ کچھ مزید بڑی رقوم پانے والے بھی ہیں۔ ان میں سے Siljander کے سوا سبھی ڈیموکریٹ ہیں۔

ان PACs کی ڈرامائی نشوونما جو کہ ۱۹۷۹ء کے بعد وقوع پذیر ہوئی' کے باوصف چندوں کا معتد بہ حصہ اب بھی اسرائیل نواز شدت پسند افراد سے براہ راست امیدواروں کو وصول ہوتا ہے۔

ڈیموکریٹ امیدواروں کا انحصار خاص طور پر یہودی ذرائع آمدنی پر ہوتا ہے۔ "Jews and

"American Politics کے مصنف Stephen Isaacs کو ایک غیر یہودی Strategist نے بتلایا کہ "اگر آپ ڈیموکریٹ ہیں تو قومی سیاست میں آپ یہودی سرمایہ کے بغیر کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔" ۱۹۶۸ء میں ان ۲۱ افراد میں سے جنہوں نے ایک لاکھ ڈالر یا زائد کا قرضہ صدارتی امیدوار ہیوبرٹ ہمفری کو دیا تھا' ۱۵ یہودی تھے۔ Isaacs کے بیان کے مطابق ڈیموکریٹک نیشنل کمیٹی کا نصف سے زائد سرمایہ یہودی ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔

۱۹۸۲ء میں Zablocki کی ناگہانی موت پر خارجہ امور کمیٹی کا صدر چنے جانے کے سال بھر پہلے Fascell نے کہا تھا:

"الیکشن مہم کے دوران چندوں کے خلاف شور و غوغا یہی اٹھتا ہے تاکہ ہم خرید لئے گئے ہیں؟ اگر آپ کو رقم درکار ہو تو کیا آپ کو یہ دشمنوں سے ملے گی؟ ہرگز نہیں' یہ آپ کو دوستوں ہی سے ملے گی۔"

ہمارا اپنا خارجہ پالیسی کا ایجنڈا

۱۹۸۲ء میں AIPAC کے مرکزی کردار میں عوامی تائید کو وسیع تر کرنا' کالج اور کرسچین کمیونٹی تک رسائی بڑھانا اور چھوٹی PAC کو اپنے ہنر میں مزید مہارت پیدا کرنے کے لئے مدد دینا تھا۔ ان تمام تر کوششوں کا مقصد سینیٹ میں اثر و رسوخ زیادہ کرنا تھا۔ AIPAC ہرگز ۱۹۸۱ء والی ناکامی جس میں سعودی عرب کو AWACS کی خریداری نہ رکوا سکنا شامل تھا' دوبارہ نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔

AIPAC کس طرح سینیٹ میں اپنے حمائتیوں کی تعداد بڑھاتی ہے اس کا ایک مظاہرہ مسوری کے نازک انتخابات میں دخل اندازی سے جھلکتا ہے۔ AIPAC نے ایک دوست کے ساتھ وضعداری نبھائی اور کامیاب رہی۔ J.C. Danforth جو کہ باقاعدہ Episcopal پادری تھا بطور ریپبلکن سینیٹر Re-election کے لئے کھڑا ہوا اور مقابلہ ایک یہودی ڈیموکریٹ Harriot Woods سے تھا۔ اس سخت مقابلے میں ڈین فورتھ نے یہ دیکھا کہ AIPAC اپنے ساتھ لگاتار ایفائے عہد کرنے والے امیدوار کی مدد کرتی ہے چاہے مقابلے میں ایک یہودی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ امداد بے حد قیمتی تھی کیونکہ وہ صرف "ایک فیصد" ووٹوں کی اکثریت سے جیتا۔

Maine میں بھی AIPAC کی حمایت نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور ڈیموکریٹ سینیٹر جارج مچل

نے اپنے ریپبلکن حریف کانگریس ممبر ڈیوڈ ایمری پر سبقت حاصل کی۔ "The Almanac of American Politics" نے مچل کے بارے میں لکھا کہ ڈیموکریٹ سینیٹر جس کے انتخاب مکرر کے امکانات ہر لحاظ سے معدوم جانے جاتے ہیں' اس نے کبھی بھی کوئی انتخاب نہیں جیتا تھا۔ ۱۹۷۴ء میں آزاد امیدوار کے ہاتھوں گورنر کے انتخابات میں شکست کھانے کے بعد اسے اس سینیٹ کی خالی سیٹ پر نامزد کیا گیا تھا جو کہ سینیٹر ایڈمنڈ مسکی کے صدر کارٹر کے اسپیشل اسسٹنٹ مقرر کئے جانے پر مستعفی ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔

AIPAC کی آشیرباد پر ۲۷ اسرائیل نواز PACs نے جو کہ سب کی سب Maine سے باہر کی تھیں۔ مچل کی مہم میں ۷۷۴۰۰ ڈالر کا چندہ دیا۔ اس امداد کے بل بوتے پر مچل نے جو کہ لبنان نژاد تھا' بڑی آسانی سے پیشہ ور سیاست دان کو غچہ دے کر مات دی۔ کامیابی کے بعد مچل نے AIPAC کے ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کو فون کر کے کہا "میں آپ کو فراموش نہ کروں گا۔"

ایک دوسری مثال منی سوٹا کے ریپبلکن سینیٹر David Durenberger کی ہے۔ ۱۹۸۲ء میں اس کے دوبارہ منتخب ہونے کے لئے ۲۰ اسرائیل نواز PACs نے اسے ۵۷۰۰۰ ڈالر بطور چندہ دیئے' جس میں وہ ۱۰۰۰۰ ڈالر بھی شامل تھے جو کیلیفورنیا کی منظم کردہ PAC نے دیئے تھے۔ اُس PAC نے ۵۰۰۰ ڈالر تو اس دن دیئے جب چار ماہ ہو گئے تھے مچل کے منفی ووٹ برائے Sale of AWACS to Saudi Arabia اور ۵۰۰۰ الیکشن والے دن سے پہلے دیئے۔ اس PAC کے ڈائریکٹروں میں Alan Rothenberg بھی شامل ہے جو کہ ڈیموکریٹ قومی چیئرمین Charles Manatt کا کاروباری ساتھی ہے۔

جہاں مقابلہ زیادہ کانٹے کے تول ہوتا ہے وہاں لابی والے دونوں اطراف کو امداد دیتے ہیں تاکہ جو بھی جیتے ممنون ہو۔ IDAHO کی ۱۹۸۰ء کے سینیٹ کے انتخابات میں جہاں اسرائیل نواز پرجوش کارکنوں نے اپنے پرانے مربی ڈیموکریٹ فرینک چرچ (جو کہ سینیٹ کی خارجہ امور کمیٹی کا چیئرمین تھا) کو چندہ دینے کے علاوہ اس کے حریف ریپبلکن کانگریس ممبر Steven D. Symms کو بھی امداد دی۔

اس دوہری امداد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سینیٹ میں سعودی عرب کو AWACS کی اگلے سال فروخت پر رائے شماری تھی۔ اس مہم کے دوران Symms اور Church دونوں کو اس کا

مخالف بتلایا گیا تھا اور چونکہ مقابلہ کانٹے کے تول تھا اس لئے لابی نے دونوں طرف بنائے رکھنے میں ہی بہتری جانی۔

Symms نے چرچ کو بہت ہی معمولی اکثریت سے مات دی لیکن اسرائیل نواز لابی کی یہ سرمایہ کاری کسی کام نہ آئی۔ جب AWACS پر رائے شماری کی نوبت آئی تو نئے سینیٹرز نے اپنی رائے تبدیل کر لی تھی۔ اس ایک ووٹ نے جو AWACS کی فروخت کے حق میں پڑا AIPAC کو ایک نایاب دھچکا لگایا۔

AIPAC نے اپنے نیوز لیٹر "Near East Report" میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ 98th کانگریس کا سینیٹ قدرے زیادہ اسرائیل نواز ہوگا' بطور شہادت یہ بتلایا گیا کہ پانچ نئے سینیٹرز میں سے دو یہودی ہوں گے۔ یعنی فرینک نیو جرسی کا ڈیموکریٹ اور Chic Hecht جو کہ NEVADA کا ریپبلکن تھا۔ ان دونوں کا اسرائیل کی طرف داری کرنے کا لمبا ریکارڈ تھا۔ نیو میکسیکو کے ڈیموکریٹ جیفری بنگامین کا انتخاب بھی ان کے حق میں گیا' کیونکہ AIPAC نے اس کے مخالف کو اس بناء پر امداد نہیں دی تھی کہ اس نے (یعنی Harris Schmitt نے) سعودی عرب کو AWACS فروخت کرنے کی حمایت کی تھی اور خارجہ امداد کی مخالفت کی تھی۔

PAC کے حمایتی امیدواروں کو چونکہ اس سے زیادہ رقم کی ضرورت ہوتی ہے جو یہ مہیا کر سکتی ہے لہٰذا AIPAC بھی براہ راست چندہ اکٹھا کرنے میں امداد مہیا کرتی ہے۔ یہ اپیل کافی سخت لب و لہجہ والی بھی ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ لٹریچر پیش کیا جا سکتا ہے جو کہ ۱۹۸۴ء میں Minnesota کے ریپبلکن سینیٹر Rudy Boschwitz کے حوالہ سے سپرد ڈاک کیا گیا۔ ساتھی ریپبلکن سینیٹر Lowell Weicker نے اس کا دیباچہ لکھا اور کہا کہ اسرائیل کا برے وقت کا ساتھی ہے۔ "اس نے اشارہ کیا کہ Boschwitz اس ذیلی کمیٹی کا چیئرمین تھا جو کہ "اس امداد کی سطح کا تعین کرتی ہے جو کہ ہمارا ملک اسرائیل کو دیتا ہے۔ اس نے ان کوششوں کی بھی تعریف کی جو وہ سعودی عرب کو فوجی ساز و سامان کی فروخت رکوانے کے لئے کرتا رہا تھا۔ اس اپیل میں سینیٹر Bob Packwood اور واشنگٹن میں "یروشلم پوسٹ" کے مراسلہ نگار کا خراج تحسین بھی شامل تھا۔

AIPAC نے کانگریس کو یہ باور کرا رکھا ہے کہ وہ ان تمام یہودیوں کی نمائندہ ہے جو ووٹ ڈالتے ہیں۔ کالم نگار Nat Hentoff نے جون ۱۹۸۳ء میں نیویارک کے جریدہ "Village Voice"

میں اس رائے کا پرچار کیا' جبکہ حقیقت یہ تھی کہ ۱۸ یہودی راہبوں کا وفد اس سے اختلاف کرتے ہوئے کیپٹل ہل کی خاک چھان رہا تھا تاکہ کانگریس کو قائل کر سکے کہ کچھ یہودی اسرائیل کی حکمت عملیوں کے خلاف بھی ہیں۔ ان راہبوں نے بتلایا کہ کئی ممبران کانگریس نے ان کو یقین دہانی کرائی کہ وہ ان کے نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہیں لیکن ڈر کے مارے اظہار عمل کی جرأت نہ تھی۔ Hentoff نے بحث سمیٹتے ہوئے کہا "صرف وہی یہودی حلقہ انتخاب (کانگریس) ان کے لئے حقیقت رکھتا ہے جو AIPAC یا دوسرے یہودی اہل کاروں کے نمائندے انہیں بتلاتے ہیں۔" OHAIO کا ایک کانگریس ممبران کے بارے میں خوف اور فکر کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

"کیپٹل ہل پر AIPAC سب سے مؤثر اور طاقتور لابی گروپ ہے۔ یہ لابی بیحد سنگدل ہے۔ وہ پوری طرح باخبر ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ ان کے پاس ایسے افراد ہیں جو مالی ذرائع کے مالک ہیں' وہ ان کے لئے بہت کچھ کر رہے ہیں۔ ان کے بنیادی مسئلہ کے ساتھ سب امریکیوں کو ہمدردی ہے' لیکن میرے لئے یہ سوہان روح ہے کہ امریکی پالیسی ساز AIPAC کے زیر اثر امریکہ اور اسرائیل کے قومی مفادات میں تفریق نہیں کر پا رہے۔ جب یہ دونوں ہم آہنگ ہوں تو کیا کہنے' لیکن یہ ہمیشہ تو ہم آہنگ نہیں رہ سکتے۔"

۱۹۸۲ء کے انتخابات کے بعد تھامس اے ڈائین نے AIPAC کی کامیابیوں کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ انہی کی وجہ سے امریکہ کے یہودی اپنا خاص خارجہ پالیسی ایجنڈا بنانے پر قادر ہیں۔

بعد ازاں جب وہ ۱۹۸۴ء کے انتخابی نتائج پر تبصرہ کر رہا تھا تو ڈائین نے اس کا سہرا یہودی ووٹوں نہیں بلکہ یہودی نوٹوں کے سر باندھا۔ ابتدائی رقوم' وسطی رقوم اور آخری رقوم۔ اس نے فخریہ ان تین سینیٹرز کو ہرانے کا سہرا اپنے سر باندھا جنھوں نے سعودی عرب کو AIPAC کی فروخت کے حق میں ووٹ دیئے تھے ان کے نام تھے: (۱) ILLINOIS کے ریپبلکن سینیٹر چارلس پرسی (۲) IOWA کے ریپبلکن سینیٹر Roger Jepson اور (۳) KENTUCKY کے ڈیموکریٹ سینیٹر Walter Huddleston۔ ڈائین نے کہا کہ یہ کامیابیاں اس صدی کے اواخر تک یہودی سیاسی قوت کی مظہر ہیں۔

باب دوئم

مدھم آوازوں کو بھی کلی طور پر خاموش کرنا

کیلیفورنیا کا نوعمر کانگریس ممبر اپنے ساتھیوں کی تقاریر دلچسپی سے سن رہا تھا۔ اس کی سنجیدگی اور زلفیں ایک سابقہ کانگریس ممبر جان ایف کینیڈی کی یاد تازہ کر رہی تھیں۔ گھنٹہ بھر سے زائد ہو چلا تھا کہ Paul N. "Pete" McClosky نے ۲۳ سے زائد ساتھیوں کو یکے بعد دیگرے تقریر کرنے دیا۔ ان سب نے تعاون کیا اور اسپیکر "Tip" O Neill سے بحث کے لئے وقت مانگا لیکن درحقیقت یہ بحث ایک اور خار دار مسئلہ سے پہلو تہی کرنے کی ایک کوشش تھی نہ کہ قانون سازی کے لئے۔

جس مسئلہ کو McCloskey نے چنا تھا اس پر حقیقی بحث تو کبھی ہوئی ہی نہ تھی یعنی اسرائیل کو امداد۔ زیادہ تر کانگریس ممبرز ایسے ووٹ یا بیانات دینے سے گریز کرتے ہیں جن پر اسرائیل مخالف ہونے کا شبہ بھی کیا جاسکے، لیکن McCloskey ایسا نہ تھا۔ اس نے آزادی رائے اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ویتنام کی جنگ کی مخالفت اس وقت شروع کر دی جب امریکیوں کی اکثریت اس کے حق میں تھی۔ اس نے یونانی لابی کے دباؤ کو نظر انداز کرتے ہوئے ترکی کو امداد میں کٹوتی کے خلاف رائے دی۔ اس نے ہمیشہ شہری حقوق کے مسائل پر متنازعہ امور کی حمایت کی اور اب مشرق وسطیٰ کی پالیسی پر مروّجہ قدروں کو للکارا تھا۔ ہم دونوں کانگریس ممبران کے اس چھوٹے سے گروہ کے اراکین تھے جو اسرائیل پر سرعام نکتہ چینی سے گریزاں نہ تھے اور ہم دونوں کو کیپٹل ہل سے جلد ہی ویس نکالا ملنے والا تھا۔

۱۹۸۰ء کی اس جون کی سہ پہر کو میکلوسکی کو اس کے بیشتر ساتھیوں نے تقریر کرنے کا وقت دیا اور بحث میں حصہ لیا، کیونکہ یہی ایک طریقہ تھا اسرائیل کی امداد میں کٹوتی کی تحریک پر پیش کردہ ترمیم پر رائے شماری رکوانے کا۔ چند ایک ممبران اس کی ترمیم کے حق میں تھے لیکن اس پر ووٹنگ کی نوبت نہ آنے دینا چاہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اگر ووٹنگ ہو جاتی تو انہیں اسرائیل نواز لابی کے دباؤ کا

مقابلہ کرنا پڑتا اور میکلوسکی کی ترمیم کے خلاف ووٹ ڈالنا پڑتا جو کہ ان کے ضمیر کے خلاف ہوتا۔

اس ترمیم میں میکلوسکی نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اسرائیل کو دریائے اردن کے مغربی کنارے پر نئی یہودی بستیاں تعمیر کرنے سے روک دیا جائے جہاں اس نے بزور شمشیر قبضہ کر رکھا تھا۔ اسرائیل سے یہ منوانے کے لئے دباؤ ڈالنے کی خاطر اس نے اسرائیل کی امداد میں ۱۵۰ ملین ڈالر کٹوتی کی تحریک پیش کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسرائیل اتنی ہی رقم ان بستیوں کی تعمیر پر ہر سال خرچ کر رہا تھا۔ انجام کار ٹھوس حقیقتوں نے اسے اس تحریک پر رائے شمار کروانے سے باز رکھا۔

دوست اور دشمن ہر ایک نے مجھے تحریک پر زور دینے سے منع کیا۔ کچھ احباب نے یہ دلیل دی کہ اگر رائے شماری ہو بھی جاتی تو تحریک کو بری طرح سے شکست ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو اسرائیل کی حوصلہ افزائی ہوتی اور وہ کہتے "ہماری مخالفت میں کوئی بولا تو سہی' لیکن یہ دیکھ لو کہ اس کا حشر کیا ہوا۔" کانگریس کے اندر ہر یہودی ممبر نے مجھے ذاتی طور پر بتلایا کہ میں حق بجانب ہوں۔

جیمز جانسن جو کولوریڈو سے ریپبلکن ممبر تھا' ان چند ممبران میں شامل تھا جو میکلوسکی کی حمایت کر رہے تھے۔ اسے اس دباؤ کا اندازہ تھا جو دوسرے ممبران کانگریس اس پر ڈال رہے تھے۔ جانسن نے اعلان کیا کہ اس کے کئی ساتھی اسرائیل کی نئی بستیاں بنانے کے ذاتی طور پر تو مخالف تھے لیکن کہتے تھے کہ کانگریس میں یہ اہلیت نہیں کہ اسرائیل کے خلاف کچھ ایکشن لے سکے۔ اس نے کہا کہ میں یہ واضح کر دینا چاہوں گا کہ اس معزز ممبر کی تحریک ترمیم پر کانگریس صرف اس لئے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی کہ اس کا تعلق اسرائیلی قوم سے ہے۔

یہ کوئی پہلا موقع نہ تھا کہ سینئر ارکان کے دباؤ کے ماتحت ایک اسرائیل مخالف ترمیم کی تحریک کو ٹھکانے لگایا گیا اور میکلوسکی بھی پہلا ممبر نہ تھا جس نے اپنے ساتھیوں کا پاس کرتے ہوئے تحریک واپس لی۔ جب بھی اسرائیل کو امداد میں کٹوتی کرنے کی کوئی تجویز زیر بحث آتی ہے تو ایسے دباؤ خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ بہت سے ممبران اسرائیل کو اتنی زیادہ امداد پر ندامت رکھتے ہیں۔ تمام امریکی امداد کا ایک چوتھائی اسرائیلی ہڑپ کر جاتے ہیں اور انہیں اس بات پر پشیمانی بھی ہوتی ہے کہ ان کی اس حمایت کا ریکارڈ رکھا جا رہا ہے' لیکن اسرائیل کے حلیفوں کے ڈر کے مارے وہ اس کی مخالفت مول لیتے ہوئے اور بھی زیادہ پشیمانی محسوس کرتے ہیں۔ اس سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ کس حد تک یہ دباؤ حقیقی ہے اور کس حد تک مصنوعی۔ زیادہ تر ممبران کانگریس اس دباؤ کو حقیقی تصور کرتے

ہیں اور اس معاملے میں خطا کھانے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ اپنے سیاسی وجود کی بقاء پر متفکر وہ کہتے ہیں اسرائیلی لابی کی مخالفت مجھے درکار نہیں۔ کون یہ چاہے گا؟ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ اسرائیل کو امداد دینے کے سلسلے میں کسی تحریک پر میرے رائے شماری کے اصرار کو بھانپ کر میرا کوئی ساتھی سرگوشی کرتا" بھئی تمہاری رائے تو سب کو معلوم ہے' تم باقی ہم سب کا بھانڈا کیوں پھوڑتے ہو؟"

زیادہ تر کمیٹیوں کا کام اعلانیہ ہوتا ہے۔ مثلاً پورے ایوان کا' اور اسرائیلی امداد کا کوئی معاملہ بھی AIPAC کے کم از کم ایک نمائندے کی موجودگی کے بغیر زیر بحث نہیں آتا۔ اس کی شرکت سے اسرائیل کے خلاف کوئی بھی نکتہ چینی فوراً چیدہ چیدہ رائے دہندوں کو مہیا کر دی جاتی ہے۔ بیچارہ کانگریس ممبر اپنی کمیٹی کی کاروائی سے فارغ ہو کر اپنے دفتر پہنچتا ہے تو احتجاجی ٹیلیفون کالوں کی بھرمار شروع ہو جاتی ہے۔

AIPAC کے Lobbyist ایوان نمائندگان کے ضابطوں اور شخصیات جاننے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اسرائیل کے خلاف چاہے بند کمرے ہی میں بات کیوں نہ کی جائے ان کو فوراً پوری تفصیل پہنچ جاتی ہے۔ ان Lobbyist کو معلوم ہے کہ اگر اسرائیل کو امداد پر رائے شماری ہوئی تو بہت بھاری تعداد میں حمایت ہوگی۔ انتظامیہ کے Lobbyists بھی دنیا بھر کی خارجہ امداد منظور کروانے میں اس امداد پر تکیہ کرتے ہیں۔ یہ دونوں Lobbyist گروپ من تراحاجی بگو کے مصداق باہمی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے میکلوسکی جیسے کسی بھی ممبر کو ناؤ میں خاک نہیں اڑانے دیتے۔

صف شکنی

میکلوسکی کے لئے یہ مفاہمت ایک غیر معمولی تجربے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے اپنے تمام تر سیاسی کیریئر میں دباؤ کا مقابلہ کیا تھا۔ اس وقت بھی جب اس کے نکتہ چیں بے رحمانہ وار کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے قومی سطح پر شناخت اس وقت حاصل کی جب ۱۹۷۲ء میں اس نے ویتنام جنگ کی مخالفت کی اور اسی سال بطور صدارتی امیدوار بھی اس کا نام ڈرامائی طور پر سامنے آیا۔ اس کی منزل یہ تھی کہ عوامی مسائل پر کھل کر دوٹوک بحث مباحثہ کیا جائے خصوصاً جنگ کے بارے میں' اس کا خیال تھا کہ غلط فیصلے تبھی ہوتے ہیں جب اقلیت کی سنی ان سنی کر دی جائے یا باشعور لوگ خاموشی اختیار کر لیں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ نکسن انتظامیہ کئی اہم امور پر اخفاء راز سے کام لے رہی ہے۔

اس نے الزام لگایا کہ یہ انتظامیہ عوام کے خوف و نفرت کو کام میں لا رہی ہے۔ جب میکلوسکی نے صدارت کے لئے اپنی امیدواری کا اعلان کیا تو اس کے حامیوں نے اسے خودکشی سے تعبیر کیا۔ دوسری طرف اس کے مخالفوں نے جو کہ انتہائی دائیں بازو کے تھے بعینہ یہی الفاظ کہے۔ گو اُسے احساس تھا کہ یہ امیدواری اس کی کانگریس ممبری کے حق میں زہر ثابت ہوسکتی ہے لیکن اس نے پھر بھی جنگ جاری رکھنے کی مذمت کی اور کہا کہ دوسرے امریکن شہریوں کی طرح میں نے بھی صدر نکسن کے اس اعلان کا اعتبار کیا تھا کہ وہ جنگ ختم کرنے کا پلان رکھتا ہے۔ میکلوسکی کو اس پر بیحد دکھ تھا کہ امریکہ کے ہزاروں فوجی ہلاک ہو رہے ہیں اور امریکن ایئر فورس ویتنام لاؤس اور کمبوڈیا کے شہری ٹھکانوں پر خوفناک کلسٹر بم گرا کر حملے کر رہی تھی۔

میکلوسکی کو جنگی معاملات کا ذاتی تجربہ تھا۔ کوریا میں بطور میرین کے وہ اس وقت زخمی ہوا تھا جب وہ اپنی پلٹن کی قیادت کرتے ہوئے خندقوں میں ڈٹے ہوئے دشمن پر کئی کامیاب حملے کر چکا تھا۔ جنگ کوریا میں اسے نیوی کراس، سلور اسٹار اور دو عدد Purple Heart تمغے دیئے گئے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے جنگی تجربے نے اسے یہ احساس دلایا کہ زندہ رہنا خوش قسمتی کا کس قدر بھرپور احساس ہے۔ اسی بات نے اسے ایک دوسری قسم کے خندق میں مورچہ بند دشمنوں پر حملہ کرنے کا حوصلہ عطا کیا گو اس لڑائی میں بہادری دکھانے پر کوئی تمغہ نہ ملتا تھا۔

جنگ کے خلاف احتجاج کرنے پر میکلوسکی پر "سیاسی عمل کا دشمن" کا ٹھپہ لگا بلکہ کمیونسٹ نواز ہونے تک کا الزام لگایا گیا۔ ایک صحافی نے تو یہاں تک لکھا کہ کم از کم پچاس دائیں بازو کے ممبران ایوان کی رائے میں میکلوسکی نیا سرخ خطرہ ہے گو یہ الزام مضحکہ خیز تھا لیکن کیلیفورنیا کے پارٹی کے کرتا دھرتا سخت بے چین تھے۔ کیلیفورنیا جرنل کے مطابق نائب صدر جیرالڈ آر فورڈ کی ذاتی مداخلت اس کو ۱۹۷۴ء کے پرائمری انتخاب میں بچانے کے لئے درکار ہوئی۔ اسے ان مریضانہ رویوں کا کفارہ دینا پڑا۔ اسے دو مرتبہ Ways and Means Committee کی رکنیت کے لئے نظرانداز کیا گیا حالانکہ وہ سنیارٹی کی بناء پر استحقاق رکھتا تھا۔

۱۹۸۰ء کے ترمیمی بل برائے اسرائیلی امداد کو پیش کرنے تک وہ مشرق وسطیٰ کے قضیے میں الجھ چکا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں مشرق وسطیٰ کے ایک دورہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اسرائیلی پالیسیاں امریکہ کے بہترین مفاد میں نہیں تھیں۔ اسے اچنبھا تھا کہ مغربی کنارے پر نئی یہودی آبادیاں جنہیں

امریکی انتظامیہ خود بھی غیر قانونی قرار دے چکی تھی رکوانے میں واشنگٹن کیوں ناکام ہوچکا تھا؟ اور ساتھ ہی اسرائیل کے امریکی مہیا کردہ اسلحہ کے غیر قانونی استعمال کو کیوں نہ روک سکا؟ کانگریس ممبر کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ ایسا کیوں ہے؟

اس کا جواب چنداں مشکل نہ تھا۔ یہ بھی مشرق وسطیٰ کے تمام دوسرے مسائل کی طرح کانگریس یا وہائٹ ہاؤس دونوں کے لئے ایک "شجر ممنوعہ" کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس موضوع پر بحث کی پکار نے صحافتی بھڑوں کو چھتے کو چھیڑنے اور رائے دہندوں کی طرف سے ناراضگی بھرے خطوط آنے کے سلسلے کو جنم دیا۔ میکلوسکی کے لئے یہ حملے بہت طنزیہ تھے۔ وہ اپنے آپ کو اسرائیل اور اہل یہود دونوں کے مفاد کا حامی سمجھتا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں اس نے ایک کامیاب مہم کے بعد اسٹین فورڈ یونیورسٹی میں پہلی مرتبہ ان کی "Phi Delta Theta" انجمن میں یہودیوں کا داخلہ منظور کروایا تھا۔ اس نے سان فرانسسکو جیوش جرنل کے ایک نقاد Earl Raab کو یہ یاددہانی کروائی کہ ماضی میں اُس نے ہمیشہ اسرائیل کو دی جانے والی امریکی اقتصادی امداد کے حق میں ووٹ دیا ہے۔ میکلوسکی نے اسرائیل کے لابی کرنے کے حق کا بھی پرزور دفاع کیا کہ Lobbying امریکی سیاسی نظام کا ایک اہم اور پروقار حصہ ہے اور اسے ہونا بھی چاہئے۔ اس نے AIPAC کو واشنگٹن کی طاقتور ترین لابی قرار دیا اور اصرار کیا کہ اس میں کچھ کجروی یا دغابازی نہیں۔

ان سب کے باوجود میکلوسکی نے ایک چبھتا ہوا سوال اٹھایا تھا۔ کیا امریکہ کی اسرائیلی لابی اس قدر بااثر ہے؟ اس نے لاس انجلز ٹائمز میں ایک مضمون میں اس کا جواب مہیا کیا: "جی ہاں! اور یہی ایک روڑہ ہے مشرق وسطیٰ کے امن کی راہ میں۔" میکلوسکی نے اشارہ کیا مشرق وسطیٰ میں ایٹمی محاذ آرائی اور امریکہ و اسرائیل کے مفاد کے بنیادی تضادات کا۔ اس نے کہا کہ یہودی کانگریس کے ان تضادات کے باوجود اسرائیل کی ہمہ وقت امداد کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ ان کا یہی تقاضا بقول اس کے "جب یہ کانگریس کی دباؤ نہ سہہ سکنے کی کمزوری کے ہم رکاب ہوجائے تو صدر کو کسی نازک موقع پر اسرائیل/ فلسطینی مفاہمت حاصل کرنے کے سلسلے میں کسی لچکدار رویہ کو اختیار کرنے سے روک سکتا ہے۔" اس نے تفصیلی بحث مباحثے پر اصرار کیا:

"اگر امریکہ کو مشرق وسطیٰ میں قیام امن کے لئے کام کرنا ہے تو پھر اس لابی کی طاقت کو تسلیم کرنا ہوگا اور بذریعہ عام اور مناسب بحث اس کا توڑ بھی تلاش کرنا ہوگا۔ مجھے امید تھی کہ امریکہ کی

یہودی آبادی اب اس حد تک بالغ ہو چکی ہے کہ اس کی لابی کرنے کی کوششوں پر کھلے عام بحث ہو سکتی ہے بغیر Anti Semitism کا سرخ لیبل چسپاں کروائے۔ کسی لابی کی طاقت کو تسلیم کرنا اس پر نکتہ چینی تو نہیں۔"

میکلوسکی کا یہ مضمون ۱۹۸۲ء میں اس کی سینیٹ کی نشست کے لئے نامزدگی سے کچھ ہی پیشتر شائع ہوا تھا۔ یہ ایک غیر روایتی حملے کا آغاز تھا اور حسب توقع اس پر زیادہ تر نکتہ چینی ہی ہوئی۔ ان سب میں Redlands Daily Facts (Calif) کا تجزیہ ایک استثناء تھا جس نے لکھا کہ یہ ایک بہادرانہ لیکن پر خطر کام ہے۔ اس اخبار نے لکھا کہ میکلوسکی ایسے لوگوں کا امیدوار تھا جو یہ چاہتے ہیں کہ ان کا نمائندہ ان سے چند امور پر بیشک اختلاف کرے لیکن اس میں اپنی بہتر صوابدید پر ڈٹ جانے کی صلاحیت بھی ہو۔

دوسری جانب "سان فرانسسکو ایگزامینر" میں ان کے ایک کالم نگار پال گرین برگ نے میکلوسکی پر کیچڑ اچھالا لیکن اسی اخبار کے دوسرے کالم نگار Guy Wright نے میکلوسکی کا دفاع کیا اور کہا کہ گرین برگ نے میکلوسکی کی تقریر کا ایک بھی قابل اعتراض فقرہ سند میں پیش کئے بغیر ہرزہ سرائی کی ہے۔ اس نے مثالیں دے کر میکلوسکی کی برأت ثابت کی اور اس کے خلاف مہم کو "میکارتھی ازم" سے تشبیہ دی۔ ایسی مثالیں شاذ ہی ملیں گی۔ B'nai B'rith Messenger (یہودیوں کا اندرونی رسالہ) نے ایک مضمون میں لکھا کہ میکلوسکی نے لاس اینجلز ٹائمز کے مدیران کے ساتھ ایک میٹنگ میں یہ تجویز پیش کی کہ تمام یہودی ربیوں کو بطور غیر ملکی ایجنٹ رجسٹر کروانا چاہئے۔ یہ کہا گیا کہ یہ خبر بہت ہی "ثقہ ذرائع" سے حاصل ہوئی ہے اور یہ الزام قومی پیمانہ پر مشتہر کیا گیا۔ یہ ایک سفید جھوٹ تھا جسے ٹائمز کے ایڈیٹر Tony Day نے فوراً ہی میکلوسکی کی تردید کی حمایت کر کے ثابت کر دیا۔

Messenger نے مہینہ بھر کے بعد تردید مع معذرت شائع کی لیکن الزام کی اشاعت ہوتی رہی۔ یہ تردید اسرائیلی لابی کے واشنگٹن آفس تک کو بھی نہ ملی۔ عرصہ دو سال بعد بھی AIPAC کے قانون ساز ڈائریکٹر Douglas Bloomfield نے میکلوسکی کے بارے میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے یہ الزام پھر بطور حقیقت دہرایا۔ غالباً اسے بھی تردید اور معذرت کا علم نہیں تھا۔ اسی طرح کی جھوٹی اطلاعات نے ہی میکلوسکی کے بارے میں اسے بدگمان کر دیا ہوگا جو اس نے میکلوسکی کو بدمزاج اور یہودیوں سے انتہائی نفرت کرنے والا قرار دیا۔ اس نے کہا: میں اس کو Anti-semitic نہیں کہنا چاہتا۔

اسرائیل مخالف ہونا ایک سیاسی فیصلہ ہے اور Anti-semitic ہونا ایک بالکل ہی الگ چیز ہے۔ میرے خیال میں وہ اس حد کو پار نہیں کرتا۔ "Messenger" کی تردید کے باوجود اس کے خلاف نکتہ چینی میں کمی نہ آئی' اس پر الزام تراشی جاری رہی۔ ایک اور یہودی جریدے نے اس کی تصویر کے نیچے عنوان لگایا "گوئبلز کا وارث" "Heritage Southwest Jewish Press" نے ایک آرٹیکل میں اس کے لئے رکیک جملے مثلاً اوّل درجے کا کتیا کا پلہ' ناشائستہ پوزیشن' امریکی یہودیوں کے خلاف اور Crummy (چکنا سر موٹا)' "Sleazy" (بودا' بے بنیاد) جیسے الفاظ استعمال کئے۔

میکلوسکی کے لئے حریفانہ مخالفت کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن ان حملوں کی تندی اور تیزی نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ کسی بھی ربی یا یہودی جریدے نے اس کا دفاع نہ کیا۔ اگر کوئی دفاع میں بولا بھی تو ایتھریٹن۔ کیلیفورنیا کا ایک ممتاز تاجر Merwyn Morris جو ان چند یہودی افراد میں سے تھا جنہوں نے اس کی حمایت کی اور کہا کہ اگر میکلوسکی Anti Semitic ہے تو اتنا ہی جتنا وہ خود ہے۔ (مورس اور میکلوسکی دونوں یہودی ہیں۔ مترجم) لیکن اس کے باوجود مورس نے سینیٹ کے انتخاب کے وقت میکلوسکی مخالفت ہی کی۔

جوش ٹیل بوم جس نے کچھ عرصہ میکلوسکی کے اسٹاف کے طور پر کام کیا تھا اور جو Palo Alte کے ایک Rabbi کا بیٹا تھا اس بات پر مستعفی ہوگیا کہ اسے میکلوسکی کا رویہ اسرائیل کے بارے میں پسند نہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنے سابقہ آجر کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ "میکلوسکی Anti Semitic نہیں ہے لیکن اس کے الفاظ ان لوگوں کے لئے ہمت افزا ہوسکتے ہیں جو Anti Semitic ہیں۔"

میکلوسکی کے اسرائیل کے بارے میں نظریات نے اس کی مہم کے دوران چندہ اکٹھا کرنے کے کام میں پیچیدگی پیدا کردی۔ متوقع یہودی سرمایہ کے سوتے خشک ہوگئے۔ ایک سابقہ حلیف کروڑ پتی یہودی Loius E. Wolfson نے لکھا کہ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مجھے دوسرے امریکیوں کے ہمراہ تمہاری سینیٹ میں انتخابی کامیابی کو ناممکن بنانے کے لئے ہر ممکن اقدام کرنے پڑیں گے بلکہ اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ تم دوبارہ کسی بھی عہدہ پر فائز نہ ہوسکو۔

اس انتہائی دوڑ کے اوائل میں جبکہ اس کا مقابلہ نامزدگی کے لئے سینیٹر S.I.Hayakewa سے تھا تو اسے موہوم سی امید تھی' لیکن جب Hayakewa مقابلے سے دستبردار ہوگیا تو پھر میکلوسکی

کے امکانات معدوم ہو گئے کیونکہ مد مقابل San Diego کا ہر دلعزیز میئر Pate Wilson تھا۔ جب پرائمری انتخاب کی دوٹوں کی گنتی ہوئی تو میکلوسکی شمال میں تو جیت رہا تھا لیکن گنجان آباد جنوب میں ہار گیا۔ وہ مجموعی طور پر ولسن سے ۱۰ فیصد پیچھے رہا۔ یہ بھی ماہرین کے نزدیک اچنبھا تھا۔ وہ تو آخر وقت تک اس کو چار میں سے چوتھا یا تیسرا قرار دے رہے تھے۔ کانگریس مین بیری گولڈ واٹر جونیئر کی مایوس کن تیسری پوزیشن آئی' حالانکہ وہ شروع میں Favourite تھا اور رابرٹ ڈور مین چہارم رہا۔

آخری دن جب ووٹ شمار کیے گئے تو زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ اگر میکلوسکی یہودی تنازعہ کھڑا نہ کرتا تو شاید جیت جاتا۔ تینوں حریفوں کو یہودی مالی امداد حاصل تھی۔ واشنگٹن پوسٹ کے ایک تبصرہ نگار ڈپٹی ایڈیٹر Stephen S. Rosenfeld کے حتمی نتیجہ کے مطابق میکلوسکی کی شکست کی وجہ "یہودی سیاسی شراکت" تھی۔

اس لابی نے انتخابات ختم ہونے پر بھی وار کرنے بند نہ کئے اور نہ ہی میکلوسکی اظہار اختلاف سے باز آیا۔ ۲۲/اکتوبر ۱۹۸۲ء کو جب کہ چند روز پہلے بیروت میں سینکڑوں فلسطینیوں کو پناہ گزین کیمپوں میں تہہ تیغ کیا گیا تھا' میکلوسکی نے ایوان نمائندگان میں اسرائیل کو ۵۰ ملین ڈالر کی گرانٹ کی مخالفت میں تقریر کی۔ اس نے انتباہ کیا کہ یہ عمل اس چیز کی حوصلہ افزائی سمجھا جائے گا جو اسرائیل نے گذشتہ جمعرات کو مغربی بیروت میں دخل دے کر کیا جس کا براہ راست نتیجہ قتل عام تھا۔ یہ امداد اس احتجاج کے باوجود منظور کر دی گئی۔

97th کانگریس کے اختتامی اجلاس میں خاتمہ سے چند گھنٹے پہلے اور ۱۵ سال تک اس زرّیں ادارے کا رکن رہنے کے بعد میکلوسکی نے اپنے الوداعی خطبہ میں جارج واشنگٹن کے الوداعی خطبہ کے الفاظ دہرائے کہ کسی ایک قوم کا دوسری کسی قوم کے ساتھ جذباتی وابستگی رکھنا کئی طرح کی برائیوں کو جنم دینا ہے۔

میکلوسکی کو یہ نصیحت بے حد مناسب لگی اور اس نے کہا کہ پچھلے روز کانگریس نے جو عمل کیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسے اسرائیل سے جذباتی وابستگی ہے جو فی کس امداد اسرائیل کے لئے منظور کی گئی ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے جو کہ ہم اپنے ملک میں کئی نادار اور بے روزگار افراد کو دینا گوارا کرتے ہیں اور یہ سب کچھ اس کے باوجود کہ اسرائیل اب امریکہ کے دوست کا کردار ادا نہیں کر رہا۔

میکلوسکی کا حق آزادی تعلیم

سیاسی کیریئر کے اس طرح ختم ہوتے نظر آنے پر میکلوسکی نے سوچا کہ وہ اپنی پرانی قانونی فرم جو کہ اس نے Palo Alto میں ایک دیرینہ وکیل دوست جان ولسن کے ہمراہ قائم کی تھی' میں پھر شرکت کرلے گا' لیکن اسے جلد ہی پتہ چل گیا کہ دوسروں کے ارادے مختلف ہیں۔ فرم کے سب سے بڑے مؤکل Ken Oshman نے انتباہ کیا کہ اگر میکلوسکی نے اس کمپنی میں شرکت کی تو وہ اپنا بزنس کسی اور کو دیں گے۔ فرم کے سینئر حصہ داروں نے میکلوسکی پر واضح کیا کہ وہ اپنی آفر سے پیچھے نہ ہٹیں گے' لیکن اس مسئلہ سے اسے آگاہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ میکلوسکی نے Oshman کو خط لکھ کر اپنی مایوسی ظاہر کی تو جواب میں اس نے کہا کہ وہ میکلوسکی کے اسرائیل کے بارے میں نظریات سے اختلاف رکھتا ہے۔

میکلوسکی نے سان فرانسسکو کی ایک قانونی فرم Brobeck Phlegeer and Herrison میں بطور حصہ دار شمولیت کی لیکن یہ دباؤ اس کے پیچھے پیچھے وہاں بھی پہنچ گیا۔ برکلے کیلیفورنیا سے ایک فون کال موصول ہوئی۔ اس نے اپنا تعارف صرف یہ کروایا کہ وہ Wells Fargo Bank کا ایک بڑا حصہ دار ہے۔ اس نے کہا کہ بینک کے آیندہ عمومی جلسہ شراکت داران میں وہ یہ مطالبہ کرے گا کہ بینک اپنے قانونی بزنس کو کسی اور فرم کے پاس منتقل کردے۔ وجہ؟ کیونکہ یہ فرم اپنے حصہ داروں میں ایک "Known Anti Semetic" کو شامل کر رہی ہے جو کہ P.L.O. اور چیئرمین عرفات کا حامی ہے۔ میکلوسکی نے شراکت داروں کی اس دھمکی کو نظرانداز کردیا اور بینک نے بھی اپنا بزنس واپس نہ لیا۔ (مطلب صاف ظاہر ہے کہ کوئی جعلسازی سے دھوکہ دے رہا تھا۔۔۔ مترجم)

B'nai B'rith کی Anti Defamation League نے جاسوسی کا ایک ایسا جال بچھا رکھا تھا کہ میکلوسکی کو بطور ایک عام شہری کے بھی کہیں چین سے رہنے نہ دیا جائے۔ اس گروہ نے قومی سطح پر ایک یادداشت تقسیم کی جس میں اس کے خلاف الزامات اور اس کی تقریروں کے اقتباس تھے۔ مقصد یہ تھا کہ اس کو مقامی A.D.L. گروپ بطور گائیڈ لائین اختیار کریں اور جب بھی میکلوسکی عوامی سطح پر نظر آئے تو اس کے خلاف مخالفانہ کاروائی کی جائے۔

مصیبت نے اس کا پیچھا کیمپس پر بھی نہ چھوڑا۔ میکلوسکی نے اسٹینفورڈ یونیورسٹی کی طلباء گورننگ کونسل کی دعوت قبول کرلی کہ وہ کانگریس کے بارے میں ایک کورس پڑھائے۔ اس کونسل

کے ممبر ہاورڈ گولڈ برگ نے جو کیمپس کے یہودی کلب Hillel Center کا ڈائریکٹر بھی تھا' یہ کہا کہ گروپ نے میکلوسکی کو مدعو کر کے یہودی کمیونٹی کے منہ پر طمانچہ رسید کیا ہے۔ طلباء کے اور لیڈر Seth Linfield نے اس سلسلے میں تیاری کو مؤخر کر دیا اور بعد ازاں یہ حق مانگا کہ وہ مہمان لیکچرر کا چناؤ کریں گے۔ میکلوسکی نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اس نوجوان ڈائریکٹر نے اسے پہلے یہ یقین دلایا تھا کہ وہ اپنے مہمان مقرر خود چنے گا۔

جوں جوں سیمیسٹر گزرتا گیا' مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا۔ مہمان مقررین کو بروقت ادائیگی نہ کی جاتی۔ میکلوسکی کو مجبوراً یہ اخراجات خود دینے پڑتے اور پھر وہ یہ اخراجات یونیورسٹی سے وصول کرتا۔ اس کی اپنی فیس بھی کم کر دی گئی۔ پہلے ۳۵۰۰ ڈالر کا وعدہ کیا گیا جو کہ Linfield نے بعد ازاں ۲۰۰۰ ڈالر کر دیئے اور اس کی ادائیگی بھی مشکوک بنا دی گئی۔ "San Jose Mercury News" میں بقول ایک تبصرہ کے یہ ۲۰۰۰ ڈالر بھی تبھی ادا کیے جائیں گے جب Linfield میکلوسکی کے کام سے مطمئن ہو۔ ایک طالب علم .Jeferey Au نے اسکول کے حکام کو شکایت لکھی کہ اس قضیہ سے علمی کام کا معیار کم تر ہو رہا ہے۔ اس کے جواب میں Prof. Hubert Marshall نے لکھا کہ طلباء کی یہ سرگرمیاں "اپنی نظیر نہیں رکھتیں اور اس سے مسٹر میکلوسکی کی تعلیمی آزادی مجروح ہو رہی تھی۔"

یہ ایک طرح کی الٹی Anti Semetism ہے۔ اس میں یہودی فرقہ گویا یہ کہہ رہا ہے کہ ہم اس شخص کو اسٹین فورڈ یونیورسٹی میں تدریس نہ کرنے دیں گے اور اگر یہ تدریس کرے گا تو ہم اس کو یہ مواد استعمال نہ کرنے دیں گے۔ سان فرانسسکو کرانیکل نے لکھا کہ میکلوسکی کی اس تقرری نے یونیورسٹی کیمپس کے باہر بھی قضیہ کھڑا کر دیا ہے۔ اس Bay Area کے سبھی یہودی لیڈران نے تشویش کا اظہار کیا۔ جب طلباء کونسل نے قلیل اکثریت سے میکلوسکی کی تقرری کا فیصلہ کیا۔

وسط مئی تک معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ یونیورسٹی کے Provost Albert H. Hostorf کو خط لکھ کر معذرت طلب کرنی پڑی۔ اس کا تمام امریکہ میں شہرہ ہوا۔ اس نے لکھا کہ مسٹر میکلوسکی کو اس چیز سے قدرے تلافی محسوس ہوگی کہ ان کے کیس کی وجہ سے یونیورسٹی کو اپنے ضابطوں پر نظر ثانی کرنی ہوگی کہ مستقبل میں مہمان پروفیسروں اور اساتذہ کو وہ خاص مدافعت مہیا کی جائے جس کے وہ مستحق ہوں۔ اس معذرت کے ساتھ ہی بقیہ رقم بھی منسلک تھی جس سے اس کا وظیفہ پھر ۳۵۰۰ ڈالر ہو گیا جیسا کہ پہلے وعدہ کیا گیا تھا۔

میکلوسکی نے The Peninsula Times - Tribune میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ اسٹین فورڈ کی معذرت کا کوئی جواز نہیں۔ اسے تو اس بات سے ہی تسکین مل چکی تھی کہ ۵۰ میں ماسواء ایک طالبعلم کے سب نے اس کی کلاس کو اعلیٰ ترین میں سے ایک کا درجہ دیا تھا۔ اس نے انتباہ کیا کہ دوسرے اسکولوں کو مشکلات پیش آسکتی ہیں کیونکہ AIPAC نے ملک گیر پیمانہ پر کالج طلباء کو اسی طرز پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کی تھی۔ اس کورس کے خاتمہ کے ساتھ میکلوسکی کی خارجہ پالیسی کے بارے میں سرگرمیاں ختم نہ ہوئیں۔

۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران اس نے وکالت کے ساتھ ساتھ امریکہ بھر میں عرب / اسرائیل تنازعہ پر تقاریر جاری رکھیں۔ متعدد اخباری مقالے شائع کیے اور کئی مرتبہ مشرق وسطیٰ اور یورپ کا دورہ کیا۔ ایک طرف اس نے اسرائیل کی پالیسیوں پر کڑی نکتہ چینی کی اور دوسری طرف اس نے P.L.O. سے بھی کہا کہ وہ اسرائیل کے زندہ رہنے کے حق کو تسلیم کرے بلکہ ایک موقع پر تو یہی اپیل کرنے وہ خود یورپ گیا۔ ۱۹۸۳ء میں اس نے جنیوا میں فلسطین کے مسئلہ پر بین الاقوامی کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ وہ فلسطین کے بارے میں سبھی یو این قرار دادوں پر صاد کرے۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس بات سے یہ گروپ نہ صرف فلسطینیوں کے حقوق کو تسلیم کرلے گا بلکہ اسرائیلیوں کے ۱۹۶۷ء سے پہلے چھینے گئے علاقوں پر ان کے رہنے کے حق کو بھی تسلیم کرلے گا۔ اس نے کچھ ترامیم پیش کیں جن سے یہ مسئلہ جماعتی مخالفت کی بجائے حق وانصاف کے طور پر اس کانفرنس کے اعلامیہ میں پیش ہوتا نظر آئے۔ اس سے اس کانفرنس کا اثر و نفوذ اس کے ممبران کے اثر و نفوذ سے بھی بڑھ جائے گا اور ان شکی و کمزور ذہنوں کا بھی جواب ہوگا جو کہ اس کا مقاطعہ کررہے تھے۔

میکلوسکی نے پرزور طور پر یہ اعلان کرنے کو کہا کہ اسرائیل کی بقاء کے ساتھ ساتھ فلسطینیوں کے لئے انصاف کی بھی ضمانت دی جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس طرح نہ صرف امریکی رائے عامہ تبدیل ہوسکتی ہے بلکہ امریکن کانگریس کا رویہ بھی۔ کانفرنس نے یہ تجویز رد کردی۔

ہم معذور ہوئے لیکن!

ایک جانب سفید فام ریپبلکن انتظامیہ کا نمائندہ میکلوسکی عالمی انسانی حقوق کی حمایت اور مزید

دخل اندازی در ویتنام جنگ کی مخالفت کر رہا تھا تو دوسری جانب ڈسٹرکٹ آف کولمبیا (یعنی واشنگٹن) کے ڈیموکریٹ حلقہ سے ایک سیاہ فام Baptist پادری جو کہ قومی Street Activist کے طور پر مشہور تھا' یہی کام سرانجام دے رہا تھا۔

یہ دونوں اصحاب کانگریس کے ممبران تھے' اچھے دوست بھی تھے اور دونوں نے امن کی خاطر لبنان کے متنازعہ فیہ دورے کئے۔ ان دونوں کو اس کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ پادری تو سیاسی وجود قائم رکھ سکا لیکن سابقہ میرین اپنی بقاء قائم نہ رکھ سکا۔ یہ پادری Rev. Waltor F. Fauntroy تھا۔ ان دونوں کے لئے مشرق وسطیٰ کے منصفانہ حل پر اصرار تباہ کن ثابت ہوا جبکہ قومی شہری حقوق پر احتجاج اور ویتنام کی جنگ کی مخالفت اس قدر تباہ کن نہ تھی۔

Fauntroy کے مسائل زیادہ تر ایک دوسرے سیاہ فام لیڈر کے مشرق وسطیٰ کے منصفانہ حل کی اصرار کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ Andrew Young کو Andrew کو بطور سفیر برائے اقوام متحدہ کے عہدہ سے جبراً استعفیٰ دینا پڑا تھا۔ وجہ یہ کہ اس نے P.L.O. کے مبصر Zuhdi Labib Terzi سے ملاقات کی تھی۔ سیاہ فاموں کی اکثریت نے اس جبری استعفیٰ پر انتہائی غصے کا اظہار کیا کہ یہ اسرائیلی دباؤ کے تحت کروایا گیا۔ اینڈریو ینگ کا بھی یہی کہنا تھا۔ بقول اس کے امریکہ کی ایسی حکمت عملی جو اپنے نمائندہ کو کسی P.L.O. عہدہ دار سے غیر رسمی بات چیت سے بھی منع کرے وہ حکمت پر مبنی کیسے ہو سکتی ہے؟

امریکی سیاہ فاموں اور یہودیوں میں تعلقات پہلے ہی کشیدہ ہو چکے تھے' حالانکہ یہ دونوں فریق ماضی میں شہری حقوق کے معاملے میں ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ مزید وجہ سیاہ فاموں کا ملازمت میں کوٹہ اور اسرائیل کے جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت سے قریبی روابط تھے۔ کارٹر انتظامیہ کے ممتاز ترین سیاہ فام رکن یعنی اینڈریو ینگ کے استعفیٰ نے اس کو مزید گمبھیر کر دیا۔ اس استعفیٰ کے فوراً بعد عزت مآب جیسی جیکسن نے کہا کہ میرے خیال میں سیاہ فاموں اور یہودیوں کے مابین تعلقات میں یہ مشکل ترین وقت تھا۔

۱۹۶۰ء کی شہری حقوق کی تحریک میں Fauntroy نے اینڈریو ینگ کے ہمراہ Southern Christian Leadership Conf. (SCLC) اور مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کی سربراہی میں کام کیا تھا' ان کو Brooks Brothers کا نام پیار سے دیا گیا تھا کیونکہ یہ دونوں ہمیشہ ہر مارچ میں سوٹ بمع

نکٹائی زیب تن کئے ہوتے تھے جبکہ زیادہ تر مظاہرین نے عام لباس پہنا ہوتا تھا۔

خزاں ۱۹۷۹ء میں Fauntroy اور SCLC کے صدر جوزف لووری نے نیویارک جا کر Terzi سے ملاقات کی۔ مقصد انڈریو ینگ کے ساتھ یکجہتی کا اظہار اور امریکی پالیسی کی مخالفت تھا۔ فون ٹرائے کا کہنا تھا کہ وہ عربوں اور اسرائیل کے درمیان رابطہ قائم کر کے مشرق وسطیٰ کے مسائل کے پرامن حل کو فروغ دینا چاہتا تھا۔ بقول اس کے نہ ہی اینڈریو ینگ نہ میں اور نہ ہی SCLC کا کوئی بھی ممبر بین الاقوامی میدان میں مارٹن لوتھر کنگ کی پالیسیوں پر شرمسار ہے۔

Terzi تو اس ملاقات سے بہت خوش اور ممنون ہوا کہ سیاہ فام لیڈروں کی اس ملاقات سے امریکی عوام کو بہت کچھ پتہ چلے گا لیکن دوسری جانب واشنگٹن کی ممتاز ترین شخصیت بیحد جز بز ہوئیں۔ Rabi Stanley Rabinowitz نے شکایت کرتے ہوئے کہا کہ میرے خیال میں کسی بھی ذمہ دار ممبر کانگریس کو دہشت گردوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہئے۔ یہودیوں کی اکثریت نے Rabi کا ساتھ دیا لیکن کچھ اقلیت فون ٹرائے کی حامی تھی۔ ایک ممتاز یہودی تاجر Joseph B. Danzasky نے کہا کہ فون ٹرائے کو اپنی دانست کے مطابق جو وہ مناسب سمجھے کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ فون ٹرائے پر یہ اعتماد رکھتا ہے کہ وہ یہودی مخالف خیالات کا حامل نہیں کیونکہ وہ ایک اچھا انسان ہے۔

نقادوں کا منہ بند کرنے اور اپنی انصاف پسندی ثابت کرنے کے لئے - Lowery Fauntroy اور SCLC لیڈران نے یو این میں اسرائیلی سفیر Blum Yehuda اور امریکی یہودی لیڈروں سے ملاقات کی۔ بعد ازاں فون ٹرائے نے نامہ نگاروں کو بتلایا کہ سیاہ فام لیڈروں نے طرفین یعنی مشرق وسطیٰ کے جھگڑے کے دنوں فریقین سے کہا کہ وہ ایک دوسرے کے انسانی حقوق تسلیم کریں اور حق خود ارادیت بھی، لیکن اسرائیل نواز حلقے اس کو بالکل دوسرے رنگ میں دیکھ رہے تھے۔ امریکن جیوش کمیٹی کے صدر Howard Squadron نے میٹنگ سے نکل کر کہا کہ SCLC کے لیڈروں کی Terzi سے ملاقات نے ایک ایسی تنظیم کو عزت بخش دی تھی جو کہ دہشت گردی اور تشدد پر کاربند تھی اور یہ ایک فاش غلطی ہے۔

اسی تناؤ کے تناظر میں امریکہ کے طول و عرض سے سیاہ فام لیڈروں نے نیویارک میں ینگ کے استعفیٰ پر اظہار تشویش کے لئے ایک جلسہ کیا۔ وہ اپنا یہ حق جتلا رہے تھے کہ وہ خارجہ پالیسی پر

اپنی رائے کا برملا اظہار کر سکتے ہیں۔ کچھ نے کہا کہ وہ خارجہ پالیسی کے معاملہ میں اپنا اعلان آزادی جاری کر رہے ہیں جبکہ فون ٹرائے نے رائے دی:

''سیاہ فام شہریوں نے اس ملک کے قائم ہونے کے بعد جو بھی جنگ ہوئی اس میں حصہ لیا اور اپنے ملک کے لئے جان کی قربانی دی۔ بنکر ہل سے لے کر ویتنام تک ان کا خون بہا۔ اب اگر مشرق وسطیٰ میں کوئی جنگ چھڑتی ہے تو ایک بار پھر سیاہ فام امریکیوں کو جان قربان کرنے کو کہا جائے گا۔'' اس کے الفاظ جلد ہی الہامی ثابت ہوگئے جب جنوبی لبنان میں سیاہ فاموں کو قربانی دینی پڑی' باوجود اس کے کہ امریکہ کی کل آبادی کا صرف دس فیصد سیاہ فاموں پر مشتمل ہے۔ بیروت کے ٹرک بم والے دہشت گردی کے واقعہ میں بیس فیصد سیاہ فام ہلاک ہوئے۔ یعنی ۲۴۶ میں سے ۴۷ سیاہ فام تھے۔

سیاہ فام لیڈر ایک جانب تو جز بز ہوتے تھے اس تنقید پر جو فلسطین کے مسئلہ پر کی جاتی تھی اور دوسری جانب انہیں یہ بھی تشویش لاحق تھی کہ اس کا اثر امریکہ میں شہری حقوق کی پیش رفت پر کیسا ہوگا امریکہ کے یہودی اس مد میں ہمیشہ دامے درمے مدد کرتے آئے تھے۔ National Association for the Advancement of Colored People کے چار پہلے اصلی منتظمین میں سے تین یہودی تھے۔ ''واشنگٹن پوسٹ'' نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ کئی سیاہ فام لیڈروں نے اپنے جلسوں میں ''حق خود ارادیت پر متحدہ محاذ رکھنے پر زور دیا' لیکن بیک وقت اس بات کا بھی اقرار کیا کہ بعض سیاہ فام تنظیمیں جو یہودی سخاوت پر زیادہ انحصار کرتی ہیں وہ متاثر ہوں گی۔'' اس تشویش کی جلد ہی تصدیق ہوگئی جب کئی یہودی چندہ دینے والوں نے NAACP اور Urban League کو مطلع کیا کہ وہ ہاتھ کھینچ رہے ہیں۔

فون ٹرائے کا کہنا تھا کہ ہم اس سے معذور تو نہ ہوئے البتہ ہمیں زیادہ محتاط اور سمجھدار بننا پڑا تاکہ انصاف کے حصول اور عدم تشدد کے اصولوں کو کسی نہ کسی طرح سیاست سے بالا رکھا جائے۔ اس بات کا اس کی ذاتی انتخابی چندہ مہم پر بھی مضر اثر پڑا۔ صاف ظاہر ہے کہ کئی پرانے حمایتیوں نے مجھے بتلایا کہ وہ میری امیدواری کی مہم میں میرے رویہ کی وجہ سے چندہ نہیں دیں گے۔

فون ٹرائے نے اپنی مستقل مزاجی تین ہفتے بعد اس طرح ظاہر کی کہ وہ Lowery کے ہمراہ مشرق وسطیٰ کے ایک متنازعہ دورہ پر روانہ ہوگیا۔ روانگی کے وقت Lowery نے اعلان کیا کہ وہ امن

وعدم تشدد اور انسانی حقوق کے اخلاقی اصولوں کے پرچار پر کاربند رہے گا۔

یاسر عرفات کے ساتھ ایک ملاقات میں انہوں نے تشدد کے خاتمے کی اپیل کی اور .P.L.O لیڈر سے چھ ماہ کے لئے تشدد کے التوا پر اتفاق کرنے کے لئے کہا۔ عرفات نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی مجلس عاملہ کے سامنے یہ تجویز رکھے گا۔

فون ٹرائے اس ڈرامائی لمحے کی یاددہانی کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے یونائیٹڈ میتھوڈسٹ چرچ کے Dr. Harry Gibson سے دعا کرنے کو کہا' پھر ایک رومن کیتھولک پادری نے عربی میں دعا کی۔ ہم اشکبار تھے' دعا کے اختتام پر کسی نے ...... جانے کون؟ ......"We shall overcome" گانا شروع کر دیا اور عرفات نے فوراً اپنے بازو بلند کئے اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈال دیئے۔

امریکہ میں انہی یہودیوں نے جو کہ سیاہ فاموں کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر یہ گانا گاتے تھے' شہری حقوق کی تحریک کے دنوں میں اب اس چیز پر ناک بھوں چڑھایا کہ تصاویر میں فون ٹرائے عرفات سے کیوں بغلگیر ہے؟ کچھ نے یہ ڈر ظاہر کیا کہ یہ .P.L.O کے ساتھ سیاہ فاموں کا نیا اتحاد ہے جس سے سیاہ فاموں نے یہودی سیاسی امداد کو دغا دیا ہے۔ انہوں نے سیاہ فام لیڈروں کا یہ دعویٰ مسترد کر دیا کہ وہ امن کے غیر جانبدار پیامبر تھے۔

یہ قضیہ اس وقت اور گمبھیر ہو گیا جب مشرق وسطیٰ سے واپسی پر فون ٹرائے نے یہ اعلان کیا کہ اس نے یاسر عرفات کو امریکہ آکر تعلیمی سطح پر تقاریر کرنے کی دعوت دی ہے اور یہ کہ SCLC اس کا بندوبست کرے گی۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہو گی جس میں دونوں طرف کے نکتہ ہائے نظر کو موقع دیا جائے گا۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ امریکن عوام کو دونوں اطراف کا نکتہ نظر سننے اور امریکن حکومت کو متاثر کرنے کا موقع ملے گا۔ حسب امید اس اعلان نے تنقید کا طوفان کھڑا کر دیا۔ Washington Hebrew Congregation نے اعلان کیا کہ عرفات کی آمد جلتی پر تیل کا کام کرے گی۔

New Bethel Baptist Church میں ایک نیوز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فون ٹرائے نے اپنا امن مشن بیان کیا اور کہا کہ وہ اپنی کوششیں جاری رکھے گا۔ میں اول و آخر ایک آسمانی صحیفے کا مبلغ ہوں جو اسی منبر سے ہر روز یہی تبلیغ کرتا ہے کہ خداوند ہمارا باپ ہے اور سب انسان بھائی بھائی ہیں۔ میں اگر موقع ملنے پر اس پر عمل کرنے سے گریز کروں تو یہ میرے ارفع عہدے کی

توہین ہے۔ اس نے اپنے معترضین کو چیلنج کرتے ہوئے کہا "جو بھی میرے خلاف انتخاب لڑنا چاہتا ہے لڑے۔ جو بھی میری حمایت نہیں کرنا چاہتا وہ نہ کرے، مجھے ذرہ بھر پرواہ نہیں۔"

Fauntroy اس وقت بھی ٹس سے مس نہ ہوا جبکہ ایک دوسرا موضوع جس کے بارے میں اس کی رائے اچھی تھی خطرے میں نظر آیا۔ میرا مطلب واشنگٹن (D.C.) کے باسیوں کو کانگریس میں پوری نمائندگی دینا۔ یہ معاملہ دستور میں ترمیم کرنے کے لئے مختلف ریاستی قانون ساز اداروں کے روبرو پیش تھا۔ فون ٹرائے کے نقادوں کا کہنا تھا کہ اس کی امن سازی کی کوششوں سے اس ترمیم کا پاس ہونا کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ فون ٹرائے نے جواباً کہا کہ وہ ان تنگ نظر لوگوں سے متاثر نہیں ہوگا جو واشنگٹن .D.C کے باسیوں کے لئے تو حق خود اختیاری چاہتے ہیں لیکن ایسے ہی دوسرے لوگوں کے بارے میں نہیں حالانکہ وہ بھی خداوند کے فرزند ہیں۔

فون ٹرائے کے عزم کی آزمائش کا موقع ریاست Maryland کی اسمبلی میں اس مسئلہ پر بحث کے دوران آگیا۔ اس مسئلہ پر رائے شماری کی نوبت آنے سے پہلے دو یہودی ممبران اسمبلی Steve Sklar اور David Shapiro نے فون ٹرائے کو یہ نوٹس دیا کہ اگر اس نے .P.L.O کی مذمت نہ کی تو وہ اس ترمیم کو نامنظور کروادیں گے۔ سال گذشتہ ان دونوں نے اس ترمیم کے حق میں ووٹ دیا تھا لیکن اب وہ کہہ رہے تھے کہ وہ نہ صرف خود مخالفت کریں گے بلکہ دوسروں کو بھی قائل کر کے ساتھ لے لیں گے، حالانکہ دونوں مسائل آپس میں کچھ ربط نہ رکھتے تھے۔ فونٹرائے نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا لیکن اس کی خبر کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔ واشنگٹن پوسٹ کے ایک اداریے میں جس کا عنوان ".D.C ترمیم کے لئے ناک رگڑنا" تھا یہ کہا گیا کہ فونٹرائے نے مطلوبہ بیان دینے پر رضامندی ظاہر کی تھی اور اب مکر جانے پر اس کے لینے کے دینے پڑ گئے۔ "میری لینڈ کے مٹھی بھر ممبران اسمبلی والٹر فونٹرائے کو اپنی انگلیوں پر نچا رہے ہیں۔"

فونٹرائے نے جوابی بیان میں Post کی اس کتھا کو سو فیصد من گھڑت قرار دیا۔ یہ ترمیم بعد ازاں صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے منظور تو ہو گئی لیکن Sklar اور Shapiro کی حمایت کے بغیر ہی۔ وسط اکتوبر تک فونٹرائے کے مشرق وسطیٰ کے مسائل نئی جہت اختیار کر چکے تھے۔ نیشنل اربن لیگ کے صدر Vernon Jordan نے ایک تقریر کے دوران سیاہ فام لیڈروں اور .P.L.O کے درمیان رابطوں کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ امریکی سیاہ فاموں کی توجہ امریکہ کے اندر درپیش سنگین

مسائل سے ہٹانے کی ایک کوشش تھی۔ بہت سے سیاہ فام لیڈروں نے Jordan کی حمایت کی۔ Rustin نے اسرائیل کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کرنے کے لئے اسرائیل روانگی کے موقع پر کہا کہ سیاہ فاموں کی ایک بہت بڑی تعداد یہ چاہتی ہے کہ امریکہ اسرائیل کو ہر ممکن ضروری امداد دے۔

کئی دوسرے سیاہ فاموں نے Jordan کی مخالفت کی اور الزام لگایا کہ وہ یہودی اسرائیلی لابی کے ہاتھوں بک چکے تھے۔ Rev. George Lawrence of Progressive National Baptist Convention کے بقول "ایسی کوئی بھی شہری حقوق کی تنظیم جسے یہ فکر ہو کہ اگر وہ کوئی Stand لیں گے تو ان کی مالی امداد ختم کر دی جائے گی۔ وہ شہری حقوق کی تنظیم کہلوانے کی حقدار نہیں۔" "ہمیں یہ معلوم ہے کہ Vernon کا مسئلہ کیا ہے' وہ اپنی روزی پر لات نہیں مروانا چاہتا۔ ہم بھی اسرائیل کے زندہ رہنے کے حق کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی فلسطینیوں کے لئے انصاف بھی چاہتے ہیں۔"

سیاہ فام لیڈروں کے اس تبادلہ خیالات سے پیشتر ہی فونٹرائے اپنی دعوت (یاسر عرفات کو امریکہ آنے کے لئے واپس لے چکا تھا۔ وجہ یہ دی کہ اس نے .P.L.O کی طرف سے تشدد پر التوا کا اظہار نہ کیا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی امن کوششوں کو جاری رکھنے کا اعلان کیا اور کہا کہ ہمارے خیال میں .P.L.O سے یہ کہنا کہ وہ اسرائیل کے مردوں' عورتوں اور بچوں کے خلاف تشدد بند کر دے اور اسرائیل کے زندہ رہنے کے حق کو تسلیم کرے۔ اس کے مترادف ہے کہ ہم تشدد کی حمایت اور اسرائیل کی تباہی چاہتے ہیں' یہ ایک انتہائی احمقانہ بات ہے۔ فونٹرائے نے مزید کہا کہ ہم اسرائیل کی امداد میں صرف دس فیصد کمی چاہتے ہیں تاکہ ان کا یہ پیغام پہنچے کہ امریکی مہیا کردہ ہتھیاروں کو غیر فوجی نشانوں پر استعمال نہیں کرنا۔

فونٹرائے کو ڈسٹرکٹ آف کولمبیا میں ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا لیکن اس کے مشرق وسطیٰ پر اس Stand نے ۱۹۸۲ء میں اس کے سینیٹ کی سیٹ پر مکرر انتخاب کے سلسلے میں کچھ رخنہ پیدا کیا۔ Marie Bembery نے اعلان کیا کہ وہ اس بات پر احتجاج کرنا چاہتی تھی کہ فونٹرائے نے یاسر عرفات کے ساتھ گلے لگ کر "We shall overcome" گایا تھا۔ اسے ڈسٹرکٹ آف کولمبیا کے مسائل کو اولیت دینی چاہئے۔

ایک ماہ بعد لبنان پر اسرائیلی حملہ کے دوران اس نے دوبارہ یہ مسئلہ اٹھایا۔ یہ واشنگٹن عبرانی

مجلس کے امیدواروں کے فورم پر اٹھایا گیا۔ محترمہ نے فونٹرائے کو جھانسہ دینے کے لئے کہا فونٹرائے کی بے حسی اور یہودی فرقہ کے مسائل کی بے تکی نمائندگی کے بعد اسے اس فورم پر آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ اس پر مجھے سخت حیرت اور صدمہ ہے۔ شام کے اجلاس میں اس نے پھر کہا کہ اگر واشنگٹن ڈی سی کا نمائندہ یہودی ہونے کے باوجود (Ku Klu Klan (KKK کے ماسٹر ڈریگن کو گلے لگاتا ہے تو پھر اسے واپس .D.C میں آکر یہ کہنے کا ہرگز کوئی حق نہیں کہ وہ بطور سیاہ فام میرا نمائندہ اور اس ضلع کا ووٹر ہے۔

فونٹرائے نے بعد میں اسی فورم پر تقریر کرتے ہوئے اس غصہ بھرے مجمع کو کہا کہ میں اسرائیل کا حمایتی ہوں اور اس کے زندہ رہنے کے حق کی حمایت کرتا ہوں' لیکن میں دوسری مخلوق خدا یعنی فلسطینیوں کے حقوق کا بھی اتنا ہی پاس کرتا ہوں۔ میں فلسطینیوں کے لئے وطن حاصل کرنے کے حق کو بھی جائز سمجھتا رہوں گا۔

دونوں امیدواروں نے لبنان پر اسرائیلی حملہ کے جواب میں لگی لپٹی رکھے بغیر جواب دیئے۔ فونٹرائے نے کہا "نہیں" لیکن جب Bembery نے جواباً "ہاں" کہا تو حاضرین نے کھڑے ہو کر پرجوش تالیوں سے استقبال کیا۔ حریف امیدوار کو اس پرائمری انتخاب میں سخت منہ کی کھانی پڑی اور فونٹرائے ۸۵ فیصد ووٹ لے کر کامیاب ہوا۔ اس بھاری ڈیموکریٹ اکثریت والے ضلع میں فونٹرائے نومبر کے عام انتخابات میں بلامقابلہ کامیاب ہوا۔

۱۹۸۳ء کے موسم گرما میں فونٹرائے کو پھر سیاہ فام بمقابلہ یہودی چپقلش کا سامنا ہوا۔ مارٹن لوتھر کنگ کے واشنگٹن پر مارچ کرنے کی بیسویں سالگرہ کے موقع پر اس نے یہودیوں کی حمایت حاصل کرنی چاہی۔ وہ اس پر بھی راضی ہوگیا کہ جو پیپر وہ خارجہ پالیسی پر پیش کر رہا تھا اس میں سے وہ الفاظ یا تراکیب حذف کر دے گا جن پر یہودی لیڈران کو اعتراض تھا۔ اس کے فائنل مسودہ میں سے یہ فقرہ نکال دیا گیا کہ مشرق وسطیٰ میں امریکن پالیسی کو عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہے اور فلسطینیوں کے حق میں لفظ بھی قلمزد کر دیا گیا اور یہ بھی نکال دیا گیا کہ امریکہ اور اسرائیل دونوں براہِ راست .P.L.O سے مذاکرات کریں۔ ان تمام رعائتوں کے قطع نظر بیشتر یہودی قومی گروپوں نے تعاون کرنے سے گریز کیا۔

فونٹرائے کا کہنا تھا کہ مشرق وسطیٰ اور واشنگٹن ڈی سی کے عوام کے لئے حق خود اختیاری

حاصل کرنے کی کوششوں نے جو مسائل کھڑے کئے وہ اس کے لئے آنکھیں کھول دینے کو کافی تھے اور یہ کہ وہ ان دونوں محاذوں پر جدو جہد جاری رکھے گا۔

۱۳ منٹ میں ۳ ٹیلی فون کالیں

میکلوسکی اور فونٹرائے کے علاوہ شاید ہی کسی اور ممبر نے ان حالیہ برسوں میں ایوان نمائندگان میں اسرائیلی پالیسی پر نکتہ چینی کی ہو' ایسا اسی لئے ممکن ہوا کہ جو لابی کیپٹل ہل پر اسرائیل مخالف باتوں کا (خصوصاً معاملات خارجہ کی ہاؤس کمیٹی میں) بے حد چوکسی اور ہنر سے خیال رکھتی ہے وہ اس کی پیش بندی کرتی ہے۔ ۱۹۸۱ء میں ایک نوجوان کو جو کہ مرحوم کانگریس ممبر Benjamin S. Rosenthal (نیویارک) کے دفتر میں کام کرتا تھا' یہ حیرت ناک مظاہرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ بنجامن اس وقت یہودی کمان کا سالار اعلیٰ تھا۔ ایک دن صبح نو بجے سے ذرا پہلے روزن تھال کے دفتر میں فون بجا۔ اس وقت اس کا ایک مشیر Michael Neiditch موجود تھا۔ اس وقت کے AIPAC کے ڈائریکٹر Morris Amitay نے واشنگٹن پوسٹ میں Evans اور Novak کے سنڈیکیٹ کالم میں جو مضمون پڑھا وہ اسے اچھا نہ لگا۔ ان صحافیوں نے یہ لکھا تھا کہ روزن تھال نے حال ہی میں اسرائیلیوں سے آئے ہوئے ایک گروپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسرائیل کے غربی کنارہ پر قبضہ کی ایسی مثال تھی کہ کسی نے بھاری بوجھ پیٹھ پر اٹھا رکھا ہو۔ وہ بوجھ تلے دبا جا رہا ہوتا ہے لیکن زیادہ بوجھ کا احساس کم ہوتا جاتا ہے۔ روزن تھال نے Novak کو یہ ذاتی گفتگو میں کہا تھا اور بے حد نرم الفاظ استعمال کئے گئے تھے لیکن Neidikh کا کہنا تھا کہ پھر بھی کھلبلی مچ گئی۔ Amitay نے روزن تھال کے لتے لئے کہ اس نے تبصرہ کرنے میں بے صبری کی۔ اس کے ۵ منٹ ہی بعد امریکہ میں اسرائیلی سفیر Ephraim "Eppie" Evron کا فون آیا' اس کے چند منٹ بعد بڑی یہودی تنظیموں کے صدور کی کانفرنس کے چیئرمین Yahuda Hellman کا فون آیا۔ ایک ہی بات دہرائی گئی۔ روزن تھال نے Neiditch کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "نوجوان! تم نے ابھی ابھی یہودی لابی کی طاقت کا مظاہرہ دیکھا ہے' تین کالیں تیرہ منٹ کے اندر اندر۔"

ایک اور سینئر کمیٹی ممبر (Ohio سے کانگریس کا رکن تھا اور اسرائیل کے بارے میں روزن تھال سے زیادہ آزاد خیال) نے یہ دیکھا کہ اس کی حرکات و سکنات کا بنظر غور معائنہ ہوتا تھا۔

ریپبلکن ممبر Charles Whalen کو بھی اس لابی کے دباؤ کا سامنا ہوا جب اس نے ۱۹۷۳ء میں لندن میں منعقدہ ایک مشرق وسطیٰ کانفرنس میں شرکت کی دعوت عین آخر وقت پر قبول کر لی۔ یہ فورڈ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ہو رہی تھی۔ اسرائیل کے کسی نمائندے نے شرکت نہ کی لیکن واہلن کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب واپسی کے بعد ایک اسرائیلی لابی کے اہلکار نے اس سے اس میٹنگ کی مکمل تفاصیل طلب کیں۔ ایجنڈا کیا تھا؟ کون حاضر تھا؟ واہلن نے کیوں شرکت کی تھی اور فورڈ فاؤنڈیشن نے کیوں اس کا اہتمام کیا تھا؟

واہلن کا کہنا تھا کہ یہ بیحد حیرت ناک تھا' انہوں نے پیچھا ہی نہ چھوڑا۔ واہلن کے خیال میں فورڈ نے پھر کبھی ایسی کانفرنس نہ کی۔ یہ چیز واہلن کے رویہ میں ایک موڑ ثابت ہوئی کہ اگر وہ کسی ایسی کانفرنس میں شرکت کر کے اپنے علم نہیں بڑھا سکتا تو یہ سب کچھ کیا ہے؟

Minnesota کے ایک ڈیموکریٹک ممبر کو بھی ایسی ہی حیرت کا سامنا ہوا جب وہ کانگریس چھوڑ چکا تھا۔ Richard Noland اب Minnepolis میں بزنس کرتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جب اس کا ایک عالمانہ مضمون مشرق وسطیٰ کے بارے میں چھپا تو اس کے سابقہ ساتھی اس سے کترانے لگے۔ اس نے پندرہ کانگریس ممبران کو الگ الگ رابطہ کر کے یہ کہا کہ وہ امریکہ کے عرب ریاستوں کے ساتھ نفع بخش تجارتی تعلقات بڑھانے کے امکانات کے سلسلے میں لکھے گئے اس کے آرٹیکل کو Congressional Record میں شائع کروا دیں۔ یہ مضمون Ghanem Al-Mazrvi کا تصنیف کردہ تھا جو کہ متحدہ امارات کا ایک اہلکار تھا۔ اس نے مکالمہ کو وسیع کرنے اور گھسے پٹے دشمنانہ رویوں کو ترک کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ایوان کے ضابطوں کے مطابق ایسا کوئی بھی مضمون جب درج کیا جائے تو اس ممبر کا نام درج کرنا ضروری تھا جس نے یہ اشاعت کے لئے بھجوایا تھا۔

Nolan نے بتلایا کہ ان پندرہ میں سے ہر ایک نے کہا کہ یہ بڑا زبردست مضمون ہے اور ضرور شائع ہونا چاہئے لیکن آپ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اگر میں اپنے نام سے شائع کرواؤں گا تو بیحد مشکلات پیدا ہونگی۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی مضمون کے عمدہ معیار پر حرف نہ دھرا اور مزید حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ میں نے وہ پندرہ ممبران چنے تھے جو میرے خیال میں سب سے زیادہ تعاون کرنے والے تھے۔ مشی گن سے ڈیموکریٹ ممبر David E. Bonior وہ سولہواں شخص تھا جو اس پر تیار ہو گیا اور نولان کا یہ مضمون "Record" کے صفحہ ۲۷۹۱۴ پر ۵/اکتوبر ۱۹۸۳ء کو

چھپا۔ یہ ایک ان غیر معمولی واقعات میں سے ایک تھا کہ "Congressional Record" میں ایک ایسی چیز شائع ہوئی جو کہ اسرائیل پر نکتہ چینی کے مترادف ہو یا جس میں عربوں کے ساتھ مکالمہ کرنے کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا۔ یہ ان کئی بہادرانہ اقدامات میں سے ایک تھا جس کی وجہ سے Bonior کو اسرائیلی لابی کا اگلا ہدف بننا پڑا۔ Flint (مشی گن) میں اپنے ۱۹۸۴ء کے انتخاب سے صرف دو ماہ قبل Association of Arab American Univ. Graduates کے روبرو تقریر کرتے ہوئے Bonior نے اسرائیل کو امداد دینے کے لئے شرائط لگانے کی مانگ کی۔ اس نے کہا کہ امریکہ اسرائیل کی ان پالیسیوں کی ہمت افزائی کا مرتکب ہو رہا ہے جو امریکہ کے مفاد میں نہیں۔ جس میں سعودی عرب اور اردن جیسے قدیم امریکی حلیفوں کے ساتھ تعلقات کا بگاڑ بھی شامل تھا۔

غیر جانبداری کا حیران کن مظاہرہ

ایوان نمائندگان میں سینئر لیڈران جن کے حلقہ ہائے انتخاب محفوظ ہیں وہ بھی اس دباؤ سے آزاد نہیں۔ اس لابی کا دباؤ انہیں بعض مرتبہ مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف ووٹ دیں۔

اکتوبر ۱۹۸۱ء میں صدر ریگن کی یہ متنازعہ تجویز کہ سعودی عرب کو F-15 جنگی جہاز اور Awacs دیئے جائیں لیکن ان میں تبدیلیاں کر کے ایوان میں زیر بحث تھا۔ کانگریس مین Daneil Rotemkowaski جو کہ Ways and Means Committee کا چیئرمین تھا اور کیپٹل ہل پر سب سے زیادہ مؤثر رکن قانون ساز اسمبلی تھا۔ اس بحث کے دوران اسرائیلی لابی کے جوابی حملہ کی زد میں آگیا۔ یہ نئے منتخب شدہ صدر اور لابی کے درمیان اولین زور آزمائی تھی۔ ضابطے کے مطابق اگر دونوں ایوان اس کو نامنظور نہ کرتے تو یہ فروخت طے قرار پاتی۔ لابی کی حکمت عملی یہ تھی کہ پہلے کانگریس میں اس پر رائے شماری ہو جہاں ان کی اکثریت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ایوان میں بہت بڑی اکثریت رائے سے نامنظور ہو جانے کا سینیٹ پر مناسب اثر پڑے گا اور شاید وہ بھی نامنظور کر دیں۔

لابی کے انتہائی دباؤ کے ماتحت Rotenskowaski نے بطور تعاون منفی ووٹ دیا لیکن بعد میں اس نے شکاگو ریڈیو اسٹیشن WMAQ کے رپورٹر کو بتلایا کہ وہ درحقیقت اس فروخت کا حامی تھا' لیکن اس نے ووٹ خلاف اس لئے دیا کہ اسے یہودی لابی کا خوف دامن گیر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایوان میں اس فروخت کی مخالفت اس قدر زیادہ تھی کہ اس کا ایک ووٹ کچھ بھی فرق نہ ڈالتا۔ مخالفت

میں 311 اور حق میں صرف 111 ' لیکن اسرائیلی لابی کا مطمع نظر زیادہ سے زیادہ منفی ووٹ حاصل کرنا تھا تاکہ سینیٹ پر اثرانداز ہوا جاسکے اور اس کے لئے Rotenskowaski کے اکیلے ووٹ کی بھی بیحد اہمیت تھی۔

کالم نویس Carl Rowan نے Rotenskowaski کے اس اعتراف کو راست بازی کا ایک مظاہرہ قرار دیا۔ اس نے لکھا کہ امریکہ میں طبقہ امراء کا رقم خرچ کر کے فیصلوں پر اثرانداز ہونے کا عمل کوئی اچنبھے کی بات نہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ امریکہ مین بہت سے مالدار یہودیوں نے مدتوں پہلے سے یہ سیکھ رکھا ہے کہ وہ اپنی تعداد سے کہیں بڑھ کر اثرانداز ہو سکتے ہیں' اگر وہ ممبران کی الیکشن میں مناسب عطیات دیں تو۔ عربوں کی آبادی اس قسم کا رول ادا نہیں کرتی۔ Rotenskowaski بہرحال اسرائیل نواز PAC سے اس قدر عطیات وصول کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ اگلے سال اسے ان حلقوں کی طرف سے اپنی انتخابی مہم کے لئے صرف ایک ہزار ڈالر وصول ہوئے۔

یہ لابی اگرچہ ہاؤس کے تمام ممبران اور Rotenskowaski جیسے لیڈروں پر توجہ مرکوز رکھتی ہے لیکن خصوصی توجہ خارجہ کمیٹی کے ممبران پر دی جاتی ہے جہاں پر تمام تر امداد (فوجی اور اقتصادی) طے پاتی ہے۔ اسرائیل نوازی بعض مرتبہ رائے شماری میں عجیب و غریب صورت حال پیدا کر دیتی ہے۔ وہ ممبران جو کہ دنیا کے ہر حصہ میں پالیسی کے بارے میں فاختہ ہوتے ہیں وہ اسرائیل کا نام آتے ہی شاہین بن جاتے ہیں۔

واشنگٹن پوسٹ کے ادارتی صفحے کے نائب مدیر S.S. Rosenfield نے مئی ۱۹۸۳ء میں لکھا:

"اگر کوئی مریخ کا باسی یہ دیکھے کہ کانگریس کس طرح اسرائیل اور ال سالویڈور کی امداد کی درخواستوں کو طے کرتی ہے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ہمارا سیاسی نظام ان طفیلی ریاستوں کے زندگی یا موت جیسے اہم مسائل کا فیصلہ ایک ایسے طریقہ سے کرتی ہے جو سمجھ سے بالاتر ہے۔"

خارجہ امور کمیٹی کی ایک خاص دن یعنی ۱۱ر مئی ۱۹۸۳ء کی کارکردگی سے روزن فیلڈ کو سخت اچنبھا ہوا۔ ایل سلوادوڑ کی حکومت کو انتہائی مشکل سیاسی فیصلے کرنے کے لئے کہا گیا جس کے بدلے میں اس کو صرف اتنی امداد ملنی تھی جس سے ان کی ناک پانی کے باہر رہتی اور یہ تمام فیصلے چشم زدن

میں کیے گئے' لیکن اس کے چند لمحوں بعد ہی مشرق وسطی کی ایک غالب فوجی قوت یعنی اسرائیل کے لئے جو امداد منظور کی گئی وہ ان اربوں ڈالروں سے بھی ایک تہائی ارب ڈالر زاید تھی جس کا مطالبہ انتظامیہ نے پیش کیا تھا۔ اسرائیل کے ایک بڑے حامی Stephen J. Solarz (یہودی کانگریس ممبر) نے بہت پرجوش لہجے میں سلواڈور کے لئے رکاوٹوں اور اسرائیل کے لئے اس فیاضی کو سراہا۔

لیڈروں میں سے کسی کو انکار کا حوصلہ نہیں

اسرائیل کی لابی امور خارجہ کمیٹی کی صدارت پر خاص توجہ مرکوز رکھتی ہے۔ یہ پوزیشن قانون سازی کی مجالس کے جلسوں میں کلیدی اہمیت رکھتی ہے' لہٰذا جب بھی یہ کرسی خالی ہوتی ہے تو اس پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔

جنوری ۱۹۷۷ء میں جب F.A.C. کا چیئرمین Thomas E. Morgan ریٹائر ہوا تو Clement J. Zablocki جو کہ ۱۸ سال سے بطور نمبر دو موجود تھا' اس کے چیئرمین بننے کے مواقع تھے۔ نوجوان ڈیموکریٹس کے ایک گروپ نے نیویارک کے Benjamin S. Rosenthal کی سربراہی میں اس کو روکنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے دعوے کی بنیاد اس ۳۸ صفحات کی رپورٹ کو بنایا جس میں یہ الزامات درج تھے کہ Zablocki نے بہت سے ڈیموکریٹ خارجہ امور کے بارے میں مخالف ووٹ دیئے اور یہ کہ اس کے کوریا سے قابل اعتراض تعلقات ہیں۔ یہ رپورٹ روزن تھال کے اسٹاف نے تیار کی تھی۔ Zablocki نے اس کورین الزام کو سفید جھوٹ قرار دیا اور Qtrly Congressional کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلا کہ اس نے گذشتہ کانگریس کے دوران اپنی پارٹی کے حق میں ۷۹ فیصد ووٹ دیا تھا۔ Zablocki نے اعلان کیا کہ روزن تھال اور اس کے ساتھی درحقیقت جس بات پر برہم ہیں وہ یہ کہ میں اسرائیل کی پوری حمایت نہیں کرتا اس کے باوجود ایک کلیدی موقع پر ووٹ کے علاوہ اس نے ہمیشہ اسرائیل کو امداد کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ روزن تھال کی رپورٹ شائع کرنے والے کالم نویس Jack Anderson کو بیان دیتے ہوئے Zablocki نے کہا کہ میں Anti-semitic نہیں ہوں' لیکن میں روزن تھال جتنا اسرائیل نواز نہیں ہوں۔ روزن تھال تو رابین (اسرائیل کا وزیراعظم) سے بھی مطمئن نہیں۔

لابی کی مخالفت کے باوجود Zablocki چیئرمین منتخب ہوگیا' اس کے حق میں ۱۸۲ اور مخالفت

میں ۲۷ ووٹ آئے لیکن لگتا ہے کہ اس نے اس سبق کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا اور پھر کبھی لابی کی مخالفت میں ووٹ ڈالا اور نہ کوئی بیان دیا۔ Zablocki کے ایک اہلکار کا بیان تھا کہ قصور سارا Zablocki کا نہیں تھا' زیادہ تر اسپیکر "TIP" ONeil ہی اسرائیل کی مخالفت کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ اس لیڈر شپ میں ایک بھی اسرائیلی لابی کو انکار نہیں کرتا' ایک بھی نہیں۔

متحدہ یہودی اپیل سے بھی آگے

اسٹیفن جے سولاز جو کہ ایک محنتی کانگریس ممبر ہے اور بروک لین کے یہودی اکثریتی حلقہ کی نمائندگی کرتا ہے' اسرائیل کے لئے کئی اچھے کام کرنے کا دعویدار ہے۔ ۱۹۷۴ء میں وہ پہلی مرتبہ منتخب ہوا اور تب ہی سے وہ "Eager Beaver" مشہور تھا کیونکہ وہ ہر وقت پا بہ رکاب جارحانہ اور ہمہ وقت اسرائیل کے مفاد کی چوکسی سے حمایت کرنے والا تھا۔ کمیٹی کے جلسوں میں وہ مخاطب کے پہلے سوال کا جواب دینے سے پہلے دوسرے سوال پر تلا نظر آتا ہے۔

دسمبر ۱۹۸۰ء میں اس نے اپنے حلقہ انتخاب کے ووٹروں کو ایک اطلاعی خط کے ذریعے اس بات کی جھلک دکھلائی کہ امریکن حکومت کے اپنے بجٹ کے معاشی بحران کے باوجود وہ کس طرح اسرائیل کی امداد میں روز افزوں اضافہ کرتی جاتی ہے۔ اس سال کے اوائل میں سولارز اپنی مزید اضافہ امداد کی مہم شروع کر چکا تھا۔ اس نے بتلایا کہ اس نے سیکریٹری آف اسٹیٹ سائرس وانس کو کیپٹل ہل پر اپنے دفتر میں آنے پر قائل کیا تاکہ اس پر بات چیت ہو سکے۔ جہاں اس نے وانس کو دھمکایا کہ اگر کمیٹی میں انتظامیہ نے اس بل کی مخالفت کی تو ایوان میں پیش کرتے وقت اس امداد کی رقم کو بڑھا دیا جائے گا۔ اس کے کچھ دیر بعد وانس نے یہ اطلاع بھجوائی کہ انتظامیہ اس امداد میں زیادتی یعنی فوجی امداد کے لئے مزید ۲۰۰ ملین ڈالر منظور کر لے گی لیکن اتنی نہیں جتنی سولارز چاہتا تھا۔

اس کا اگلا ہدف یہ تھا کہ خارجہ امور کمیٹی اس امداد کو انتظامیہ کی منظور کردہ سطح سے بھی بڑھا دے۔ سولارز کو یقین تھا کہ جتنی امداد کمیٹی منظور کرے گی وہ ایوان میں منظوری حاصل کر لے گی۔ بطور پہلا قدم اس نے یورپ' مشرق وسطیٰ ذیلی کمیٹی کے چیئرمین Lee H. Hamiltion سے ملاقات کی۔ اس کمیٹی نے اس امداد پر پہلے غور وخوض کرنا تھا۔

ہیملٹن ایک سرو قد عالمانہ خدوخال اور فکر انگیز شخصیت کا مالک تھا اور اسے اپنے اکثریت

کے ساتھ رہنے کے ہنر پر ناز تھا۔ چاہے وہ کمیٹی میں ہو یا ایوان میں' وہ کبھی بھی کھردرے پن کا مظاہرہ نہ کرتا تھا اور اکثر پیشگی ہی متنازعہ امور پر سمجھوتہ کر لیتا تھا تاکہ کھلے اختلاف کی نوبت نہ آئے۔ وہ Indiana کے ایک دیہاتی حلقہ انتخاب کی نمائندگی کرتا ہے جس میں یہودی آبادی کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسے تو اسرائیل کی روزافزوں فوجی مہمات پر تشویش ہے لیکن وہ یہ نکتہ چینی شاذ ہی اعلانیہ کرتا ہے' وہ اپنے مصالحت کارانہ رویہ کی حفاظت کرتا ہے۔ سولارز نے ہیملٹن کو ملتفت پایا۔ اس نے حامی بھر لی کہ وہ فوجی امداد کو ۲۰۰ ملین ڈالر بڑھانے کی حمایت کرے گا' اس سے مجموعی اضافہ ۴۰۰ ملین ہو گیا۔ اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ اس نے ہیملٹن سے اسرائیل کو دی گئی ۷۸۵ ملین ڈالر کی اقتصادی امداد کو واپس نہ کرنے کی تجویز کی حمایت کرنے کا وعدہ لے لیا۔ انتظامیہ اسرائیل سے اس کا ایک تہائی واپس لینا چاہتی تھی۔

سولارز کا کہنا تھا کہ ہماری توقع کے عین مطابق کانگریس میں ہیملٹن کی مدد سے ہمارا یہ بل بیحد آسانی سے ذیلی کمیٹی اور کمیٹی کی میٹنگ سے پاس ہونے کے بعد جب ایوان میں خارجہ امداد کا بل پیش ہوا تو یہ منظور ہو گیا۔ Idaho کے ڈیموکریٹ فرینک چرچ (خارجہ امور کمیٹی کا چیئرمین) اور سینئر ریپبلکن Jacob Javits (دونوں انتہائی اسرائیل نواز تھے) ان بلوں کے آسانی سے پاس ہونے میں اپنا کردار ادا کیا۔

سولارز نے اختتامیہ میں کہا کہ نتیجتاً اسرائیل کو اس سال بمقابلہ پچھلے سال کے امریکہ سے ۶۶۰ ملین ڈالر زائد کی اقتصادی اور فوجی امداد ملے گی۔ اپنے اس کارنامے کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا "ترغیب و مستقل مزاجی کے اس آمیزہ کی وجہ سے ہم نے اسرائیل کو ایک سال کے اندر جو زائد اقتصادی' فوجی امداد دلوائی وہ متحدہ جیوش اپیل کے تین سالہ چندہ کے لگ بھگ تھی۔"

اپنے اس خط میں سولارز نے کہا کہ وہ خارجہ امور کمیٹی کی رکنیت کا اس لئے طالب تھا کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ میں اسرائیل کے لئے مفید بنوں۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس کے سینکڑوں ڈیموکریٹ اور ریپبلکن ممبران ہیں لیکن یہ صرف خارجہ امور کمیٹی اور سینیٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی کے ممبران ہی ہیں جو اس وقت کام آتے ہیں جب ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی خارجی امداد کے وقت جس پر کہ اسرائیل کا اتنا انحصار ہے۔ سولارز کے جوش و جذبہ میں کوئی کمی نہ آئی۔ ستمبر ۱۹۸۴ء میں جبکہ بطور ممبر اس نے سینیٹ کمیٹی کے .Export Admn کے ترمیمی بل کے

بارے میں یہ دریافت کیا کہ اسرائیل پر اس کے کیا اثرات ہوں گے؟ اس نے کانگریس مین Howard Wolpe سے دریافت کیا "کیا اسرائیلی ہم سے کچھ چاہتے ہیں یا ممکنہ طور پر چاہیں گے جو وہ حاصل کرنے میں ناکام رہے؟" جبکہ والپ نے صاف طور پر "نہیں" جواب دیا تو پھر بھی سولارز نے اصرار کیا "کیا آپ نے (اسرائیلی) سفارت خانہ سے بات کرلی ہے؟" والپ نے کہا "میں نے ذاتی طور پر تو نہیں کی لیکن میرے دفتر والوں نے کی ہے۔" سولارز نے پھر پینترا بدل کر کہا "گویا آپ مجھے یہ پختہ یقین دہانی کروا رہے ہیں کہ انہیں (اسرائیل کو) اس بارے میں کوئی تشویش نہیں؟" آخر کار جب سولارز قائل ہوگیا کہ اسرائیل اس قانون سے مطمئن ہے تو اس نے چین کا سانس لیا کہ اگر انہیں اس پر اعتراض نہیں تو ہمیں کیا فکر؟

ایک جہاندیدہ کانگریس ممبر (OHIO) نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

جب سولارز اور اس کے ساتھی اسرائیل کے لئے امداد میں اضافے کا مطالبہ کرتے ہیں تو کوئی بھی انکار نہیں کرنا چاہتا۔ سیاست دانوں کو ڈرانے دھمکانے کی اتنی مثالیں موجود ہیں کہ آپ کو اس کے امکان کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہودی لابی بیحد زبردست ہے اور جو بھی چاہتی ہے حاصل کرلیتی ہے۔ یہودی پڑھے لکھے ہیں' اکثر وہ مالدار بھی ہوتے ہیں اور وہ ووٹ بھی ایک ہی مشترکہ مسئلہ یعنی اسرائیل کو مدنظر رکھ کر ڈالتے ہیں۔ مثال کے طور پر مانع اسقاط حمل کے حامی کافی زیادہ ہیں لیکن وہ اس قدر تعلیم یافتہ نہیں اور نہ ہی اتنے مالدار۔ یہودی لابسٹ کے پاس یہ سب کچھ ہے اور مستزاد اس پر یہ کہ وہ سیاسی طور پر متحرک بھی ہیں۔"

یہ ممبر کانگریس کو چار گروپوں میں تقسیم کرتا ہے:

پہلے گروپ کا کام ہے کہ اسرائیل جو بھی مانگے دے دو۔ دوسرے گروپ میں وہ شامل ہیں جنہیں کچھ تشویش ہوتی ہے لیکن وہ قطار سے باہر ہونے سے ڈرتے ہیں' وہ خاموش رہتے ہیں۔ تیسرے گروپ میں وہ کانگریس ممبران شامل ہیں جنہیں معقول اعتراضات ہوتے ہیں لیکن وہ ذاتی طور پر چپکے چپکے کوشش کرتے ہیں کہ اسرائیل کی امداد قدرے سست کر دی جائے۔ چوتھا گروپ وہ ہے جو ببانگ دہل امریکہ کی مشرق وسطیٰ کی پالیسی پر معترض ہے اور اسرائیلی اقدامات کو چیلنج کرتا ہے۔ فنڈلے اور میکلوسکی کی رخصتی کے بعد یہ گروپ اب معدوم ہے۔

وہ خود اپنے آپ کو تیسرے گروپ میں شامل کرتا ہے اور کہتا ہے میں شاید اس سال پہلی مرتبہ

خارجہ امداد کے بل کی مخالفت میں ووٹ ڈالوں۔ اگر میں نے ایسا کیا تو اس کی وجہ بیان نہ کروں گا۔ سولارز نے اسرائیل کی امداد میں اپنی حمایت میں کبھی کمی نہیں آنے دی لیکن ایک دوسرا کانگریس ممبر جو کہ پیشتر اسی نہج پر تھا بعد میں بدل گیا۔

خون کے آنسو

کیلیفورنیا کا سابقہ لیفٹیننٹ گورنر ڈیموکریٹ کانگریس ممبر Mervyn M. Dymally جب ۱۹۸۰ء میں واشنگٹن پہنچا تو وہ سو فیصد اسرائیل نواز ہونے کی شہرت رکھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر سیاہ فام امریکہ پر نظر دوڑائیں تو پچھلے بیس سال میں اسرائیل کی حمایت کرنے میں صرف Bayard Rustin مجھ سے آگے تھا۔ یہ کوتاہ قد قبول صورت اور صاف گو کانگریس ممبر پہلا سیاہ فام امریکی تھا جس نے ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۳ء کی جنگوں کے بعد اسرائیل کا دورہ کیا۔ اپنی لیفٹیننٹ گورنر کی انتخابی مہم کے دوران اس نے ریاست میں ہر جگہ جلسوں کے دوران اسرائیل کی حمایت کی۔ وہ اسرائیل کے سیاہ فام حامیوں کی کمیٹی بنانے والے بنیادی ممبران میں سے ایک تھا۔ اس نے کیلیفورنیا کے اخبارات میں اسرائیل نواز اشتہارات نکلوائے اور دوسرے سیاہ فاموں کو اس مقصد کے لئے متحد کیا اور ایوان نمائندگان میں امور خارجہ کمیٹی میں اسرائیل کا ایک معتبر حمایتی بن کر ابھرا۔

ان سب کے باوصف ۱۹۸۲ء میں یہودی فرقہ نے اپنی مالی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا اور اس سے اگلے برس کیلیفورنیا کی AIPAC تنظیم نے اسے شکست دلوانے کا تہیہ کر لیا اور ۱۹۸۴ء کے انتخاب میں اس کا مقابلہ کرنے کے لئے معقول مخالف امیدوار ڈھونڈھنا شروع کر دیا۔ حالات کے اس انقلاب کو Dymally اس طرح بیان کرتا ہے۔ اس کے خلاف کانگریس میں اسرائیل نواز رویہ کے بارے میں دو عدد سیاہ دھبے تھے۔ اولاً یہ کہ وہ کمیٹی میں اسرائیل کو امداد کے موضوع پر چبھتے ہوئے سوالات پوچھتا تھا گو اس کے سوالات نرم اور کچھ اتنے زیادہ نہ ہوتے تھے لیکن وہ نمایاں اس لئے ہو گیا کہ کوئی دوسرا اتنی بھی ہمت نہ کرتا تھا اور ثانیاً جو کہ AIPAC کی نگاہ میں گناہ کبیرہ کے برابر تھا یہ کہ وہ دو مرتبہ یاسر عرفات سے ملاقات کر چکا تھا۔

یہ دونوں ملاقاتیں اتفاقیہ ہوئی تھیں۔ پہلی مڈبھیڑ ۱۹۸۱ء میں ہوئی جب Dymally ابوظہبی میں مقامی وزیر منصوبہ بندی سے ملنے کے لئے رکا۔ وہ جنوبی ہندوستان میں ایک خارجہ پالیسی کی

کانفرنس میں شرکت کے بعد واپس آ رہا تھا۔ وزیر نے اسے بتلایا کہ وہ ابھی ابھی عرفات سے ملا ہے اور Dymally سے پوچھا کہ آیا وہ بھی ملنا چاہے گا؟ Dymally کا کہنا تھا کہ مجھے انکار کرتے شرم آئی اور پھر میرے خیال میں عرفات بھلا ایک گمنام سے جونیئر کانگریس ممبر کو کیوں ملے گا اور وہ بھی اتنے قلیل نوٹس پر۔ اسے حیرانی ہوئی' جب عرفات نے فوراً ملاقات پر آمادگی ظاہر کر دی۔ Dymally کے ہمرکاب اہل کاروں میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ Dymally کو امریکی سفیر کی سرکاری گاڑی میں گھمایا جا رہا تھا جس پر امریکہ کا پرچم لہرا رہا تھا۔ امریکی اہلکار کو علم تھا کہ امریکی انتظامیہ کے ارکان کو P.L.O. کے اہل کاروں سے ملنے پر پابندی عائد تھی' لہٰذا اس نے جلدی سے یہ جھنڈا اتارا اور ڈرائیور کو ہدایات دیں کہ Dymally کو عرفات سے ملاقات کے لئے لے جائے۔ Dymally کا کہنا تھا کہ وہ بیچارہ سخت مشکل میں نظر آتا تھا۔

عرفات سے مختصر ملاقات کر کے جب وہ باہر نکلا تو عرب نیوز کے ایک نامہ نگار سے پالا پڑ گیا۔ ڈملی نے اسے کہا کہ عرفات نے امریکہ کے ساتھ گفت و شنید کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس شام ABC کے قومی خبروں کے بلیٹن میں Peter Jennings نے امریکی عوام کو لندن سے یہ بتلایا کہ رونالڈ ریگن کے صدر بننے کے بعد یہ کسی امریکی ممبر کانگریس کی عرفات سے پہلی ملاقات تھی۔

یہودی فرقہ اس ملاقات سے بہت جز بز ہوا اور بیشتر یہودی یہ ماننے پر تیار نہ تھے کہ ملاقات اتفاقیہ تھی۔ ڈملی کے اسٹاف کی ایک یہودی رکن Stella Epstein نے بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا۔ ڈملی کی دوسری ملاقات بھی اسی طرح اتفاقیہ تھی۔ وہ ۱۹۸۲ء میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ لبنان گیا تھا۔ اوہایو کی (Marry Rose Oakar (DEM ویسٹ ورجینیا کا Nick Rahell مشی گن کا David E. Bonoir اور (REP) McCloskey N. "Pete" Paul اس وفد میں شامل تھے۔ مقصد لبنانی لیڈروں سے ملاقات پناہ گزیں کیمپوں کا دورہ اور اسرائیلی حملہ کے اثرات کا جائزہ لینا تھا۔ ڈملی کو یہ سب کچھ دیکھ کر دھچکا لگا۔ ان (فلسطینی) پناہ گزیں کیمپوں کو دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے' اس نے کہا۔ آمد کے بعد انہوں نے عرفات سے ملنے کی دعوت قبول کر لی جو کہ ان دنوں بیروت میں محاصرہ میں گھرا ہوا تھا۔

اب یہودی فرقہ کی ناراضگی مزید بڑھ گئی۔ ڈملی پر یہ جھوٹا الزام لگایا گیا کہ اس نے ۱۹۸۱ء میں سعودی عرب کو AWACS (جاسوسی طیارے) فروخت کرنے کے حق میں ووٹ دیا تھا' حالانکہ

اس نے اسرائیلی لابی کی حمایت کرتے ہوئے فروخت کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ اس نے ایوان کی کاروائی کے دوران اس فروخت کے خلاف دو تقاریر بھی کیں۔ دوسری تقریر جیوش لیبر کمیٹی کے Max Mont کی تحریر کردہ تھی جس کا کہنا تھا کہ پہلی تقریر مطلوبہ حد تک تند و تیز نہ تھی۔ اس کے باوجود اس چیز کو جان بوجھ کر بھلا دیا گیا۔ اس کی ایک مالی معاون Carmen Warshaw نے ایک عوامی ڈنر میں اسے کہا "ڈملی! میرے پیسے واپس کر دو" اور جب ڈملی نے پوچھا "کیوں؟" تو اس نے جواباً کہا کہ تم نے AWACS کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ Carmen کیلیفورنیا کی ڈیموکریٹک پارٹی اور یہودی معاملات میں نمایاں مقام رکھتی تھی۔

ڈملی نے خارجہ امور کمیٹی کی رکنیت کو "جیت ناممکن" (چت بھی ان کی اور پٹ بھی ان کی) معاملہ قرار دیا۔ اس سے اپنے اور بیگانے دونوں ناخوش ہوئے۔ اس کے ایک اسٹاف ممبر نے اس وقت استعفیٰ دے دیا جب اس نے عرفات سے ملاقات کی اور دوسرے نے اس وقت بطور احتجاج استعفیٰ دیا جب اس نے اسرائیل میں جنگی جہاز بنانے کے سلسلے میں ایک بڑے امدادی پیکٹ کے حق میں ووٹ دیا۔ ڈملی نے کچھ عرصہ کے لئے اسرائیل کے متعلق شکایات اور سوالات کرنے بند کر دیئے۔ جب وال اسٹریٹ جرنل نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ پال فنڈلے 'ڈربن انتخابی معرکہ اس کے لئے بیحد سبق آموز تھا۔

ڈملی کو اور اطراف سے بھی ڈراوے موصول ہوئے۔ جب بھی وہ کوئی شکایت کرتا تو اس کا ایک حلقہ ووٹر AIPAC کے نمائندہ کے ہمراہ اس کے پاس آتا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے پرانے یہودی دوستوں کے ایک حلقہ کو بتلایا کہ وہ اعتراض کرنے کے باوجود آخر کار ووٹ اسرائیل کو امداد منظور کرنے کے حق میں ہی دیتا ہے۔ کبھی ایک مرتبہ بھی میں نے اس راستے سے انحراف نہیں کیا۔ اس کے ایک حلقہ ووٹر نے کہا کہ یہ صحیح نہیں ہے 'ایک مرتبہ آپ نے ووٹ نہیں دیا تھا۔ ڈملی نے کہا کہ وہ لوگ اس قدر حیران کن حد تک مطلع ہوتے ہیں 'یہ سچ تھا۔

میں سن رہا ہوں

کانگریس میں آنے کے بعد دو سال تک انتظار کے بعد ڈملی نے اسرائیل کو امداد کے خلاف برملا شکایت کی۔ یہ ۱۹۸۳ء کا ایک خنک دن تھا 'کیپٹل ہل کے ایک کمرہ سماعت میں جو کھچا کھچ بھرا

ہوا تھا' ڈملی نے 98th کانگریس کی نئی تشکیل شدہ ذیلی کمیٹی برائے یورپ مشرق وسطیٰ میں اس بحث میں شرکت کی کہ اسرائیل کو کس قدر امداد درکار ہے۔ حاضرین کو یہ بتلایا گیا کہ ایسی امداد کیونکر کانگریس سے بہ آسانی منظور کروائی جاتی ہے بلکہ اکثر زیادہ کر دی جاتی ہے۔

گواہ کے کٹہرے میں مشرق وسطیٰ' جنوبی ایشیا کا اسسٹنٹ سکریٹری آف اسٹیٹ Nichola Veliotes کھڑا تھا۔ یہ دراز قد سیاہ بالوں والا یونانی نژاد سفارت کار پیشتر ازیں اسرائیل اور اردن میں کام کر چکا تھا۔ اس دن کیپٹل ہل پر وہ یہ وضاحت کرنے آیا تھا کہ ریگن انتظامیہ کیوں کانگریس سے اسرائیل کے لئے ۷۸۵ ملین ڈالر کی اقتصادی امداد منظور کروانا چاہتی تھی جو کہ اسرائیل کو امداد کے لئے دیئے جانے والے 2.5 ملین ڈالر امدادی پیکٹ کا حصہ تھا' اگلے سال کے لئے یہ میزان ہو رہی تھی جو سال گذشتہ تھی۔ صرف یہ فرق تھا کہ امریکہ کی اپنی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ شرط لگائی گئی تھی کہ اسرائیل اس امداد کا ایک تہائی واپس کرے۔ اس بحث میں سات ڈیموکریٹ اور ایک ریپبلکن (کیلیفورنیا سے نیا کانگریس ممبر Mr. Ed Zschau) حصہ لے رہے تھے۔ ذرائع ابلاغ پوری پوری تشہیر کر رہے تھے۔ فلڈ لائٹوں کی وجہ سے درجہ حرارت اور چکا چوند کافی زیادہ تھی۔ اس تنگ سے کمرے میں دو گھنٹے تک Veliotes کو انگاروں پر لوٹایا گیا۔ پانچ کانگریس ممبران نے باری باری اس پر سوالات کی بوچھاڑ کی جن کا لب لباب صرف یہ تھا کہ انتظامیہ کی مذمت کی جا رہی تھی اس بات پر کہ یہ امداد سال گذشتہ سے قدرے کم تھی۔ صرف ڈملی نے انتظامیہ کی حمایت کی۔ اس ساری تفتیش کی ماہیت شدت اور عدم توازن دیکھتے ہوئے کوئی ناواقف کار یہ سمجھتا کہ یہ اسرائیل کی پارلیمنٹ میں ہو رہی ہے نہ کہ امریکن کانگریس میں۔ کیلیفورنیا کے ڈیموکریٹ Tom Lantos نے دو دفعہ باری لی اور اس ہنگری سے آئے ہوئے سفید ریش مہاجر نے Veliotes کو کڑی ڈانٹ پلائی کہ وہ اسرائیل کو نئے خطرات کا صحیح ادراک نہیں کر رہا جو کہ شام میں سوویت میزائل نصب ہونے اور لیبیا کو ہتھیاروں کی فروخت سے پیدا ہوئے ہیں۔ Lantos نے انتظامیہ کی اس پالیسی کا مذاق اڑایا کہ لبنان سے سارے اسرائیلی فوجی واپس بلائے جائیں۔ جن لوگوں نے Lantos کے ۱۹۸۲ء کے دوبارہ منتخب ہونے کی مہم کو دیکھا تھا وہ اس برتاؤ پر حیران نہیں تھے۔ چندہ جمع کرنے کی مہم میں Lantos نے بار بار یہ کہا تھا کہ کانگریس کے اندر اسرائیل کے حمایتی کو ہونا چاہئے۔ اب یہ حمایتی اپنا احسان کانگریس کے اندر چکا رہا تھا۔

متعدد ڈیموکریٹ نئے ممبران بھی اسی طرح کے سوالات اٹھا رہے تھے۔ فلوریڈا کے لارنس جے اسمتھ کو لبنان کے اندر اسرائیلی فوجی کاروائی مکمل امن کی جانب ایک قابل قدر پیش رفت نظر آتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اسرائیل کو امداد بڑھا دینی چاہیئے کیونکہ امدادی رقم افراط زر کی وجہ سے گھٹ چکی ہے۔ Mel Levine نے بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا کہ کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کے تحت سینائی کے قصبہ کو واپس کر دینے سے اسرائیل کو تیل کے چشموں کی آمدنی سے ہاتھ دھونا پڑا ہے۔ نیو جرسی کے Robert Torricelli کا کہنا تھا کہ انتظامیہ نے امداد کو زیادہ نہ کر کے دباؤ کا مظاہرہ کیا ہے۔ کمیٹی کے جہاندیدہ ممبر سولارز نے یہ گرہ لگائی کہ گذشتہ چند سالوں میں انتظامیہ نے ہمیشہ اس امداد کو بڑھایا ہے یا اس کی شرائط میں ایسی تبدیلیاں کیں کہ یہ اسرائیل کے حق میں زیادہ سودمند ثابت ہو۔

صرف ڈلی نے شکایتاً کہا کہ یہ امداد بہت زیادہ ہے' اپنے اقتصادی بحران کے ہوتے ہوئے امریکہ کیسے اتنی بڑی رقم دے سکتا ہے؟ اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ وہ ملک صدر امریکہ کے امن مذاکرات ٹھکرا چکا ہے بلکہ مقبوضہ علاقوں میں آبادکاری کو بڑھا رہا ہے۔

صرف کیلیفورنیا کے نئے ریپبلکن ممبر Ed Zschau نے اس اسرائیل نواز سوال جواب میں رخنہ ڈالا۔ اس نے پوچھا "کیا ہمیں اس (اسرائیلی امداد) پر ایسی شرائط عائد کرنی چاہئیں جو کہ اس امن کے عمل میں سودمند ہوں؟" جب جواب نہ ملا تو اس نے کہا کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہم امداد اس مقصد کے تحت دے رہے ہیں کہ اس علاقے میں امن قائم ہونے میں مدد ملے تو کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم کچھ معمولی سی شرائط یعنی ان آبادیوں کا قیام روکنا اس کے ساتھ منسلک کر دیں؟

Veliotes نے ان تمام سوالات کے جواب دیتے وقت پھونک پھونک کر قدم رکھا۔ جب Zschau نے صاف جواب دینے کے لئے کہا تو Valiotes نے صرف یہ کہا کہ مجھے سنائی دے رہا ہے۔ اس کے اپنے ذاتی جذبات کے قطع نظر اسے Zschau کی بیان کردہ شرائط کو قبول کرنے کی اجازت نہ تھی۔

ڈلی نے ایک ماہ بعد پھر زبان کھولی جب مشرق وسطیٰ کی ذیلی کمیٹی نے اسرائیل اور دوسرے کئی مشرق وسطیٰ کے ممالک کو امداد کی منظوری پر عمل درآمد کے لئے قانون بنایا۔ ڈلی نے ایک تحریک پیش کی کہ مصر کو دی جارہی فوجی امداد کو بڑھا دیا جائے اور اس میں سے نصف کو گرانٹ اور نصف کو

قرضہ قرار دیا جائے۔ اس تحریک کی پشت پر اس کی یہ منطق تھی کہ اس طرح امریکی حکومت اسرائیل اور مصر کے درمیان اپنا برتاؤ انصاف پر مبنی برابری کی سطح پر لے آئے گی کیونکہ دونوں فریق کیمپ ڈیوڈ کے سمجھوتے میں منسلک اور دونوں امریکہ کے دوست تھے۔ ڈملی کا استدلال تھا کہ مصر کے اقتصادی مسائل چونکہ اسرائیل سے زیادہ سنگین تھے لہٰذا اسے امریکی سخاوت سے اسی پیمانے پر بہرہ مند ہونا چاہئے جتنا کہ اسرائیل کو۔ اس کی یہ تحریک نامنظور ہوئی۔ Lantos نے بجٹ کی وجہ بتاتے ہوئے مخالفت کی۔ صرف ڈملی نے حمایت میں ووٹ دیا۔ یہ منظوری عین اس تحریک کی منظوری کے بعد ہوئی جس میں اسرائیل کو "Forgiven Direct Credits" بطور فوجی امداد اور زیادہ دینے کے لئے کہا گیا تھا۔ یہ براہ راست گرانٹ کا ایک دوسرا نام تھا۔ یہ امداد ۲۰۰ ملین ڈالر بڑھادی گئی اور مزید ۶۵ ملین کی خطیر رقم اقتصادی امداد میں ایزاد کی گئی۔ اس بار اس ذیلی کمیٹی کو کسی بجٹ کی وجہ کا سامنا نہ تھا حالانکہ اس زیادتی سے وفاقی بجٹ کے خسارے میں اسی قدر اضافہ ہونا تھا۔ اس دن صرف ڈملی نے وفاداری بشرط استواری کا ثبوت دیتے ہوئے دونوں تحریکوں پر "ہاں" میں ووٹ دیا۔

اسی اجلاس کے دوران اس ذیلی کمیٹی نے اردن کو بیچے جانے والے جنگی جیٹ طیاروں کے ساتھ یہ شرط منسلک کرنے کی کوشش کی کہ اس فروخت سے پیشتر شاہ حسین اسرائیل کے ساتھ صلح کی بات چیت شروع کردیں۔ اس پابندی سے نمائندگان کے رجحان کا پتہ چلتا تھا جس کے ۱۷۰ اراکین پہلے ہی ایک کھلے خط کے ذریعے اس خواہش کا اظہار کرچکے تھے۔ اس کھلی جھڑکی سے صدر ریگن کی سبکی بھی ہوتی تھی اور اس کی ذاتی کوششوں کو جو وہ شاہ حسین کا تعاون حاصل کرنے کے لئے کررہے تھے ایک دھچکا بھی پہنچتا تھا۔ لیکن انتظامیہ کا نمائندہ یعنی ڈپٹی اسسٹنٹ سیکریٹری آف اسٹیٹ Robert Pellatrean موجود ہوتے ہوئے بھی منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھا رہا اور اس کے سامنے ذیلی کمیٹی نے یہ پابندی منظور کی۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انتظامیہ اس لابی کا سامنا کرنے سے کس قدر گھبراتی ہے۔

انتظامیہ کی بے بسی

گو انتظامیہ کے اہلکار اسرائیل کو امداد میں اضافہ کرنے کا الزام کانگریس پر دھرتے ہیں لیکن ان کو اپنے گریبان میں بھی جھانکنا چاہئے۔ ڈملی کی تحریک نامنظور ہوجانے کے ایک ماہ بعد اور

Pelletrean کی نامناسب خاموشی کے بعد امور خارجہ کی کمیٹی نے اس بل پر بحث شروع کی۔ اس مرتبہ انتظامیہ کے نمائندے Alvin Drichler نے جو کہ اسسٹنٹ سیکریٹری آف اسٹیٹ ہی تھا' اس سوال کے دونوں پہلوؤں پر ایک جیسا جواب دے کر اپنی گواہی کا اثر مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ کانگریس مین J. Pritchard (واشنگٹن) کی ۲۶۵ ملین ڈالر کٹوتی کی تحریک پر بحث ہو رہی تھی۔ سوال یہ تھا کہ یہ اضافی امداد کاٹ کر ٹوٹل اس پہلی سطح پر لے آیا جائے جو کہ انتظامیہ نے اسرائیل کی امداد کے لئے پہلے پہل منظوری کے لئے پیش کی تھی۔ Drischler نے کمیٹی کو بتلایا کہ ہم انتظامیہ کے موقف کی حمایت کرتے ہیں یعنی Pritchard کی ترمیم برائے کٹوتی کی حمایت لیکن دوسرے ہی سانس میں اس نے کہا کہ لیکن ہم اضافی رقم کی مخالفت بھی نہیں کرتے۔ کمیٹی روم میں زوردار قہقہہ گونجا اور C.J. Zabloski نے شکایتاً کہا ہماری الجھن قائم ہے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اگر انتظامیہ کا کچھ ارادہ تھا بھی تو وہ اب تک تحلیل ہو چکا تھا۔ Pritchard انتظامیہ کی ترمیم کی موافقت بھی کر رہا تھا اور انتظامیہ کی امداد سے محروم بھی تھا۔ اس نے یہ انتباہ تو کیا کہ کانگریس اسرائیل کے ساتھ معاملہ کرنے میں اپنا اثر کھو بیٹھے گی' اگر اس نے یہ اضافہ منظور کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ لیکن یہ احساس ہمیشہ سے ہے کہ کانگریس میں اسرائیل کو اتنی حمایت حاصل ہے کہ وہ انتظامیہ کی کسی بھی پیش قدمی کو مات دے سکتا ہے۔

ڈیموکریٹ ممبر George Crechett (مشی گن) نے آگاہ کیا کہ یہ اضافہ اسرائیل کے وزیر اعظم M.Begin کو نئی آبادکاری جاری رکھنے کے لئے سرمایہ مہیا کرنے کا سبب بنے گا لیکن ریپبلکن ممبر (Kansas) Larry Winn نے فوراً اس کا توڑ کرتے ہوئے کہا: اس گرانٹ کو بڑھانے سے اسرائیل کو اپنے قرض پر سود ادا کرنے کی مزید سہولت ملے گی جو اس نے USA کو ادا کرنا ہے جو کہ ۱۹۸۳ء میں ایک بلین ڈالر کی حد کو چھو چکی تھی۔ گویا Winn صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ امریکہ اسرائیل کو اس لئے قرضہ دے کہ وہ امریکہ کا قرضہ ادا کر سکے۔ اس قسم کی منطق کامیاب رہی۔ پرٹچارڈ کی ترمیم ۸ کے مقابلہ میں ۱۵ ووٹوں سے نامنظور کی گئی۔ US-AID کے لابسٹ نے بعد ازاں کہا کہ پرٹچارڈ ترمیم پر اس لئے زور نہ دیا گیا کہ ووٹ تو موجود ہی نہ تھے اس کے لئے۔ پرٹچارڈ نے اس پر یوں تبصرہ کیا "انتظامیہ امریکن خارجہ پالیسی بنانے کے سلسلے میں بے بس ہے۔"

میں آزاد محسوس نہیں کرتا

Dymally کے کبھی کبھار کے آزادانہ اظہار رائے اور ووٹ برائے مشرق وسطیٰ نے متوقع طور پر اسرائیل نواز حلقوں میں شکایات پیدا کیں۔ گو ۱۹۸۴ء میں تو وہ اس کے خلاف موزوں مدمقابل نہ لا سکے لیکن اسے یہ احساس تھا کہ یہ نقصان ناقابل تلافی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ امور خارجہ کمیٹی کی ممبری ایک ''چت بھی ان کی، پٹ بھی ان کی'' والی بات ہے۔ اس نے مزید کہا ''مجھے یہ ماننے میں باک نہیں کہ میں اسرائیل پر نکتہ چینی کرنے میں اتنا آزاد محسوس نہیں کرتا جتنا کہ اپنے جائے پیدائش والے جزیرہ Trinidad پر'' ڈملی نے بتلایا کہ ٹرینیڈاڈ ان چند جزیروں میں شامل تھا جنہوں نے Grenada پر ۱۹۸۳ء میں امریکی حملہ کی حمایت کی تھی، لیکن ڈملی کی پرزور مخالفت نے اسے گرینیڈا کے عوام میں غیر مقبول نہ بنایا۔ گو کہ گرینیڈا کے چند لیڈر مجھ سے خفا ضرور ہوئے لیکن وہ میرے انتخابی مہم کے لئے چندہ بدستور دے رہے ہیں۔ درحقیقت اس علاقے کے لوگ نیویارک میں ایک جلسہ چندہ جمع کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔ وہ مجھے سیاہ فام مخالف یا غرب الہند مخالف کے طور پر نہیں دیکھتے۔ وہ اس حملے کے معاملے میں میرے ہم خیال نہیں ہیں لیکن وہ میرے دشمن نہیں بنے۔ اس رویہ کا موازنہ وہ کیلیفورنیا کے یہودی نکتہ چینیوں سے کرتے ہوئے کہتا ہے ''انتہائی تکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ بیشتر یہودی اسرائیل پر نکتہ چینی کو Anti-Jewish یا Anti-Semitic سمجھ بیٹھتے ہیں۔'' وہ اس بات کی تعریف کرتا ہے کہ اسرائیل کے اندر اسرائیلی پالیسی پر کھلے بندوں تنقید کی جاتی ہے۔ اسرائیلی کنشت یعنی پارلیمنٹ میں اسرائیل پر تنقید آسان لیکن امریکی کانگریس میں دشوار ہے۔ اور وہ بھی اس آزادی گفتار والی سرزمین پر۔

ڈملی کا کہنا تھا کہ امور خارجہ کی کمیٹی کے ۳۷ میں سے ۱۰ ممبران یہودی ہیں اور وہ اس قدر جانبدار ہیں کہ تعمیری گفت وشنید کا ہرگز کوئی امکان نہیں۔ صرف کیلیفورنیا کا ریپبلکن ممبر Ed Zschau ہے جو کہ یورپ، مشرق وسطیٰ کی ذیلی کمیٹی کی نورا کشتی میں حصہ لیتا ہے، بقیہ ممبران میں سے کوئی بھی تنقید میں حصہ نہیں لیتا۔

ڈملی کا خیال ہے کہ امریکی سیاسی منظر میں اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ عرب نژاد امریکن خود بہتر لابسٹ بنیں اور یہ احساس ان میں جاگے کہ اس کے لئے ان کو رقم خرچ کرنی ہوگی۔ وہ کیپٹل ہل پر اپنا مسئلہ پیش کرنا جانتے ہی نہیں۔ غیر ملکی نژاد گروپ نہ تو لابی کرنے کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور

نہ ہی ان میں سیاسی سخاوت ہے۔ ایک گذشتہ کانگریس آفس کے طالب علم مددگار Peter Spieller نے اسے بتلایا کہ یہودیوں میں یہ مشہور ہے کہ تم عرب سرمائے سے خریدے جا چکے ہو۔ ڈملی نے ہنستے ہوئے کہا "میں نے اسے بتلایا کہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ عرب نژاد امریکی مجھے کچھ رقم دیں" اس کے کہنے کے مطابق انہوں نے کچھ بھی مدد نہیں کی حالانکہ اسے اپنے ۱۹۸۰ء کے انتخابی مہم کے کئی قرض ابھی ادا کرنے ہیں۔ اس سے پیشتر ڈملی کو اپنے یہودی حمایتیوں سے ہزاروں ڈالروں کی امداد انتخابی مہم میں یقینی ہوتی تھی لیکن عرفات سے ملاقات کے بعد یہ سوتے خشک ہو گئے' کیونکہ اس نے اسرائیل کی حکمت عملی پر سوالات کئے تھے۔ ۱۹۸۲ء کی انتخابی مہم میں ایک یہودی دوست نے سو سو ڈالر کے دو ٹکٹ خریدے اور اس مہم میں یہی کل یہودی امداد تھی۔

ڈملی کی امور خارجہ کی ذیلی کمیٹی میں اسرائیلی لابی اس لئے آسانی سے غالب آجاتی ہے کیونکہ اکثر کانگریس ممبر اس میں شرکت کو سیاسی ذمہ داری خیال کرتے ہیں۔ جب امریکی عوام کی اکثریت خارجہ امداد میں اگر مکمل خاتمہ نہ سہی' کمی کی خواہش مند ہے۔ وہ کانگریس ممبران جو کہ سیاسی طور پر تقریباً غیر جانبدار حلقوں سے آتے ہیں وہ خارجہ امداد کی حمایت کرتے وقت جوا کھیل رہے ہوتے ہیں اور اس سے بھی بڑا جوا کھیلتے ہیں۔ اگر انہیں اس کمیٹی کا رکن لگا دیا جائے جو اس امداد کا انتظام کرتی ہے۔

اوہایو کا ایک سینئر ڈیموکریٹ جو کہ امور خارجہ کمیٹی کا گذشتہ ممبر رہ چکا ہے یہ بتلاتے ہوئے کہ اسرائیل نواز ممبران کس طرح اس کمیٹی کی رکنیت بغیر کسی مشکل کے حاصل کر سکتے ہیں۔ کہتا ہے اس کمیٹی کے طلبگار سب سے کم ہوتے ہیں۔ اگر آپ شمولیت کرنا چاہیں تو یقیناً کامیاب ہوں گے۔ ایک برس تو ڈیموکریٹ پارٹی کو باقاعدہ تلاش کرنا پڑی تھی کہ کم از کم ان کا نشستوں کا کوٹہ تو پورا ہو۔ بیشتر ڈیموکریٹ اس کمیٹی کی رکنیت کو ایک ناخوشگوار بوجھ سمجھتے ہیں۔ یہ صرف ان ممبران کے لئے سود مند ہے جن کے انتخابی حلقوں میں یہودیوں کے بڑے بڑے گروپ ہیں۔ ریپبلکن بھی اس بارے میں یہی سوچ رکھتے ہیں۔

چودہ نوآموز آڑے وقت کام آئے

اسرائیلی لابی کی عقابی نظروں تلے ممبران کانگریس اپنا پورا زور لگاتے ہیں کہ وہ اسرائیل کو امداد دینے کے قوانین منظور کروائیں۔ ۱۹۸۳ء کے اواخر میں کانگریس کے اجلاس برخواست ہونے

سے ذرا پہلے ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ یعنی ۱۴ نئے ڈیموکریٹ ممبران کے گروہ نے کاروائی کے طبع شدہ ریکارڈ میں اپنے ووٹ تبدیل کروائے۔ ممبران ایسا کرنے سے اس لئے گریز کرتے ہیں کہ دوسرے انہیں متلون مزاج نہ سمجھیں' لیکن اس دن ۱۴ نئے ممبران اسرائیلی لابی کا زوردار دباؤ برداشت نہ کرسکے اور گھٹنے ٹیکتے ہوئے اپنا ووٹ بدلنے پر راضی ہوگئے تاکہ ایک "امرت دھارا" قانون بنام "قانون تسلسل" منظور کیا جاسکے۔ اس قانون کے ماتحت ان پروگراموں پر خرچ جاری رکھا جاتا ہے جو کانگریس نے دستور عام کے تحت منظور نہیں کئے ہوتے اور ان میں اسرائیل کی امداد شامل تھی۔ اس منظوری سے اس امداد کا تسلسل نہ ٹوٹے گا۔

کم از کم اس ایک مرتبہ AIPAC اور کانگریس کی ڈیموکریٹ قیادت دونوں خواب خرگوش میں پکڑے گئے۔ AIPAC عام طور پر قانون سازی کے ان معاملات پر جن کا اسرائیل کی امداد سے واسطہ ہوتا ہے مکمل کنٹرول رکھتی ہے' لیکن اس دفعہ چوک ہوگئی اور وہ اٹھتی بغاوت کو بروقت نہ بھانپ سکے۔ بجٹ کے خسارے اور لاطینی امریکہ کے بارے میں متنازعہ امور نے ان نئے ممبران کو اپنی قیادت سے بغاوت پر اُبھارا۔ وقت کم تھا کہ ترامیم پیش کی جاتیں لہٰذا انہوں نے چپکے سے یہ طے کیا کہ یہ پورا بل ہی منظور نہ ہو۔ جب رائے شماری کا مرحلہ آیا تو یہ بل نامنظور ہوگیا۔ اسپیکر کے اوپر لگا ہوا بڑا برقی بورڈ صاف دکھا رہا تھا کہ حق میں ۲۰۳ اور مخالفت میں ۲۰۶ ووٹ آئے تھے۔ نئے ڈیموکریٹ ممبران میں سے ۲۴ نے قیادت کی مخالفت کرتے ہوئے نہ میں ووٹ ڈالا تھا۔ اس منفی ووٹ سے یہ مراد نہ تھی کہ وہ اسرائیل کو امداد کی مخالفت کررہے تھے۔ کسی کا خیال یہ تھا کہ بجٹ کا خسارہ مدنظر رکھتے ہوئے یہ قیادت کے لئے نئے ٹیکس لگانے کا ایک مطالبہ تھا' جبکہ چند دوسروں کے لئے یہ صرف ایک احتجاج تھا لیکن اسرائیل کے لئے اس کی اہمیت زیادہ تھی۔

ایک پرانے کیپٹل ہل سفارت کار کے الفاظ میں "یہودی فرقہ تو مخبوط الحواس ہوگیا" AIPAC کے گرگ سفارت کار حرکت میں آئے۔ چار بلاک پرے واقع اپنے دفتر سے انہوں نے ان نئے راہ گم کردہ ممبران کے حلقہ ہائے انتخاب میں کلیدی شخصیات کو فون کھڑکائے۔ انہوں نے ان افراد کو معیاری فون کال کئے جنہوں نے پچھلے کانگریس انتخابات میں اہم رول ادا کیا تھا۔ ہر ایک کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ وہ اپنے ممبر کانگریس کو ارجنٹ فون کال کرکے ذاتی رسائی کے لئے اصرار کرے اور مندرجہ ذیل پیغام دے:

"قانون تسلسل کا منظور ہونا بیحد اہم ہے۔ اسرائیل اس کے بغیر نقصان میں رہے گا۔ میں اس کے خلاف آپ کے پہلی مرتبہ کے ووٹ کو ہدف نہیں بنا رہا۔ یقیناً آپ کے پاس معقول وجہ ہوگی۔ بہرحال مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ مسئلہ دوبارہ رائے شماری کے لئے پیش ہوگا' اغلباً کل۔ میں آپ کے کئی دوسرے رائے دہندگان اور حامیوں کی طرف سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب دوبارہ رائے شماری ہو تو آپ اپنا ووٹ تبدیل کر لیں۔"

ہر شخص کو یہ ہدایت تھی کہ فون کال کی تکمیل کی رپورٹ AIPAC کو دے اور ایسا ہی ہوا۔ ایوان نمائندگان نے یہ معاملہ اگلی دوپہر کو دوبارہ اٹھایا۔ اس بل میں حرف بحرف وہی کچھ درج تھا جو دو یوم قبل ایوان نے نامنظور کیا تھا۔ "Appropriation Committee" کے سینئر ریپبلکن ممبر Silvio Conte نے ان نئے ڈیموکریٹ ممبران کو ڈٹے رہنے کا مشورہ دیا' اگر وہ ہمت رکھتے ہیں۔ کیونکہ اسے اسرائیلی لابی کے دباؤ کا علم تھا۔ ریپبلکن لیڈر Bob Michel نے بھی سرزنش کرتے ہوئے دباؤ برداشت نہ کر سکنے والوں کو حوصلہ دلایا۔ اس دباؤ میں کچھ حصہ ڈیموکریٹ قیادت کا تھا جنہیں خفت تھی لیکن ووٹ تبدیل کروانے کا اصلی سہرا AIPAC کے سر جاتا ہے۔ حساس معاملات میں ممبران اپنے حلقہ کے رائے دہندگان کا دباؤ تو قبول کر لیتے ہیں لیکن قیادت کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔ ریپبلکن Conte اور Michel کے لئے یہ معاملہ بجٹ کو حد کے اندر رکھنے کا تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اس بل کو اس بناء پر نامنظور کیا جائے۔ اس دن بحث کے دوران یا کسی بھی اور دن کسی نے بھی اسرائیلی لابی کے اثر و نفوذ کا ذکر نہیں کیا۔

ان ارجنٹ فون کالز نے جو کہ ان حلقوں سے کی گئیں تھیں کام کر دکھایا۔ جب رائے شماری ہوئی تو ۱۴ نئے ممبروں نے کچھ جھینپتے ہوئے اپنے ووٹ تبدیل کر لئے' ان کے نام مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ نارتھ کیرولینا کا C. Robin Britt.

۲۔ Tennessee کا Jim Cooper

۳۔ الی نوائے کا رچرڈ۔ جے۔ ڈربن

۴۔ اوہائیو کا Edward F. Feighan

۵۔ مشی گن کا Sander M. Levin

۶۔ انڈیانا کا Frank McCloskey

۷۔ Connecticut کا Druce A. Morrison

۸۔ ورجینیا کا جیز اولن

۹۔ ورجینیا کا Norman Sisissky

۱۰۔ Minnesota کا Timothy J. Pennu

۱۱۔ نیوادا کا Harru M. Reid

۱۲۔ نیو میکسیکو کا بل رچرڈسن

۱۳۔ ساؤتھ کیرولینا کا John M. Sprattt JR.

۱۴۔ ویسٹ ورجینیا کا Harley O. Staggers JR.

ان نئے ممبران کو بہانہ مہیا کرنے کی خاطر قیادت نے یہ وعدہ کیا کہ وہ نیا ٹیکس بل لائیں گے لیکن ہر کسی کو یہ علم تھا کہ یہ ایک فریب ہے' ٹیکس بل کی منظوری کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ یہ بہانہ کارگر رہا اور یہ بل ۲۲۴ ووٹ حق میں اور ۱۸۹ خلاف ہونے سے پاس ہوا۔ اسرائیل کو امداد میں کوئی رکاوٹ نہ آئی۔

غیر ملکی مسابقت کی امداد

"قانون تسلسل" پر آخری رائے شماری نے ایک عجیب اور نئے طریقے سے اسرائیلی امداد کو جنم دیا۔ اس میں ایک ترمیمی شق AIPAC کی چالاکی سے اور اسرائیل نواز ممبران Clarence Long (Maryland) اور Jack Kamp (N.Y.) کی طرف سے پیش کی گئی۔ ۲۵۰ ملین ڈالر کی فوجی امداد بطور گرانٹ اسرائیل کو دی گئی کہ وہ اسرائیل میں ایک نئے فوجی ہوائی جہاز Lavi کو ترقی دے۔ اس نئے جنگی ہوائی جہاز نے کھلی بین الاقوامی مارکیٹ میں نارتھراپ کے F-20 اور جنرل ڈائنامکس کے F-16 کا مقابلہ کرنا تھا۔ یہ دونوں ماڈل خاص طور پر برآمد کے لئے بنائے گئے تھے۔ اس ترمیم سے انکل سام کی طرف سے ایک ایسی خصوصی سہولت ایک غیر ملکی حریف کو دی گئی جس کی ماضی میں کوئی نظیر نہ تھی۔ اس کے غیر معمولی ہونے کی ایک مزید وجہ یہ تھی کہ اس سے ایک پچھلا امریکی قانون منسوخ ہوگیا جس کے ماتحت امریکی غیر ملکی امداد کا خریداری فنڈ امریکہ کے اندر خرچ کرنا لازم تھا۔

اس پر بحث کے دوران ویسٹ ورجینیا کا ڈیموکریٹ Nick J. Rahall ایک ایسا ممبر تھا

جس نے اعتراض کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس ترمیم سے امریکہ میں موجودہ شدید بے روزگاری میں مزید اضافہ ہو گا۔ اس نے کہا "اگر ہم نے یہ ۲۵۰ ملین ڈالر امریکی معیشت سے نکال کر اسرائیل کو فوجی ساز و سامان خریدنے پر خرچ کرنے کے لئے دیئے جو کہ آسانی سے امریکہ کے اندر میسر ہیں تو اندازاً چھ ہزار لوگوں کا روزگار جاتا رہے گا۔ امریکیوں کے ٹیکس سے جمع کی ہوئی دولت کو ایک غیر ملک کی انڈسٹری کو ترقی دینے کے لئے خرچ کیا جا رہا ہے۔ اب اس کے لئے ان کو اپنے روزگار سے تو محروم نہ کیا جائے۔"

اس روز Rahall تو کوئی ایسی ترمیم پیش نہ کر سکا جس سے یہ بات منسوخ یا تبدیل ہو جائے۔ اس کی وجہ وہ پابندیاں تھیں جو کہ اس بحث کے شروع ہونے سے پہلے ایوان نے مقرر کر دیں تھیں۔ طے یہ پایا تھا کہ کوئی بھی ممبر ہاں یا نہیں میں ووٹ دے گا۔ اس سارے Long Kemp ترمیمی بل پر جس میں نہ صرف اسرائیل کو امداد شامل تھی بلکہ بین الاقوامی بینک اور ایل سلواڈور کو امداد جیسے متنازعہ مسائل بھی شامل تھے۔ یہ ترمیم ۱۵۰ کے مقابلے میں ۲۶۲ ووٹوں سے منظور ہوئی۔ ان ۱۵۰ مخالف ووٹوں میں سے اکثر اسرائیل کو امداد کے خلاف نہ تھے بلکہ یہ ممبران دوسرے متنازعہ امور کے خلاف تھے۔

آئندہ مئی میں راحل نے خارجہ امداد کے بل پر بحث کے دوران یہ ترمیم پیش کی کہ اسرائیل کو امداد والے یہ ۲۵۰ ملین ڈالر حذف کر دیئے جائیں' لیکن یہ تجویز ۴۰ کے مقابلہ میں ۳۷۹ ووٹوں سے نامنظور ہوئی۔ باوجودیکہ اس ترمیم کا تعلق جہاز سازی کی صنعت سے تھا لیکن پھر بھی ۱۰ فیصد سے بھی کم ممبران نے اس کے حق میں ووٹ دیا۔ یہ پچھلے چار سالوں کے دوران پہلی دفعہ ہوا کہ صرف اسرائیل کو امداد کے بل پر خصوصی رائے شماری ہو۔ اس شکست کا Margin اس معاملے میں AIPAC کی قوت کو ظاہر کرتا ہے۔

اس رائے شماری کے بعد AIPAC نے ان ۴۰ ممبران کے خلاف اجتماعی مہم شروع کی جنہوں نے اس کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ راحل کا کہنا تھا کہ AIPAC نے ان ۴۰ باہمت کانگریس ممبران کے خلاف مہم چلائی۔ تقریباً ان سبھی نے جو ووٹ دینے میں میرے ساتھی تھے' مجھے بتلایا کہ وہ اب تک اپنے یہودی رائے دہندوں سے قیامت خیز مخالفت کا سامنا کرتے ہیں' وہ اب تک اس مار کے شاکی ہیں جو ان کو سہنی پڑی۔

ان باہمت ممبران کو کسی نے بھی شکریہ نہ کہا' صرف دو نسلی گروپوں یعنی American Arab Anti Disc. Committee اور National Assoc. of Arab Americans نے راحل کو اس کے اس اقدام پر مبارکباد دی اور اپنے ممبران کو کہا کہ وہ دوسرے ۳۹ ممبران کو بھی مبارک باد کے خطوط ارسال کریں جنہوں نے اس ترمیم کا ساتھ دیا' اس کے نتائج کافی حوصلہ شکن تھے۔ راحل کو بطور اس ترمیم کے مصنف کے زیادہ خطوط ملنے چاہئے تھے لیکن اس کو صرف دس خطوط ملے اور اندازہ یہ ہے کہ دوسروں کو اس سے بھی کم ملے ہوں گے۔

کانگریس پر تکیہ نہ کریں

کانگریس میں ممبران اسرائیل پر تنقیدی لہجہ میں بات کرنے سے کس قدر ہچکچاتے ہیں اس کا ایک ثبوت ۱۹۸۳ء میں صدر ریگن کی دی جانے والی اس اجازت سے ظاہر ہے جو کہ بیروت میں امریکن Marines کو ۱۸ ماہ کے لئے لبنان میں رکھنے کے لئے دی گئی۔ یہ رائے شماری اس افسوسناک ٹرک حملہ سے چند روز پہلے ہوئی تھی جس میں ۲۴۰ سے زائد میرین مارے گئے تھے۔ جب یہ بل پاس ہوا تو اس وقت تک کئی میرین ہلاک ہو چکے تھے۔ کئی ممبران نے آئندہ مزید مشکلات کا انتباہ دیا اور ریگن پر دباؤ ڈالا کہ وہ میرین کو لبنان سے واپس بلالیں۔ پانچ ممبران نے اس کے بر مخالف اسرائیل کی شمالی سرحدوں کے تحفظ کا ذکر کرتے ہوئے اس کی حمایت کی۔ کل ملا کر ۹۱ ممبران نے تقاریر کیں لیکن اسرائیل نے لبنان کے اندر جو فوجی اقدامات سال گزشتہ کئے تھے اس کی بیروت پر بہیمانہ بمباری .P.L.O کے جنگجوؤں کا زبردستی انخلاء اور پھر فلسطینی پناہ گزین کیمپوں میں بہیمانہ قتل عام.......... اس پر سبھی نے چپ سادھے رکھی۔ ان تمام واقعات نے لبنان کا معاملہ اس قدر حساس بنادیا تھا کہ صدر ریگن میرین کو واپس بھجوانے پر مجبور ہو گئے تھے گویا دوسرے الفاظ میں میرین کا وہاں بھجوانا اسرائیل کے اقدامات کا شاخسانہ تھا۔ اس تمام بحث کے دوران ہزاروں الفاظ بولے گئے لیکن ان نازک معاملات کا ذکر بھی نہ کیا گیا۔

ایک جہاندیدہ ممبر نے بعد ازاں گذشتہ تجربہ کی روشنی میں اس کی وجہ یوں بیان کی: اس دہشت گردانہ حملہ میں بیروت میں اپنے کیمپ کے صحن میں خوابیدہ Marines مارے گئے تھے۔ کانگریس مین Lee Hamiltion سے یہ سوال پوچھا گیا کہ آیا کانگریس میرین کو لبنان سے نکالنے

کے بارے میں خود ہی کوئی ایکشن لے سکتی ہے؟ یہ سوال کانگریس مین William quandt نے اٹھایا جو کہ کارٹر انتظامیہ میں ایک چیدہ سینئر ممبران کے گروپ کا رکن تھا جس نے کیپٹل ہل پر مشرق وسطیٰ کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی تھی۔ ہیملٹن نے جو کہ کانگریس اور مشرق وسطیٰ دونوں پر گہری نظر رکھتا تھا' جواب دیا کہ مدد کے لئے کانگریس کی طرف نظریں نہ اٹھائیں۔ ہمیں تو صرف اسرائیل کو دی جا رہی امداد کو بڑھانا ہی آتا ہے۔

اس سے اگلے سال ہیملٹن کی ذیلی کمیٹی میں اسرائیل کو امداد کے بارے میں بحث و مباحثہ کافی حد تک محدود رہا اور پھر ہیملٹن کا بھی واسطہ براہ راست نہ رہا۔ فروری ۱۹۸۴ء کے اواخر میں تو اس سے ذاتی طور پر بھی کوئی مشورہ نہ کیا جاتا کہ اسرائیل کو امداد کس قدر دی جائے تاوقتیکہ یہودی ہائی کمان جس کا سربراہ فلوریڈا کا ڈیموکریٹ لیری اسمتھ تھا اس کو قبل ازیں تفصیل سے طے نہ کر لے۔ اس ہائی کمان میں دوسرے ممبران جو سبھی ڈیموکریٹ تھے' کیلیفورنیا سے Mel Levine اور Tom Lantas اور نیو جرسی کے Robert Torricelli تھے۔ ٹوری چلی جو کہ اطالوی نژاد تھا' امریکہ کے ایسے ضلع کی نمائندگی کرتا تھا جہاں یہودیوں کی بڑی اکثریت تھی۔ اس کے ساتھی ممبران اس کو پیار سے "غیر یہودی- یہودی" پکارتے تھے۔ اس گروپ کے چار ووٹ اس ذیلی کمیٹی میں ہمیشہ کافی رہتے تھے کیونکہ بقیہ چھ ممبروں میں سے کوئی بھی اسرائیل بل کے خلاف ووٹ دینا تو کجا صرف اس یہودی ہائی کمان کا فیصلہ بے چوں و چرا مان لیتا تھا۔ اس سے صاف عیاں تھا کہ اسمتھ ایک نئے ممبر ہونے کے باوصف ایوان کے ۲۹ یہودی ممبران کا عملی طور پر سربراہ تھا۔ کیا یہ امر باعث حیرت نہ تھا؟ کسی سے جب پوچھا گیا کہ ایک نئے ممبر کے لئے یہ کیونکر ممکن ہوا؟ تو اس کا جواب تھا "وہ ہمیشہ موجود رہتا ہے' کبھی میٹنگ میں ناغہ نہیں کرتا اور نہ کبھی چوکتا ہے۔"

جب اس ہائی کمان نے ہیملٹن سے اقتصادی امداد کی سطح کے بارے میں مشورہ مانگا تو اس نے صرف ایک ترمیم کی شرط پر ان کی حمایت کی حامی بھری۔ اس نے کہا کہ اسرائیل کو جو گرانٹ منظور کی جا رہی ہے وہ صرف ۲۵۰ ملین ڈالر اس رقم یعنی ۸۵۰ ملین جو انتظامیہ نے مانگی تھی بڑھائی جائے نہ کہ جیسا یہ ہائی کمان کہہ رہی ہے کہ ۳۵۰ ملین بڑھائی جائے۔ دوسرے تمام امور چونکہ وقت سے پیشتر طے ہو چکے تھے لہٰذا اس ذیلی کمیٹی نے اسرائیل کو امداد کے بارے میں فقید المثال امور بغیر کسی بحث و تمحیص کے منظور کر دیئے' اس کے بعد مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک کے بارے میں امداد پر بحث

شروع ہوئی۔ اس پینل نے ممبر Zschau کی ایک اور ترمیم بھی منظور کی جس میں کہا گیا تھا یہ رقوم اس امید کے ساتھ منظور کی جا رہی تھیں کہ رقم پانے والے ممالک امن کو فروغ دینے والی سرگرمیاں اختیار کریں اور صدر اور دیگر لوگوں نے جو پیش قدمیاں اس بارے میں کی ہیں ان کو ملحوظ خاطر رکھیں۔" AIPAC نے اپنا اثر و رسوخ یوں ظاہر کیا کہ اس ترمیم کے فل کمیٹی کے سامنے پیش ہونے سے پیشتر ہی اس کے الفاظ میں ترمیم کر کے اسے کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے ساتھ منسلک کر دیا نہ کہ صدر ریگن کی سفارشات کے۔ AIPAC کے لابسٹ Douglas Bloomfield کی تحریر کردہ یہ عبارت کمیٹی نے فقط آواز سے ووٹنگ کر کے منظور کر دی۔

جس طرح بھی اس ترمیم کو دیکھیں یہ کچھ خاص اہم نہ تھی لیکن دوسری دو ترامیم جو کہ اس لابی نے ڈرافٹ کیں اور ذیلی کمیٹی نے بھاری اکثریت سے منظور کیں وہ اس قدر غیر اہم نہ تھیں۔ پہلی ترمیم جو کہ بغیر کسی مخالفت کے منظور کی گئی یہ تھی کہ امریکن حکومت اور .P.L.O کے درمیان ہرگز کوئی رابطہ نہ کیا جائے' جب تک .P.L.O اسرائیل کو تسلیم نہ کر لے۔ اس کا مقصد ان غیر سرکاری رابطوں کو بھی ختم کرنا تھا جو کہ کارٹر اور ریگن انتظامیہ نے فلسطینی لیڈرشپ سے رکھے تھے۔ دوسری ترمیم (جو کہ ۷ بمقابلہ ۲ سے کامیاب ہوئی) کی رو سے اردن کو کوئی بھی ترقی یافتہ ہوائی جہاز یا اسلحہ بیچنے سے ممانعت کی تھی' جب تک وہ اعلانیہ طور پر اسرائیل کو تسلیم کرنے کی حامی نہ بھر لے۔ بعد ازاں جب شاہ حسین نے واشنگٹن میں اسرائیلی لابی کے اثر و رسوخ پر نکتہ چینی کی تو انہی دونوں ترامیم کا حوالہ دیا۔

اسی دوران کیلیفورنیا کے ڈیموکریٹ کانگریس مین Howard Berman نے ایک ایسے بل پر بحث شروع کروانے میں کامیابی حاصل کر لی جس سے اسرائیل کو امریکی امداد میں ایک نہایت عجیب و غریب جہت کا اضافہ کرنا مقصود تھا۔ یہ بل جون ۱۹۸۴ء میں پیش کیا گیا۔ اس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ اسرائیل کو اپنے امدادی پروگرام برائے ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کے لئے امریکہ کی طرف سے ۲۰ ملین ڈالر کی رقم فراہم کی جائے۔ اس سے اعلانیہ طور پر ان معاملات کی منظوری مل جاتی جن پر امریکن CIA خفیہ طور سے پچھلے بیس سال سے عمل پیرا تھی۔ (ملاحظہ کریں باب ۵)

فلوریڈا کے ڈیموکریٹ ممبر Larry Smith نے Bermn کے بل کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ میرے خیال میں اس سے تیسری دنیا میں امریکن وقار میں اضافہ ہوگا۔ Kensas کے ریپبلکن

ممبر Larry Winn نے اس کی ذو جماعتی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ یہ پہلے ۲۰ ملین ڈالر تو اونٹ کے منہ میں زیرہ ہو گا۔ آئندہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں کافی بڑی رقوم منظور کرنی ہوں گی' گو ۱۹۸۴ء کے دوران یہ بل کمیٹی کے پاس ہی رہا لیکن اس کے حمایتیوں کو یقین ہے کہ اسرائیل کو اس طرح کی امداد منظور ہو جائے گی۔

صاف عیاں ہے کہ جس سڑک کی طرف Winn اشارہ کر رہا تھا وہ چڑھائی کی طرف جاتی تھی۔ امریکہ کی اپنی بجٹ مشکلات کے باوصف اور اسرائیل کے سرکش رویے امریکن مہیا کردہ اسلحے کے استعمال کے بارے میں اور مقبوضہ علاقے میں آباد کاری جاری رکھنے کے باوجود اسرائیل کی امداد میں اضافہ ہی ہوتا چلا جارہا ہے اور تاحد نگاہ کمی کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا۔

باب سوئم

ایوان مباحث میں مباحثہ کا فقدان

امریکن سینیٹ اور کیپٹل ہل بلڈنگ کو ایک راہداری دوسری منزل پر آپس میں ملاتی ہے۔ یہاں پر زائرین کھڑے ہو کر چشم تصور سے ماضی کی یادگار بحثوں کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ یہ پرانے سینیٹ کی بحال کردہ عمارت ہے' یہاں کی گئی بحثوں نے ہی اسے دنیا کا عظیم ترین ایوان مباحث ہونے کی شہرت عطا کی تھی۔ یہاں ہر معاملہ پر کھلی بحث ممکن تھی۔

تقریباً ہر لحاظ سے یہ اس شہرت کی مستحق تھی۔ جن پانچ سینیٹرز یعنی Robert, Henry Clay, Daniel, Daniel Webster, John C. Calhaun, La Follette اور Robert Teft' جن کی تصاویر سے اس کے ریسیپشن روم مزین ہیں۔ وہ سب اپنی علو ہمتی اور آزادی اظہار کی وجہ سے ممتاز ہوئے تھے نہ کہ تقلید پرستی سے۔

اب یہ عالم ہے کہ کم از کم مشرق وسطی کی حد تک علو ہمتی اور آزادی اظہار بالکل معدوم ہے۔ سینیٹ میں بحث تو ہوتی ہی نہیں۔ یہ موضوع ایک مرتبہ اردن کے ولی عہد شہزادہ حسن اور روہوڈ آئی لینڈ کے سینیٹر Claiborne Pell (جو کہ سینیٹ کی امور خارجہ کمیٹی میں ایک سینئر ڈیموکریٹ ممبر تھا) کے درمیان ناشتہ کی میز پر زیر بحث آیا۔ Pell نے بہت بے لاگ طریقہ سے اسرائیل کو اپنی لگاتار حمایت اور عرب مفادات کو نظر انداز کرنا۔ شہزادہ حسن کو یوں بتلایا "میں آپ کے ساتھ ایمانداری تو برت سکتا ہوں لیکن انصاف نہیں کر سکتا۔" اس بارے میں Pell کا ریکارڈ اس کے ساتھیوں جیسا ہی ہے۔

۱۹۴۸ء میں جدید اسرائیل کے قیام کے بعد صرف مٹھی بھر سینیٹرز کو ہی اسرائیلی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف بولنے یا کچھ کرنے کی توفیق ہوئی ہے۔ اس بارے میں جو ذرا بھی انحراف کرتے

ہیں وہ مشکلات میں گھر جاتے ہیں۔ یہ مصیبت کسی تقریر' ترمیم' ایک ووٹ یا کسی تحریری اشاعت یا ان کے کسی بھی آمیزہ سے وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔ یہ آئندہ پرائمری یا عام انتخابات میں مقابلے کا شاخسانہ ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مصیبت قدرے دیر سے کھڑی ہو حتیٰ کہ سینیٹ میں تعیناتی ختم ہونے کے بعد بھی Illinois کے سینیٹر کے ساتھ یہی ہوا۔

ایڈلائی تم ٹھیک کہتے ہو لیکن...!

اکتوبر ۱۹۸۲ء کے "جیوش شکاگو" کے سرورق پر ایڈلائی سٹیونسن (سوم) کا پورٹریٹ چھپا تھا جو کہ الی نوائے کی گورنری کا ڈیموکریٹ امیدوار تھا۔ اس کے پس منظر میں ایک کافیہ پوش عرب کی تصویر تھی جس کے کاندھے پر رائفل لٹکی تھی اور سر منہ کا بیشتر حصہ مستور تھا۔ اس شمارے میں جو مضمون تھا اس کا عنوان تھا "ایڈلائی کا نظارہ یہودی آنکھوں سے۔"

یہ مضمون اور تصویر سٹیونسن مخالف مہم کا حصہ تھی جو شکاگو کی 2.5 لاکھ کے قریب یہودی آبادی اس مقصد سے چلا رہی تھی کہ ایڈلائی اسٹیونسن اپنے حریف گورنر جیمز آر تھامپسن جونیئر سے مات کھا جائے۔

سٹیونسن دس سال سینیٹ میں ڈیوٹی دینے کے بعد سیاسی مراجعت کی کوشش کر رہا تھا۔ سینیٹ میں اس نے جلد ہی اپنے لئے بطور آزاد ممبر جگہ بنالی تھی۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے وسط میں جب تیل کی قلت ہوئی تو اس نے تاجر برادری کو یہ تجویز پیش کر کے چونکا دیا تھا کہ تمام خام تیل کی ترسیل' درآمد کے لئے سرکاری کارپوریشن بنا دی جائے۔ اس نے یہ انتباہ بھی کیا کہ جوہری ہتھیاروں کی تیاری کا پھیلاؤ اپنے اندر تباہی و بربادی کا سامان لئے ہوئے ہے' لہٰذا ہمیں بین الاقوامی تحفظات مہیا کرنے چاہئیں تاکہ دوسری اقوام کو جوہری اسلحہ کی تیاری سے باز رکھ سکیں۔ امریکی حکومت کی بین الاقوامی مارکیٹ میں گرتی ہوئی ساکھ کا ذکر کرتے ہوئے اس نے تجویز دی کہ قومی معاشی پالیسیاں حکومت کے زیر اثر بنائی جائیں تاکہ ہم غیر ملکی چیلنج کا سامنا کر سکیں۔

سٹیونسن دوسرے کئی سیاستدانوں کی طرح شعلہ بیان اور صاف گو نہ تھا۔ "Time" رسالے نے اسے ایک "قدرے سنجیدہ شخص جو کہ سیاسی میدان میں کچھ موزوں نہیں لگتا" قرار دیا تھا۔ وہ کمیٹی کے کام میں مؤثر تھا جہاں زیادہ تر قوانین ترتیب پاتے ہیں لیکن ووٹ جمع کرنے میں وہ اتنا مؤثر نہ تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ میں پیچھے پڑنے والا یا درباری ٹائپ نہیں ہوں اور سینیٹرز کو گھیر گھار کر لانا میرا شعار نہیں۔

"شکاگو ڈیلی نیوز" کے کالم نویس Mike Royko نے اسٹیوسن کی سادگی کا خوش دلی سے مذاق اڑاتے ہوئے لکھا کہ سیاست میں Charisma سب سے خطرناک عنصر ہے' یہ لوگوں کو بغیر معقول وجہ کے جوش میں لاتا ہے۔ ایڈلائی اسٹیوسن کبھی ایسا نہیں کرتا' وہ لوگوں کو غنودگی میں لاتا ہے' اس کے بال کم ہو رہے ہیں' وہ ایک الجبرا کے استاد جتنی ہی چرب زبانی دکھلا سکتا ہے۔ اس کا پہناوا لگتا ہے کہ اس نے کسی کفن فروش سے خریدا ہے۔ جب وہ خوش ہوتا ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے اس پر کسی وائرس کا حملہ ہوا ہے۔ ہمیں مزید ایسے سیاست دانوں کی ضرورت ہے جو ہمارے خون کو نیم گرم رکھیں۔

Rokyo یہ بھی ایزاد کر سکتا تھا کہ اسٹیوسن میں اس خود پارسائی کا بھی فقدان ہے جو کہ کیپٹل ہل پر اکثر پائی جاتی ہے۔ وہ حالانکہ Blue Blood ہے یعنی طبقہ امراء سے اتنا قریب تھا جتنا کہ امریکہ میں ممکن ہے' لیکن اسے کاک ٹیل پارٹیوں اور سیاسی اشتہار بازی سے کچھ علاقہ نہ تھا۔ ۱۹۷۵ء کے دورہ چین کے دوران اس کے سابق سینیٹروں کو جھالریں لگی لموزین دی گئی اور اسے مع بیوی کے ایک سادہ گاڑی الاٹ ہوئی لیکن اس نے ذرا بھی پرواہ نہ کی۔

وہ اپنی سینیٹ کی دوسری باری کے دوران کارٹر انتظامیہ سے بددل ہو گیا۔ وہ اپنی بچی کھچی طاقت کو مجتمع رکھنے میں دلچسپی رکھتا تھا نہ کہ اسے مؤثر طور پر استعمال کرنے میں۔ ۱۹۷۹ء میں اس نے اعلان کیا کہ وہ دوبارہ سینیٹ کے لئے انتخاب نہ لڑے گا' البتہ اس نے ایک نیا شوق ظاہر کیا' وہ یہ کہ صدر کے لئے امیدواری۔ شاید وہ اگلے برس صدر کے لئے انتخاب میں حصہ لے۔ "میں خیالات و تصورات کے بارے میں بات کروں گا اور یہ دیکھوں گا کہ آیا اب بھی خیالات و تصورات کامیاب ہو سکتے ہیں یا ان سے کچھ فرق پڑتا ہے" لیکن فرق نہ پڑا۔ آخر کار اسٹیوسن نے انتخاب میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ایڈورڈ کینیڈی کے میدان میں ہوتے ہوئے اسے ذرائع ابلاغ کہاں پوچھیں گے اور جب تک کینیڈی کنارہ کشی کرے اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ اپنے آپ کو تیار نہ کر سکتا تھا۔

سال بھر قدرے آرام کرنے کے بعد ۱۹۸۱ء میں اس نے الی نوائے کی گورنری کے انتخاب میں حصہ لینے پر دلچسپی کا اظہار کیا' اس دفعہ اس نے اسے عملی جامہ پہنایا۔ اس کی انتظامی ٹیم کی ہیئت انتخابی مہم کا کردار اور گذشتہ امداد جو اس کو اپنے حلقے کے ووٹروں سے مل رہی تھی' یہ سب عناصر اس

مخالفت کی نشاندہی نہ کر سکے جو اسے اسرائیل نواز حلقوں کی طرف سے پیش آئی۔ اس کی انتخابی مہم کی ٹیم کے بیشتر اہم ممبران یہودی تھے۔ مثلاً Philip Klutznick جو کہ B'nai B'rith کا اعزازی صدر تھا۔ وہ Major Jewish Organisation کے صدور کا بھی منتظم تھا جس نے اسٹیوسن کی انتخابی مہم کے بڑے ڈنر کا انتظام کرنے کی حامی بھری تھی۔ ملٹن فشر اس کی فنانس کمیٹی کا صدر اور ایک مشہور قانون داں تھا۔

Rick Jasculca (ابلاغ عامہ کا Executive) اس کا کل وقتی پریس سیکریٹری بنا۔ اسٹیوسن نے Grace Mary Stern کو بطور لیفٹیننٹ گورنر اپنا انتخابی ساتھی چنا۔ اس کا شوہر شکاگو کے یہودی حلقوں میں ایک معروف شخصیت گنا جاتا تھا۔ اسٹیوسن کو خود بھی گذشتہ سالوں میں یہودی حلقوں کی طرف سے کئی اعزازات مل چکے تھے۔ شکاگو کی یہودی آبادی نے ۱۹۷۴ء میں اسے اسرائیل بانڈز کا Man of the Year قرار دیا تھا۔ ۱۹۷۷ء کے اسرائیل مخالف عرب بائیکاٹ کے بارے میں قانون سازی پر امریکن جیوش کمیٹی نے اس کی تعریف کی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ اسرائیلی حکومت نے بھی اسے نوازا تھا اور Rehovot میں وائیزمین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس میں اس کے نام پر "Adlai E. Stevenson III Chair" قائم کی تھی۔ اسٹیوسن کو پورا پورا یقین تھا کہ الی نوائے کی منظم یہودی آبادی اس کے کبھی کبھار نہایت معمولی اسرائیل مخالف تنقیدی رویے کو نظرانداز کر دے گی، لیکن مصیبت آ کر رہی۔

یہودیوں کے ایک حلقہ نے خاموشی سے ایک حملہ شروع کیا جو کارگر رہا۔ ان مخالفین نے ہر قیمت پر اسٹیوسن کو گورنری کی مہم میں مات دینے کا تہیہ کر رکھا تھا تاکہ وہ آئندہ صدر بننے کے ارادہ سے باز رہے۔ اس کام کے لئے ان کا بنیادی ہتھیار وہ دستاویز تھی جو کہ AIPAC نے واشنگٹن سے مہیا کی۔ اس میں اسٹیوسن کے ان اقدامات کا خلاصہ درج تھا جو اس نے سینیٹ میں مشرق وسطیٰ کے موضوع پر کئے، لیکن اس میں اس کی اسرائیل کے حق میں لگاتار حمایت کا ذکر بالکل نہ تھا اور نہ ہی یہ تذکرہ کہ یہودیوں نے اظہار تشکر کے طور پر اس حمایت کے بدلے میں کیا خراج تحسین پیش کیا تھا۔ AIPAC کی تمام دوسری دستاویزات کی طرح یہ بھی توازن اور معروضیت سے عاری تھی۔ مثال کے طور پر AIPAC نے اسٹیوسن کی ۱۹۷۶ء مشرق وسطیٰ یاترا کا صرف ایک اکلوتا فقرہ چنا تھا کہ "P.L.O. کے علاوہ اور کوئی بھی تنظیم نہیں ہے جسے عمومی طور پر فلسطینیوں کی نمائندہ مانا جاتا ہو" یہ ایک حقیقت

کا اظہار تھا۔ لیکن "جیوش شکاگو" کے تجزیہ نگار نے AIPAC "خلاصے" کی بنیاد پر یہ رائے دی کہ ان الفاظ کی وجہ سے اسٹیوسن اسرائیل کے سخت ترین نکتہ چیں اور اسرائیل کو امریکی امداد کے ناقد کی شہرت رکھتا ہے' یعنی فلسطینیوں میں .P.L.O کی حمایت کو اسرائیل پر حملے کا مترادف مانا گیا تھا۔

اصل میں سٹیوسن کا پورا پیرا اس رپورٹ میں (جس میں سے AIPAC نے یہ اقتباس لیا) کافی معقول نظر آتا ہے:

"اس پر عام اتفاق ہے کہ فلسطینی اس مسئلے کا چھوٹا سا گمشدہ ٹکڑا ہیں۔ گو وہ بے حد منتشر ہیں لیکن تعداد میں بڑھتے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی معاشی حالت اور فوجی قوت اور مقصد سے لگن میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے کسی بھی حل میں ان کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ جیسے وہ خود غیر متحد ہیں ویسے ہی ان کی اعلیٰ سطح قیادت بھی انتشار کا شکار ہے' لیکن .P.L.O کے علاوہ اور کوئی ایسی تنظیم بھی موجود نہیں جسے عمومی طور پر فلسطینیوں کی نمائندہ تسلیم کیا جا سکے۔"

اس رپورٹ میں سٹیوسن نے اسرائیل کی بعض حکمت عملیوں پر تنقید کی تھی لیکن وہ "اسرائیل دشمن" نہ تھی۔ بقول اس کے "ہم بھلے سے .P.L.O سے بے اعتباری' لاتعلقی یا نفرت کا اظہار کریں لیکن وہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو یہی کہ کوئی دوسری متبادل تنظیم فلسطینیوں میں موجود ہی نہیں۔"

سٹیوسن نے مزید ایک چیلنج امریکہ کے سیاسی لیڈروں کو پیش کیا:

> "انتظامیہ اور مقننہ دونوں سے ایک نئے انداز کی قیادت کا تقاضا ہے۔ اب حد ہو چکی ہے کانگریس کی بدانتظامی کی اور مشرق وسطیٰ کے اصلی مسائل سے لاعلمی کی۔ وقت آ گیا ہے کہ اس بات کا احساس کیا جائے کہ الیکشن کے سال کے دوران مسئلہ کے اصل پہلو کو نظر انداز کرنے سے نہ امریکہ کا کوئی فائدہ ہے اور نہ اسرائیل یا کسی بھی عرب ریاست کا۔"

ان مثبت تبصروں میں سے کسی کو بھی "جیوش شکاگو" کے مضمون میں جگہ نصیب نہ ہوئی اور نہ ہی اس کا ذکر اس سٹیوسن مخالف لٹریچر میں کیا گیا جو کہ ۱۹۸۲ء کے گورنری مہم میں تقسیم کیا گیا۔ سٹیوسن مخالف شدت پسندوں نے اس بات کو خطرناک قرار دیا کہ ۱۹۸۰ء میں سٹیوسن نے اسرائیلی امداد میں کمی کی ترمیم پیش کی تھی اور گزشتہ سال سینیٹر Mark G. Hatfield کی ایسی ہی ترمیم کی حمایت کی تھی۔ اس ترمیم میں Hatfield نے صرف اسرائیل کی فوجی امداد میں دس فیصد کٹوتی کی تجویز

پیش کی تھی۔

سٹیونسن کی ترمیم نے اسرائیلی مقبوضہ علاقے میں یہودی بستیاں تعمیر کرنے پر توجہ مرکوز کرائی تھی۔ یہ چیز صدر کارٹر نے بھی اور پچھلی انتظامیہ نے بھی غیر قانونی قرار دی تھی اور اسے امن کے لئے رکاوٹ قرار دیا تھا' لیکن سوائے کبھی کبھار اظہار افسوس کرنے کے اس اقدام کو روکنے کے لئے کچھ نہ کیا گیا۔ سٹیونسن نے یہ ترمیم پیش کی تھی کہ اسرائیل کو ۱۵۰ ملین ڈالر کی امداد روک دی جائے تاوقتیکہ وہ مزید بستیاں تعمیر کرنا یا ان کا منصوبہ بنانا بند کر دے۔ یہ ترمیم امداد کو کم کرنے کے لئے نہیں تھی بلکہ کل 2.18 بلین ڈالر کی اسرائیلی منظور شدہ امداد کے ایک چھوٹے سے حصہ کو معطل' ملتوی کرنے کے لئے تھی۔ اس ترمیم پر اظہار خیال کرتے ہوئے سٹیونسن نے نوٹ کیا کہ دنیا بھر میں اس مقصد کے لئے دی جانے والی امریکی امداد کا ۴۳ فیصد اکیلے اسرائیل کو دیا جا رہا ہے:

> "امداد کے لئے اسرائیل کو یوں ترجیح دینے سے انسانی ہمدردی اور دیگر اہم امریکی مفادات پر زد پڑتی ہے جو کہ آج کل کے متغیر اور باہمی انحصار والی دنیا میں بہت اہم ہے۔ اگر اس سے مشرق وسطیٰ میں استحکام پیدا ہوتا ہو یا اسرائیل کی سلامتی مزید مؤثر ہو جائے تو یہ جائز ہے۔ لیکن یہ امداد امریکہ کی نیم رضامندی ظاہر کرتی ہے' ایک ایسی اسرائیلی حکمت عملی کی جس سے مشرق وسطیٰ میں استحکام میں کمی' اسرائیل کی سلامتی غیر مؤثر اور امریکن اقتدار میں دنیا بھر میں کمی ہو رہی ہے۔ مسئلہ زیر بحث اسرائیل کو امداد کا نہیں بلکہ امن و انصاف کے جن اصولوں پر اسرائیل قائم ہوا وہ زیر بحث ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا اسرائیلی حکومت کا کام ہے کہ وہ اپنے مفادات کو ہمارے ہم آہنگ کرے اور یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ ہم اسرائیل میں امن کے لئے اٹھتی آوازوں کو دبانے میں حصہ نہ لیں یا مسٹر بیگن جیسے افراد کی بات کو سچ ثابت کریں' جو یہ کہتے ہیں کہ کانگریس میں اسرائیل کے لئے امداد ایک طے شدہ امر ہے۔"
>
> یہ ترمیم بھی Hatfield کی ترمیم کی مانند بھاری اکثریت سے نامنظور کی گئی۔

ایڈلائی سٹیونسن کا کہنا ہے کہ اس ترمیم پر رائے شماری ہو جانے کے بعد اسے کئی معذرتیں ملیں۔ متعدد سینیٹرز نے میرے پاس آکر کہا "ایڈلائی! تم کہتے تو سچ ہو لیکن یہ بھی سمجھتے ہو گے کہ میں نے ووٹ مخالف میں کیوں دیا' شاید اگلی دفعہ "سٹیونسن کو پتہ تھا کہ یہ منفی ووٹ لابی کے خوف کے زیر اثر تھے۔' ایک دوسرے محاذ پر بھی اسے اسی طرح دھاندلی کا سامنا تھا یعنی ذرائع ابلاغ میں۔ اس

نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس نے ترمیم اس لئے پیش کی تھی کہ میرے خیال میں اس اہم موضوع پر بحث و مباحثہ عوام کا حق تھا لیکن خبر رساں اداروں نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا۔

یہ اس مسئلے کا ایک دوسرا پہلو ہے۔ یہ دھمکیاں صرف امریکن سیاستدانوں تک محدود نہیں بلکہ یہ امریکن صحافیوں کے لئے بھی ہیں اور اگر صحافیوں کے لئے نہیں تو پھر ایڈیٹروں بلکہ خصوصاً ناشرین کے لئے ہیں۔ سٹیوسن مخالف جنگجوؤں نے اسے عرب معاشی بلیک میل کے حامی کے طور پر پیش کیا' حالانکہ سب کو علم ہے کہ اس کا عرب مخالف قانون سازی میں کتنا زیادہ ہاتھ تھا۔ یہ سٹیوسن ہی تھا جس نے ۱۹۷۹ء میں وہ مسودہ قانون بنایا تھا جس کی رو سے امریکن کمپنیوں کو اسرائیل مخالف عرب بائیکاٹ میں تعاون سے منع کیا گیا تھا۔ لیکن گورنری کے لئے اس مہم کے دوران اس پر جو کیچڑ اچھالا گیا اس میں اس کی قانون سازی کے ریکارڈ کو بھی مسخ کر دیا گیا۔ اس پر الٹا یہ الزام دھرا گیا کہ اس نے بائیکاٹ مخالف کوششوں کو سبوتاژ کیا تھا۔

درحقیقت سٹیوسن نے تنہا جدوجہد کر کے اس قانون کا بیڑہ غرق ہونے سے بچایا تھا۔ اس کی اسی شاندار کوشش کو امریکن جیوش کمیٹی نے خراج تحسین پیش کیا تھا اور ایک کتبہ پیش کیا تھا۔ نیشنل جیوش کونسل کے چیئرمین R. Mann Theodore نے اپنی تنظیم کی طرف سے شکریہ کے خط میں لکھا کہ اس اہم سنگ میل قانون کے منظور کروانے کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں اور مزید کہا "اس سے امریکہ کے یہودی فرقہ کو نہ صرف تسلی ملی کہ امریکہ بین الاقوامی تجارت میں ایمانداری اور رواداری کا حمایتی ہے بلکہ بنیادی اہمیت اس بات کی ہے کہ ہماری قوم اصول پسند اور بااخلاق ہے۔"

جیوش شکاگو نے سٹیوسن کی ان بائیکاٹ مخالف کامیابیوں اور یہودی لیڈروں کی اس بارے میں تعریفوں کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے لکھا کہ اسے اس بارے میں امریکن جیوش لیڈروں سے بائیکاٹ مخالف قانون سازی میں متعدد بار مخالفت کا سامنا رہا۔

ایک چھوٹے سے اشتہار میں جو کہ ایک غیر معروف "Informed Citizens against Stevenson Committee" نے شائع کیا تھا' یہی الزام دہرایا گیا۔ "ایڈلائی سٹیوسن کی حقیقت" کے عنوان سے اس میں نیم سچ باتوں کا سہارا لے کر الزام لگایا گیا کہ سٹیوسن سینیٹ کی رکنیت کے دوران اسرائیل مخالف رہا۔ آخر میں کہا گیا تھا کہ یہودی ووٹروں کو سٹیوسن کے ریکارڈ کے بارے میں آگاہ کرنا انتہائی اہم ہے۔ اکثر یہودی اب بھی اس کے نام سے خیرہ ہو کر یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ

کس قدر یہود دشمن ہیں۔ اس نام نہاد کمیٹی نے اپنے ممبران کے نام اور پتے ظاہر نہیں کئے تھے' بعد ازیں شکاگو کی آزاد صحافی Shirley Friedman نے اس تصنیف کی ذمہ داری قبول کی۔ اشتہار کے آخر میں تھا "یاد رکھئے! سب یہ جانتے ہیں کہ سٹیوسن کے لئے گورنری صدارت تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے۔ سب کو بتلایئے' سچ کو ظاہر ہونے دیجئے۔"

۱۹۸۲ء کے موسم گرما اور خزاں میں اس بات کو شکاگو کے یہودی حلقوں میں خوب خوب تشہیر دی گئی۔ شکاگو سن کے سیاسی مدیر نے جون میں یہ خبر دی کہ Thompson کے چند متحرک کارکن کئی مہینوں سے ایک گروہ خاموشی سے اکٹھا کر رہے تھے تاکہ یہودی ووٹروں کو سٹیوسن مخالف تحریک دی جا سکے۔ ان کوششوں کے نتیجہ میں "The coalition for Re-election of Jim Thompson" کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں وہ یہودی ڈیموکریٹ بھی شامل تھے جنہوں نے اس سے پہلے تھامپسن کی حمایت نہیں کی تھی۔ جب ریپبلکن سینیٹر Rudy Boschwitz (Minn) نے اکتوبر میں شکاگو آ کر ایک ناشتہ پارٹی میں شرکت کی جو اس کولیشن نے منعقد کی تھی تو اس نے کہا کہ بطور سینیٹر سٹیوسن ہمیشہ اسرائیل کی امداد کا دشمن رہا ہے۔

طعنہ زنی و کیچڑ اُچھالنا

ایک بڑا مسئلہ وہ غیر مطبوعہ کانا پھوسی کی مہم تھی کہ سٹیوسن Anti-Semetic تھا' حالانکہ وہ ایسا شخص تھا جس نے تمام عمر اپنے والد کی مانند ہمیشہ تمام امریکنوں کے شہری حقوق کے لئے آواز بلند کی۔ سٹیوسن کا کہنا تھا کہ اسے انتخابات کے دوسرے دن اس بات کا علم ہوا کہ یہ افواہ ساری مہم کے دوران پھیلائی گئی۔ سٹیوسن کی انتخابی مہم میں کام کرنے والی ایک خاتون Mrs. Battylu Saltzman جو کہ Mr. Phil Klutznick کی بیٹی تھی' کہتی ہے "اس کے Anti-semetic ہونے کے بارے میں کافی مواد پھیلایا گیا تھا۔ یہ بد سے بدتر ہوتا گیا' یہ ایک ایسا بڑا مسئلہ بن گیا جو ہمارے تصور سے بھی باہر تھا۔" سٹیوسن کی انتخابی ساتھی Stean Grace Mary کا کہنا ہے "یہودی حلقوں میں ایک زبردست مہم (سٹیوسن کے خلاف) فون پر جاری تھی۔" بقول اس کے یہودی معبدوں میں ہر جگہ سٹیوسن کے اسرائیل مخالف ہونے کے بارے میں بڑی تعداد میں اشتہار بانٹے گئے اور اس Anti-semetic کے موضوع پر بہت بحث و مباحثہ ہوا۔ یہ مہم بڑے زوروں سے چلی۔ ایک سے دوسرے کو' دوست سے

دوست کو' ایک لاکر روم سے دوسرے لاکر روم کو' ہم تو اس سے زچ ہو کر رہ گئے۔

لا محالہ اس کا اثر انتخابی چندہ جمع کرنے پر پڑا۔ پہلے یہودی حلقوں نے دونوں مرتبہ سٹیوسن کی سینیٹ انتخابی مہم میں امداد کی تھی لیکن سینیٹ کے آخری سال میں اس کے بیانات سے یہ امداد کافی کم ہو گئی۔ سٹیوسن کا کہنا تھا کہ زیادہ ترفیاض یہودی تو میرے ساتھ ہی رہے لیکن تنظیمی ٹائپ کے یہودی اور زیادہ پیشہ ور مجھے چھوڑ گئے۔ اس کا خیال تھا کہ اس منظم یہودی مخالفت نے ریاست سے باہر سے آنے والی مالی امداد کو بھی کم کر دیا و گرنہ زیادہ رقم آتی۔ آخر کار تھامپسن جو رقم خرچ کر پایا وہ سٹیوسن کو ملنے والے چندہ سے دس گنا سے بھی زائد تھی۔

اوائل ستمبر تک ان من گھڑت Anti-semetic الزامات سے زچ ہو کر سٹیوسن نے ردّعمل ظاہر کیا اور کہا کہ تھامپسن کے حواری اس کے خلاف خفیہ طعنہ زنی اور کیچڑ اچھال رہے تھے۔ اس کے پریس سیکریٹری Rick Jasculcas نے شکایتاً کہا کہ جم کی انتخاب مکرر کی کولیشن یہ تاثر ابھار رہی ہے جیسے Adlai سراسر اسرائیل مخالف ہے۔ تھامپسن کے سیاسی ڈائریکٹر Phlilp O'Connor نے اس کیچڑ اچھال مہم سے اور Friedman کے اشتہار سے اپنی لاتعلقی ظاہر کی۔

تھامپسن نے خود سٹیوسن کے بارے میں کہا کہ میرا یہ خیال نہیں کہ وہ Anti-semetic ہے' البتہ اسرائیل کا کچھ خاص دوست بھی نہیں۔ شکاگو سن ٹائمز نے ادارتی طور پر مذمت شائع کرتے ہوئے لکھا "یہ تو وہی بات ہوئی کہ میرا خیال نہیں کہ سٹیوسن اپنی بیوی کو پیٹتا ہے لیکن پچھلے ہفتہ اس کی آنکھ سوجی ہوئی تھی۔" اداریہ میں مزید لکھا تھا "زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ بیان سچ نہیں ہے۔ سٹیوسن نے کبھی کبھی اسرائیلی حکومت کے اختیار کردہ موقف سے روگردانی ہو سکتا ہے کہ ہو۔ لیکن اس کی بنیاد معقول وجوہ اور مشرق وسطیٰ میں ایک مستقل امن قائم کرنے کی مخلصانہ خواہش تھی۔ تھامپسن کا اس طرح گول مول بات کرنا اپنے ووٹروں کی توجہ مبذول کرانے کا ایک بھونڈا انداز تھا جس میں ووٹر اپنے امیدوار کی اہمیت ایک لچکدار معیار پر پرکھتے ہیں۔ صرف ان یہودیوں نے اس حملے کے دفاع کی کوشش کی جو سٹیوسن کے قریبی دوست تھے۔ Philip Klutznick (مشہور یہودی ماہر اور سٹیوسن ڈنر کمیٹی کا صدر) کا کہنا تھا "ایسے معاملات کو گورنری کے لئے انتخاب کی مہم میں اٹھانا یہودی فرقہ کے لئے ایک نیچ حرکت ہے۔" سٹیوسن کی مہم کے خزانچی ملٹن فشر کا کہنا تھا "اغلباً ایڈلائی کے نظریات اسرائیلی کنشت (پارلیمنٹ) کے ۴۰ فیصد ممبران سے ہم آہنگ ہیں۔"

آخر کار سٹیوسن کو شکست کا سامنا ہوا۔ یہ الی نوائے کی تاریخ میں سب سے زیادہ مختصر مارجن کی شکست، فتح تھی۔ گنتی میں صرف ۵۰۷۵ کا فرق رہا' یعنی ۳۵ لاکھ کل ڈالے گئے ووٹوں میں سے ایک فیصد کا ساتواں حصہ۔

اس الیکشن میں کچھ ایسی عجیب و غریب بے قاعدگیوں کا سلسلہ ہوا کہ رسالہ "Times" نے اسے بیان کرتے ہوئے لکھا "اس قدر غیر ممکن' اتنی اتفاقیہ اور اتنی قابل اعتراض باتوں کا ایک ساتھ ہونا طلسم کدہ میں ممکن تھا یا پھر Windy City میں" الیکشن کی رات شکاگو کے ۱۵ حلقوں سے بیلٹ بکس پراسرار طور پر غائب ہو گئے اور چند اور' انتخابی کارکنوں کے گھروں یا کاروں میں پائے گئے۔ سٹیوسن نے دوبارہ گنتی کے لئے کہا کیونکہ گذشتہ کئی مکرر گنتیوں میں پانچ سے سات ہزار تک کا فرق نکلا تھا' لیکن الی نوائے کی سپریم کورٹ نے ۴ بمقابلہ ۳ کے ووٹ سے یہ درخواست رد کر دی۔ ایک ڈیموکریٹ جج Seymour Simon نے اپنا ووٹ تین ریپبلکن ججوں کے ساتھ ملا کر سٹیوسن کے خلاف فیصلہ کروایا۔

الیکشن کے بعد ایک اداریے میں شکاگو کے ایک مضافاتی اخبار نے لکھا کہ اس کیچڑ اچھالنے کی مہم کا انتخابی نتائج پر برا اثر پڑا۔ اس کے الفاظ میں "شکاگو کے یہودی حلقوں کی بروقت اور شدید جدوجہد نے سٹیوسن کی گورنر تھامپسن کو تبدیل کرنے کی کوشش پر پانی پھیر دیا۔ انتخاب سے پیشتر اختتام ہفتہ میں کئی یہودیوں اور مضافاتی یہودی ربیوں نے سٹیوسن کے خلاف تقریریں کیں اور یہودی علاقوں میں ہزارہا پمفلٹ اور اشتہار تقسیم کئے گئے جن میں سابقہ سینیٹر پر حملے کئے گئے تھے۔" ان حملوں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد اداریہ کا اختتامی جملہ تھا "سٹیوسن کے خلاف یہ شدید مہم شکاگو شہر کے ۲۴۸۰۰۰ ووٹران پر اثر انداز ہوئی ہو گی۔ ساری ریاست میں مجموعاً ۲۶۶۰۰۰ ووٹر یہودی تھے اور خاص طور پر جبکہ اس کا توڑ نہ کیا گیا۔ یہ وہ ووٹ تھے جو کہ روایتی طور پر پہلے اس کی حمایت میں ڈالے جاتے تھے۔"

سٹیوسن کا منیجر Joseph Novak اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے "اگر یہ کوشش نہ کی گئی ہوتی تو سٹیوسن آج گورنر ہوتا۔" شکاگو کے اطراف میں ہائی لینڈ پارک اور لیک کاؤنٹی بھاری یہودی اکثریت کے مضافات تھے' بقول پریس سیکریٹری Rick Jasculca "وہاں تو ہمارا بیڑہ ہی غرق ہو گیا۔ زیادہ تشویش مجھے اس بات پر ہے کہ ماسوائے Phil Klutznick کے کسی بھی دوسرے یہودی لیڈر

کو یہ کہنے کی توفیق نہ ہوئی کہ ایڈلائی سٹیوسن کو اسرائیل مخالف کہنا بالکل نامعقول بات ہے۔"

AIPAC کے ایگزیکٹیو ڈائریکٹر تھامس اے. ڈائن نے فخر سے کہا "ایڈلائی سٹیوسن کے بطور سینیٹر اسرائیل مخالف رویہ نے اس کے الی نوائے کے یہودی ووٹروں کو ناراض کیا اور یہی وجہ تھی کہ وہ گورنر نہ بن سکا۔" سٹیوسن کا بھی یہی خیال ہے کہ یہودی حلقوں میں اس کے خلاف پروپیگنڈہ کا اس شکست میں بڑا ہاتھ تھا۔ اس قدر سخت اور برابر کے مقابلے میں یہ بھی پانسہ پلٹنے کے لئے کافی تھا۔ اسرائیلی لابی کے امریکن سیاسی منظر پر اثر کے بارے میں اس نے بلاجھجک جواب دیا کہ امریکی یہودیوں کی ایک چھوٹی سی فعال / متحرک اور دھونس ڈالنے والی اقلیت اسرائیلی حکومت کے ہر جائز و ناجائز فیصلے کی حمایت کرتی ہے۔ یہ کام وہ بہت جارحانہ انداز اور بلند آہنگی سے کرتی ہے تاکہ دوسرے خوف زدہ ہو جائیں اور اقلیت میں ہونے کے باوجود یہ انہی کی آواز ہے جو کہ امریکی سیاست میں گونجتی اور اثرانداز ہوتی ہے۔ یہ آواز امریکہ میں اس سے بھی زیادہ اونچی ہے جتنی کہ اسرائیل میں دوسرے الفاظ میں اسرائیل کے اندر اختلاف رائے زیادہ شدید اور جاندار ہے بہ نسبت امریکہ کے۔ اسرائیل کے وزیراعظم کو امریکن خارجہ پالیسی برائے مشرق وسطیٰ پر زیادہ دسترس حاصل ہے بہ نسبت خود اپنی حکومت کی پالیسیوں کے۔

سابقہ سینیٹر اس معاملے میں یہودیوں کے اندر ایک گہری تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ یہودیوں کی شہری حقوق اور معاشرتی بہبود مختصراً یہ کہ آزادروی کے بارے میں گہری دلی وابستگی اب قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔ اب مسئلہ صرف اور صرف اسرائیل ہے۔ اب اگر انہیں کہا جائے کہ وہ روایتی آزادروی کا جذبہ اور اسرائیل میں سے کسی ایک کا چناؤ کریں تو وہ اسرائیل کو چنیں گے۔

سٹیوسن یادرفتہ کرتے اور جو قیمت اسے چکانا پڑی' اسرائیلی پالیسیوں کو چیلنج کرنے پر آخر میں کہتا ہے "مجھے یہی کچھ جاری رکھنے پر قطعاً کوئی تذبذب نہیں۔ کاش میں یہ اور پہلے شروع کر دیتا تو اور زیادہ مؤثر ہوتا۔ میرے خیال میں عوامی خدمت کا کیا فائدہ' جب آپ عوام کی خدمت نہ کر سکیں' بہتر ہے کہ آپ ہار جائیں۔ کچھ بھی خدمت نہ کرنا بہتر ہے بہ نسبت اپنے آپ کو گروی رکھنے کے یا مشکوک رویہ اختیار کرنے کے۔" سٹیوسن نے بھی اپنے ایک ساتھی سینیٹر کی روایت پر عمل کیا تھا جو کہ Arkonsas کا مشہور سینیٹر تھا اور کئی سالوں تک اسرائیل پر تنقید کرتا رہا اور امریکی خارجہ پالیسی پر بھی۔

غیر مقلد

"جب ہم سب مرکھپ چکے ہوں گے تو صرف William Fulbright ہی لوگوں کو یاد رہ جائے گا" یہ خراج تحسین IDAHO کے ڈیموکریٹ سینیٹر فرینک چرچ نے اپنے ساتھی سینیٹر کو پیش کیا تھا اور وہ اس کا مستحق بھی تھا۔ اپنے زمانے میں اس نے یعنی J. William Fulbright نے امریکی قوم کے رویوں پر بھرپور اثر ڈالا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جوہری اسلحہ نے دنیا میں طاقت کے استعمال کو بہت مہیب بنادیا تھا۔ اختلاف رائے اس کی طرز زندگی کا امتیازی وصف تھا لیکن یہ اختلاف رائے اعلیٰ درجے کا ہوتا۔ حقیقت یہ تھی کہ فلبرائیٹ عموماً حق پر ہوتا۔

فلبرائیٹ نے اولاً قومی شہرت میکارتھی ازم کی "حرام پائی" کی مذمت سے پائی تھی۔ ۱۹۵۴ء میں جب تمام امریکہ وسکونسن کے سینیٹر کی Permanent Investigatjon Sub-Committee کی صلیبی جنگ پر ڈونگرے برسا رہے تھے تو فلبرائیٹ نے اس سب کمیٹی کو مزید رقم دینے کے خلاف واحد مخالف ووٹ ڈالا تھا' اسی ووٹ کی بناء پر اسے "کمیونسٹ ہمسفر دہریہ اور قابل نفرین سے بھی کمتر" کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔

فلبرائیٹ نے ۱۹۶۱ء میں کیوبا میں مداخلت کی مخالفت کی اور پھر چار سال بعد ڈومینکین ریپبلک کے بارے میں یہی کہا۔ سوویت یونین سے بقائے باہمی اور چین سے سفارتی روابط استوار کرنے کے مشورہ دینے میں وہ اپنے زمانے سے آگے تھا۔ جب اس نے صدر کے انتخاب کے لئے ایک مختلف سسٹم اختیار کرنے کا مشورہ دیا تو صدر ٹرومین نے اسے ناراضگی میں "وہ ضرورت سے زائد پڑھا آکسفورڈ ک.ک.ب." کے خطاب سے نوازا۔ ۲۵ سال بعد ۱۹۷۴ء میں نیویارک ٹائمز نے اسے "اپنے زمانے کا امریکن خارجہ حکمت عملی کا سب سے زیادہ بے باک نقاد" قرار دیا تھا۔

اس کی سب سے بڑی دلچسپی تعلیم کے ذریعے بین الاقوامی مفاہمت کو فروغ دینا تھی۔ ہزاروں نوجوانوں نے ان وظیفوں کے ذریعے اپنا ذہنی افق کشادہ کیا ہے جو اس کے نام پر قائم ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ فلبرائیٹ کی شہرت ویتنام جنگ کے بیباک مخالف کے طور پر بھی تھی جسے وہ فضول اور کبھی نہ ختم ہونے والی نامعقول اور کمزور کرنے والی قرار دیتا تھا۔ اس بات نے اس کے ایک دیرینہ ساتھی اور قریبی دوست صدر لنڈن بی. جانسن کے ساتھ اس کی ناچاقی کروادی۔ صدر جانسن کا خیال تھا کہ امریکہ ویتنام میں جو جنگ لڑ رہا تھا وہ جنوب مشرقی ایشیا کی ایک بین الاقوامی کمیونسٹ سازش کے

خلاف ایک مقدس مشن تھا' لیکن فلبرائیٹ اس سے متفق نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس میں چین سے مخاصمت کا خطرہ تھا اور یہ جنگ طاقت کے غرور کا عملی اظہار تھا۔

۱۹۶۳ء میں فلبرائیٹ کی زیر صدارت تفتیش سے یہ امر منظر عام پر آیا کہ اسرائیل کو دی جانے والی امدادی رقوم پر خصوصی ٹیکس رعایت دی جا رہی تھی۔ یہودی فرقے نے اس پر ناراضگی کا اظہار کرنا ہی تھا۔ یہ تفتیش ایک صحافی Walter Pincus نے کی تھی جسے فلبرائیٹ نے اس کی ایک لابی کرنے کے بارے میں رپورٹ پڑھنے کے بعد اس کام پر معمور کیا تھا۔ Pincus کا کہنا تھا کہ فلبرائیٹ نے اسے پوری پوری آزادی دے رکھی تھی کہ جیسے چاہے دس بڑی Lobbying Activities چن لے اور اس نے اس متنازعہ فیہ تفتیش کے دوران اسے مکمل حمایت مہیا کی۔ Pincus نے جو کہ بذات خود بھی یہودی تھا جیوش ٹیلی گراف ایجنسی کو تفتیش کے لئے چنا۔ یہ اس وقت یہودی لابی کا ایک مؤثر ہتھیار تھا۔ فلبرائیٹ اور Pincus دونوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ جیوش ٹیلیگراف ایجنسی کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے اور یہ دونوں Anti-semetic تھے۔

Pincus کا کہنا تھا کہ کئی سینیٹروں کا اصرار تھا کہ یہ تفتیش ختم کر دینی چاہئے۔ سینیٹر Hubert Humphrey اور Bourke Hickenlooper (دونوں امور خارجہ کمیٹی کے سینئر ریپبلکن ممبر تھے) ان میں شامل تھے لیکن فلبرائیٹ نہ مانا۔

فلبرائیٹ تحقیقات کے نتیجے میں اسرائیل کی طرف سے امریکن صیہونی کونسل کو دی جانے والی خطیر غیر قانونی مالی امداد بھی سامنے آئی۔ اس کونسل کو پچاس لاکھ سے زائد ڈالر خفیہ طور پر دیئے گئے تھے کہ وہ اسے پبلک ریلیشنز کی فرموں پر اسرائیل نواز پروپیگنڈہ کے لئے خرچ کریں اور یہ فلبرائیٹ کمیٹی کی تحقیقات کے اختتام سے پیشتر تھا۔

فلبرائیٹ نے اسرائیل نواز لابی کے بارے میں اپنی تشویش کے باوجود یہ غیر معمولی قدم اٹھایا کہ امریکہ کی جانب سے اسرائیل کی سرحدوں کی ضمانت کی سفارش کی۔ ۱۹۷۰ء میں اپنے ایک خطاب میں اس نے یہ تجویز پیش کی کہ امریکہ ایک باقاعدہ معاہدہ کے تحت حملہ کی صورت میں اسرائیل کو سرزمین کی ضمانت اور آزادی کا تحفظ دے گا چاہے اس کے لئے امریکہ کو فوجی مداخلت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ لیکن یہ سرحدیں ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے کی ہوں گی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ معاہدہ اس امن پروگرام کا حصہ ہونا چاہئے جو اقوام متحدہ طے کروائے۔ اس تجویز کا مقصد ان لوگوں کی دلیل کو

کالعدم کرنا تھا جو کہتے تھے کہ اسرائیل کو یہ مقبوضہ علاقے اپنے تحفظ کے لئے درکار ہیں۔

فلبرائیٹ کے نقطہ نظر سے اسرائیل کا ان عرب علاقوں کو جو اس نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں چھینے تھے، خالی کر دینا ہی امن کی بنیاد تھا۔ اسرائیل امن بھی چاہے اور عرب علاقے پر قبضہ بھی برقرار رکھے یہ کیسے ممکن تھا؟ اس کا کہنا تھا کہ اسرائیلیوں کے مقبوضہ علاقوں میں بستیاں تعمیر کرنے کی پالیسی غیر لچکدار رویہ اور دوربینی کے فقدان کی مظہر تھی۔ فلبرائیٹ نے کہا کہ ہمیں عرب لیڈروں کے اسرائیل کو تباہ کر دینے کی خوفناک دھمکیوں کو نظر انداز کر دینا چاہئے۔ اس کا خیال تھا کہ متحدہ عرب ریپبلک کے صدر ناصر اور اردن کے شاہ حسین نے عملی طور پر ایسی خوفناک دھمکیوں سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے لیکن لگتا ہے کہ اسرائیلیوں نے اس کا ادراک نہیں کیا۔

۱۹۷۰ء کی پوری دہائی میں فلبرائیٹ نے بارہا اس دعویٰ کی مخالفت کی کہ مشرق وسطیٰ کا مسئلہ امریکہ کے عزم کا امتحان تھا کہ وہ سوویت دخل اندازی کے خلاف صف آرا ہو گا یا نہیں۔ ۱۹۷۱ء میں اس نے اسرائیل پر کمیونزم کا فرضی ہوا کھڑا کرنے کا الزام لگایا اور کہا کہ مشرق وسطیٰ میں تنازعے کے جاری رہنے سے صرف سوویت مفادات کو فائدہ ہو گا۔

۱۹۷۳ء میں "Face the Nation" ٹی وی پروگرام میں فلبرائیٹ نے کہا کہ سینیٹ اسرائیل کی پالیسی کے تابع ہے اور یہ امریکہ کے مفاد کے خلاف ہے۔ اس نے کہا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا مشرق وسطیٰ میں دہشت گردی جاری رکھنے میں بہت بڑا حصہ ہے۔ اس نے مزید کہا کہ یہ صاف ظاہر ہے کہ اسرائیل ہرگز وہ کچھ نہیں کر سکتا جو کہ وہ کر رہا ہے' اگر اسے امریکہ سے رقم اسلحہ اور دیگر طرح کی امداد نہ مل رہی ہوتی۔

فلبرائیٹ نے کہا کہ امریکہ اسرائیل کو پر امن تصفیہ کے لئے مجبور کرنے میں ناکام رہا ہے' کیونکہ سینیٹ کی تقریباً ۸۰ فیصد اکثریت اسرائیل کی غیر مشروط حمایت کرتی ہے۔ یہ بات بار بار سامنے آئی ہے اور یہ ہماری حکومت کی مشکل ہے۔ سینیٹر نے دعویٰ کیا کہ سینیٹ اسرائیل کے زیر تسلط ہے اور انتباہ کیا کہ ہمیں امریکہ کے مفادات کا زیادہ خیال رکھنا چاہئے۔ اس پروگرام کے چھ ہفتے بعد اس نے پھر تشویش کا اظہار کیا کہ اسرائیل نے عرب علاقوں پر قبضہ جما رکھا ہے۔ اس نے یہ الزام لگایا کہ U.S.A. نے اسرائیل کو غیر محدود پھیلاؤ کے لئے غیر محدود حمایت مہیا کر رکھی ہے۔

اس کی اس نکتہ چینی نے ہلچل پیدا کر دی جو یہودی پہلے اس کے حمایتی تھے' وہ بے چین

ہو گئے۔ سالہا سال کی آسان انتخابی فتوحات کے باوصف ۱۹۷۴ء میں اس کے لئے خطرے نے سر اٹھایا۔ ڈیموکریٹ پرائمری انتخابات میں عین انتخابی درخواستیں دینے کی آخری تاریخ سے پہلے گورنر Dale Bumpers نے فلبرائیٹ کے مقابلے میں سینیٹ کے انتخاب کے لئے کھڑا ہونے کا اعلان کر کے سیاسی دنیا کو حیرت سے دوچار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسا صرف یہودیوں کی روزافزوں ناراضگی کے سبب ہی ممکن ہوا۔ فلبرائیٹ کو گورنر Bumpers سے یہ امید نہ تھی لیکن فوراً اس ہردلعزیز نوجوان گورنر سے خطرہ کا احساس ہو گیا۔ اس نے کہا "اس کے گھنے بال ہیں (بمقابلہ فلبرائیٹ کے) وہ ٹی وی پر عمدہ نظر آتا تھا اور اس نے کسی کو بھی ناراض کرنے کے لئے کبھی کچھ نہ کیا تھا۔"

کئی وجوہ اور بھی تھیں۔ W. Pincus (جو بعد میں واشنگٹن پوسٹ کا رپورٹر بنا) کے خیال میں اس پرائمری الیکشن سے عین قبل فلبرائیٹ کے چھٹی پر برموداجا کر گالف کھیلنے سے Bumpers نے یہ اندازہ لگایا ہو گا کہ وہ اس الیکشن کے بارے میں زیادہ سنجیدہ نہیں ہے۔ یہ سال "واٹر گیٹ کا سال" بھی تھا، یعنی حاضر ممبران کے لئے نامسعود۔ Bumpers نے اپنی مہم کے دوران "واشنگٹن میں بدانتظامی" کا نعرہ بلند کر کے تبدیلی کا مطالبہ کیا۔ نیویارک ٹائمز نے لکھا کہ Bumpers نے اس پرانے احساس کا بھی چابک دستی سے فائدہ اٹھایا کہ فلبرائیٹ تو اپنی وقت صرف ہنری کسنجر کے ساتھ دعوتیں اڑانے یا مشرق وسطیٰ کے بارے میں بیکار تشویش پر صرف کرتا ہے۔

Arkansas کے اندر اور باہر یہودی ووٹروں کے رویے نے بھی خاصا فرق ڈالا۔ فلبرائیٹ کا کہنا تھا کہ Bumpers بغیر اس حوصلہ افزائی کے انتخاب میں حصہ ہی نہ لیتا۔ انتخاب کے بعد ایک قومی یہودی تنظیم نے اس نوجوان گورنر کی شاندار اور غیر متوقع کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھا۔ فلبرائیٹ کے پاس اس "بصیغہ راز" چٹھی کی ایک نقل موجود تھی جو کہ B'nai B'rith کے سیکریٹری جنرل Herman Edelsberg نے اپنے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو لکھی تھی، اس میں تھا کہ اس بات کے قوی آثار ہیں کہ گورنر Bumpers کی حمایت کی ہماری کوششوں کے نتیجے میں فلبرائیٹ اپنی سینیٹ کی کلیدی پوزیشن سے محروم ہو جائے گا، بعد ازاں ایڈلبرگ نے اس خط کو جعلی قرار دے دیا۔

فلبرائیٹ نے شکست کے بعد بھی اپنی بیباکانہ اظہار رائے جاری رکھا اور اسرائیل کو اس کے اڑیل پن پر ملامت کرنا اور اسرائیلی لابی کی مذمت کرنا جاری رکھا۔ اپنی سینیٹ نمائندگی کے اختتام سے ذرا قبل فلبرائیٹ نے انتباہ دیتے ہوئے کہا "اسرائیل کا کبھی نہ ختم ہونے والا دباؤ برائے اسلحہ اور

اقتصادی امداد...... اور ہر مرتبہ جو مانگنا اس سے زیادہ مل جانا...... یہ اسرائیل کی طرف سے ایک اچھے دوست کا برا استعمال ہے۔" اس کی تشویش کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ اس سے مشرق وسطیٰ میں کہیں جوہری جنگ نہ چھڑ جائے۔ اس نے بڑی غمگینی کے لہجے میں یہ انتباہ کیا کہ امریکہ میں اسرائیل کے حمایتی اسرائیلی ہٹ دھرمی کی حمایت کر کے اسے ایک ایسے راستہ پر گامزن کر رہے ہیں جو اسے تباہی کی طرف لے جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ شاید ہمیں بھی۔

فلمر ائیٹ کے خیال میں اس کی امید بہت کم ہے کہ کیپٹل ہل اسرائیلی لابی کو للکارے۔ اس کا کہنا تھا کہ سیاست دانوں کے لئے اس کی مخالف خودکشی کے مترادف ہے۔ کوئی آئیزن ہاور جیسا شخص ہی ایسا کر سکتا ہے جو پہلے ہی سے محفوظ ہو۔ آئیزن ہاور پہلے ہی سے اپنی ساکھ بنا چکا تھا۔ وہ اپنے ملک کے لوگوں کی نگاہ میں پہلے ہی ایک عظیم شخص تھا اور وہ کسی سے ڈرتا بھی نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا جس پر اسے ایمان تھا۔

وہ قدرے رجائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ صدر ایسا کر سکتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کا نام آئیزن ہاور ہی ہو۔ فلمر ائیٹ ایک اسی طرح کا موقع ہاتھ سے کھو دینے کی مثال دیتے ہوئے کہتا ہے "میں ۱۹۷۵ء میں جیری فورڈ کو ملنے گیا جو صدر بن چکا تھا' میں اس وقت کسی عہدہ پر نہ تھا۔ میں مشرق وسطیٰ کا دورہ کر چکا تھا اور کئی نمایاں شخصیات سے ملاقات کر چکا تھا۔ میں نے صدر سے کہا کہ میرے خیال میں یہ (عرب) لیڈر اسرائیل کو تسلیم کرنے پر رضامند ہیں لیکن اسرائیلیوں کو ۱۹۶۷ء کی سرحدوں پر واپس جانا ہوگا۔ اگر آپ اس مسئلہ پر مضبوط موقف اختیار کریں تو اس کا حل نکل سکتا ہے۔" فلمر ائیٹ نے یہ پیش گوئی کی کہ امریکی عوام صدر فورڈ کی حمایت کریں گے اگر وہ اسرائیل کو تعاون کرنے کے لئے کہیں۔ اس نے صدر فورڈ کو یاد دلایا کہ جب اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا تھا تو آئیزن ہاور نے زبردستی ان کی واپسی کروائی تھی اور اس کے بعد وہ بھاری اکثریت سے دوبارہ صدر منتخب ہوئے تھے۔ اسرائیل مخالف موقف آئیزن ہاور کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ وہ نیویارک میں بھی بھاری اکثریت سے جیتا جہاں یہودیوں کی ایک بڑی تعداد رہتی ہے۔ میں نے فورڈ سے کہا کہ اگر وہ بات کو مناسب طریقے سے پیش کرے تو میرے خیال میں وہ ہارے گا نہیں۔ اسے یہ کہنا چاہئے کہ اسرائیل کو ۱۹۶۷ء کی سرحدوں پر واپس جانا ہوگا۔ اگر وہ نہ مانیں تو اقتصادی اور اسلحے کی امداد بند کر دی جائے۔ آئیزن ہاور نے بھی یوں ہی کیا تھا۔ اسرائیل کو تعاون

کرنا ہی پڑے گا۔ اسے اپنی آئندہ انتخابی مہم میں یہ کہنا چاہئے کہ وہ اسرائیل کی حمایت کرتا ہے لیکن امریکہ اس کی اولین ترجیح ہے۔" فلبرائیٹ کا کہنا ہے کہ فورڈ نے یہ باتیں بہت غور سے سنیں لیکن صاف ظاہر ہے کہ اس کی صلاح پر عمل نہیں کیا۔ لیکن ان تمام دل شکنی کے باوجود اس نے ہمت نہ ہاری اور بطور سینیٹر کے اپنے آخری خطاب میں کہا "تاریخ گواہ ہے کہ بنی آدم اپنے مسائل سے منطقی طور پر نپٹنا چاہتی ہے لیکن ارادے کا فقدان آڑے آتا ہے' اس سے ماضی کے جھروکوں کا منظر دھندلا اور غیر یقینی ہو جاتا ہے۔ اس سے امید تو ابھرتی ہے لیکن یہ اعتبار نہیں آتا کہ فتح عقل کی ہوگی۔ لیکن جب اس سے کوئی اور نقصان نہیں ہو سکتا تو پھر ایک مزید کوشش کیوں نہ کی جائے۔"

مطلق العنانی کے خلاف انتباہ

ساؤتھ ڈکوٹا سے James Abourezk ۱۹۷۳ء میں ایوان نمائندگان میں دو سال گزارنے کے بعد سینیٹ میں پہنچا' وہ پہلا عرب نژاد سینیٹر تھا' لبنانی مہاجروں کا بیٹا جو کہ سینیٹ میں منتخب ہو کر آیا۔ اس نے عرب مفادات پر اظہار خیال کیا اور نتیجتاً فوراً ہی متنازعہ شخصیت بن گیا۔

عہدہ سنبھالنے کے بعد اس نے Yeshiva University of N.Y. میں تقریر کرنے کی ایک دعوت قبول کرلی' لیکن اسکول کے تشویش زدہ عہدہ داروں نے فوراً فون کر کے اسے بتلایا کہ طالب علموں میں اس کی آمد کے خلاف احتجاج بڑھتا جا رہا ہے۔ چند روز بعد ڈنر کمیٹی کے چیئرمین نے ابورزق سے کہا کہ وہ ایک اعلان کرے کہ اسرائیل اور اس کے عرب ہمسایوں میں دو بدو' براہ راست گفت و شنید ہونی چاہئے۔ اس نے کہا کہ بالکل یہی بات اسرائیل کی مسز گولڈا میئر نے بھی کہی ہے اور اس سے طلباء کا احتجاج ختم ہو جائے گا۔ ابورزق حالانکہ ایسے مذاکرات کا حامی تھا لیکن اس نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ وہ احتجاج کرنے والوں کے سامنے جھکنا نہیں چاہتا تھا۔ اس اسکول کا وائس پریزیڈنٹ ربی اسرائیل ملر خود واشنگٹن آیا کہ ابورزق سے نظرثانی کے لئے کہے۔ جب ابورزق نے اب بھی انکار کیا تو ڈنر چیئرمین نے فون پر کہا کہ طلباء پکٹنگ کی تیاری کر رہے تھے۔ ابورزق نے یہ دیکھتے ہوئے کہ انتظامیہ یہ فنکشن منسوخ کرنا چاہتی ہے خود ہی معذرت کر لی جو بہت سرعت سے منظور کر لی گئی۔

اس کے کچھ دیر بعد نیویارک Rochester میں لبنانی خانہ جنگی سے متاثرہ افراد کے لئے رقم

جمع کرنے کی خاطر ایک ریلی کا اہتمام کیا گیا' اس میں ابورزق نمایاں مقرر تھا۔ اس ریلی کی انتظامی کمیٹی کو فوراً ہی فون پر بم مارنے کی دھمکیوں کی بوچھاڑ سہنی پڑی۔ سب ملا کر ۲۳ فون کالز آئیں کہ اگر ابورزق نے شرکت کی تو وہ بلڈنگ بم سے اڑا دی جائے گی۔ مقامی پولیس نے .F.B.I کی مدد سے تمام بلڈنگ کی تلاشی لی اور کوئی بم نہ پا کر اسے اس جلسہ کے لئے کھول دیا۔ پرہجوم سامعین نے جو اس دھمکی سے بے خبر تھے پوری کاروائی بغیر کسی دقت کے سنی۔

دسمبر ۱۹۷۳ء میں ابورزق نے کئی عرب ممالک کے دورے سے واپسی پر عرب پناہ گزینوں کے ساتھ نیشنل پریس کلب واشنگٹن میں اظہاری ہمدردی کیا۔ AIPAC نے نیوز لیٹر Near East Report کے لئے Wolf Blitzea نے اس بارے میں لکھا کہ اگر یہ (ابورزق) پوزیشن تسلیم کر لی جائے تو اسرائیل کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا۔ یہ رپورٹ AIPAC کے ڈائریکٹر I.L. Kenen نے ان سب یہودیوں کو بھجوائی جنہوں نے اس کی انتخابی مہم میں چندہ دیا تھا اور تبصرہ جو ساتھ لکھا وہ یہ تھا کہ ابورزق کی انتہائی کوشش یہی ہے کہ اسرائیل کے لئے امریکہ کی دوستی کی بنیاد گرا دی جائے۔ اس مراسلے کے بعد بقول ابورزق اس کی AIPAC سے ٹھن گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر مجھ پر یہ ناجائز ذاتی حملہ نہ کیا جاتا تو میں شاید مشرق وسطیٰ پر اتنا وقت صرف نہ کرتا۔

(۱۹۸۰ء میں سینیٹ سے ریٹائر ہونے کے بعد ابورزق نے American-Arab Anti-Discrimination Committee کی بنیاد رکھی جس کے اب ۲۰۰۰۰ ممبر ہیں اور جس کا مقصد "اسرائیلی لابی کا توڑ" مہیا کرنا ہے۔)

سینیٹ میں ایک موقع پر ابورزق نے لابی کے دباؤ کو حکمت عملی سے اپنے حق میں استعمال کیا۔ وہ ۱۹۷۴ء میں Senate Judiciary Committee میں ایک خالی سیٹ پر اپنی رکنیت چاہتا تھا۔ اس نے B'nai B'rith کی Anti-Defamation League کے لابسٹ David Brody کو دھمکی دی کہ اگر اسے یہ سیٹ نہ ملی تو وہ امور خارجہ کمیٹی پر سیٹ لینے کی کوشش کرے گا۔ یہ وہ کمیٹی ہے جہاں اسرائیل کو دی جانے والی امداد طے ہوتی ہے۔ ابورزق نے ہنستے ہوئے بتلایا کہ اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ڈیوڈ بروڈی کو میں امور خارجہ کمیٹی میں ہرگز گوارا نہ تھا کیونکہ وہاں اسرائیل کے لئے امداد طے پاتی ہے' لہٰذا لابی کی حمایت سے میں اس میں کامیاب رہا حالانکہ میرا مدمقابل ایک سینئر سینیٹر James Allen تھا۔ اس عہدہ کی وجہ سے ابورزق کو ۱۹۷۷ء میں کرسی صدارت پر بیٹھ کر

کمیٹی میں اسرائیل کے مغربی کنارے اور غازہ پر قبضہ کی قانونی حیثیت کے بارے میں بحث سننے کا موقع ملا۔ ابورزق کا کہنا تھا کہ یہ پہلی اور آخری بحث تھی' اس موضوع پر اور میرے ایک بھی ساتھی نے اس میں حصہ نہ لیا۔ میں کمیٹی میں یک و تنہا تھا۔

۱۹۷۵ء میں ابورزق نے P.L.O. کے بیروت آفس کے سربراہ شفیق الحوت کو سینیٹ میں لنچ پر مدعو کیا تو اسے پتہ چلا کہ اس بارے میں کوئی بھی راز رکھنا کس قدر دشوار ہے۔ ابورزق کی اس یقین دہانی پر کہ یہ معاملہ بالکل ذاتی رکھا جائے گا۔ ایک یہودی سینیٹر (Connecticut) ابراہیم ربی کوف کے علاوہ دس اور سینیٹرز کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ الحوت نے مشرق وسطیٰ کے بارے میں P.L.O. کا نکتہ نظر بیان کیا۔ اس واقعہ کے گھنٹہ بھر کے اندر اندر واشنگٹن پوسٹ کے سپنسر رچ نے ابورزق سے فون پر تبصرہ کرنے کے لئے کہا۔ اسے اس لنچ میں شامل ہونے والے تمام مدعوئین کے ناموں کا پہلے ہی علم تھا۔ اگلے ہی دن اسرائیل کے ایک ممتاز روزنامے یروشلم پوسٹ نے یہ خبر شائع کی کہ ربی کوف اور دوسرے کئی سینیٹروں نے قاتل الحوت کے ساتھ لنچ کیا۔

۱۹۷۷ء میں جب والٹر مونڈیل (نائب صدر) کی جگہ ابورزق نے کولوریڈو ڈیموکریٹ پارٹی کے Denver میں منعقدہ "جیفرسن' جیکسن ڈے ڈنر" پر تقریر کرنے کی حامی بھری تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ یہودی لیڈروں نے احتجاج کیا اور ڈینور کے ایک مزدور رہنما John Mrozek نے ابورزق کو عرب نواز اور اسرائیل مخالف قرار دیا۔ ڈنر کمیٹی کی رکن Betty Crist نے دعوت نامہ واپس لینے کا مطالبہ کیا۔ جب کرسٹ کا یہ مطالبہ معمولی اکثریت سے نامنظور ہوا تو کمیٹی نے کوشش کی کہ ایک اسرائیل نواز مقرر کو بھی مدعو کیا جائے جو ابورزق کو مباحثہ میں الجھائے۔ نیت یہ تھی کہ اگر یہ مباحثہ ممکن نہ ہو سکے تو یہ تقریب ہی منسوخ کر دی جائے۔ اس بات نے معاملے کو مضحکہ خیز بنا دیا کیونکہ ابورزق نے اپنے خطاب میں مشرق وسطیٰ کا ذکر ہی نہ کرنا تھا۔ جب کمیٹی کو اس بارے میں کامیابی نہ ہوئی تو ابورزق کو دعوت نامہ برقرار رکھا گیا۔

ڈینور ایئرپورٹ پر آمد کے بعد ابورزق نے اخباری نمائندوں کو بتلایا "امریکہ کے سینیٹر کے طور پر حلف اٹھاتے وقت میں نے حکومت ریاستہائے متحدہ کی وفاداری کا عہد کیا تھا لیکن مجھے کبھی خواب میں بھی یہ نہ سوجھا تھا کہ کسی اور حکومت کی وفاداری کا عہد کرنا ہوگا۔" اس ڈنر کے ۷۰۰ حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے اس نے صیہونی لابی کے غیر معمولی اثر و رسوخ سے خبردار کرتے ہوئے کہا

''یو.ایس اپنی اس مؤکل ریاست کا قیدی بن جائے گا' اگر وہ اب تک نہیں بن چکا تو۔'' اس نے مزید کہا کہ ''اس ڈنر کے بارے میں قضیہ اس بات پر اٹھا کہ میں نے اسرائیل کے بارے میں ایک قطعی نکتہ نظر رکھنے سے انکار کیا۔ اس قسم کے قطعی نظریات ہم سب کے لئے خطرہ کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ صرف ایک ہی پوزیشن یعنی اسرائیل نواز پوزیشن ہی واحد پوزیشن ہے۔''

"Rockey Mountain News" نے یہ خبر لگائی کہ پر جوش تالیوں سے اس تقریر کو سراہا گیا' گو کچھ لوگ منہ پھلائے بیٹھے رہے۔ اس اخبار کے اداریہ میں لکھا گیا کہ جیمز ابورزق کوئی ایسا شدت پسند نہیں جو اسرائیل کے خون کا پیاسا ہو۔ کولوریڈو کے ڈیموکریٹ لیڈروں کو اس پر فخر ہونا چاہئے کہ انہوں نے خطاب کے لئے ایسا شخص چنا جو ان کے استحقاق سے بھی بڑھ کر تھا۔

گناہِ فروگذاشت

کیپٹل ہل پر لابی کی ۲۵ سالہ طویل کامیابیوں کی تاریخ میں صرف دو بار رخنہ پڑا۔ دونوں ہزیمتیں اسے سینیٹ میں اٹھانا پڑیں اور دونوں میں سعودی عرب کو فوجی سامان کی فروخت زیر بحث تھی۔ ۱۹۷۸ء میں سینیٹ نے F-15 کی فروخت کو ۵۴ بمقابلہ ۴۴ ووٹوں کی اکثریت سے منظور کیا اور ۱۹۸۱ء میں AWACS کے جاسوسی طیارے اور F-15 کے لئے خصوصی آلات کی فراہمی کو 52/48 سے منظور کیا گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ دونوں مرتبہ اس قضیہ نے AIPAC کو ریاست Maine کی سیاست میں الجھایا۔

یہ دخل اندازی ۱۹۷۸ء کے موسم بہار کی ایک سہ پہر کو سینیٹ کے اجلاس کے دوران شروع ہوئی جب سینیٹر ایڈورڈ "TED" کینیڈی کو ایک پیغام کانا پھوسی کر کے دیا گیا۔ اس کا چہرہ ناراضگی سے گلنار ہو گیا۔ AIPAC نے ایک ایسے ڈیموکریٹ سینیٹر کا دامن چھوڑ دیا تھا جو اسرائیل کی حمایت میں ہمیشہ سرگرم رہا تھا۔ Sen. William Hathaway جس نے ہمیشہ بغیر کسی استثناء کے اسرائیل کے حق میں ووٹ ڈالا تھا کو چھوڑ کر اس کے ریپبلکن حریف William S. Cohen کی حمایت کی جا رہی تھی۔ کینیڈی نے ساتھ والے کمرے سے جا کر فون کیا۔ کینیڈی نے AIPAC کے اس وقت کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر Morris J. Amitay سے وضاحت طلب کی۔ Amitay نے گھبراہٹ میں کہہ دیا کہ اس نے Hathaway کی مخالفت نہیں کی۔ اس کا کہنا تھا کہ تنظیم امیدواروں

کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے' کسی کی حمایت یا مخالفت نہیں کرتی۔ جب کینیڈی نے زور دیا تو Amitay نے وعدہ کیا کہ وہ ایک خط لکھ کر اس بات پر Hathaway کا شکریہ ادا کرے گا کہ اس نے ہمیشہ اسرائیل کی حمایت کی۔

یہ خط تو بھیج دیا گیا لیکن جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ گو Amitay کا یہ کہنا کہ لابی کسی خاص امیدوار کی حمایت نہیں کرتی' ظاہراً اور قانوناً درست تھا لیکن وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے مختلف ذرائع استعمال کر کے چندہ جمع کر کے ووٹ پر اثرانداز تو ہو جاتی تھی۔ Miane کے اس انتخاب میں وہ Cohen کے حق میں اور Hathaway کے خلاف سرگرم تھی۔ اس تبدیلی کی وجہ صرف ایک مرتبہ Hathaway کی فروگذاشت تھی لیکن یہ فروگذاشت گناہ کبیرہ تھی۔

۱۹۷۵ء میں Hathaway نے تعاون کیا تھا جب AIPAC نے وہ مشہور Spirit of 76 جاری کیا تھا۔ اس میں صدر جیرالڈ فورڈ سے کہا گیا تھا کہ ہم اصرار کرتے ہیں کہ اسرائیل کی سلامتی کے بارے میں امریکہ کی قدیم روایت جاری رکھی جائے اور اس کے لئے اسے فوجی ساز و سامان اور اقتصادی اور سیاسی امداد کی ترسیل جاری رکھی جائے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اس سے کسی بھی قسم کی ہلچل نہ ہوتی' کیونکہ جان. ایف. کینیڈی کی حکومت تو پہلے ہی ایسا کر رہی تھی لیکن جب جنوری ۱۹۷۵ء میں یہ خط مشتہر کیا گیا تو اس نے انتظامیہ کو ہلا کر رکھ دیا۔

صدر فورڈ نے ذرا دیر پہلے یہ بیان جاری کیا تھا کہ وہ مشرق وسطیٰ میں امریکی حکمت عملی پر نظر ثانی چاہتا ہے' کیونکہ وہ اسرائیل کی حکمت عملی سے مطمئن نہیں۔ اس بیان میں بطور ملزم فریق اسرائیل کا نام نہیں لیا گیا تھا لیکن یہ پیغام واضح تھا کہ فورڈ یہ چاہتا تھا کہ امریکہ' عرب تعلقات بہتر ہوں اور نظر ثانی کا مطلب تھا کہ جب تک اسرائیل اپنا برتاؤ بہتر نہ کرے اس کی امداد بند کر دی جائے۔ یہ ایک تاریخی تجویز تھی۔ آئیزن ہاور کے بعد پہلی مرتبہ کسی امریکی صدر نے یہ واضح اشارہ عوامی طور پر دیا تھا کہ شاید اسرائیل کی امداد روک دی جائے' اس سے زیادہ تباہ کن اور حوصلہ شکن بات اور کیا ہو سکتی تھی؟ یہ ۷۶ دستخط گویا فورڈ پر واضح کرتے تھے کہ وہ اپنی نظر ثانی پر عمل نہ کر سکے گا۔ سینیٹ میں اسرائیل کے ڈیموکریٹ اور ریپبلکن حامی ملا کر اتنی تعداد میں تھے کہ اسرائیل کو امداد بن کرنے کا کوئی بھی بل جو انتظامیہ اور فورڈ پیش کرتے وہ منظور نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ وہ صدر کے ویٹو کے اختیارات کو روندتے ہوئے اسرائیل نواز قانون منظور کر سکتے تھے۔

یہ خط ایک مؤثر اور واضح گھونسے کی مانند تھا۔ AIPAC نے اسے راتوں رات تیار کر کے سینیٹ ممبران کی اکثریت سے منظور کروا کر جاری کر دیا تھا۔ کئی سینیٹرز نے پہلے انکار کیا لیکن جلد ہی اپنی بات سے پھر گئے۔ سینیٹر John Culver نے صاف مان لیا کہ دباؤ اتنا شدید تھا کہ مجھے جھکنا پڑا۔ یہی صدر فورڈ نے بھی کیا اور دوبارہ کبھی لابی کی مخالفت مول نہ لی۔

یہ پہلا موقع نہ تھا کہ AIPAC کی کال پر Hathaway نے وہائیٹ ہاؤس کی مخالفت کی ہو۔ تین سال بعد فورڈ کے جانشین صدر جمی کارٹر نے بھی لابی کے ساتھ ایک معرکہ مارا۔ اس مرتبہ معاملہ سعودی عرب کو F-15 جنگی جہازوں کی فروخت نامنظور کرنے کا تھا۔ وہائیٹ ہاؤس کو اس تجویز کو مسترد کرنے کے لئے صرف ایک ووٹ درکار تھا۔ وہائیٹ ہاؤس کا خیال تھا کہ ایوان نمائندگان تو بڑی اکثریت سے اس فروخت کو نامنظور کر دے گا' لہٰذا انہوں نے اپنی تمام تر کوششوں کا رخ سینیٹ کی طرف موڑ دیا۔ دونوں طرف لابنگ جارحانہ اور واضح تھی۔ سعودی عرب کے چیف لابسٹ Frederick Duter نے کیپٹل ہل پر اس فروخت کی حمایت کا راگ الاپا۔ واشنگٹن پوسٹ نے خبر دی کہ آج کل تقریباً ہر روز صبح کالی لموزین واشنگٹن کے Hotel Medison کے باہر آکر اپنے عرب مسافروں کو جمع کرتی ہیں۔ وہ اکثر کیپٹل ہل کا رخ کرتی ہیں جہاں پر آج کل F-15 کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔

اسرائیلی لابی نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ انہوں نے قومی سطح پر تعلقات عامہ کی ایسی مہم شروع کی کہ یورپ میں نازیوں کی یورپی یہودیوں کی دوسری عالمی جنگ میں نسل کشی کی مہم کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ پہلے تو ٹی وی پر فلم Holocaust کا سلسلہ وار پروگرام دکھلانے کے بعد کیپٹل ہل پر اس ناول کی بوچھاڑ کر دی گئی جس پر یہ پروگرام مبنی تھا۔ ان کتاب کے ساتھ AIPAC کا خط ملفوف ہوتا کہ یہ لرزہ خیز بیان ساٹھ لاکھ یہودیوں کے خاتمہ کے بارے میں ہے اور اسرائیل کو موجودہ گفت و شنید برائے سلامتی کے بارے میں سخت تشویش ہے جو بغیر کسی بیرونی ضمانت کے انجام پائے۔ AIPAC کے Aaron Rosenberg نے اس کتاب کی تقسیم کے بارے میں واشنگٹن پوسٹ کو بتلایا کہ ہمارے خیال میں سچی بات تو یہ ہے کہ اس سے کوئی نہ کوئی ووٹر تو متاثر ہوگا اور لابنگ کرنا قدرے آسان ہوگا۔ سینیٹر Anderson Wendell نے پہلے پہل اس فروخت کی حمایت کی تھی کہ یہ انصاف پر مبنی لگتی ہے' لیکن چند ہی روز بعد اس نے فون کر کے انتظامیہ کو بتایا کہ میں اس کی

حمایت نہیں کر سکتا۔ میرا انتخاب قریب ہے اور میرے یہودی Co-chairperson نے حمایت ختم کر دینے کا کہا ہے' اگر میں نے F-15 کی فروخت کے حق میں ووٹ دیا۔ اس نے مزید کہا کہ ایک یہودی گروپ نے مل کر یہ باور کرایا ہے کہ سینیٹ مہم کی ڈیموکریٹ کمیٹی کے لئے ۷۰ فیصد رقم یہودی ذرائع سے حاصل ہوتی ہے۔

یہ دباؤ شدید اور لگاتار رہا۔ یہودیوں کے ممتاز افراد نے یہ انتباہ دیا کہ یہ جنگی جہاز اسرائیل کی سلامتی کے لئے ایک شدید خطرہ ہوں گے۔ اس کے باوصف Connecticut کے ایک نمایاں سینیٹر Abraham Ribikoff نے کارٹر کا ساتھ دیا۔ یہ Amitay کے لئے ایک سخت دھچکہ تھا کیونکہ وہ پیشتر Ribikoff کے اسٹاف میں کام کر چکا تھا۔ اسی سال کے اوائل میں Ribikoff نے AIPAC کے ہتھکنڈوں اور اسرائیل کی پالیسیوں کی غیر متوقع طور پر سخت نکتہ چینی کی تھی۔ اس نے سعودی جنگی ہتھیاروں کے بارے میں اپنا نکتہ نظر اپنے تک محدود رکھا۔ وال اسٹریٹ جرنل کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے Ribikoff نے اسرائیل کے مقبوضہ علاقوں پر قبضہ برقرار رکھنے کو غلط قرار دیا اور کہا کہ امریکہ کو اس کی حمایت نہیں کرنی چاہئے۔ اس کے خیال میں "AIPAC امریکہ اسرائیل حتیٰ کہ یہودی فرقے کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہی۔ اس نے ۱۹۸۰ء میں اپنی نشست کے لئے دوبارہ حصہ نہ لیا۔

سینیٹ نے ۴۸'۴۴ ۵۲ کی اکثریت سے یہ سودا منظور تو کر دیا لیکن صدر کارٹر کو ایسا سبق حاصل ہوا کہ اس نے دوبارہ مشرق وسطیٰ حکمت عملی کے بارے میں کبھی کانگریس میں پنگا نہ لیا۔

Hathaway ان ۴۴ میں سے ایک تھا جو AIPAC کی حمایت میں ثابت قدم رہا لیکن جب انتخاب مکرر کا وقت آیا تو کافی ثابت نہ ہوا۔ AIPAC کو ایسا سینیٹر درکار تھا جس کا ووٹ اور دستخط انہیں ہمیشہ اور ہر حال میں حاصل رہے۔ ایسی وفاداری کی تلاش لابی کو Cohen تک لے گئی۔ ان کا یہ فیصلہ عین انہی اوقات میں ہوا جب Hathaway سعودیوں کے باؤ کو نظرانداز کر رہا تھا۔ ڈیموکریٹک سینیٹ مہم کمیٹی کا اسٹاف سخت جز بز ہوا۔ ان میں سے ایک نے کسی ملاقاتی سے کہا AIPAC سو فیصد کا مطالبہ کرتی ہے۔ اگر Hathaway جیسا عمدہ سینیٹر بھی صرف ایک مرتبہ تعاون نہ کرے تو وہ اس کا کیریئر ختم کر دیتی ہے۔ ایک سینیٹ کمیٹی کے اسٹاف ممبر کا بیان تھا "AIPAC کو خوش کرنے کے لئے آپ کو آئیوری صابن سے بھی زیادہ خالص ہونا پڑتا ہے۔ 99.44 فیصد خالص

ہونا کافی نہیں۔" چونکہ Hathaway میں AIPAC کا مطلوبہ خالص پن نہ تھا لہٰذا ۱۹۷۸ء میں اسے ناکام ہونا پڑا۔

"AWACS" کے مخمصے میں گرفتار

William Cohen منتخب ہو کر سینیٹ کا رکن تو بن گیا لیکن جلد ہی اسے بھی اپنے پیشرو Hathaway کی طرح ایک طوفان کا سامنا کرنا پڑا۔ مسئلہ پھر سعودی عرب کو فوجی سامان فروخت کرنے اور اسرائیل پر اس بارے میں تشویش ابھرنے اور Maine کے سینیٹر کا تھا۔ یہ رونالڈ ریگن کے صدارت سنبھالنے کے فوراً بعد کا واقعہ ہے کہ ریگن نے وہ درخواست منظور کرنے کا فیصلہ کیا جو اس کے پیشرو جمی کارٹر نے گزشتہ سال ملتوی کر دی تھی۔ سعودی عرب کو AWACS بمعہ ساز و سامان کے فروخت کیے جانے تھے جس سے ان کے F-15 طیاروں کا دائرہ کار اور جنگی صلاحیت بڑھ جاتی۔ اسرائیلی حکام اس بناء پر اس سودے کے مخالف تھے کہ اس سے سعودی عرب اسرائیل کے جنگی طیاروں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے قابل ہو جائے گا۔

۱۹۷۸ء کی طرح اس مرتبہ بھی میدان کارزار سینیٹ ہی بنا اور وہائیٹ ہاؤس حسب معمول سست۔ یہ سوچتے ہوئے کہ جمی کارٹر نے بہت سارے مختلف مسائل پر بیک وقت محاذ کھول دیئے تھے ریگن انتظامیہ نے پہلے چند ماہ میں صرف ٹیکس اور بجٹ کے معاملات پر توجہ مرکوز کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے جو خلاء خارجہ پالیسی میں پیدا ہوا اس سے AIPAC نے بہت مہارت سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے نئے ڈائریکٹر Thomas A. Dine نے سعودی عرب کو ہتھیاروں کی فراہمی کے خلاف جوابی حملہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ پیشتر اس کے کہ ریگن AWACS کے بارے میں تجویز کیپٹل بل بھجوائے' AIPAC نے بقول ایسوسی ایٹیڈ پریس کے ویٹو کرنے کے قابل اکثریت ہموار کر رکھی تھی۔ AIPAC کا یہ حملہ ایوان نمائندگان میں ایک عوامی خط سے شروع کیا گیا۔ یہ خط نیویارک کے ریپبلکن Norman Lent اور میری لینڈ کے ڈیموکریٹ Clarence Long نے لکھا تھا۔ آخر کار اکتوبر میں ۱۱۱' ۳۰۱ ووٹوں کی اکثریت سے یہ تجویز نامنظور کر دی گئی' لیکن اصل میدان کارزار سینیٹ تھا۔ اسی سال کے اوائل میں جب یہ تجویز ابھی سینیٹ میں زیر بحث بھی نہ آئی تھی کہ Oregon کے سینیٹر Bob Packwood (جو ہمیشہ ایک قابل اعتماد اسرائیل نواز رہا تھا) نے یہ اعلان

کیا کہ ۵۴ سینیٹرز یعنی اکثریت نے یہ درخواست دستخط کر دی ہے کہ صدر ریگن اس ارادے سے باز رہیں۔ مہلت حاصل کرنے کے لئے وہائیٹ ہاؤس نے مقابلہ مؤخر کر دیا۔ ستمبر تک ۵۰ سینیٹروں نے اس ریزولیشن پر دستخط کر دیئے تھے کہ وہ صدر ریگن کا فیصلہ ویٹو کریں گے اور مزید چھ نے وقت پڑنے پر دستخط کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ وہائیٹ ہاؤس کے پاس دوبارہ ملتوی کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا۔

اس دفعہ سعودی نئے صدر کے ساتھ اپنے تعلقات کو آزما رہے تھے' لہٰذا انہوں نے ۱۹۷۸ء کے مقابلے میں زیادہ تر لابنگ وہائیٹ ہاؤس پر چھوڑ دی۔ انہوں نے ریپبلکن سینیٹ لیڈر Howard Baker کی ذاتی کوششوں آرمڈ سروسیز کمیٹی چیئرمین سینیٹر Frederic Duttok اور امور خارجہ کمیٹی کے چیئرمین سینیٹر چارلس پرسی پر زیادہ تر انحصار کیا۔ Frederick Duttok کو ہدایت تھی کہ پس منظر میں رہے البتہ امریکن عربوں کی قومی تنظیم کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر David Saad نے ان امریکی صنعتی اداروں کی امداد منظم کرنے میں امداد دی جن کا مفاد اس سودے سے وابستہ تھا۔

اس دوران Dine کی ٹیم سینیٹ کی غلام گردنوں میں متحرک رہی جبکہ AIPAC نے اپنے حامیوں کے ذریعے رائے دہندوں سے دباؤ ڈلوایا۔ "The Post" کے مطابق AIPAC کا سرچشمہ تحقیق تقریباً ۲ لاکھ افراد تک پہنچتا ہے۔ Ohio کے سینیٹر John Glenn نے کہا کہ مجھے ملک کی تمام یہودی تنظیموں سے فون کالیں ملتی رہیں۔ وہ مسئلہ کے بارے میں بات نہ کرنا چاہتے تھے لیکن سارا زور اسی بات پر تھا کہ میں وہ خط اور ریزولیشن پر دستخط کر دوں۔ Glenn نے اس امید پر دستخط نہ کئے کہ اسے امید تھی کہ وہ وہائیٹ ہاؤس سے سودے بازی میں حصہ لے گا۔ ایک سنڈیکیٹ کالم نگار Carl T. Rowan نے لکھا "اس کی قوی شہادت ہے کہ AWACS کے بارے میں جدوجہد نے یہودی لابی کے خلاف عوام کا غیض و غضب زیادہ بھڑکا دیا۔"

کچھ لوگوں کے نزدیک یہ صدر ریگن اور وزیراعظم Begin میں سے کسی ایک کو چن لینے کے برابر تھا۔ گاڑیوں کے بمپروں پر واشنگٹن میں یہ سٹکر لگائے گئے: ریگن یا بیگن۔ جب سینیٹ نے آخر کار رائے شماری کی تو Cohen نے جو کہ پہلے مخالف شمار ہوتا تھا عین وقت پر اپنی رائے تبدیل کر کے وہ اہم اکلوتا ووٹ مہیا جس سے یہ سودا منظور ہوا۔ اس نے اپنی قلابازی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اگر یہ تجویز نامنظور ہو جاتی تو مشرق وسطیٰ امن مشن کی ساری ناکامی اسرائیل کے ذمہ

تھوپ دی جاتی۔

اس ایک لغزش جو AIPAC کی نظر میں اختیاری غلطی تھی' کے سوا اس کا برتاؤ ہمیشہ مثالی رہا۔ اس نے کبھی بھی دوبارہ روگردانی نہ کی' لہٰذا ۱۹۸۴ء میں اس کے دوبارہ انتخاب کا وقت آیا تو AIPAC نے مخالفت نہ کی۔

شائستگی کی حمایت

میری لینڈ کے ایک مشہور سینیٹر Charles "Mac" Mathias مریضانہ ذہنیت کے مالک ہیں۔ اغلباً یہ رول ان کے سیاسی بقاء کا ضامن ہے۔ وہ ایک ایسی ریاست کے ریپبلکن ہیں جہاں ڈیموکریٹ ریپبلکوں سے تین گنا ہیں۔ نکسن کے دور میں وہ اکثر ریپبلکن پالیسی سے انحراف کرتے تھے۔ نکسن انتظامیہ نے اسے فہرست دشمناں میں درج کر رکھا تھا کیونکہ وہ نہ صرف ویتنام جنگ کا مخالف تھا بلکہ شہری حقوق کا پرجوش مبلغ اور یہودی عوام کا حامی تھا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں جبکہ ابھی واٹر گیٹ کا وہ قضیہ شروع نہیں ہوا تھا جو نکسن کے زوال کا باعث بنا اور ملک بھر میں ناچاقی پھیلی ہوئی تھی۔ ویتنام جنگ اور مقامی بے چینی کی وجہ سے Mathias نے نکسن کو یہ مشورہ دیا کہ وہ قوم کے زخم سہلانے کا کام کرے۔ اس نے صدر پر زور دیا کہ ۱۹۷۲ء کی صدارتی مہم میں انقلابانہ اقدامات کا اعلان کرے اور ایسی پالیسی کو ترک کر دے جو خواہ مخواہ ملک میں مزید تفرقہ کا سبب بن رہی ہے۔ Mathias نے نکسن کے مشیروں کو بھی لتاڑا کہ وہ معاشرتی مسائل کو اور گمبھیر بنا رہے ہیں۔ جرائم' شہری حقوق' شہری آزادیاں اور طلباء بے چینی کے بارے میں اپنی سخت مبالغہ آمیز طرز خطابت سے وہ ریپبلکن پارٹی کے مزید دایاں رخ اختیار کرنے پر مشوش تھا۔ ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء میں اس نے صدارت کے لئے بطور ایک آزاد تیسرے امیدوار کے انتخاب لڑنے کا بھی سوچا تھا تاکہ ایک مخلوط مرکز وجود میں آسکے۔ مرحوم NAACP) Mitchall Clarence کا واشنگٹن میں ڈائریکٹر) نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ وہ ہمیشہ سوچ بچار کے بعد اپنے نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ درحقیقت اپنی تلاش معاش کے شروع ہی میں اس نے بطور ایک ترقی پسند اور شہری حقوق کے ہیرو کی شہرت پائی اور اس کے رائے دہندگان اس کے ان نظریات کو سمجھتے تھے۔ Mathias کے آبائی شہر Frederick کے ایک شہری نے واشنگٹن پوسٹ کو بتلایا کہ یہاں بہت سے لوگ اسے بہت زیادہ آزاد خیال گردانتے ہیں

لیکن پھر بھی وہ اسے ووٹ دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ بہت نفیس انسان ہے۔ اس کی اپنی ایک سج دھج ہے۔ اس میں جرأت رندانہ بھی ہے۔ ۱۹۸۱ء کے موسم بہار میں اس نے سہ ماہی مجلہ "Foreign Affairs" میں ایک مضمون لکھا جس کے بارے میں اسے پتہ تھا کہ ایسا کرنا یہودی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہے کیونکہ اس نے اس میں امریکی خارجہ پالیسی میں نسلی لابیوں خصوصاً یہودی لابی کے رول پر کڑی نکتہ چینی کی تھی۔ اس متنازعہ فیہ مضمون نے Maryland کی باثر یہودی آبادی کو زیروزبر کر دیا' حالانکہ وہ ہمیشہ Mathias کی انتخابی مہم میں حامی رہے تھے۔ ۱۹۷۸ء میں اس نے سعودیہ کو F-15 کی فروخت کی حمایت کی تھی اور ۱۹۸۱ء میں اس کے ووٹ نے صدر ریگن کو AWACS کا سودا منظور کروانے میں مدد دی تھی۔

جس سال اس کا یہ مضمون شائع ہوا اور یہ اس کے تیسری دفعہ منتخب ہونے کے ذرا دیر بعد ہی تھا۔ Mathias نے ایک اور قدم بھی اٹھایا جو سیاسی طور پر اس قدر غیر مناسب تھا کہ اکثر لوگوں نے سوچا کہ وہ کانگریس سے ۱۹۸۶ء میں ریٹائر ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ سینیٹر ہاورڈ بیکر اور چارلیس پرسی کے اصرار پر اس نے Appropriation Committee پر اپنی سینئر پوزیشن ترک کر کے امور خارجہ کمیٹی کی رکنیت اختیار کر لی۔ وہ دونوں یہ چاہتے تھے کہ امور خارجہ کمیٹی میں ایک اور معتدل ریپبلکن ہو۔

اس کے اس فیصلے نے بالٹی مور کی قیادت کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ شہر ریاست میں سب سے بڑا تھا اور وفاقی حکومت کی اقتصادی امداد حاصل کرنے کا امیدوار۔ بالٹی مورسن نے اس کے اس فیصلہ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا "اگر Mathias اسی Appropriation Committee میں رہتا تو وہ یقیناً اس ذیلی کمیٹی کا چیئرمین بن جاتا جو ڈیپارٹمنٹ آف ہاؤسنگ اینڈ اربن ڈیولپمنٹ کے لئے خزانے کی کنجیاں کنٹرول کرتی ہے۔ یہ ایجنسی بالٹی مور کے احیاء کے لئے بیحد اہم تھی۔"

میری لینڈ کے سیاسی مبصروں کے اندازوں کے برخلاف Mathias اپنی ریٹائرمنٹ کے لئے تیاری نہیں کر رہا تھا' گو اس نے جو کمیٹی ترک کی وہ اس کے رائے دہندگان کے لئے اہم تھی لیکن امور خارجہ کمیٹی میں اسے ان معاملات پر اثرانداز ہونے کا موقع میسر تھا جو خارجہ پالیسی کے رخ کا تعین کرتے ہیں۔ یہ اس کی اپنی پسند تھی' وہ ایک ایسے فلسفہ کا اظہار کر رہا تھا جس کی سابقہ سینیٹر Mike Mansfield نے تعریف کی تھی اور Mathias کو سینیٹ کے ضمیر کی آواز قرار دیا تھا۔

سابقہ سیکریٹری آف اسٹیٹ ہنری کسنجر کا کہنا تھا کہ Mathias ان معدودے چند مدبر سیاست دانوں میں سے تھا جن سے اس کا واشنگٹن میں واسطہ پڑا۔

Mathias کی یہی خصوصیات تھیں جنہوں نے اسے "Foreign Affairs" کے آرٹیکل میں یہ لکھنے پر مجبور کیا کہ ہمیں کانگریس میں نسلی وکالت پر بحث کرتے وقت شائستگی کو پھر رواج دینا چاہئے۔ اس نے یہ تسلیم کیا کہ نسلی گروہوں کو قانون سازی کے لئے لابی کرنے کا تو حق ہے لیکن یہ انتباہ بھی دیا کہ کسی حق کو تسلیم کرنا اور اس کو ناحق دبانے سے احتراز سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس حق کو پوری ذمہ داری سے اور عوامی بھلائی کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ Mthias نے اسرائیلی لابی کو سب سے زیادہ طاقتور نسلی پریشر گروپ قرار دیا جو دوسرے گروپوں سے اس بات میں مختلف ہے کہ وہ قومی سلامتی کے بیحد اہم مفادات پر توجہ مرکوز کر کے لگاتار دباؤ جاری رکھتا ہے۔ دوسرے لابی گروپ کسی بحران میں نمودار ہوتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں اور یہ کسی قومی معاملے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ Mathias نے مزید کہا :

آئیزن ہاور انتظامیہ کو چھوڑ کر جس نے تقریباً جبراً ہی اسرائیل سے جزیرہ نما سینائی خالی کروایا جس پر اس نے ۱۹۵۶ء کی جنگ میں قبضہ کیا تھا۔ تمام امریکن صدور اور اس سے بھی زیادہ حد تک سینیٹرز اور کانگریس ممبران کو ایسے مستقل دباؤ کا سامنا کرنا پڑا جسے ہم اسرائیلی لابی کے نام سے پہچانتے ہیں۔ اپنے ساتھیوں کے خلاف فیصلہ دیتے ہوئے وہ کہتا ہے: وہ خود اکثر آمادہ رہے ہیں (اسرائیل نواز لابی کے دباؤ میں) لیکن قومی مفادات پر اس لابی کا دباؤ برداشت کرنے پر اور یہ اکثر قومی مفادات کے اور ان کے ذاتی اعتقادات سے لگا نہیں کھاتا۔

Mathias نے مثال کے طور پر AIPAC کی فقید المثال کامیابی کا ذکر کیا جو اس نے Sprit of 76 کے خط کے بارے میں حاصل کی تھی۔ ہم میں سے ۷۶ نے بغیر سوچے سمجھے اپنے دستخط کر دیئے حالانکہ نہ کوئی بحث ہوئی اور نہ ہی انتظامیہ کو اپنا موقف بیان کرنے کی دعوت دی گئی۔ میری لینڈ کے ریپبلکن کا خیال تھا کہ کانگریس کی آزادی پر AIPAC کے دھمکی آمیز رویہ نے منفی اثر ڈالا تھا۔ اس نے کہا کہ کانگریس کا اعتقاد اسرائیل کی حمایت میں اس علم سے بہت ہی مستحکم ہو گیا کہ جو بھی اسرائیل کو روز افزوں اقتصادی اور فوجی امداد کی حمایت نہیں کرے گا اس کا سیاسی مقاطعہ ہو گا۔

ہر چند کہ اس نے AIPAC کا ۱۹۷۵ء کا خط صدر فورڈ کے نام دستخط کیا تھا۔ Mathias نے

۱۹۷۸ء میں کارٹر انتظامیہ کے ۶۰ عدد F-15 سعودی عرب کو بیچنے کے سودے کی AIPAC مخالف مہم کی حمایت نہ کی۔ سینیٹ میں رائے شماری سے پیشتر والی بحث میں اس نے کہا کہ سعودی عرب اور اسرائیل دونوں ہی امریکہ کے قابل قدر دوست ہیں اور دونوں کو امداد کی ضرورت ہے۔

Mathias کا کہنا تھا کہ اسرائیل اور سعودی عرب دونوں کے ساتھ امریکی مفادات کو بیلنس کرنے کی کوشش کے باوجود اس سودے کے بارے میں سینیٹ میں جذباتی عدالتی فیصلے جیسا ماحول تھا۔ اس نے ایک نیویارک سے شائع شدہ یہودی جریدہ میں چھپی خبر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مسٹر Mathias تیل کی اہمیت کو یہودیوں اور اسرائیل کی بہبود پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے لوگ یہودیوں کو بے وقوف نہ بنا سکیں گے چاہے وہ جو مرضی کہیں کیونکہ ان کے اعمال ثابت کرتے ہیں کہ وہ کیا ہیں۔

Mathias پہلے ہی اس طرح کی تنقید کا جواب "Foreign Affairs" کے مضمون میں یوں دے چکا تھا۔ "کسی مخصوص گروپ کے دباؤ کی مزاحمت کرنے سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ ہم بک چکے ہیں یا ہمیں اس ملک یا اس کے مقصد سے ہمدردی نہیں۔ بلکہ یہ تو ایک مخلصانہ رویہ کا اظہار ہے کہ ہمیں قومی مفاد عزیز ہے۔" اس نے صدر اور کانگریس دونوں سے التجا کی کہ وہ اس طرح قومی دھارے کو منتشر ہونے سے بچائیں اور امریکی قوی یکجہتی کے احساس کو فروغ دیں۔ صدر کو تو ساری قوم منتخب کرتی ہے لہٰذا اس کے لئے یہ مشکل نہیں' البتہ کانگریس مختلف گروپوں کے دباؤ کا شکار ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے بھی اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہئے۔ Mathias کا کہنا تھا کہ صرف رائے عامہ پر چل پڑنا ہی کافی نہیں۔ ایک منتخب نمائندہ کی کچھ اور دوسری ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ اسے مفاد عامہ کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بتانا اور مقدور بھر سمجھانا اور پھر اس کے منطقی سیاسی نتائج برداشت کرنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے۔" اس نے یہ انتباہ کیا کہ نسلی وکالت شدت پر مائل کرتی ہے اور اعلیٰ قومی مفاد کو پس پشت بھی ڈال سکتی ہے۔

بالٹی مور کے جیوش ٹائمز نے لکھا کہ اس آرٹیکل کا ردِ عمل لکھنے میں یہودی لیڈروں کو ایک نازک مسئلے کا سامنا رہا۔ بنیادی طور پر جائے ماندن نہ پائے رفتن والی بات تھی۔ اگر وہ اس آرٹیکل کا جواب نہ دیں اور مونچھیں نیچی رکھیں تو شکست خوردہ نظر آتے' لیکن اگر وہ اس سینیٹر کے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جائیں تو گویا وہ اس کی دلیل برائے غیر معمولی دباؤ کا ثبوت مہیا کر رہے ہوتے۔

کچھ یہودیوں نے مؤخر الذکر لائحہ عمل اختیار کیا۔ Towson University کے تاریخ کے

پروفیسر Arnold Blumberg نے Mathias پر الزام دھرا کہ وہ اس روایت کی بھرپور نمائندگی کررہا تھا جو امریکنوں کو جاپان اور نازی جرمنی کے ساتھ اس وقت تک تجارت جاری رکھنے کی حمایت کرتی تھی جب تک کہ ہمارا ہی مہیا کردہ Scrap ہمارے سپاہیوں کے سر پر جاپانی اور جرمن جہازوں سے برسنا شروع نہ ہو جائے۔ایک اور ممتاز یہودی عہدہ دار نے کہا کہ یہ آرٹیکل بدنیتی پر مبنی تھا اور Mathias نے اپنے اندر کا زہر اگلا تھا۔ نیویارک کے ڈیموکریٹ اور امور خارجہ کمیٹی کے ایک سینئر رکن Benjamin S. rosenthal نے Mathias پر الزام لگایا کہ وہ ہٹ دھری کی دہلیز تھا اور یہ کہ وہ صرف نسلی لابیوں کو ہی امریکن خارجہ پالیسی بنانے میں اثر انداز ہونے کا حق نہیں دے رہا۔ کئی نکتہ چینیوں نے اسے Anti-semitism پر ابھارنے والا کہا۔ میری لینڈ کے یہودی War Veterans تنظیم کے ایک نمائندے نے کہا کہ Mathias نے اپنے آپ کو سعودی مفاد کے عوض بیچ دیا ہے۔ ”بالٹی مورسن“ نے تنبیہ کرتے لکھا کہ کاش Mathias میں یہ اخلاقی جرأت ہوتی کہ وہ اپنے مکرر انتخاب سے ایک سال پیشتر ایسے خیالات کا اظہار کرتا نہ کہ ایک سال بعد۔ ایک سابق لابی کرنے والے نے لکھا کہ Mathias ایک ہونہار اور معزز قانون ساز ہے جو کہ روسی یہودیوں کے بارے میں مؤثر رہا ہے لیکن جہاں اسرائیل کا معاملہ ہو وہ سب سے آخر میں ساتھ ملتا ہے۔ وہ ہمیشہ نام رضامند ہوتا ہے۔ یہودی گروپوں کو دباؤ استعمال کرنا پڑتا ہے اور اسی دباؤ کو وہ ناپسند کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس ہاؤ ہو سے بلند سمجھتا ہے۔ اب ایسا لگتا ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ جو کہنا چاہے کہہ سکتا ہے۔

بہت سے دوسرے یہودی ربی اور صحافی دوستوں نے بھی اس آرٹیکل کی بالترتیب مذمت اور تعریف کی۔ ایک نے لکھا کہ نسلی میل جول امریکی زندگی کا خمیر ہے' لیکن اس بات کا خیال رہنا چاہئے کہ یہ اس قدر اہم نہ بن جائے کہ امریکن شہری بننے کی بنیادی ڈیوٹی پس پشت چلی جائے۔ بعض مرتبہ اس سلسلے میں کی جانے والی جدوجہد ضرورت سے زیادہ جوش ظاہر کرتی ہے۔

کچھ ناقدین نے اس کا مضمون پوری طرح سے پڑھا بھی نہ تھا۔ گویا وہ زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ میں نے پڑھا تو نہیں لیکن میں اس کے خلاف ہوں۔ یہودی گروپوں کی ناشتہ میٹنگوں میں اسے لگاتار چیلنج کیا جاتا تھا۔ جب بھی ایسا ہوتا تو متھائی پوچھتا کہ حاضرین میں سے کس کس نے میرا مضمون پڑھا ہے؟ اور جواباً ۲۰۰ میں سے شاید دو ہاتھ کھڑے ہوتے۔

اسرائیل نواز ذرائع سے ۳۱ لاکھ ڈالر

صنعت کا نوجوان جادوگر خود ساختہ کروڑ پتی ترقی پسند (Causes) کاز کے لئے انتھک مہم چلانے والا ریپبلکن چارلس ایچ. پرسی ۱۹۶۰ء کی دہائی میں صدارت کے لئے روشن امکانات کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنی پہلی سینیٹ ٹرم (۱۹۶۷ء سے شروع) کے دوران بام شہرت پر اس وقت پہنچا جب اس نے معمر لبرل ڈیموکریٹ پال ڈوگلس کو غیر متوقع شکست دی۔

اس کے پہلے الیکشن میں ۶۰ فیصد یہودی ووٹ ڈوگلس کو ملے۔ الی نوائے میں یہودیوں کی چوتھی بڑی آبادی ہے' لیکن اگلے چھ سال کے دوران پرسی نے اسرائیل کی امداد میں مدد کی۔ روس کو یہودیوں کو ہجرت کی اجازت دینے کے لئے کہا۔ .P.L.O کی دہشت گردی کی مذمت کی اور سوشل کازوں کی بھرپور حمایت کی۔ جب وہ انتخاب مکرر کے لئے کھڑا ہوا تو یہودی آبادی اس کی بیحد طرفدار بن گئی۔ ۱۹۷۲ء میں پرسی نے تاریخ ساز کامیابی حاصل کی۔ اس نے ہر کاؤنٹی میں اکثریت حاصل کی اور الی نوائے کے پروٹسٹنٹ ریپبلکن حلقہ انتخاب میں یہودی ووٹوں کا ۷۰ فیصد حاصل کر کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔

۱۹۷۵ء میں اس کا یہودیوں کے ساتھ ہنی مون قدرے مکدر ہوا جب اس نے مشرق وسطیٰ سے واپسی پر اعلان کیا "اسرائیل اور اس کے لیڈر جن کے لئے میرے دل میں بڑی قدر ہے' مستقبل میں اس بات پر انحصار نہیں کر سکتے کہ امریکہ ان کے لئے سادہ چیک لکھتا رہے گا۔" اس نے کہا کہ اسرائیل نے سمجھوتے کے کئی مواقع ضائع کئے ہیں۔ .P.L.O لیڈر یاسر عرفات ایک نسبتاً زیادہ معقول رہنما ہے جبکہ جارج حباش زیادہ شدت پسند ہے۔ اس نے اسرائیل پر زور دیا کہ وہ پی. ایل. او سے مذاکرات کرے۔ اگر پی. ایل. او دہشت گردی سے کنارہ کشی اور اسرائیل کے محفوظ سرحدوں کے اندر زندہ رہنے کے حق کو تسلیم کر لے۔ اس نے یاد دلایا کہ اسرائیل کے پہلے وزیراعظم ڈیوڈ بن گوریان نے یہ کہا تھا کہ اسرائیل کو امن کے بدلے علاقہ دینے کے سودے پر تیار رہنا چاہئے۔

ایک ہفتے بعد پرسی کو اپنے عملے سے یہ میمورنڈم ملا۔ "آپ کے مشرق وسطیٰ کے بیانات کے ردّعمل کے طور پر ہمیں ۲۲۰۰ تار اور ۴۰۰۰ خطوط موصول ہوئے ہیں۔ یہ ۹۵ فیصد مخالفت میں ہیں' جیسا کہ آپ جان سکتے ہیں۔ اس مخالفانہ ڈاک کا بڑا حصہ شکاگو کی یہودی آبادی سے موصول ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی حمایت اور ووٹ آئندہ آپ کو نہ دینے کی دھمکی دی ہے۔" اسی برس پرسی

نے وہ مشہور "٧٦ کی سپرٹ" والا خط دستخط نہ کر کے اسرائیل نواز شدت پسندوں کی خفگی مول لی۔ اس خط سے اس کے ٧٦ ممبر ساتھیوں نے جیرالڈ فورڈ کی مشرق وسطیٰ پالیسی پر نظر ثانی کی مؤثر ناکہ بندی کر دی تھی۔ اس پر بھی مخالفانہ ڈاک کا ایک ریلا امنڈ آیا تھا۔

اس تمام گھن گرج کے باوجود ١٩٧٨ء میں اسرائیل نواز شدت پسندوں نے اس کے خلاف کوئی سنجیدہ ہم نہ چلائی۔ ١٩٧٢ء میں اس کی تاریخی کامیابی ابھی تک ذہنوں میں تازہ تھی۔ انہوں نے اس کے لئے کوئی قابل ذکر حریف نہ تو پرائمری میں کھڑا کیا اور نہ الیکشن میں۔ جب ایک غیر معمولی وکیل نے ڈیموکریٹ نامزدگی صرف کسی اور کے مقابلہ پر نہ آنے سے حاصل کر لی تو یہودیوں نے ذرہ بھر دلچسپی نہ لی' حتیٰ کہ اس انتخاب کے سال میں پرسی کو F-15 سعودی سودے کے حق میں ووٹ دینے سے بھی کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

حقیقت میں صرف ١٠٠ کے لگ بھگ یہودیوں نے شکاگو میں Seith کی حمایت کی اور اور اکثریت ان میں غیر معروف تھی۔ اس کے حامی نامزد کنندہ نے ہر یہودی تنظیم (مرد اور عورت دونوں) اور یہودی عبادت گاہ سے درخواست کی لیکن صرف ایک نے اس کو تقریر کرنے کی اجازت پر رضامندی ظاہر کی۔ اس کی مہم کے منیجر Gary Ratner نے کہا کہ یہ گھٹیا ذہنیت تھی۔ یہودیوں کی اکثریت کا خیال تھا کہ پرسی کی ہار کا کوئی امکان نہ تھا تو اسے کیوں اپنے خلاف کیا جائے۔ Seith نے جو دس لاکھ ڈالر خرچ کئے اس میں یہودیوں کا حصہ بیس ہزار ڈالر سے بھی کم تھا۔ Philip Klutznic (شکاگو کا ممتاز یہودی لیڈر) کے الی نوائے کے یہودیوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی وجہ سے اس سے کئی گنا زیادہ رقم پرسی کو دی گئی۔ جن ستر یہودی لیڈروں کو ایک اشتہاری مہم کے لئے امداد کرنے کو کہا گیا ان میں سے ٦٥ نے دستخط کر دئے۔ الیکشن کے دن پرسی کی فتح میں یہودی حمایت پیش پیش رہی۔ ساری ریاست کے ووٹوں میں اس کا تناسب ٥٣ فیصد تھا جبکہ یہودی ووٹوں کا ٦١ فیصد اسے ملا۔

١٩٨٤ء کی انتخابی مہم ڈرامائی انداز سے مختلف تھی۔ اسرائیل نواز حلقوں نے شروع ہی سے شکست دینے کے لئے کام شروع کر دیا اور اسے سانس لینے کی مہلت نہ دی۔ پرسی نے یہودیوں کو AWACS کے سودے کی حمایت کر کے برافروختہ کر لیا تھا۔ (کارٹر انتظامیہ بھی سعودی عرب کو بیچنے کے حق میں تھی) اس بات نے پرسی کے خلاف مزید چنگاری بھری۔ پرسی نے یہ فیصلہ اس لئے کیا تھا کہ اسٹاف ممبران نے اسرائیل سے واپس آ کر یہ شہادت دی تھی کہ اسرائیلی فوجی افسروں کا یہ

کہنا تھا کہ اس سودے سے توازن طاقت تو اسرائیل کے خلاف نہ بگڑے گا البتہ وہ امریکہ اور سعودی عرب کے درمیان لین دین شروع ہونے کے مخالف ہیں۔

۱۹۸۴ء کے اوائل ہی میں AIPAC نے یہ فیصلہ کیا کہ پرسی کو ہر قیمت پر ہرایا جائے گا۔ تمام قومی قوت اس پر مجتمع کر دی گئی۔ مارچ کے پرائمری انتخاب میں Tom Corcoran کی نامزدگی کی حمایت کی گئی کہ وہ پرسی کو للکارے۔ AIPAC کے ایک سابقہ ڈائریکٹر Morris Amitay کو اس کا چیف ایڈوائزر اور فنڈ کلکٹر مامور کیا گیا۔ Corcoran نے بلند آہنگی سے پرسی کی بطور اسرائیل مخالف مذمت شروع کی۔ یہودیوں کے چندہ جمع کرنے والے جلسوں میں اس نے پرسی کو کانگریس میں اسرائیل کا بدترین دشمن قرار دیا۔ Corcoran کی جانب سے اخبارات میں ایک پورے صفحہ کا اشتہار دیا گیا جس میں یاسر عرفات کی فوٹ کے نیچے عنوان تھا:

"Chuck Percy کا یہ کہنا ہے کہ یہ شخص اعتدال پسند ہے۔" اس کے برخلاف الی نوائے کے ۵۸ ممتاز یہودیوں کا لکھا ہوا خط جو پرسی کی حمایت میں تھا' صدا بصحرا ثابت ہوا۔

پرسی یہ پرائمری معرکہ تو جیت گیا لیکن Corcoran کے حملوں نے یہودی ووٹروں کے حلقہ میں اسے نقصان پہنچایا اور یہ مضبوط بنیادی بنی AIPAC کے آئندہ حملوں کے لئے۔ موسم گرما کے شروع ہی میں AIPAC کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھامس اے. ڈائن نے شکاگو کی ایک ورکشاپ میں پرسی کی کارکردگی پر کڑی نکتہ چینی کر کے حملہ کا اشارہ دیا۔ AIPAC نے پال سائمن کے حق میں چندہ جمع کرنے کی ترغیب دی اور پرسی کے خلاف اپنی پوری سیاسی قوت جھونک دی۔ اس نے کئی طالب علموں کو پرسی کے خلاف ریسرچ پر ہمہ وقتی جوت دیا اور اسٹیٹ کے باہر سے سو سے زائد طالب علموں کو بلا کر سائمن کی حمایت پر لگا دیا۔

اس مہم کے عین بیچ میں AIPAC نے ایک قابل اعتراض حربہ استعمال کیا تا کہ پرسی کو دوسروں کی نظر میں برا بنایا جا سکے۔ سینیٹ میں اہم ووٹوں کی بناء پر AIPAC نے تمام سینیٹرز کی درجہ بندی کی تھی۔ اس لحاظ سے پرسی نے ۸۹ فیصد ووٹ اسرائیل کی حمایت میں ڈالے ہوئے تھے۔ یہ سائمن کے ۹۹ فیصد سے کچھ ہی کم تھا جو کہ اس نے کانگریس میں اسرائیل کی حمایت میں ڈالے تھے۔ اس سے پرسی مخالف مہم کو کچھ زیادہ مدد نہ ملی۔ لابی نے اس مسئلہ کا حل عین منجدھار میں اپنے اصولوں کو تبدیل کر کے نکالا۔ اس نے اس فہرست میں وہ غیر معروف چھوٹے چھوٹے ووٹ بھی شامل کر دئے

جو کہ پرسی نے ذیلی کمیٹیوں میں ڈالے تھے اور وہ خط ریزولوشن بھی جو کہ اس نے دستخط نہ کئے تھے۔ اس بات سے پرسی کی درجہ بندی ۵۱ فیصد پر رہ گئی۔ یہ سائمن کے لئے مفید تھا جب وہ یہودیوں کو خطاب کر رہا ہوتا تھا۔

سائمن کو زیادہ تر رقم تو انفرادی طور پر وصول ہوئی لیکن پولیٹکل ایکشن کمیٹیوں کا حصہ زیادہ رہا۔ وسط اگست تک ان کمیٹیوں نے ۱۴۵۰۰۰ ڈالر سائمن کو دے چھوڑے تھے اور یہ سب سینیٹروں سے زیادہ چندہ تھا۔ الیکشن کے دن تک یہ رقم ۲۳۵۰۰۰ ڈالر تک پہنچ چکی تھی اور ۵۵ کمیٹیوں نے اس میں حصہ لیا۔ مزید بر آں کیلیفورنیا کے ایک یہودی شدت پسند Micheal Goland نے وفاقی قانون میں ایک سقم کا سہارا لیتے ہوئے ریڈیو' ٹی وی' اشتہاری بورڈوں پر ۱۶ لاکھ ڈالر کی خطیر رقم خرچ کر ڈالی۔ اس میں الی نوائے کے باشندوں سے کہا گیا تھا کہ ریسی جیسے گرگٹ کو ترک کر دیں۔ پرسی نے زبردست جوابی حملے کئے۔ نیویارک کے سابقہ سینیٹرز Javit Jacob نے جو کہ قومی سطح پر ایک ممتاز ترین یہودی تھا اور سینیٹ کی خارجہ امور کی ذیلی کمیٹی برائے مشرق وسطیٰ کے چیئرمین سینیٹر Rudy Boschwitz دونوں نے شکاگو میں آکر پرسی کے حق میں ذاتی طور پر جلسوں سے خطاب کیا۔ الی نوائے کے ۱۰۰ یہودیوں نے سابقہ اٹارنی جنرل Edward H.Levi کی سربراہی میں ایک پورے صفحہ کا اشتہار دیا جس میں کہا گیا تھا کہ پرسی نے الی نوائے کا حق ادا کیا۔ امریکہ کا حق ادا کیا اور اسرائیل کا بھی حق ادا کر دیا ہے۔" اس اشتہار میں بغیر Goland کے حملوں کا حوالہ دیئے' یہ انتباہ درج تھا" آیئے ہم اپنے امریکن سینیٹ کی انتخابی مہم کو ایک کیلیفورنیا والے کے ہاتھ فروخت نہ ہونے دیں۔" ماسواء ایک مرتبہ یہ کہنے کے کہ سائمن تو ۱۰۰ فیصد دفعہ ووٹ اسرائیل کے حق میں ڈالنے کا دعویدار ہے۔ پرسی نے اس مہم میں "اسرائیل بمقابلہ امریکن یہودی" جھگڑے سے اپنا دامن آلودہ نہ ہونے دیا۔

یہ تمام احتیاطیں اور قانون سازی میں لگایا گیا زور سب رائیگاں گیا۔ یہ پرسی ہی کی بطور چیئرمین سینیٹ خارجہ کمیٹی کے شہ تھی کہ اسرائیل کو ریگن کی درخواست کردہ مدد سے ۴۲۵ ملین ڈالر کی زائد امداد منظور کی گئی۔ ۱۹۸۳ء میں اور ۱۹۸۴ء میں ۳۲۵ ملین زائد' لیکن اسرائیل کے حق میں یہ کامیابیاں بالکل غیر مؤثر ثابت ہوئیں۔ انتخاب سے ایک مہینہ پہلے کئے گئے رائے شماری کے ایک جائزے میں یہ کھلا کہ یہودیوں کی بڑی اکثریت سائمن کی طرفدار تھی۔ پرسی کو یہ سیلاب روکنا دوبھر تھا۔

جب ووٹوں کی گنتی مکمل ہوئی تو پرسی ساری ریاست پر ۸۹۰۰۰ ووٹوں سے ہارا تھا۔ بعد میں

کئے گئے ایک جزوی جائزہ سے یہ ظاہر ہوا کہ پرسی کو یہودیوں کے صرف ۳۵ فیصد ووٹ ملے تھے۔ اسی رائے شماری میں الی نوائے کے یہودی ووٹروں نے ریگن کے مکرر انتخاب کے حق میں ۳۰ فیصد ووٹ ڈالے تھے۔ حالانکہ وہ صدر کے چرچ اور اسٹیٹ کی علیحدگی اسقاط حمل اور دوسرے معاشرتی مسائل پر خیالات کے بارے میں خوش نہ تھے اور سعودی عرب کو Awacs کی فروخت کا معاملہ اس کے علاوہ تھا۔

ایسے انتخاب میں جہاں ووٹوں کا فرق اس قدر کم تھا' کسی بھی بڑے مسئلہ کو اہم قرار دیا جاسکتا ہے۔ گو پرسی عام طور پر صدر ریگن کی حمایت کرتا تھا لیکن ووٹر اسے بطور معتدل مزاج' ترقی پسند ریپبلکن ہی جانتے تھے۔ کچھ قدامت پسند ریپبلکن بھی اس کی شکست پر خوش تھے۔ نئے دائیں بازو والے گروہ نے شروع ہی میں پرسی کی مخالفت اور سائمن کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا حالانکہ کانگریس میں اس کا ریکارڈ انتہائی آزاد خیالی کا تھا۔

بہرحال صرف ایک مشرق وسطیٰ کا جھگڑا ہی اس شکست کے لئے کافی تھا۔ ان ہزاروں یہودیوں نے جنہوں نے ۱۹۷۸ء میں اس کے حق میں ووٹ دیا تھا' اب چھ سال بعد وہ اس کے مخالف اور ڈیموکریٹ کے حامی بن گئے تھے۔ اس کی وجہ اسرائیلی لابی کا مہم کے دوران سال بیحد مؤثر طریقے سے اس بات کے لئے کام کرنا تھا کہ پرسی "اسرائیل دشمن" ہے۔ اسرائیل کی امداد کے لئے پرسی کا طویل ریکارڈ ہی اس الزام کا مثبت جواب تھا۔ لیکن صرف چند ہی یہودی دفاع میں بولے۔ سینیٹر کو یہ پتہ چل گیا کہ ایک مرتبہ جب کسی امیدوار پر "اسرائیل مخالف" کا لیبل چسپاں کر دیا جائے تو پھر اس زہریلے وار کا کوئی توڑ نہیں۔

اس مہم میں مشرق وسطیٰ کا بہت دخل رہا۔ سائمن کے اخراجات ۵۳ لاکھ ڈالر تھے جبکہ پرسی کے تقریباً ۶۰ لاکھ۔ اگر اس میں گولڈنگ کے ۱۶ لاکھ بھی ملا لئے جائیں تو پھر سائمن کے حق میں خرچ کی جانے والی رقم ۶۹ لاکھ ڈالر بن جاتی ہے۔ اس رقم کا ۴۰ فیصد (یعنی ۳۱ لاکھ ڈالر) یہودی ذرائع سے ملے جو پرسی کے عرب اسرائیل تعلقات کے نظریے سے نالاں تھے۔ سائمن کو اس میں سے نصف رقم کا وعدہ تو نامزدگی سے پیشتر ہی مل چکا تھا۔ جب وہ ابھی اس بات پر غور و خوض کر رہا تھا کہ وہ ایوان نمائندگان میں اپنی محفوظ نشست سے ہاتھ دھولے یا نہیں تو اسے یہودی ذرائع سے ۱۵ لاکھ ڈالر کی یقین دہانی کرا دی گئی تھی۔ یہ وعدہ شکاگو کے ایک تاجر Schrayer Robert کے واسطہ سے کرایا

گیا۔ وہ ایک ممتاز یہودی لیڈر تھا اور اس کی بیٹی Elizabeth پرسی کے خلاف بطور AIPAC کی پولیٹکل افیئرز کمیٹی کی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے مہم کی انچارج تھی۔

اپنی شکست کے اوپر مشرق وسطیٰ کے جھگڑے کے اثر کا جائزہ بوقت نظرثانی کرتے ہوئے اس نے کہا "اس سے کوئی فرق پڑا' یہ مجھے معلوم نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر Robert Schrayer اسے ۱۵ لاکھ ڈالر دینے کا وعدہ نہ کرتا تو وہ انتخاب کے لئے کھڑا ہی نہ ہوتا۔" سائمن نے بھی مانا کہ اس وعدہ کا میرے فیصلہ میں دخل تھا۔

AIPAC کے تھامس ڈائن نے کینیڈا کے سامعین کے سامنے کہا "امریکہ کے سارے یہودی' اس ساحل سے اس ساحل تک پرسی کو ہٹانے کے لئے متحد ہو گئے۔ چنانچہ ان تمام امریکی سیاستدانوں کو جو اس وقت عوامی عہدوں پر ہیں اور آئندہ بھی ان پر رہنے کی خواہش رکھتے ہیں ایک سبق مل چکا ہے۔"

باب چہارم

اوول آفس اور لابی

ایک اتوار کی سہ پہر اپنے انتخاب سے چند ہی روز قبل ۱۹۶۰ء میں ڈیموکریٹ صدارتی امیدوار John F. Kennedy نے اپنی کار واشنگٹن کے ایک فیشن ایبل نواح میں فوکس ہال روڈ کے قریب 4615-W اسٹریٹ پر پارک کی۔ وہ اکیلا تھا اور اس کے ساتھ خفیہ پولیس کے وہ اہکار نہ تھے جو کہ جلد ہی اس کے جزوِ زندگی بننے والے تھے۔

وہ انتخابی مہم کے دباؤ سے فرار اور ایک پرانے دوست اور صحافی Charles Bartlett کے ساتھ گپ شپ کرنا چاہتا تھا۔ ان کی دوستی جب وہ جنگ عظیم دوم کے بعد فلوریڈا میں ملے تھے تب سے چلی آ رہی تھی اور Bartlett ہی نے اسے اس کی ہونے والی دلہن Jacqueline سے متعارف کروایا تھا۔

گزشتہ شب ہی کینیڈی نے نیویارک کے متمول اور ممتاز یہودیوں کے ایک گروپ کے ساتھ ڈنر کیا تھا۔ اس شام کے ایک واقعہ پر اسے گہری تشویش لاحق تھی۔ Bartlett کو یہ بتلاتے ہوئے اس نے کہا کہ یہ بڑا حیران کن تجربہ ہے۔ اس نے بغیر نام لئے کہا کہ پارٹی میں شریک ایک شخص نے کہا کہ وہ جانتا ہے کہ کینیڈی کی انتخابی مہم مالی دشواریوں سے دوچار ہے اور وہ اس گروپ کی طرف معتدبہ مالی امداد کی پیشکش کرتا ہے بشرطیکہ کینیڈی بطور صدر اگلے چار سال کے دوران انہیں مشرق وسطیٰ پالیسی پر اجارہ داری دے دے۔ یہ بہت ہی چونکا دینے والی تجویز تھی۔ کینیڈی نے Bartlett کو بتلایا کہ اس کا ردّعمل بطور عام شہر کے نہ کہ بطور صدارتی امیدوار کے یہ تھا کہ بقول اس کے یہ اس کے لئے توہین آمیز بات تھی کہ کوئی ایسی پیشکش کرے خصوصاً ایسے شخص کو جس کے صدر چنے جانے کے امکانات بیحد کم تھے۔ اس نے جواباً کہا کہ اگر کبھی وہ صدر بن گیا تو وہ ایک ایسا قانون پاس کروانے کی کوشش کرے گا کہ صدارتی انتخابی مہم کا خرچہ امریکی خزانے سے ادا کیا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس طرح صدارتی

امیدواران آئندہ اس طرح کے دباؤ میں آنے سے بچ جائیں گے اور اس سے ملک کا آخر کار بہت بھلا ہوگا۔ بارٹلٹ کو یہ تو علم نہ ہوا کہ کینیڈی نے اس تجویز کے جواب میں کیا کہا لیکن اس نے کہا مجھے اس کے رویہ کا علم ہے۔ اس نے اغلباً ایک عموی سا تبصرہ کر کے موضوع بدل دیا ہوگا۔

بارٹلٹ سے اس واقعہ کا علم ہونے کے بعد میں نے اس ڈنر کے ایک شریک Myer Feldman (ایک واشنگٹن اٹارنی) جو کہ ۱۹۶۰ء کی انتخابی مہم میں کینیڈی کا قریبی ساتھی تھا اور بعد ازاں اس کا مشیر بن گیا تھا (اس کی ذمہ داری یہودی فرقہ کے ساتھ صدر کے رابطے کے لئے کام کرنا تھا)' سے اس بارے میں پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مزید روشنی ڈال سکے گا۔ ۶۲-۱۹۶۱ء کے دوران بطور ایک نئے کانگریس ممبر کے میرا Feldman کے ساتھ سوویت روس کو گندم بیچنے کے مسئلہ پر کئی مرتبہ دوستانہ تبادلہ خیال ہو چکا تھا۔

اسے وہ ڈنر یاد تھا جو Abraham Feinberg کے فلیٹ پر ہوا تھا۔ وہ نیویارک کے American Bank and Trust Company کا چیئرمین تھا اور اسے ڈیموکریٹ پارٹی کے علاوہ یہودیوں کے قومی معاملات میں بھی اثر و نفوذ حاصل تھا۔ Feldman کا کہنا تھا کہ حاضرین مجلس کینیڈی کے بارے میں متذبذب تھے۔ انہیں یہ یقین نہیں تھا کہ وہ مشرق وسطیٰ پالیسی پر کیا رخ اختیار کرے گا اور نتیجتاً وہ اس کی حمایت کے بارے میں ڈانواں ڈول تھے۔ امیدوار کو تند و تیز اور پریشان کن سوالات کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا پڑا جب کینیڈی سے یہ پوچھا گیا کہ اسرائیل کے دارالحکومت کو تل ابیب سے یروشلم منتقل کرنے کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے؟ تو اس نے جواب دیا "موجودہ حالات میں نہیں۔" اس کا کہنا تھا کہ کینیڈی نے تمام سوالات کے جوابات بغیر لگی لپٹی رکھے دیئے اور حاضرین پر خوش گوار تاثر چھوڑا۔ فیلڈمین نے کہا کہ اسے کسی ایسی تجویز کا علم نہ تھا جس سے مستقبل کے صدر کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔

یہ کوئی پہلا موقعہ نہ تھا کہ مشرق وسطیٰ کی سیاست صدارتی انتخابی مہم میں دخل انداز ہوئی ہو۔ بارٹلٹ کا کہنا تھا کہ جب اس نے یہ روداد Roger L. Stevens کو سنائی تو اس نے کہا "بھئی بہت دلچسپ' کیونکہ سابق یو. این. سفیر Adlai E. Stevenson کے ساتھ ۱۹۵۶ء میں لاس اینجلز میں یہی کچھ پیش آیا۔" Rogers واشنگٹن ڈی سی میں J.F.K. Centre for Pref. کا ڈائریکٹر تھا اور ایڈلائی ۱۹۵۶ء میں ڈیموکریٹ صدارتی امیدوار کے طور پر آئزن ہاور کے دوبارہ انتخاب کے خلاف حصہ

لے رہا تھا۔

نسلی گروپ کا دباؤ امریکہ کے سیاسی افق پر بروقت منڈلاتا خطرہ ہے اور چونکہ صدر امریکہ بڑی حد تک ذاتی طور پر ساری خارجہ پالیسی تشکیل دیتا ہے' لہٰذا یہ دباؤ انہی شخصیات پر مرکوز کیا جاتا ہے جو صدر ہوتے ہیں یا صدارت کے امیدوار۔ جب یہ دباؤ اسرائیل کے دوستوں کی طرف سے ہوتا ہے تو صدر اور صدارتی امیدوار اکثر مغلوب ہو جاتے ہیں۔

لابی کا دباؤ وہائیٹ ہاؤس میں کئی مختلف سطحوں پر ڈالا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ براہ راست یعنی روبرو بہت مختلف طرح کا ہو سکتا ہے۔ اس کا انحصار زیادہ تر اس بات پر ہے کہ اس وقت کس قسم کا شخص صدارت پر براجمان ہے۔

بعض دفعہ ایسے دباؤ ڈالنے والوں کا اثر صرف ایک ہی صدر تک محدود ہوتا ہے کیونکہ وہ صدر کے قریبی دوست ہوتے ہیں۔ مثلاً P.Ed. Jacobson جو صدر ٹرومین کا یار غار تھا اور ایک پرجوش صیہونی نیویارک کے ایک ممتاز یہودی لیڈر Mr. and Mrs. Arthur Krim نے صدر لنڈن بی جانسن کے ساتھ قریبی تعلقات رکھے۔ اس زمانے کا وہائیٹ ہاؤس کے عملے کا ایک رکن کہتا ہے "۱۹۶۷ء میں جنگ سے ذرا پہلے کے نازک عرصے میں Mr. Arthur Krim L.B.J. Ranch پر مہمان تھے اور Mrs. Mathilda Krim وہائیٹ ہاؤس میں بطور مہمان مقیم تھیں۔ جنگ کے دوران وہائیٹ ہاؤس کی دستاویزات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ مسز Krim نے اکثر فون پر صدر جانسن سے بات کی۔

دیگر یہودی لیڈران ایک سے دوسری انتظامیہ تک تعلقات استوار رکھتے ہیں۔ نیویارک کے Abraham Feinberg (جس نے ۱۹۶۰ء میں کینیڈی کی دعوت کی تھی) کے برسوں وہائیٹ ہاؤس سے تعلقات رہے۔ صدر جانسن کے دور میں وہ اکثر حاضری دیتا تھا۔ ۱۹۸۴ء میں بھی اس نے والٹر مونڈیل اور گیری ہارٹ کی روبرو ملاقات اور بحث اپنے نیویارک کے اپارٹمنٹ میں کروائی جبکہ یہ دونوں ممتاز صدارتی امیدوار تھے۔ شکاگو کے Philip Klutznick نے ٹرومین' آئزن ہاور' کینیڈی' جانسن اور کارٹر کے دور صدارت تک قریبی تعلقات برقرار رکھے۔ وہ B'nai B'rith کا سابقہ صدر تھا۔

کبھی کبھار اسرائیل کے سفارت کاروں کے ذاتی تعلقات صدر تک براہ راست رسائی مہیا کرتے ہیں۔ Ephrahim Evron جو کہ اسرائیلی سفارت خانے کا ڈپٹی چیف تھا اور میر اسٹینیٹ کے دنوں کا دوست۔ بعض مرتبہ اوول آفس میں صدر جانسن سے ذاتی طور پر گفتگو کیا کرتا تھا۔

دوسری سطح کا دباؤ صدر کے قریبی عملے کے واسطہ سے ڈالا جاتا ہے۔ مثلاً مشیر برائے رابطہ یہودی فرقہ یا دوسرے سینئر مددگار۔ صدر کینیڈی نے ہنستے ہوئے اپنے ایک دوست کو بتلایا تھا کہ جب وہ واشنگٹن سے باہر ہوتے تھے تو ان کے یہودی معاملات کے مشیر کار Myer Feldman کبھی کبھار یہودی لیڈروں کو بلا کر وزارتی کمرے میں صلاح مشورہ کیا کرتے تھے۔

قصر صدارت پر دباؤ کے لئے تیسری سطح مختلف نظامتوں (Deptt.) کے سربراہان تھے...... اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ' ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ' نیشنل سیکورٹی کونسل۔ یہاں اسرائیلی حکام اور امریکن یہودیوں کے شدت پسند گروپ اپنے ایجنڈوں کو آ کر پیش کرتے تھے۔ یہ کام کابینہ کی سطح کے عمال یا ان کے نائبین کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ (دیکھیں باب ۵)

ووٹ آپ کے خلاف ہیں

ٹرومین کے اوائل صدارت میں ہی صیہونیوں نے اپنے کیس کی وکالت شروع کر دی اور ان کی کوششوں میں اس وقت ۱۹۴۷ء میں شدت پیدا ہو گئی جب اس نے شروع میں فلسطین کے اندر ایک یہودی ریاست کے قیام کی مخالفت کی۔ یہودی لیڈروں نے اخبارات میں اشتہاری مہم چلانے کے لئے خرچہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ "Holocaust" کے بارے میں عوامی غیض و غضب کو یہودیوں کے قومی وطن کی حمایت میں بدل دیا جائے۔ کانگریس کے دونوں ایوانوں نے یہ قرارداد منظور کی کہ صدر اس کی حمایت کریں۔ جب ٹرومین نے مخالفت جاری رکھی اور شہریوں سے کھلے عام یہ اپیل کی کہ وہ "فلسطینی باشندوں کے جذبات انگیختہ نہ کریں" تو نیو جرسی کے ایک یہودی گروپ نے بذریعہ تار کہا "آپ کی حکمت عملی برائے فلسطین کے باعث ۱۹۴۸ء میں آپ ہماری حمایت سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔" الیکشن کی آمد آمد پر یہ زندگی کی تلخ سیاسی حقیقتوں کا ایک اظہار تھا۔ امریکہ کے دو تہائی یہودی نیویارک پنسلوینا اور الی نوائے میں بستے ہیں اور ان ریاستوں کے کل ملا کر ۱۱۰ صدارتی انتخاب میں ووٹ بنتے ہیں۔ موجودہ صدر ہونے کے باوجود ٹرومین کی جیت کے امکان تقریباً معدوم تھے' لہٰذا اسے جیتنے کے لئے ان ووٹوں کی اشد ضرورت تھی۔

اسرائیل کی نوزائیدہ ریاست کے قیام کا اعلان جلد متوقع تھا اس لئے ٹرومین نے مشرق وسطیٰ کے سفیروں کی رائے جاننے کے لئے انہیں اکٹھا کیا۔ مصر میں سفیر Pinkerton "Pinky" Tuck

نے بطور ان کے ترجمان کے فوری طور پر تسلیم کر لینے کے خلاف رائے دی۔ اس نے ٹرومین کو بتلایا کہ تسلیم کرنے میں اتنی مناسب تاخیر کرنی چاہئے کہ مرحوم صدر روزویلیٹ کا شاہ سعود سے کیا وعدہ پورا ہو سکے کہ اس بارے میں عرب ریاستوں سے مشورہ کیا جائے گا۔ ٹرومین کا جواب تھا "Mr. Tuck آپ درست ہوں گے لیکن ووٹ آپ کے خلاف ہیں!" اسرائیل کو فوری طور پر تسلیم کرنے کا فیصلہ کر کے ٹرومین نے نہ صرف Tuck کا مشورہ مسترد کیا بلکہ اپنے تمام فوجی اور سیاسی مشیروں کو بھی نہ مانی۔ اس نے اپنے یار غار Ed. Jacobson کی بات مانی۔ آج بھی اسرائیل نواز حلقے ٹرومین کے اس فیصلہ کو "کلیدی رابطے" کے واسطے سے مؤثر لابنگ کی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں جو عام دباؤ ڈالنے کے حربوں سے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ Jacobson کے صیہونی نواز خیالات ٹرومین کے سیاسی مشیروں خاص کر Clark Clifford کے بھی خیالات تھے۔ سیکریٹری آف اسٹیٹ جارج سی مارشل تو اس فیصلہ کا اس قدر شدید مخالف تھا کہ اس نے ٹرومین کے تسلیم کر لینے کے فیصلہ کے اعلان کرنے پر اسے کہا کہ اگر اگلے روز انتخاب ہوں تو وہ اسے ہرگز ووٹ نہ دے گا۔ اسرائیل میں جذبات قدرے مختلف تھے۔ ۱۹۴۹ء میں اسرائیل کے چیف ربی نے وہائیٹ ہاؤس کے دورہ کے دوران صدر کو کہا کہ خدا نے آپ کو بطن مادر میں اس لئے رکھا تھا کہ آپ ۲۰۰۰ سال بعد اسرائیل کے احیاء ثانی کا وسیلہ بنیں۔

سیاسی وابستگیوں کے لحاظ سے ٹرومین اس فیصلہ سے نفع میں رہا۔ انتخاب کے دن اسے قومی یہودیوں کے ۷۵ ووٹ پڑے جن کے سبب اسے ایک انتہائی غیر متوقع اور بیحد قلیل اکثریت سے کامیابی نصیب ہوئی اور ساتھ ہی اسرائیلی ڈاک کے ٹکٹوں اور صیہونی دلوں میں مستقل مقام بھی۔

یک جماعتی خیالات سے بیزاری

ٹرومین کے جانشین صدر آئیزن ہاور کے عہد میں اسرائیلی ریاست کے حق میں صدارتی برتاؤ بالکل الٹ گیا۔ اس نے اسرائیلی لابی کے دباؤ کا مقابلہ کیا اور کم از کم تین موقعوں پر اس نے اسرائیل کو اپنی ایسی پالیسیوں سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا جن کا وہ کھلے بندوں اظہار کر چکا تھا۔

۱۹۵۳ء میں اس نے ۲۶ ملین ڈالر پر مشتمل وہ اسرائیلی امداد اس وقت تک منسوخ کرنے کے احکام جاری کئے جب تک اسرائیل دریائے اردن سے پانی موڑنے والی اس نہر پر کام بند نہ کر دے جو وہ ۱۹۴۹ء کے جنگ بندی معاہدے کے خلاف ورزی کرتے ہوئے کر رہا تھا۔ اس سے اسرائیل کو ان

آبی ذرائع پر دسترس حاصل ہو جاتی جو اس خطے کے سب ملکوں کے لئے اہم تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی صدر نے واقعی اسرائیل کی امداد روکی۔ اس نے محکمہ مال کو بھی ہدایت کی کہ وہ یونائیٹڈ جیوش اپیل اور ایسی ہی دوسری تنظیموں کی طرف سے اسرائیل کے لئے جمع کر کے دیئے جانے والے عطیات کا انکم ٹیکس سے استثناء کے احکام منسوخ کر دے۔

آیزن ہاور کے اس فیصلے سے طوفان اٹھنا متوقع تھا۔ نیویارک کے میڈیسن سکوئیر گارڈن میں یروشلم کی تین ہزارویں سال گرہ مناتے ۲۰۰۰۰ کے مجمع سے خطاب کرتے Dr. Israel Goldstein نے کہا کہ امداد روک کر دباؤ ڈالنے سے اس کے عمل میں مدد نہیں ملے گی۔ نیویارک سے کانگریس کے ممبران بھی اس شور و غوغا میں شامل ہو گئے۔ سینٹر رابرٹ ویگنر کا کہنا تھا کہ یہ فیصلہ ظالمانہ اور غیر معقول ہے۔ Emanuel Celler نے فوری فیصلہ کہہ کر مذمت کی۔ تمام بڑی بڑی یہودی تنظیموں نے اس فیصلے کی مذمت کی۔ آئیزن ہاور امداد کی بندش پر ڈٹا رہا اور دو ماہ بعد اسرائیل نے اعلان کیا کہ وہ اس دریائی پانی موڑنے کے پلان پر عمل ترک کر رہا ہے۔ سو پہلا راونڈ صدر نے جیتا۔ محاذ آرائی ختم ہوئی اور امداد بحال کر دی گئی اور وہ انکم ٹیکس استثناء والا قانون منسوخ نہ ہوا۔

اکتوبر ۱۹۵۶ء میں آئیزن ہاور کا پھر لابی سے سامنا ہوا۔ یہ اس کے انتخاب مکرر سے صرف چند ہی روز پیشتر کی بات تھی۔ اسرائیل نے برطانیہ اور فرانس سے ایک خفیہ معاہدہ کیا تھا کہ یہ تینوں مل کر مصر کے کرنل ناصر پر فوجی حملہ کریں گے۔ کرنل ناصر نے انہی دنوں نہر سویز کو قومیالیا تھا۔ اسرائیل نے صحراء سینا عبور کر کے نہر کی طرف پیش قدمی کرنی تھی جبکہ برطانیہ اور فرانس نے ہوائی بمباری کے بعد شمال سے حملہ کرنا تھا۔ اتحادی حکومتوں کا خیال تھا کہ امریکہ دخل اندازی نہیں کرے گا۔ برطانیہ اور فرانس کا خیال تھا کہ آئیزن ہاور اپنے سابقہ جنگی حلیفوں کے ساتھ اعلانیہ مخالفت سے باز رہے گا۔ اسرائیل نے یہ سوچا تھا کہ امریکی صدارتی انتخاب کے ہوتے ہوئے امریکی لابی اپنے دباؤ کے زیر اثر صدارتی امیدوار کو اس قضیے سے الگ تھلگ رکھ سکے گی۔ سب کے اندازے غلط نکلے۔

۲۹ر اکتوبر کو اسرائیل کا حملہ شروع ہوتے ہی آئیزن ہاور نے فوراً اسرائیل کی امداد بند کر دی' صرف وہ غذائی امداد جاری رہنے دی گئی جو پہلے ہی دوران سفر تھی باقی ہر قسم کی امداد پر پابندی لگا دی گئی' چاہے وہ فوجی تھی یا اقتصادی۔ ان اقدامات کا اثر اس قدر شدید تھا کہ اسرائیل کا حملہ رک گیا۔ برطانیہ اور فرانس نے بھی امریکی دباؤ کے ماتحت شمال سے حملے کرنے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

اس مشرق وسطیٰ پالیسی پر جماعتی مخالفت کے باوجود آئیزن ہاور نے آسانی سے انتخاب مکرر جیت لیا بلکہ ۱۹۵۲ء کے ۳۶ فیصد یہودی ووٹوں کے مقابلہ میں ۱۹۵۶ء میں اسے ۴۰ فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔ لیکن اس سے آئیزن ہاور کے لئے اسرائیل کے مسئلے کی سردردی ختم نہ ہوئی۔ حملہ روک دینے کے بعد بھی اسرائیل نے مصر کے زیرانتظام غزہ کی پٹی اور خلیج عقبہ کے دہانے پر واقع اہم بندرگاہ "شرم الشیخ" پر اپنا غاصبانہ فوجی قبضہ برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ امریکہ کے احتجاج اور اقوام متحدہ کی چھ قرار دادوں کو بھی نظرانداز کیا گیا۔ اسرائیل انخلاء پر راضی نہ ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آئیزن ہاور پر لابی کا دباؤ بڑھتا گیا۔ اب مرحوم روزویلٹ کی بیوہ ایلینور روزویلٹ کے علاوہ سابقہ صدر ٹرومین اور سینیٹ میں دونوں اطراف کے لیڈر مثلاً ٹیکساس کے ڈیموکریٹ Lyndon B. Johnson اور کیلیفورنیا کے ریپبلکن William Knowland بھی شامل تھے۔ جب نولینڈ کو بتلایا گیا کہ امریکہ شاید اسرائیل پر اقوام متحدہ کی طرف سے پابندیاں عائد کرنے کا مطالبہ کرے تو اس نے جان فاسٹر ڈلس سکریٹری آف اسٹیٹ کو انتباہ کرتے ہوئے کہا "اس سے ہمارے راستے جدا جدا ہو جائیں گے۔" ڈلس ثابت قدم رہا اور کہا "تم اس پر ذرا غور کرو۔ ہماری ساری پالیسیاں تو یروشلم میں تشکیل نہیں پا سکتیں۔" ٹائمز انکارپوریٹڈ کے مالک اور اسرائیل نواز Henry Luce کو ڈلس نے کہا "مجھے یہ معلوم ہے کہ اس ملک میں ایسی خارجہ حکمت عملی پر عمل کرنا جس کی یہودی حمایت نہ کریں' کس قدر دشوار ہے لیکن میں اس کی کوشش کروں گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اسرائیل دشمن ہوں بلکہ میں جارج واشنگٹن کے الوداعی خطبے میں کہی گئی۔ اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ کسی دوسرے ملک کے ساتھ جذباتی وابستگی کو اس پر اثرانداز نہیں ہونا چاہئے۔

آئیزن ہاور کے خیال میں یہ بہت بنیادی بات تھی۔ اس نے دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کو وہائیٹ ہاؤس میں بلا کر مدد کی درخواست کی لیکن یہ حلقے اسرائیل نواز حلقوں کے ساتھ محاذ آرائی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ اس دن آئیزن ہاور نے اپنی ڈائری میں یہ اقتباس نقل کیا "میں نے جب صبح ہونے والی سطحی بحث پر غور کیا تو مجھے قدرے مایوسی ہوئی کہ جنگ امن اور زندگی موت جیسے اہم فیصلوں پر بھی جماعتی وفاداری کو ترجیح دی جائے۔"

صدر نے پامردی سے یہ معاملہ ۱۹۵۷ء کے موسم بہار میں امریکی عوام کے سامنے ٹی وی خطاب کے ذریعے پیش کر دیا۔

"کیا ایک ملک جو حملہ آور ہو اور غیر ملکی علاقے پر اقوام متحدہ کی ممانعت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے قبضہ جاری رکھے' اسے اپنے انخلاء کے لئے خود ساختہ شرائط منوانے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ اگر ہم یہ بات مان لیں کہ جارحیت سے جارح کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے تو میرے خیال میں ہم بین الاقوامی نظام کو ماضی کی جانب لوٹا رہے ہیں۔"

وہاہیٹ ہاؤس میں خطوط اور تاروں کا تانتا بندھ گیا۔ ۹۰ فیصد پیغامات یہودیوں کی طرف سے تھے اور سب اسرائیل کی حمایت میں۔ ڈلس نے شکایتی لہجے میں کہا "ملک کے پروٹسٹنٹ عناصر سے جب کچھ بھی مدد نہ ملے تو ہم کب تک یہ بند باندھے رکھ سکتے ہیں۔ البتہ یہودی لگاتار ہمارے اوپر حملہ جاری رکھتے ہیں۔" آئیزن ہاور ثابت قدم رہا کہ اگر اسرائیل نے سارا جزیرہ نما سینائی اور غزہ خالی نہ کیا تو امریکہ اقوام متحدہ میں اسرائیل کے خلاف تادیبی پابندیوں کے ریزولوشن کی حمایت کرے گا۔ اس نے اسرائیل نواز چندہ جمع کرنے والوں کے لئے ٹیکس کا استثناء ختم کرنے کی بھی دھمکی دی۔ اسرائیل نے آخر کار مجبور ہو کر مقبوضہ علاقوں سے پسپائی اختیار کی۔

ہتھیاروں کی ترسیل شروع ہوسکتی ہے

وہائیٹ ہاؤس کے اگلے مکین سے اسرائیل کو بہتر سلوک ملا۔ صدر کینیڈی اور Lyndon B. Lohnson نے اسرائیل کی فوجی تیاریوں میں مدد دینی شروع کر دی۔ گو اس بات کا کوئی ثبوت تو نہیں کہ کینیڈی نے وہ ڈنر پارٹی والی تجویز قبول کر لی ہو۔ یعنی انتخاب میں مالی امداد کے بدلے مشرق وسطیٰ پالیسی کا کنٹرول حوالے کرنا۔ لیکن ۱۹۶۰ء کے انتخاب میں کینیڈی کو ۸۲ فیصد یہودی ووٹ ملے۔ یعنی ٹرومین کے ۷۵ فیصد سے بھی زائد' البتہ بطور صدر اس نے ایک فیصلہ کیا جس کے اسرائیل کے فوجی تیاریوں پر بیحد دوررس اثرات پڑے۔ اس نے پہلی بار اسرائیل کو امریکی اسلحہ کی فروخت کی منظوری دی۔

صدر جانسن کے وہائیٹ ہاؤس میں آنے پر اسرائیل کی فوجی تیاریوں کو مزید بڑھاوا ملا۔ صدر جانسن کے خیال میں اسرائیل ایک مظلوم اور ہمدردی کا مستحق ملک تھا۔ اسرائیل کے خاص دوستوں میں جن کا اثر و نفوذ وہائیٹ ہاؤس پر تھا' اقوام متحدہ میں امریکی سفیر Arthur Goldberg شکاگو کے Philip Klutznick اور تین نیویارک کے باشندے Arthur, Abraham Feinberg اور Mathilde Krim شامل تھے۔ مؤخر الذکر عموماً جانسن کے قومی سلامتی کے مشیر Walter Rostow اور اس

کے دوسرے بھائی Eugene Rostow جو کہ سیاسی امور کا اسسٹنٹ سیکریٹری آف اسٹیٹ تھا' کے واسطہ سے کام نکلواتے تھے۔

ستمبر ۱۹۶۶ء میں Klutznick نے Feinberg کو خط لکھا کہ جانسن اور امریکی یہودیوں کے درمیان تعلقات میں مزید بہتری آنی چاہئے۔ اس کی خواہش تھی کہ یہودیوں کو ویتنام جنگ اور پرائیویٹ اسکولوں کو سرکاری امداد جیسے معاملات پر اپنے اختلاف رائے کو امریکی اسرائیل امداد کے آڑے نہیں آنے دینا چاہئے۔ اس نے فین برگ پر زور دیا کہ وہ احساس شرکت پیدا کرنے میں حصہ لے۔ سودا بازی صاف نظر آتی تھی۔ اس وقت جانسن کو ویتنام جنگ کے بارے میں عوامی حمایت کی اشد ضرورت تھی اور یہودی لیڈروں کو اس بات کی یقین دہانی درکار تھی کہ امریکہ اسرائیل کی پشت پناہی کرے گا بحران کے وقت۔

امداد کی سطح بڑھادی گئی۔ ہر طرح کے اسلحہ مہیا کرنے کی اجازت دی گئی اور متعدد بہ قرضہ فراہم کیا گیا۔ ہوسکتا ہے کہ جانسن کو اسرائیل کی مدد پر آمادہ کرنے کے لئے لابی کے دباؤ کی ضرورت نہ ہو لیکن دباؤ لامحالہ ڈالا گیا۔ قومی سلامتی کونسل کے ایک اسٹاف ممبر اور بعد ازاں کارٹر کے اسسٹنٹ سیکریٹری آف اسٹیٹ برائے مشرق قریب اور جنوبی ایشیا Mr. Harold Saunders کا کہنا تھا کہ جب صدر ناصر (مصر) نے مئی ۱۹۶۷ء میں خلیج طیران کی ناکہ بندی کردی تو صدر جانسن پر تاروں اور خطوط کے طوفان کی بوچھاڑ کردی گئی کہ وہ اسرائیل کی حمایت کریں۔ ''میرے دفتر کے ڈبوں میں یہودیوں کے بھیجے گئے ڈیڑھ لاکھ خطوط اور تاریں تھیں۔ میں مبالغہ آرائی نہیں کررہا' ٹھیک ٹھیک ڈیڑھ لاکھ کاغذات کا پلندہ موجود تھا۔ ان میں ایک ہی مضمون تھا اور جانسن کا حکم تھا کہ ہر ایک کا جواب ارسال کیا جائے۔

جون ۱۹۶۷ء کے شروع میں عین اس دن جب اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا' صدر جانسن کو Rostow کا یہ ارجنٹ پیغام ملا ''آرتھر کرم نے رپورٹ دی ہے کہ اسرائیل کو جانے والی اسلحہ کی بہت سی پیٹیاں تیار حالت میں رکی پڑی ہیں اس کا خیال ہے کہ ان کی واگزاری بیحد مددگار ثابت ہوگی۔''

اسرائیل حالت جنگ میں تھا اور صدر امریکہ اس وقت کوئی روڑہ نہ اٹکا سکتا تھا۔ اسرائیل کو امداد کی ترسیل بلاروک ٹوک جاری رہی اور اقوام متحدہ میں اسرائیل کے خلاف پابندیوں کی قرارداد کو امریکن مخالفت کا سامنا تھا۔ امریکہ نے اسرائیل کی بھرپور عملی امداد کی۔ اسرائیل کے ساتھ ان نئے

قومی تعلقات نے صدر امریکہ کو ایک ایسے حادثہ پر پردہ ڈالنے پر مجبور کر دیا جس کی امریکن بحریہ کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی یعنی "U.S.S. Liberty" پر اسرائیلی حملہ۔

Saunders کا کہنا تھا کہ عرب اسرائیل جنگ کے بعد اسرائیل نواز حلقوں نے وہائیٹ ہاؤس کو اپنے ان بنیادی مطالبات میں دفن ہی کر دیا کہ اسرائیل کو ان عرب علاقوں سے نکلنے پر مجبور نہ کیا جائے جب تک عرب ممالک ایک انصاف پر مبنی پائیدار امن پر راضی نہ ہو جائیں۔ اس مطالبہ کی رو سے یہ مقبوضہ عرب علاقے عربوں سے اسرائیل کو تسلیم کروانے کے لئے بطور ایک سودے کے استعمال کئے جا سکتے تھے اور یہ وہی بات تھی جس سے صدر آئیزن ہاور نے اسرائیل کو ۱۹۵۷ء میں باز رکھا تھا۔

سونڈرز کا کہنا تھا کہ صدر جانسن نے اسرائیل کا یہ مطالبہ بغیر قومی سلامتی کونسل میں بحث کے لئے یا کسی بھی متعلقہ ادارے سے مشورہ کئے قبول کر لیا۔ اس نے مشرق وسطیٰ کی صورت حال پر برا بنیادی اثر ڈالا۔ ایک اور سینئر اہل کار کے بقول یہ حکمت عملی اس لئے اختیار کی گئی کیونکہ لابی کامیابی سے وہائیٹ ہاؤس کے سارے کے سارے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔

نکسن کے احکامات کا نظر انداز کیا جانا

جانسن کا جانشین Richard M. Nixon گو بغیر کسی یہودی امداد کے برسر اقتدار آیا تھا لیکن اپنی پہلی ٹرم میں اس نے اسرائیل کی اس قدر زیادہ امداد کی کہ ۱۹۷۲ء کے انتخاب مکرر کے دوران اسرائیلی سفیر Yitzhak Rabin نے کھلے عام اس کے حق میں مہم چلائی۔ نکسن نے ۳۵ فیصد ووٹ لئے۔ ۱۹۷۲ء میں جو کہ چار سال پیشتر کے مقابلہ میں ۲۰ فیصد زیادہ تھے۔

۱۹۷۳ء میں اس نے اسرائیل کی زبردست حمایت کی جب عرب ممالک نے ۱۹۶۷ء میں غصب شدہ علاقے اسرائیل سے واپس لینے کی کوشش کی۔ اس لڑائی میں جو ساز و سامان و اسلحہ نکسن نے بذریعہ فضائی راستہ اسرائیل کو ارسال کیا وہ اس کے لئے حیات آفریں ثابت ہوا۔ ساری دنیا میں امریکن افواج کو بالکل چوکس حالت میں رہنے کے ان احکامات نے اغلباً روس کو کسی بڑے امدادی رول سے روکے رکھا۔

نجی طور پر نکسن نکتہ چینی کرتا تھا کہ اسرائیل اپنے عرب ہمسایوں کے ساتھ ایک ہمہ جہتی تصفیہ کرنے سے گریز کرتا ہے۔ کئی مواقع پر اس نے ہنری کسنجر (قومی سلامتی کا مشیر جو بعد میں

سکریٹری آف اسٹیٹ بھی بنا) کو یہ حکم دیا کہ جب تک اسرائیل زیادہ تعاون پر آمادہ نہ ہو اس کی امداد بند کردی جائے۔ اپنے استعفیٰ سے تین دن قبل نکسن نے کسنجر کو ہدایت کی کہ اسرائیل کی طویل المدت فوجی امداد کی درخواست کو رد کردیا جائے۔ کسنجر اپنی یادداشت میں لکھتا ہے "وہ اسرائیل کو دی جانے والی تمام فوجی امداد کو ختم کردینا چاہتا تھا جب تک کہ اسرائیل ایک مفصل امن معاہدے پر راضی نہ ہو۔ اسے یہ قبل ازیں نہ کرنے پر ندامت تھی۔ اب وہ اس کی تلافی چاہتا تھا' اس کا جانشین اس بات پر اس کا احسان مند ہوتا۔ مجھے اس سلسلے میں ضروری کاغذات تیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ کسنجر کا کہنا تھا کہ نکسن نے اس موضوع پر دوبارہ بات نہ کی حالانکہ کسنجر کے کہنے کے مطابق متعلقہ کاغذات تیار کرلئے گئے' لیکن ان پر دستخط نہ ہوئے اور نہ ہی کسنجر نے ان احکامات پر عمل درآمد ضروری سمجھا۔ (جولائی ۱۹۸۴ء میں نکسن نے تصدیق کی کہ کسنجر کا بیان درست تھا اور کہا کہ اس کا اب بھی یہ خیال تھا کہ اسرائیل کو دی جانے والی امداد کو ایک ہمہ جہتی تصفیہ کے ساتھ منسلک ہونا چاہئے۔)

۱۹۷۵ء میں صدر فورڈ نے صدارت کا عہدہ سنبھالا لیکن نکسن کے لئے تیار کردہ دستاویزات پر کوئی ایکشن نہ لیا' البتہ اس نے اسرائیلی وزیر اعظم (جو پہلے امریکہ میں اسرائیل کا سفیر تھا) Yitzak Rabin کے ساتھ یہ معاملہ اٹھایا۔ فورڈ نے مزید اسرائیلی تعاون حاصل کرنے کے لئے ۱۹۷۵ء میں اپنی مشرق وسطیٰ پالیسی پر نظر ثانی کا اعلان کیا لیکن لابی کے دباؤ کی بناء پر اسے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا' لیکن اس پسپائی نے بھی اسے اگلے سال پوری مدت کے لئے صدارت کے انتخابات میں ووٹ نہ دلوائے۔ ۱۹۷۶ء میں یہودیوں کے ۶۸ فیصد ووٹ ڈیموکریٹ جمی کارٹر کو ملے۔

غیر مشروط حمایت اسرائیل پر احسان نہیں

صدر کارٹر کے ۱۹۷۶ء میں انتخابات جیتنے اور جنوری ۱۹۷۷ء کے درمیانی وقفہ میں اسرائیلی لابی نے اس کی خارجہ پالیسی بندوبست کرنے والے فرد کے چناؤ میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا۔ کارٹر نے سائیرس وانس کو نامزد کیا جو کہ ایک نفیس عادات اور انصاف پسند طبیعت کا مالک تھا۔ مشرق وسطیٰ کے بارے میں اس کا رویہ مثبت تھا لیکن ایسا کرتے وقت اس نے George W. Ball کو نظر انداز کیا جس میں ان تمام صفات کے علاوہ تجربہ ذاتی قوت اور عالمی شہرت بھی موجود تھی جس کی کارٹر کو آئندہ مشرق وسطیٰ اور دوسری جگہوں پر آنے والے بحرانوں میں ضرورت پڑنی تھی۔

میں نے پرنسٹن نیو جرسی میں ۱۹۸۳ء میں جب Ball سے ان امور کے پس منظر واقعات پر روشنی ڈالنے کے لئے ملاقات کی تو وہ اپنی چوتھی بڑی کتاب لکھ رہا تھا۔ وہ ایک بڑے کمرے میں بیٹھا تھا اور ماحول ایسا تھا جیسا کہ ایک اخباری کمرے میں پریس ٹائم سے ذرا پہلے ہوتا ہے۔ تمام کمرہ جو کہ پہلے ایک لائبریری تھا اب کمپیوٹروں کاغذات کتب اور مصروف لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس سب رونق کے درمیان وہ شخص بیٹھا تھا جو کہ دو امریکن صدور کے ماتحت ڈپٹی سیکریٹری آف اسٹیٹ رہ چکا تھا۔ اقوام متحدہ میں امریکہ کا سفیر رہا تھا اور مین ہٹن کی ایک بہت بڑی سرمایہ کاری' بینکنگ فرم میں سابقہ ایگزیکٹو تھا۔ وہ اپنے Word Processor پر کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ ۷۳ سالہ عمر میں بھی وہ اس غیر منظم دنیا میں تنظیم لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "مانچسٹر گارڈین" نے اس کے بارے میں لکھا کہ وہ ایک ایسا تصور پرست تھا جو کہ ابتری کا سامنا تمکنت سے کر رہا تھا۔

میں سوالات سے لیس ہو کر گیا تھا۔ جارج بال کو مشرق وسطیٰ کے بارے میں بے لاگ رائے ظاہر کرنے کی کیا قیمت چکانا پڑی؟ کیا اس سے اس کی قانونی پریکٹس کو نقصان پہنچا؟ اس کے اعلیٰ تر عہدوں پر کام کرنے کے امکانات معدوم ہوئے؟ جارج بال نے مصروفیت کے پیش نظر قدرے توقف سے کلام کیا۔ اس نے ابھی ابھی "ویسٹ پوائنٹ" (فوجی تربیت کا ادارہ) کے کیڈٹوں کو خطاب کیا تھا اور "واشنگٹن پوسٹ" کے لئے ایک اداراتی کالم لکھنے میں مصروف تھا جس میں اس نے ریگن انتظامیہ کو لبنان میں امریکن پالیسی کے سلسلے میں پیش آنے والے مہیب خطرات سے آگاہ کرنا تھا۔ ویتنام پالیسی کی مخالفت کی وجہ سے وہ میرا ہیرو تھا اور ایک نہایت انشاء پرداز مصنف۔ مجھے وہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے ڈین رسک (سکریٹری آف اسٹیٹ) کی طرح لگتا تھا لیکن دونوں کے ویتنام کے بارے میں نظریات بالکل مختلف تھے۔

جارج بال نے کہا "میں ابھی آپ سے بات کرتا ہوں۔" اس نے اپنے نائب Lee Hurford کو کام پر لگایا۔ چھ فٹ دو انچ کا یہ طویل شخص بہت پر اعتماد اور قوی نظر آرہا تھا۔ ان پچھلے چند برسوں میں کئی لوگوں نے اسرائیل پر تنقید تو کی تھی لیکن اسے ذاتی حلقوں تک محدود رکھا تھا اور جنہوں نے کھلے عام کچھ کہا بھی تھا تو دھیمے سروں میں۔ بال کے احباب جانتے ہیں کہ وہ اس طرح نہیں کرتا۔ وہ ضرب لگاتے کبھی بھی جھجکا نہیں' البتہ جب سرکاری عہدہ پر تھا تو اپنے صلاح مشورہ کو ذمہ داری تک محدود رکھتا تھا۔

بال کو اپنی اسرائیل کے بارے میں بے لاگ رائے کی قیمت چکانی پڑی۔ صدر کارٹر کے دور میں وہ ان تین افراد میں سے ایک تھا جن کا بطور سکریٹری آف اسٹیٹ تقرر زیر غور آیا تھا۔ ماسوائے اس کے مشرق وسطیٰ پر بے لاگ تبصروں کے اس کی اس پر تعیناتی یقینی ہوتی۔ اس کی سیاسی اور پیشہ ورانہ صلاحیتیں بے داغ تھیں۔ ایک قدیم ڈیموکریٹ کے طور پر اس نے دو مرتبہ ایڈلائی اسٹیونسن کی صدارتی نامزدگی کے لئے پرجوش مہم چلائی تھی۔ ۱۹۵۹ء میں اس نے صدر کینیڈی کی حمایت کی تھی۔ اس کا سفارتی تجربہ اور شہرت بے مثال تھی۔ وہ صدر کینیڈی اور صدر جانسن کے ماتحت اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں بطور نمبر۲ کے کام کر چکا تھا۔ اس عہدہ کے دوران چھ سال کے اندر اس نے کیوبا کے میزائل کے بحران کے علاوہ خارجہ پالیسی کے بڑے بڑے معاملوں پر کام کیا تھا۔ اس نے اقوام متحدہ میں سفیر بننا اپنی مرضی کے خلاف قبول کیا تھا کیونکہ بقول اس کے L.B.J. نے محاصرہ کر رکھا تھا۔

Ball نے انتظامیہ کے اندر پرزور طریقے سے فوجی پالیسیوں پر اعتراضات کئے۔ صدر جانسن جب کابینہ میں ایسی کوئی حکمت عملی طے کر رہے ہوتے تو اکثر کہتے: آیئے اب ذرا جارج بال سے اس کے خلاف اعتراضات سنیں۔

بال نے ہمیشہ ویتنام میں دخل اندازی بڑھانے کی مخالفت کی۔ واشنگٹن پوسٹ نے اس کے بارے میں لکھا کہ وہ عقابوں کی انتظامیہ میں ایک مستقل فاختہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے صحافی دوست والٹر لپ مین نے اسے بطور احتجاج مستعفی ہونے کا مشورہ دیا لیکن بال نہ مانا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ جنگ پر نکتہ چینی انتظامیہ کے اندر رہ کر جاری رکھنی چاہئے گو جانسن اکثر اس کی رائے رد کر دیتا تھا۔

Ball امریکہ کے مشہور ترین اور مقبول ترین سفارت کاروں میں سے ایک تھا لیکن اس نے اپنے سکریٹری آف اسٹیٹ بننے کے امکانات اغلباً خود اپنے ہاتھوں برباد کر لئے تھے۔ جب اس نے ایک مقالہ "فارن افیئرز" (سہ ماہی رسالہ) ۷۶-۱۹۷۵ء موسم سرما کی اشاعت میں لکھا جس کا عنوان تھا "امریکی اسرائیلی تعلقات میں پیش آمدہ بحران" اس سے یہودی فرقے میں مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

اس مقالے میں جارج بال نے مثال دی تھی کہ کس طرح آئزن ہاور نے اسرائیل سے سینائی خالی کروایا تھا۔ بقول اس کے "یہ آخری موقع تھا کہ امریکہ نے اسرائیلی حکومت کی زبردست خواہش

کے برعکس ایک طاقتور قدم مضبوطی سے اٹھایا اور اس پر ڈٹا رہا۔" یہ نقطہ آغاز تھا اور امریکہ کے یہودی لیڈروں نے اس کے بعد واشنگٹن میں ایک مؤثر ترین لابی بنائی جو کہ اب اسرائیلی سفارت خانہ کے قریبی تعاون سے کام کرتی ہے۔ اس نے حساس معاملات کے مسلسل افشاء پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا "نہ صرف یہ کہ کانگریس کے بیشتر ممبران اسرائیل کے امریکی حمایتوں کے زیر اثر ہیں بلکہ اسرائیل کے بارے میں کسی بھی معاملہ پر امریکی انتظامیہ میں بحث و مباحثہ ہو اور اسرائیلی حکومت کو خبر نہ ہو' یہ ناممکن بات ہے۔" اس نے کہا اسرائیل مکمل طور پر امریکی امداد پر تکیہ کرنے کے باوجود امریکہ کی نصیحت کو در خور اعتناء نہیں سمجھتا تھا۔ اسے اس امر پر کوئی حیرانی نہ تھی کہ اسرائیل آزادانہ پالیسی اختیار کرتا تھا۔ اس نے کہا اسرائیلیوں کو تو اب عادت ہو چکی ہے کہ وہ یہ امید رکھیں کہ امریکہ ان کے ملک کی حمایت کرتا رہے گا چاہے وہ اس کی نصیحت احتجاج یا مفاد کو نظر انداز ہی کیوں نہ کرتے رہیں۔ اس شدید نکتہ چینی کے باوجود کارٹر نے بطور نو منتخب صدر اپنی نئی کابینہ میں جارج بال کو تین امیدواروں میں سے اپنا خارجہ پالیسی کا مشیر چنا۔ دوسرے دو افراد Paul Warnke ایک سابقہ نائب سکریٹری دفاع اور Cyrus Vance تھے۔

Zbigniew Bazezinski (قومی سلامتی مشیر برائے کارٹر) نے اپنی کتاب "طاقت اور اصول" میں لکھا کہ وہ پہلے بال کے سکریٹری آف اسٹیٹ بننے کے حق میں تھا۔ گو وہ بعد میں سائیرس وانس کا حامی بن گیا۔ برزنسکی نے کارٹر کو یہ رائے دی کہ Ball ایک طاقتور نظریہ ساز تھا لیکن شاید ایک کمزور منتظم۔ گو وہ زور سے حق جتانے والا فرد ہے لیکن اس کے مشرق وسطیٰ پر متنازعہ فیہ بیانات اس کی کمزوری کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس کی رائے میں بال کی تعیناتی کو مغربی یورپ اور جاپان میں پذیرائی حاصل ہوگی۔ ترقی پذیر ممالک میں قدرے کم پذیرائی ہوگی اور اسرائیل میں منفی ردّ عمل ہوگا۔

متعدد یہودی لیڈروں نے کارٹر پر واضح کیا کہ اسے بال کو اپنی انتظامیہ میں کوئی اہم رول نہ دینا چاہئے۔ بال کی جو خاصیت اسرائیل کے لئے ناقابل قبول تھی وہ اس کا جرأت اظہار تھا۔ اسے اسرائیل کے خلاف کچھ کہنے میں ذرا بھی باک نہ تھا۔ کارٹر نے بال کا نام فہرست میں سے خارج کر دیا۔

کارٹر کی کابینہ کا چناؤ مکمل ہو جانے کے بعد بھی بال نے اپنی صاف گوئی جاری رکھی۔ ۱۹۷۷ء کے اوائل میں اس نے "فارن افیئرز" میں ایک اور مقالہ لکھا "اسرائیل کو خود اس سے کیسے بچایا جائے؟" جس میں اس نے نئی انتظامیہ پر یہ زور دیا کہ وہ ایک ایسے ہمہ جہتی تصفیے کے سلسلے میں پیش قدمی

کرے جو کہ فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کے لئے مبنی بر انصاف ہو۔ جب یہ لائحہ عمل ڈانواڈول ہوا تو کارٹر نے مصر اور اسرائیل کے مابین تصفیہ کروانے پر توجہ مرکوز کر دی۔ یہ تصفیہ "کیمپ ڈیوڈ" میں طے پایا اور بال کا خیال ہے کہ وہاں Begin (اسرائیلی وزیر اعظم) نے کارٹر کو جل دیا۔ بال کا کہنا تھا "میں نے کیمپ ڈیوڈ سے عین قبل کارٹر سے بات کی تھی۔ ہم نے مل کر ایک طویل ڈنر کھایا۔ اس نے مجھے بتلایا کہ وہ مشرق وسطیٰ پر ایک جامع سمجھوتہ طے کرانے کی کوشش کرے گا اور اسے فلسطینیوں کے مسئلے کا ادراک بھی تھا۔ مجھے ذرہ بھر شک نہیں کہ وہ اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے بیحد خواہش مند تھا۔" کیمپ ڈیوڈ کے بعد اسرائیل لگاتار مقبوضہ علاقوں میں بستیوں کی تعمیر جاری رکھ کر اور فلسطینیوں کی غرب اردن میں خود مختاری کا راستہ روک کر کارٹر کے اہداف کو کالعدم کرنے میں کامیاب رہا۔

کارٹر انتظامیہ کا حصہ نہ ہونے کے باوجود Mr. Ball ٹیلی ویژن پر انٹرویو پروگراموں کے لئے بے حد مقبول تھے۔ ایسی ہی ایک محفل میں ایک یہودی لیڈر کے ساتھ عوامی مذاکرہ ہو گیا۔ ۱۹۷۷ء کے آخر میں ایک پینل انٹرویو میں بال نے کہا کہ امریکہ کی یہودی آبادی نے امریکہ کے مفادات کو بہت سے معاملات میں ثانوی حیثیت دے رکھی ہے۔ نیویارک کے ایک وکیل Moris B. abram (سابقہ صدر امریکن جیوش کمیٹی) کے لئے یہ الفاظ طبل جنگ کے برابر تھے۔ سال گذشتہ سکریٹری آف اسٹیٹ کے لئے بال کی نامزدگی کی حمایت کرنے کے باوجود اس نے "واشنگٹن پوسٹ" میں بال کے نام ایک کھلا خط شائع کیا۔ اس میں اس نے یہ الزام لگایا کہ اس مقالے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بال یہودیوں کے بارے میں قدیم بہتانوں کو نہ صرف مانتا ہے بلکہ نشر کرنے میں حصہ لیتا ہے۔ اس الزام کا واشنگٹن پوسٹ میں جواب دیتے ہوئے بال نے لکھا ہے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر جیوش صیہونی جان بوجھ کر اسرائیل کو امریکہ پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ بات کچھ یوں ہے کہ اسرائیل کے ہر متشددانہ اقدام کی بغیر پرکھے حمایت کئے جانے سے یہ چیز امریکہ کے مفاد میں نہیں رہتی۔ بال کی یہ خط وکتابت Abram کے ساتھ واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہوئی۔ آخر میں بال نے کہا "جب امریکہ کے یہودی فرقے کے سربراہان اسرائیلی حکومت کے ہر جائز و ناجائز اقدام کی بغیر سوچے سمجھے تعریف اور امداد کرتے ہیں اور اس کے خلاف ہر قسم کی نکتہ چینی کو دبانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ (کانگریس میں اور عوامی ذرائع ابلاغ میں) تو میرے خیال میں وہ اس وقت امریکہ کی اور نہ ہی اپنی کوئی خدمت سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔"

ریگن انتظامیہ کے دوران بال نے کوشش کی کہ ریپبلکن پارٹی پھر وہی پالیسی مشرق وسطیٰ پر اپنالے جو اس نے آئیزن ہاور کے دنوں میں اختیار کر رکھی تھی۔ ریگن کے بارے میں اس نے کہا "اس نے وہ تادیبی پابندیاں لگانے کی کوشش نہیں کی جو کہ ہمیں اپنے قانون کے مطابق لگانے کا حق تھا' جب اسرائیلی ہمارے مہیا کردہ ہتھیاروں سے فلسطینیوں کا قتل عام کر رہے تھے۔ ہم نے یہ ہتھیار ان کو صرف اپنے دفاع میں استعمال کے لئے دئے تھے' اس کے برخلاف اس نے اسرائیلیوں کو لالچ دے کر باز رکھا اور اپنے امریکی میرین دستے امن قائم رکھنے کے لئے بھجوادئے۔ دوسری طرف فلسطینیوں کو انخلاء پر آمادہ کیا' بجائے اس کے کہ وہ لڑکر شہید ہوں۔ بال نے اپنے عوامی اظہار خیال پر اپنے بزنس کیریر کو اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ وہ اسی طرح دبنگ انداز سے بولتا رہا' البتہ اس نے یہ مانا کہ اس کے اس بے لاگ رویہ برائے مشرق وسطیٰ نے اس کے بزنس کو یقیناً فائدہ نہ پہنچایا۔ "مجھے یقین ہے کہ میری وجہ سے میرے پارٹنرز کو Lehman Bros میں کچھ نہ کچھ نقصان تو اٹھانا پڑا ہوگا۔ لیکن انہوں نے بڑے تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کیا۔ مجھے اس صاف گوئی کی وجہ سے نقصان نہ ہوا۔ میں سیاسی طور پر ان کی پہنچ سے باہر ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ کچھ گروپ میرے ساتھ معاملہ کرنے کی بجائے مجھے گولی مار دینا چاہتے ہوں گے۔"

گو کبھی اس پر گولی تو نہ چلائی گئی البتہ اسرائیلی لابی کے ساتھ اس کی چشمک بہت دفعہ ہوئی اور کیریئر کے آغاز سے ہی رہی۔ ۱۹۵۲ء کے صدارتی انتخاب کی مہم میں ایک اسرائیل نواز پیامبر نے سپرنگ فیلڈ الی نوائے میں ایڈلائی اسٹیونسن کے انتخابی ہیڈ کوارٹر میں اس سے ملاقات کی اور بال کو بتلایا کہ اس کے دوستوں نے ایک بڑی رقم جمع کی ہے لیکن وہ اس کو ان کے سپرد کرنے سے پیشتر اسرائیل کے سوال پر تبادلہ خیالات کرنا چاہتے تھے۔ بال نے کہا کہ اسٹیونسن نے گروپ سے ملاقات تو کی ...... کہ وہ ہر گروپ سے مل لیتا تھا...... لیکن اس نے ان کی توقعات کے مطابق کوئی بھی وعدہ نہ کیا۔

ماضی قریب کی صدارتی مہموں میں بال کو ایک مختلف طرح کے لابی دباؤ کا تجربہ ہوا۔ ۱۹۷۹ء کے اوائل میں John B. Anderson کی تقاریر سے متاثر ہو کر بال نے اعلان کیا کہ وہ اس آزاد امیدوار کے حق میں ووٹ دے گا۔ یہ خبر سن کر اینڈرسن خوشی سے پھولا نہ سمایا اور بال کو پیغام دیا کہ وہ جلد ہی اسے پرنسٹن آکر ملے گا لیکن اس نے ارادہ تبدیل کر دیا اور نہ آیا۔ اس کے انتخابی مہم کے عملے نے اسے باور کرایا کہ اگر وہ بطور امیدوار کے آگے بڑھنا چاہتا ہے تو اسرائیل نواز حلقوں میں راہ و

رسم پیدا کرے۔ اینڈرسن نے اسرائیل کی رسمی یاترا بھی کی۔ اسرائیل کے حق میں بیانات بھی دیئے لیکن بال سے کنارہ کشی اختیار کی۔

اس بزرگ سیاست داں کو ۱۹۸۳ء میں بھی ایسا ہی تجربہ ہوا۔ ایک صبح جب وہ سینیٹ کی خارجہ امور کمیٹی کے سامنے گواہی دے کر نکلا تو سینیٹر John Glenn نے اسے فون کر کے بات کرنے کو کہا۔ اس وقت جان گلین اپنے صدارتی امیدوار بننے کے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ کئی دفعہ فون پر رابطہ میں ناکام رہنے پر بال نے خط لکھا۔ اس میں اس نے گلین کی امداد پر رضامندی ظاہر کی اور کہا کہ وہ انتخابی مہم کے پر ہجوم اور مصروف دنوں میں اس کے لئے بیانات' تقریر اور خیالات کے بارے میں امداد کرنے کے لئے ایک سابقہ سفارت کاروں اور دانشوروں پر مشتمل پینل ترتیب دینے میں مدد کرے گا۔ ۱۹۵۶ء میں بال نے یہی خدمت ایڈلائی اسٹیونسن کے لئے انجام دی تھی۔ کئی ہفتے گزر جانے کے بعد گلین کا خط آیا کہ وہ اس تجویز کو اپنے اسٹاف کے سامنے رکھے گا اور یوں گلین کے ساتھ بال کے تعلقات تمام ہوئے۔

اس کے باوجود کہ صدارتی امیدواران کارٹر' اینڈرسن اور گلین نے خوف کے مارے اس کی امداد سے کنارہ کشی کی۔ بال کا خیال ہے کہ لابی کی طاقت کا مبالغہ آمیز اندازہ لگایا جاتا ہے۔ وہ کئی اہم ریاستوں میں ووٹ کنٹرول کرتے ہیں اور امیدواروں کو فراخ دلی سے مالی امداد مہیا کرتے ہیں' لیکن پھر بھی یہ ان کے اثرانداز ہونے کے بڑے عوامل نہیں۔

بال کا خیال ہے کہ اس لابی کا سب سے بڑا اور طاقتور ترین ہتھیار Anti-Semitism کے الزام کا بے محابا استعمال ہے۔ ایک بہت بڑی بات ان کے حق میں جاتی ہے۔ بہت سے لوگ اس بات سے بیحد خوف زدہ ہیں کہ ان پر Anti-Semitism کا الزام نہ آئے اور یہ لابی اکثر اسرائیل مخالف تنقید کو Anti-Semitism کے ہم پلہ قرار دیتی ہے۔ وہ اسی کا راگ الاپتے ہیں' چنانچہ لوگ صاف گوئی سے کنی کتراتے ہیں۔ بال کا خیال ہے کہ امریکہ میں بہت سے لوگ یہ احساس جرم رکھتے ہیں کہ نازی جرمنی میں یہودیوں کا صفایا کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ Anti-Semitism کا الزام آنے کے ڈر سے امیدوار اور سرکاری عمال' اہل کار خاموش رہتے ہیں نہ کہ ووٹوں یا نوٹوں کی وجہ سے۔

ثابت قدمی کا فقدان

جمی کارٹر نے بال کی خدمات حاصل کئے بغیر ذرا سی دیر کے لئے یہ امید بندھائی کہ وہ ایک ایسا صدر ثابت ہوگا جو اسرائیل کے دباؤ میں نہ آئے گا اور مشرق وسطیٰ میں وہی حکمت عملی اختیار کرے گا جو امریکہ کے مفاد میں ہو۔ جب وہ قصر صدارت میں آیا تو عربوں اور اسرائیل دونوں کے ساتھ انصاف کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ عہدہ سنبھالنے کے بعد اس نے فلسطینیوں کے لئے بھی محفوظ سرحدوں والے وطن کے قیام کی حمایت کی۔ گویہ عزم جلد ہی کافور ہوگیا' البتہ کارٹر نے کئی اور اطراف میں خارجہ پالیسی کے بڑے بڑے اقدامات کئے جو کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کروانے کے علاوہ تھے۔ اس کی انتظامیہ نے پانامہ کے ساتھ معاہدہ پر عمل درآمد کرایا۔ چین کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کئے' عالمی تجارت کے سلسلے میں اہم اصلاحات کیں اور سوویت یونین کے ساتھ "Strategic Arms Limitation" پر ابتدائی معاہدہ کیا لیکن ان سب کے باوجود مشرق وسطیٰ کے بارے میں اس کی پالیسی میں مقصدیت اور ثابت قدمی کا فقدان رہا۔

کارٹر بہت بددل ہوا جب اس کے مصر اسرائیل امن معاہدہ جیسے اہم اور پرانے ہدف کو حاصل کرنے میں اس کی انتظامیہ کی کامیابی کے باوجود یہودی اس سے برگشتہ ہی رہے۔ ایک ۲۰ سالہ تجربہ کار سینئر سفارت کار ۱۹۷۷ء کے امریکہ سوویت مشترکہ اعلامیہ کے بعد یہودی لابی کے دباؤ کے بارے میں کہتا ہے کہ کارٹر مشرق وسطیٰ پر جنیوا کانفرنس کے احیاء کی کوشش کر رہا تھا تاکہ عربوں اور اسرائیلیوں کے درمیان ایک ہمہ جہتی معاہدہ طے پا جائے۔ امریکی یہودی فرقہ کو اس پر شدید اعتراض تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے یہودی احتجاجی گروپوں کے لگاتار آنے سے کس قدر مصروفیت رہی۔ میں نے ایک دن حساب لگایا کہ اگر میں ان گروپوں کے کہنے کے مطابق ان لوگوں کی تعداد کو جمع کروں جن کی یہ گروپ نمائندگی کے دعویدار تھے تو میں نے تقریباً نصف امریکن یہودی آبادی کے نمائندوں سے ملاقات کی ہوگی۔ یہ تمام گروپ پوری تیاری کر کے آتے تھے اور ہر ایک کی تان اسی پر ٹوٹتی کہ:

روسیوں کو دوبارہ مشرق وسطیٰ میں دعوت دینا کس قدر غیر محب وطن اقدام ہے۔ یہ تو نہ صرف اسرائیل مخالف ہے بلکہ قریب قریب Anti-Semitic ہے۔ میں اپنا کچھ وقت ان یہودی گروپوں کو سینیٹرز اور کانگریس ممبران کے دفاتر میں ملنے میں گزارتا۔ بعض اوقات میں ۲۰ سے لے کر ۴۰ افراد پر مشتمل گروپوں کے ساتھ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے کانفرنس روم میں ملاقات کرتا۔ اسی دوران

سکریٹری آف اسٹیٹ سائرس وانس دوسرے گروپوں سے ملاقات کر رہا ہوتا اور صدر مزید کسی اور گروپ سے۔

دباؤ بیحد شدید تھا۔ کارٹر نے لابی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور جلد ہی اس تجویز سے دست بردار ہوگیا۔ کارٹر کو بھی فورڈ کی طرح یہ سبق حاصل ہوگیا کہ لابی کے دباؤ کے سامنے سرنگوں ہو جانے سے اور اسرائیل کی حمایت کرنے سے بھی انتخاب کے دن اس کا کچھ صلہ نہ ملتا۔ ۱۹۸۰ء میں انتخاب مکرر کے وقت بہت سے یہودیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

وہ اسے دمڑی بھی نہ دیں گے

اسی برس ٹیکساس کے ڈیموکریٹ نے صدر کارٹر کا جانشین بننے کے شوق میں اپنی وفاداری تبدیل کر کے ریپبلکن بننا قبول کیا اور اسرائیل نواز شدت پسندوں کے دباؤ نے ان کی قسمت پر فیصلہ کن اثر ڈالا۔

اکتوبر ۱۹۷۹ء میں ٹیکساس کے ڈیموکریٹ گورنر John Connally واشنگٹن آئے تا کہ اپنی صدارتی مہم کے سلسلے میں خارجہ پالیسی پر اپنی پہلی بڑی تقریر کریں۔ وہائیٹ ہاؤس کے ریپبلکن امیدواروں کا پہلے ہی ہجوم جمع تھا۔ گو ریگن نے ابھی تک اپنی امیدواری کا اعلان نہیں کیا تھا لیکن سات عدد ریپبلکن امیدوار میدان میں تھے۔

Connally کی تقریر کا عنوان تھا "امریکہ کے لئے لیڈر شپ" اور ٹیلی ویژن پر اشتہارات میں اسے "بھولے بسرے امریکیوں کا امیدوار قرار دیا گیا جو اتوار کے دن گرجا گھر جاتے تھے۔" Connally کا خیال تھا کہ یہ امریکی لیڈر شپ کی تلاش میں تھے۔ اس کی واشنگٹن پریس کلب کی تقریر میں عرب اسرائیل جھگڑے کو طے کرنے کے لئے ایک تجویز کے خدوخال موجود تھے۔ مطلب یہ تھا کہ ٹیکساس کے سابق گورنر اور سیکریٹری برائے خزانہ کو ایک ایسے فیصلہ کن لیڈر کے طور پر پیش کیا جائے جو کہ طاقتور غیر ملکیوں کے ساتھ برابری کی بنیاد پر بات کر سکتا ہو۔ وہ صدر نکسن کی کابینہ میں کئی عہدوں پر کام کر چکا تھا۔ اس قدر متنوع سیاسی تجربہ کے ہوتے ہوئے اسے عرب اسرائیل مسئلے کی نزاکت کا علم ہونا چاہیئے تھا۔

کئی صدور نے اپنے دور میں مشرق وسطیٰ کے حل کے لئے کئی امن تجاویز پیش کیں لیکن

Connally نے جو تجویز اس تقریر میں پیش کی وہ اب تک پیش کی گئی کسی امیدوار صدارت کی تجویز سے زیادہ پر حوصلہ تھی۔ اس کی دلیل تھی کہ کارٹر کی پیش قدمی کیمپ ڈیوڈ کے بعد اس لئے رک گئی تھی کہ سفارتی لیڈر شپ کا فقدان تھا اور امریکہ کو اب اس کی ضرورت تھی۔ ایک ایسی نئی مشرق وسطیٰ حکمت عملی درکار تھی جس کا انحصار کسی اسرائیلی یا عرب فرد پر نہ ہو بلکہ صرف امریکن مفادات پر ہو۔

اس خطہ میں امریکی مفاد اس بات میں تھا کہ یہاں امن اور استحکام ہو۔ Connally کا کہنا تھا کہ یہ مقصد حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ اسرائیل مقبوضہ عرب علاقوں کو خالی کر دے اور اس کے بدلے میں عرب اسرائیل کی حاکیت اور علاقائی سالمیت کو تسلیم کر لیں۔ عربوں پر یہ ذمہ داری عائد ہو گی کہ وہ یہودیوں کے خلاف کوئی عمل نہ کرنے کا دائمی وعدہ کریں اور تیل کی ترسیل اور قیمتوں کو سیاسی تبدیلی لانے کے لئے بطور ہتھیار استعمال نہ کریں۔ اس سے مشرق وسطیٰ کے تیل کی ترسیل بلا رکاوٹ جاری رہے گی اور یہ چیز مغربی تہذیب کے بدن میں زیر گردش خون کی مانند ہے اور اگلی کئی دہائیوں تک یونہی رہے گی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اس خطہ میں استحکام کی خاطر اپنی فوجی موجودگی میں بہت اضافہ کر دے گا۔

Connally' وہ پہلا صدارتی امیدوار بن گیا جس نے فلسطینیوں کے حق خود اختیاری کی حمایت کا اعلان کیا۔ اس نے کہا کہ فلسطینیوں کو یہ حق ملنا چاہئے کہ وہ غزہ اور غربی کنارہ پر مشتمل ایک آزاد ریاست قائم کریں یا اردن کے اندر ایک خود مختار علاقہ' ان فلسطینی لیڈروں کو خوش آمدید کہنا چاہئے جو ایک مفاہمانہ امن معاہدہ کے لئے گفت و شنید پر راضی ہوں لیکن ایسے شدت پسندوں کو جو تعاون کرنے پر آمادہ نہ ہوں اور پر تشدد کاروائیاں جاری رکھیں انہیں بین الاقوامی باغی قرار دے دیا جائے۔

Connally نے یہ بھی تجویز کیا کہ آئندہ امریکی امداد اسی شرط پر اسرائیل کو دی جائے کہ وہ غربی کنارے پر زیادہ معقول پالیسی اختیار کرے۔ اسے مستقل فوجی تیاری کی حالت میں رہنے پر جو بوجھ اسرائیلی اقتصادیات پر پڑتا تھا اس کا احساس تھا۔ اس نے کہا "امریکہ کی اربوں ڈالر کی اقتصادی اور فوجی امداد کے بغیر اسرائیل کا وجود قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ صاف گوئی کا تقاضا یہ ہے کہ اس پیمانے پر امداد بغیر اسرائیلی لیڈروں کی ہمسایوں سے مفاہمت کی خواہش ہوتے ہوئے زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکتی۔" اس نے امریکی یہودیوں کا حوالہ دیتے ہوئے جنہوں نے اس سال اوائل میں اسرائیل کی اس

پالیسی کی کھلی مذمت کی تھی، کہا یہ اخلاقی طور پر ناقابل قبول اور یہودی ریاست کے جمہوری کردار کے لئے تباہ کن ہے۔

Connally کو یہ علم تھا کہ یہ تقریر جھگڑے کو ہوا دے گی اور جلد ہی نکتہ چینی کا ردِّ عمل سامنے آ گیا۔ متحدہ امریکی عبرانی مجالس کے صدر رَبی الیگزانڈر شنڈلر نے کہا کہ Connally کی یہ مقبوضہ علاقے خالی کر دینے کی پکار اسرائیل کو دیوالیہ کرنے کا ایک فارمولا ہے۔ واشنگٹن اسٹار نے بغیر نام لئے اسرائیلی اہل کاروں کا یہ بیان نقل کیا کہ یہ عرب تیل پیدا کرنے والے ملکوں کے ہاتھوں بلیک میل ہونا تھا۔ امریکن جیوش کانگریس کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر Henry Seigman نے کہا کہ Connally کا کیمپ ڈیوڈ امن معاہدہ پر تنقید کرنا ''ان عرب متحارب ممالک کے لئے حوصلہ افزائی کے مترادف ہے جو عرب اسرائیل جھگڑے کا پر تشدد حل چاہتے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ Mr. Connally تیل کے مفادات کے حامی بن کر ابھرے ہیں۔'' Connally کے منیجروں نے بعد میں اسرائیلی سفارت خانے پر یہ کورس جاری رکھنے کا الزام عائد کیا۔

صرف چند ہی مبصروں نے اس کی تقریر کو سراہا۔ کرسچین سائنس مانیٹر کے کالم نگار Joseph C. Harsch نے اسے ایک بے لاگ امن تجویز قرار دیا اور کہا ''یہ یقیناً اسرائیل لابی کا توڑ ہے۔'' اس نے اسرائیل کے بارے میں وہ بات کہہ دی ہے جو کوئی بھی ممتاز امریکی سیاست دان ماسواء J.William Fulbright کے آج تک نہ کہہ پایا۔'' ہارش نے یہ بھی لکھا کہ ''یہ تجویز کوئی نئی نہیں ہے بلکہ یہ تو امریکی خارجہ پالیسی کی کتاب میں ۱۹۶۷ء کی جنگ کے وقت سے موجود ہے۔'' اس میں غیر معمولی بات صرف یہ تھی کہ ایک صدارتی امیدوار اس کا اظہار کرے۔ فوری سوال جو اٹھتا ہے وہ یہ کہ Mr. Connally کیا اس بات کا مظاہرہ کر سکتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ کے معاملے میں سرکاری حکومتی پالیسی اختیار کرنے کے بعد موجودہ سیاسی ماحول میں بقا ممکن ہے۔ "Nation" میں Arthur Samuelson نے تبصرہ کرتے ہوئے اس تجویز کو خطرناک بھی اور غلط بھی قرار دیا لیکن Connally کی صاف گوئی کو سراہا۔

عرصہ دراز سے مشرق وسطیٰ کی حکمت عملی کی خاص بات یہ رہی ہے کہ عوامی عہدوں کے امیدوار اس بارے میں دیانتداری اختیار نہیں کرتے۔ وہ امریکن اسرائیل تعلقات میں ۱۹۶۷ء سے قائم جمود کو توڑنے کی بجائے اسرائیل کی تعریف میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

واشنگٹن پوسٹ نے Connally کی تقریر کو "اس مرکزی مسئلہ پر امریکی بحث کا رخ ظاہر کرنے والی" قرار دیا اور لکھا کہ "اس سے پہلے کسی بھی بڑی پارٹی کے صدارتی امیدوار نے روایتی نقطہ کے اس قدر برخلاف پوزیشن اختیار نہ کی تھی۔ Mr. Connally نے اسرائیلی لابی کے سامنے سر جھکانے کے بجائے اسے ٹکر ماری ہے۔"

اس تقریر پر چند روز کے اندر ہی غیر دوستانہ تبصرے آنے شروع ہو گئے۔ ایک یہودی ریپبلکن امیدوار نے جو فلاڈیلفیا کے میئر کا انتخاب لڑ رہا تھا' Connally کی توہین کی اور اس کے ساتھ فوٹو اتروانے سے انکار کیا۔ اس کی قومی انتخابی مہم کی کمیٹی کے دو یہودی ممبران نے استعفیٰ دے دیا۔ ان میں سے ایک Rita Hauser جو امریکن جیوش کمیٹی کی خارجہ امور کونسل کی چیئرمین تھی' نے اسے ناقابل معافی اور "سیدھا سادہ سعودی عرب والا رویہ' راستہ" قرار دیا۔ دوسرا اٹارنی Arthur Hason تھا' اس کا بائیکاٹ کیا۔ واشنگٹن پوسٹ نے ایک گمنام ذریعہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ اس تجویز سے Connally نے وہ حمایت کھو دی ہے جو اسے اپنے تجارتی تعلقات کے باعث یہودیوں میں حاصل تھی اور اب "وہ اسے پھوٹی کوڑی بھی نہ دیں گے۔"

Connally کو یقیناً اپنی امیدواری میں ان زاویوں سے بھی نقصان اٹھانا پڑا جن کا واسطہ مشرق وسطیٰ پالیسی سے نہ تھا۔ اس انتخابی مہم میں اس شہ زور ٹیکساس شخصیت کو کئی مشکلات کا سامنا رہا۔ ٹی وی جیسے سرد ذریعہ ابلاغ پر بھی گرم مخالفت ہوئی اور اسے ۱۹۷۱ء میں ڈیموکریٹ سے ریپبلکن پارٹی میں آنے کا نقصان بھی سہنا پڑا۔

لیکن Connally کی مہم کے چیئرمین Winton Blount کا کہنا تھا کہ اس متنازعہ تقریر کا اثر سب سے زیادہ "تباہ کن" تھا اور Connally بھی اس سے متفق تھا۔ کالم نگار William Safir جو یوں تو Connally کا پرستار تھا لیکن تھا کٹر اسرائیل نواز۔ اس کے مہم پر پڑنے والے منفی اثرات کا دکھ بھرے لہجے میں ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "اسرائیل کے حامیوں نے بمع ان بہت سارے لوگوں کے جو عربوں کی اقتصادی اور روسیوں کی فوجی دھمکیوں کے جواب میں امریکی کمزوری کے شاکی تھے' رونالڈ ریگن پر نظر ثانی کی اور وہ انہیں دس سال زیادہ نوجوان لگا۔"

اسرائیلی احکامات پر سرنگوں

۱۹۸۴ء میں صدارتی مہم کے لئے ریپبلکن پارٹی کو نہ تو نامزدگی میں کسی مسئلے کا سامنا تھا اور نہ ہی اسرائیلی پالیسی میں۔ ریگن کے لئے میدان بالکل خالی تھا کیونکہ اس نے وہ خطرہ مول نہ لینا تھا جو چار سال قبل صدارتی امیدوار Connally نے لیا تھا۔ ۱۹۸۳ء کے اواخر میں ہی ریگن کو دوبارہ نامزدگی کا یقین تھا اور وہ جس پوزیشن میں تھا وہاں سے صرف وعدہ ہی نہیں بلکہ وعدہ پورا کر کے بھی دکھا سکتا تھا۔ اسے اپنی ستمبر ۱۹۸۳ء کی امن پلان اور عراق کے ایٹمی پلانٹ پر اسرائیلی حملے کے بعد اسرائیل کو جنگی جہاز دینے میں تاخیر جیسے معاملات پر اسرائیلی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ریگن نے اسرائیل کے ساتھ کسی بڑی مخاصمت سے بچنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ سارے یہودی ووٹ حاصل کر سکے۔ اس مقصد کے لئے اس نے اسرائیلی لابی کا ہر جائز و ناجائز مطالبہ مانا اور کوشش کی کہ اس دوران مشرق وسطیٰ کے بحران کو انتخابات کے بعد تک اٹھا رکھا جائے۔

عوامی رائے کے جائزوں سے یہ صاف ظاہر تھا کہ اصلاحی اقدامات کی ضرورت ہے۔ ۱۹۸۰ء میں ریگن کو ۴۰ فیصد یہودی ووٹ ملے تھے۔ یہ کسی ریپبلکن کے حق میں اب تک سب سے زیادہ تعداد تھی لیکن اس میں سے نصف اب زائل ہو چکے تھے۔ اپریل ۱۹۸۳ء میں ریگن کے یہودی معاملات کے مشیر Albert A. Spiegel نے استعفیٰ دے دیا۔ وہ ایک اخباری رپورٹ پر برہم تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ریگن اپنی مشرق وسطیٰ امن تجویز کو یہودیوں کی مخالفت کے باوجود روبہ عمل لانا چاہتا تھا اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ یہودی ووٹوں کے بغیر بھی دوبارہ جیت سکتا ہے۔

دسمبر ۱۹۸۳ء میں ریگن نے یہودی حمایت حاصل کرنے کے لئے اپنی کوششوں کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے یہودی فرقہ کو وہائیٹ ہاؤس کے رابطہ کو زیادہ استوار کرنا ٹھہرا' لیکن اس کے پالیسی ساز اقدامات زیادہ نتیجہ خیز تھے۔ دسمبر ۱۹۸۳ء میں اسرائیلی وزیر اعظم Yitzhak Shamir سے ملاقات کے بعد اس نے اسرائیل کی امداد میں ایک ڈرامائی اضافے کا اعلان کیا۔ پرانے فارمولے کے مطابق اسرائیل پر لازم تھا کہ کچھ رقم واپس کرے لیکن اب انتظامیہ نے تمام امداد کو گرانٹ میں تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس کے علاوہ اسرائیل کی ڈولتی اقتصادی ناؤ کو سہارا دینے کے لئے ایک نئے اسرائیلی جنگی جہاز کی تیاری میں ۲۵۰ ملین ڈالر کی امریکن امداد استعمال کرنے کی اجازت دی گئی۔ امریکہ کی طیارہ ساز کمپنیوں کی حوصلہ شکنی ہوئی کیونکہ انہیں تو اس قسم کی کوئی سرکاری امداد حاصل نہ

تھی۔(دیکھئے باب دوم)

ریگن نے "فوجی تعاون" کی سطح کو مزید بڑھادیا اور اسرائیل کو بغیر محصول کے آزادانہ تجارت کی اجازت دی۔اس بات سے اسرائیل دنیا کا واحد ملک بن گیا جسے بغیر محصول ادا کئے مشترکہ یورپی منڈی اور امریکہ دونوں تک رسائی حاصل تھی۔ اسرائیلی لابی خوشی سے جھوم اٹھی۔ AIPAC کے "Near East News Letter" نے بھرپور تعریف کی۔مارچ میں ریگن نے مزید رعایتیں لابی کو دیں۔اس نے اردن کے شاہ حسین کی درخواست پر اسرائیل کو کچھ بھی کہنے سے انکار کردیا۔ حالانکہ وہ پہلے شاہ حسین کو امن کے عمل میں حصہ لینے پر اکساتا رہا تھا۔شاہ حسین نے اس مقصد سے کہ یاسر عرفات کو تقویت حاصل ہو،.P.L.O کے اندرونی انقلابی عناصر کے برخلاف اور اسے خود بھی فلسطینیوں میں کچھ اثر و نفوذ حاصل ہو۔ صدر ریگن سے امداد کی اپیل کی۔اس کی خواہش تھی کہ ریگن اسرائیل پر دباؤ ڈالے کہ وہ غزہ اور غربی کنارے کے فلسطینیوں کو مستقبل قریب میں منعقد ہونے والی قومی کونسل کے اجلاس میں شرکت کی اجازت دے۔ایک دوسرے پیغام میں اس نے امریکہ سے یہ درخواست کی کہ وہ اقوام متحدہ میں اس قرارداد کی حمایت کرے جس میں مقبوضہ عرب علاقوں پر اسرائیل کی نو تعمیر شدہ بستیوں کو غیر قانونی قرار دیا جانا تھا۔یہ وہ نکتہ نظر تھا جو کئی پہلے صدور نے اختیار کئے رکھا تھا۔ریگن نے دونوں درخواستیں نامنظور کردیں۔نیویارک ٹائمز کو ایک بیان دیتے ہوئے شاہ حسین نے کہا کہ "امریکہ اسرائیل کے سامنے گھٹنے ٹیک رہا ہے" اور اسے آئندہ حالات میں اصلاح کی کوئی امید نظر نہیں آرہی۔

ڈیموکریٹ نامزدگی کے تمام بڑے امیدوار پہلے ہی اسرائیل کے ساتھ اظہار وفاداری سے کبھی نہ چوکتے تھے۔

ڈیموکریٹ کا ضمیر

۱۹۸۴ء کے صدارتی انتخابات میں اکثر اس سوال پر سابقہ نائب صدر والٹر مونڈیل اور سینیٹر گیری ہارٹ کے درمیان مقابلہ رہا کہ ان میں سے کون اسرائیل کا زیادہ وفادار تھا۔ مونڈیل ہارٹ پر یہ الزام دھرتا تھا کہ وہ امریکی سفارت خانہ کو تل ابیب سے یروشلم منتقل کرنے میں کمزوری دکھا رہا تھا اور ہارٹ مونڈیل پر یہ الزام لگا رہا تھا کہ وہ اسرائیل کو ڈرا دھمکا کر اسے ناقابل قبول خطرہ مول لینے پر

مجبور کر رہا تھا۔ یہ ان دنوں تھا جب وہ کارٹر کے ماتحت نائب صدر تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ کارٹر انتظامیہ میں مونڈیل ہی اسرائیل نواز قوت تھی۔ ۱۹۸۰ء کی صدارتی مہم میں اس نے لابی کے دباؤ کی حمایت میں ایک ایسا سفارتی قدم اٹھایا تھا جو کہ امریکہ کے لئے بڑا مہنگا پڑا۔ یکم مارچ کو یو۔ این. میں امریکی سفیر Donald MeHenry نے ووٹ ڈال کر بستیاں بنانے کی پالیسی پر اسرائیل کی کھلے عام مذمت کی۔ ایسا آئیزن ہاور انتظامیہ کے بعد پہلی بار ہوا تھا۔ یہودی حلقے سخت برافروختہ ہوئے اور مونڈیل بھی۔ میک ہنری کے ووٹ نے لابی کو دو نکات پر زک پہنچائی۔ اولاً اس میں غربی کنارہ پر بستیاں بسانے پر تنقید تھی اور ثانیاً مشرقی یروشلم کو "مقبوضہ علاقہ" قرار دیا گیا تھا۔

مونڈیل نے وہائیٹ ہاؤس کے اندرونی حلقہ سے فوراً جوابی حملہ کروایا۔ کارٹر کو یہ باور کرایا کہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اسے غلط مشورہ دیا تھا۔ اسی دن شام ڈھلے وہائیٹ ہاؤس سے "واشنگٹن اور نیویارک کے درمیان رابطے کی خرابی" کا اعلان کیا گیا۔ یہ کہا گیا کہ جیک ہنری کو غلط فہمی ہوئی اور اسے غیر جانبدار رہنا چاہئے تھا۔ تین روز بعد سکریٹری آف اسٹیٹ سائرس وانس نے ذاتی طور پر اس غلطی کی ذمہ داری قبول کی۔ اسے بھلا کس نے مانا ہوگا؟

اگر کارٹر اس ووٹ کو تبدیل کرنے کے لئے مونڈیل کے مطالبے کو نظر انداز کر دیتا تو اس سے امریکہ، کارٹر اور مونڈیل سب کا بھلا ہوتا۔ یہ بات کارٹر کے لئے سیاسی طور پر تباہ کن ثابت ہوئی۔ عربوں کے لئے یہ اسرائیلی دباؤ کے سامنے امریکہ کی شرمناک پسپائی تھی اور وہ بے حد جز بز ہوئے۔ دوسری طرف اسرائیل کے وزیر دفاع Ariel Sharon کے اکسانے پر امریکی یہودیوں نے بھی یہ محسوس کیا کہ انہیں دغا دیا گیا ہے۔ شیرون کا کہنا تھا کہ میں امریکہ کے داخلی معاملات میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا لیکن اسرائیل کی سلامتی دنیا بھر کے یہودیوں کا مسئلہ ہے۔ دنیا کو تو انتظامیہ بے بس نظر آتی تھی۔

کارٹر کی اس ندامت کا سب سے زیادہ فائدہ سینیٹر ایڈورڈ کینیڈی کو ہوا۔ اس نے اس یو. این. ووٹ کو اسرائیل سے غداری قرار دے کر میساچوسس پرائمری انتخاب میں کارٹر پر دگنے ووٹوں سے سبقت حاصل کی۔ وہ نیویارک اور Connecticut میں بھی جیت گیا جہاں ابتدائی جائزوں کے مطابق کارٹر کی جیت متوقع تھی۔ نیویارک میں ۸۰ فیصد یہودیوں نے کینیڈی کے حق میں ووٹ ڈالے۔

اسرائیلی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے کہا کہ "امریکہ کے یہودی فرقہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اس بات پر ایک ووٹ تبدیل کروا سکنے کی اہلیت رکھتے ہیں کہ صدر امریکہ اسرائیل کے حق میں کتنا اچھا ہے۔"

مونڈیل کے کیئے گئے اقدامات سے یہودیوں کی تسلی نہ ہوئی۔ نومبر میں انتخابات کے دوران کارٹر' مونڈیل وہ پہلی ڈیموکریٹ صدارتی نامزدگی تھی جو یہودی ووٹوں کی اکثریت سے محروم رہی۔ اسے تقریباً ۴۷ فیصد ووٹ ملے۔ ریگن' بش جوڑی سے نامزدگی میں شکست کے بعد مونڈیل نے صدارت کے لئے ہمہ وقتی مہم جاری رکھی جس کا بنیادی نکتہ اسرائیل کی اندھی حمایت تھی۔ اس نے "سعودی عرب کے ایک اعتدال پسند قوت بننے کے امکان" کو بالکل رد کر دیا اور کہا کہ ہمیں جدید ترین ترقی یافتہ امریکی فوجی ساز و سامان اسرائیلی فنی ماہرین کے حق میں رکھنا چاہیئے تاکہ اسرائیل کی مرضی کے خلاف اس کا استعمال ممکن ہی نہ رہے۔

اس کے بعد مونڈیل اور اس کے رفقاء مہم نے عرب مفادات بلکہ عرب امریکی مفادات سے گریز اختیار کیا۔ اسی جوش کا نتیجہ تھا کہ جون ۱۹۸۴ء میں مونڈیل کے فنانس ڈائریکٹر برائے الی نوائے نے پانچ عرب نژاد شکاگو شہریوں کے ہزار ہزار ڈالر کے چندہ دیۓ گئے' چیک لوٹا دیۓ۔ اس نے الزام لگایا کہ مونڈیل کے ساتھ ایک نجی میٹنگ میں انہوں نے جو باتیں کیں وہ "اسرائیل مخالف اور Anti Semitic الزام تراشی" درجہ رکھتی تھیں۔ ان پانچ میں سے ایک Albert Joseph (دیرینہ ڈیموکریٹ اور ہنٹر پبلشنگ کمپنی کا مالک) اس کا انکار کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ "ہم ۴۵ منٹ مونڈیل کے ساتھ رہے اور ماحول بیحد دوستانہ اور خوشگوار تھا۔" Albert Joseph کا کہنا تھا کہ اسے مونڈیل کی الی نوائے فنانس کمیٹی کے ایک ممبر Joseph Gomez نے بتلایا تھا کہ انہی دنوں مونڈیل کی تنظیم میں طے کیا گیا کہ کسی بھی عرب نژاد امریکی سے آئندہ کوئی رقم وصول نہیں کی جائے گی۔ شکاگو پبلشر کا کہنا تھا کہ یہ انتہائی توہین آمیز' غدارانہ اور رنجیدہ کرنے والی بات تھی۔ یہ تو گویا "ایک پورے امریکی گروہ کو اظہار رائے دہندگی سے محروم کر دینے والی بات تھی۔" اس چندہ کی واپسی پر برہم ہو کر اس شکاگو بینکر اور ہسپانوی نژاد لیڈر Gomez نے مہم سے کنارہ کشی کر لی۔ اس کا کہنا تھا کہ مونڈیل کی مہم کے اس فیصلے نے اس کا یہ نظریہ سچ کر دیا تھا کہ امریکہ میں عرب نژاد طبقہ آج کل سب سے زیادہ مظلوم گروپ ہے۔

امیدوار گیری ہارٹ کا ریکارڈ اسرائیلی امداد کے بارے میں اتنا ہی شاندار تھا جتنا مونڈیل کا اور

اس کی مہم کی انتظامیہ نے بھی امریکن عربوں کی اسی طرح اہانت کی۔ جب ہارٹ کو علم ہوا کہ واشنگٹن کے فرسٹ امریکن بینک کو جہاں وہ سالہا سال سے اپنا ذاتی لین دین کرتا تھا، ۱۹۸۰ء میں مشرق وسطیٰ کے ایک سرمایہ کار گروپ نے خرید لیا ہے تو ہارٹ نے سات لاکھ ڈالر کا لیا گیا قرضہ بھی واپس کر دیا اور بینک سے کلی قطع تعلق اختیار کر لیا۔ اس کے مشیر خاص نے کہا "ہمیں یہ علم نہ تھا کہ یہ ایک عرب بینک ہے۔ جونہی ہمیں علم ہوا وہ (ہارٹ) اس سے الگ ہوگیا۔" ہارٹ کی نامزدگی کے لئے حریف Josse Jackson نے اس چیز کو ایک "نسل پرست" عمل قرار دیا۔

بطور سینیٹر ہارٹ نے ہمیشہ ہر اسرائیل نواز کام کی حمایت کی اور عرب ممالک کو اسلحہ دینے کے ہر اقدام کی مخالفت کی۔ اس نے ہر اس دستاویز اور خط پر دستخط کئے جو اسرائیل مفاد کے حق میں تھا۔ جب اس کے چند ساتھیوں مثلاً سینیٹر John Glenn نے عراقی ایٹمی تنصیبات پر اسرائیلی حملہ کی مذمت کی تو اس نے اس مذمت کی مذمت کی تھی۔

ڈیموکریٹ نامزدگی کے اور بھی کئی امیدوار مثلاً ارنسٹ ہولنگز (ساؤتھ کیرولینا)، ایلن کرین اسٹن (کیلیفورنیا) اور ریوبن الیسکیو (سابقہ فلوریڈا گورنر) جنہوں نے جلد ہی ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ سبھی اسی طرح اسرائیل کی جائز و ناجائز حمایت کرتے تھے۔ Ohio کا سینیٹر John Glenn بھی ایسا ہی تھا، حالانکہ لوگ اسے مشرق وسطیٰ پر اعتدال پسند سمجھتے تھے۔ ماضی میں اس نے اسرائیلی فوجی کارروائیوں کی مذمت کی تھی اور F-15 سعودی عرب کو بیچنے کی حمایت کی تھی یہاں تک کہ پی۔ ایل۔ او کے ساتھ بات چیت کرنے کی بھی حمایت کی تھی۔ "ہمیں پی۔ ایل۔ او۔ سے بات چیت کا انکار نہیں کرنا چاہئے۔ اس علاقے میں صرف پی۔ ایل۔ او۔ ہی دہشت گردی میں منفرد نہیں" لیکن ۱۹۸۳ء میں Glenn کے دماغ میں جب صدر بننے کا کیڑا سر سرایا تو اس نے اپنی رائے بدل لی۔ اب وہ اس بات چیت کے خلاف تھا اور اپنے F-15 کی حمایت والے ووٹ کی یہ توضیح کرتا تھا کہ اگر وہ سعودی عرب کو فروخت نہ کئے جاتے تو وہ ایسے طیارے فرانس سے خرید لیتا جو بغیر کسی شرط کے ہوتے۔

نیویارک میں فارن پالیسی ایسوسی ایشن کے سامنے تقریر کرتے ہوئے Glenn مزید آگے چلا گیا اور کہنے لگا کہ کیمپ ڈیوڈ معاہدے پر پورا عمل درآمد ہوتے ہی یا پھر اس گفت و شنید کے مکمل تعطل کی صورت میں امریکہ کو چاہئے کہ یروشلم کو اسرائیل کا دارالخلافہ تسلیم کر لے۔ اب اس کا خیال تھا کہ "پی۔ ایل۔ او۔ ایک ٹھگوں کے گروہ سے زیادہ نہیں۔" اس کے خیال میں مشرق وسطیٰ میں قیام امن

کے عمل میں سب سے بڑی رکاوٹ عربوں کا اسرائیل کو جائز تسلیم کرنے سے انکار تھا۔ اس تقریر سے یہودیوں کے شکوک تو رفع نہ ہوئے البتہ وہ ان شہریوں کی حمایت سے محروم ہو گیا جن کا خیال تھا کہ مستقبل کے امریکی صدر کو عربوں اور اسرائیلیوں دونوں کے احساسات کا خیال رکھنا چاہئے۔ گلین کے ایک قریبی ساتھی Ohio کے کانگریس ممبر نے اس پر حیرانگی اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ گلین نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں حالانکہ یہ اس کے لئے ضروری نہ تھا۔ میں اس کے اس بیان سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اس کی طرف سے مزدور لیڈروں کو جو کالیں کرنی تھیں ان میں دیر ہو گئی۔" اس کے اس بیان کی وجہ سے جانسن انتظامیہ کے ایک بزرگ سیاست دان یعنی سابقہ سفیر Lucious Battle نے گلین کے خارجہ پالیسی مشیر کے طور پر کام کرنے سے انکار کر دیا۔

صرف دو امیدواروں کو مشرق وسطیٰ کے بارے میں متوازن پالیسی پر بولنے کی توفیق ہوئی۔ ایک تو سیاہ فام شہری حقوق کے سرگرم کارکن Jesse L. Jackson اور دوسرا George McGovern جو ۱۹۷۲ء میں ڈیموکریٹ نامزد امیدوار برائے صدارت تھا۔ McGovern نے ایک آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا اور اسرائیل کے فوجی اور آبادکاری معاملات پر نکتہ چینی کی۔ اس کی تجاویز ان سے اور بھی زیادہ واضح اور صاف تھیں جن کی وجہ سے چار سال قبل John Connally کی مہم کا خاتمہ ہوا تھا۔

فروری میں میساچوسیٹس کے ایک یہودی معبد میں تقریر کرتے ہوئے McGovern نے پوچھا "کیا یہ سیاسی اور اخلاقی طور پر برا نہیں کہ ایک ایسے امریکی سیاست داں کو اسرائیل دشمن قرار دیا جائے جو اسرائیلی پالیسیوں کو بھی اسی معیار پر جانچتا ہے جس پر وہ امریکی پالیسیوں کو جانچتا ہے؟" اس کا کہنا تھا کہ اس نے اپنے ۲۲ سالہ کانگریس کیریئر کے دوران اسرائیل کے لئے اقتصادی اور فوجی امداد کی ۱۰۰ فیصد حمایت کی تھی لیکن وہ پھر بھی لبنان پر اسرائیلی فوج کشی کا مخالف تھا۔ "میرے خیال میں ایک خود مختار قوم کو کسی اور خود مختار قوم پر حملہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

میک گورن یا جیکسن، کسی کے بھی نامزدگی کے امکانات نہ تھے۔ وہ دونوں اپنے اپنے طریقے سے "پارٹی کے ضمیر" کا کردار ادا کر رہے تھے۔ جب مارچ میں "Super Tuesday" پرائمری میں میک گورن کا بستر گول ہو گیا تو صرف جیکسن کا ضمیر ہی اس مہم میں باقی رہ گیا۔

جیکسن اس سے چار سال قبل امریکی یہودیوں کی نظر میں متنازعہ شخصیت بن چکا تھا جب وہ اپنے

انسانی حقوق کے سرگرم پرچار میں لبنان میں پی. ایل. او. کے لیڈر یاسر عرفات سے ملا۔ اس وقت تک وہ مارٹن لوتھر کنگ کے سابقہ مرید کے طور پر صرف سیاہ فاموں کے حقوق کے لئے کام کر رہا تھا جس کا نام People United to Save Humanity (PUSH) تھا۔ اس گروپ کا قیام شکاگو میں ہوا جہاں اسے متعدبہ یہودی مالی اعانت حاصل تھی۔ لبنان میں اسے فلسطینیوں کی حالت زار دیکھنے کا موقع ملا جن کو وہ مشرق وسطیٰ کے Niggers کہتا تھا۔

۱۹۸۳ء کے اوائل میں ہی جیکسن نے بطور ایک "غیر امیدوار" کے ملک میں دورے شروع کر دیئے، لیکن وہ تبھی سے ایک "دھنک رنگ اتحاد" بنانے کا راگ الاپ رہا تھا جس میں مختلف مفادات والے گروپ شامل ہوں۔ ایسے وقت جبکہ نامزدگی کے امیدوار مبہم لہجے میں بات کرتے ہیں اس نے اپنی پرانی تجویز کو دہرایا کہ امریکہ پی. ایل. او. کے ساتھ گفت و شنید شروع رکھے۔ نیویارک میں ٹی وی پر ایک بیان دیتے ہوئے اس نے کہا کہ امریکہ کی طرف سے اسرائیل کی بہترین امداد یہ ہوگی کہ وہ ایک آزاد فلسطینی وطن کے قیام کی حمایت کرے۔ جب تک یہ نہ ہوگا اس وقت تک فلسطینی تشدد کے مزید واقعات یا مایوسی کے مزید اقدامات میں حصہ لیتے رہیں گے۔ اس کا اصرار تھا کہ امریکہ براہ راست پی. ایل. او. سے گفت و شنید کرے تاکہ امن مذاکرات آگے بڑھیں۔ لیکن اس کا کہنا تھا کہ ہمارے سفارت کار اس بات پر زبانی بحث و مباحثہ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ امریکہ میں بیحد دہشت زدگی ہے۔ ان بیانات نے بیشتر یہودی لیڈر کو اس کے خلاف کر دیا۔

اکتوبر ۱۹۸۳ء میں جیکسن جب امیدوار بنا تو واشنگٹن پوسٹ کے مدیر نے اسے قوم کا دو میں سے ایک عظیم ترین سیاسی خطیب قرار دیا (دوسرا ریگن تھا)۔ اس نے فوراً ہی سیاسی منظر میں جان ڈال دی۔ وہ شام گیا اور یو. ایس. نیوی کے ایک پائلیٹ کو گفت و شنید سے رہا کروا لایا۔ اس نے اعلان کیا کہ شام اور امریکہ کے مابین بخار کچھ اترا ہے۔ درد کے دورانیہ میں وقفہ آیا ہے۔ مارچ میں شروع ہونے والے پرائمری انتخابات میں اس کو الی نوائے اور نیویارک میں اچھی خاصی پذیرائی ملی اور جنوبی ریاستوں میں بھی۔ ٹی وی پر ہارٹ اور مونڈیل سے مباحثہ کرتے ہوئے اس نے مشرق وسطیٰ کے تمام لوگوں سے نرم دلی کا برتاؤ کرنے کے لئے کہا اور سب فلسطینیوں کے اوپر دہشت گرد کا لیبل چسپاں کرنے کو بھی غلط قرار دیا۔ گو مونڈیل اور ہارٹ نے جیکسن کے اس مطالبہ کو کہ مشرق وسطیٰ میں ایک ہمہ جہتی امن قائم کرنے کے لئے فلسطینیوں کے لئے غربی کنارے پر قیام وطن ضروری

تھا، رد کر دیا۔ لیکن مدتوں بعد فلسطینیوں کے حقوق کا مسئلہ کسی صدارتی انتخاب میں شائستگی سے موضوع گفتگو بنا۔

جیکسن کو اس وقت دفاعی انداز اختیار کرنا پڑا جب ایک رپورٹر نے یہ انکشاف کیا کہ ایک نجی گفتگو میں اس نے یہودیوں کو "Hymies" کہہ کر پکارا تھا اور نیویارک کو "Hymie Town" کا خطاب دیا تھا۔ اس پر بہت سوں نے اسے Anti Semitic قرار دیا۔ ایک متنازعہ سیاہ فام لیڈر Louis Farahkhan بھی اس کے لئے سر دردی کا باعث بنا۔ اس نے یہودیت کو ایک "گندہ مذہب" اور ہٹلر کو عظیم بد معاش قرار دیا تھا۔ ان حالات میں پریس نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا حتی کہ کیوبا میں بھی پریس کانفرنس کے دوران Anti Semitic کا الزام دہرایا گیا جہاں اس کی مداخلت سے کئی امریکی شہریوں کو قید سے رہائی ملی تھی۔ ڈیموکریٹک کنونشن سے قبل ہی امریکن جیوش کمیٹی نے یہ مہم چلائی کہ جیکسن کو والٹر مونڈیل کے مقابلے میں کامیاب ہی نہ ہونے دیا جائے لیکن اس کے باوجود اس کو کنونشن میں کافی پذیرائی نصیب ہوئی تھی۔

کسی کو بھی یہ یقین نہ تھا کہ اسے صدارتی انتخاب کا ٹکٹ ملے گا لیکن وہ کنونشن ہونے سے پیشتر ہی جیت چکا تھا۔ اس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ایک سیاہ فام بھی امریکہ کے سب سے بڑے عہدہ کے لئے ایک قابل یقین امیدوار بن سکتا تھا، چاہے وہ اسرائیلی لابی کا سخت مخالف ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے اس عمل سے امریکہ کے دو مظلوم طبقوں کی عزت نفس بحال ہوئی: سیاہ فام اور امریکی عرب۔

صداتی جوئے کا جیتنے والا یعنی ریگن اس تحیر میں مبتلا ہو گیا کہ اس کی اسرائیل کے لئے سر توڑ حمایت اس کے لئے یہودی ووٹوں کے آنے کا سبب بن بھی سکے گی یا نہیں۔ اسے ۱۹۸۰ء کے ۴۰ فیصد یہودی ووٹوں کے مقابلے میں اس مرتبہ صرف ۳۱ فیصد یہودی ووٹ ...... یعنی پہلے سے ۹ فیصد کم ملے۔

دفاع کے دفاع میں رخنہ ڈالنا اور ریاست

پنٹاگون' دریائے پوٹومیک کے کنارے ایک وسیع و عریض بلڈنگ ہے۔ یہ اپنے اندر وزارت دفاع کے بیشتر مرکزی ہیڈ کوارٹرز سموئے ہوئے ہے۔ یہ ان اقدامات اور افواج کی اعلیٰ کمان کا مرکز ہے جو امریکنوں کو اس پرخطر دنیا میں سلامتی مہیا کرتی ہے۔ Potomac کے دوسرے کنارے پر اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ہے جو کہ ہمارے دنیا بھر میں پھیلے قومی سفارتی مراکز کا دفاع ہے۔ ان عمارات میں وہ ذرائع واقع ہیں جن میں سے ہزاروں خفیہ پیغامات گزرتے ہیں۔ ان عمارات میں پیشگی کلیرنس اور خصوصی پہچان کے بغیر داخل ہونا محال ہے۔ ہر جگہ مسلح گارڈ دکھائی دیتے ہیں اور ۱۹۸۳ء میں کنکریٹ کی دیواریں بنادی گئیں اور بھاری ٹرک حساس مقامات پر پارک کئے گئے تاکہ کوئی بھی شدت پسند اگر حملہ کرے تو یہ اقدامات بطور اضافی دفاعی حصار کے کام آئیں۔ یہ عمارات دو قلعے ہیں جہاں بہت ہی قیمتی قومی راز جدید ترین ٹیکنالوجی سے محفوظ رکھے جاتے ہیں' لیکن یہ راز کس قدر محفوظ ہیں؟

اسرائیل کو حیرت ناک انداز میں راز پہنچا دیے جاتے ہیں۔ اگر مجھے سیکریٹری آف اسٹیٹ سے کوئی ایسی بات کہنی ہے جس کا اسرائیل کو علم نہیں ہونا چاہئے تو مجھے انتظار کرنا ہوگا کہ اس سے میری ذاتی ملاقات نہ ہو۔ مندرجہ بالا ایک ایسے سفیر کا بیان ہے جو اب بھی Active Duty پر ہے اور مشرق وسطیٰ میں مختلف جگہ کام کر چکا ہے۔ گو امریکہ میں اسے زیادہ لوگ نہیں جانتے لیکن بیرون ملک وہ امریکہ کا مشہور ترین عہدہ دار ہے اپنے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے انٹرویو میں اس نے جو کہا وہ بہت نپا تلا تھا۔ "یہ زندگی کی ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی بااختیار عہدیدار اسرائیل کے بارے میں کچھ بھی کاغذ پر لکھنے سے کتراتا ہے۔ اگر اسے یہ بات اسرائیل سے خفیہ رکھنی ہے تو اور نہ ہی ایسے لوگ کسی بھی پرہجوم کمرے میں ایسی کسی بات کے بارے میں گفتگو کرنا چاہیں گے۔" اس سفارت کار نے خود اپنی مثال پیش کی۔ میرے ایک یہودی دوست نے مجھے فون کرکے آگاہ کیا کہ میں نے جو لمبی دستاویز

مشرق وسطیٰ پالیسی کے بارے میں ابھی بیرون ملک روانہ کی تھی وہ فاش ہوچکی ہے۔ یہ دستاویز Top Secret مارک کی گئی تھی۔ مجھے یقین نہ آیا تو میرے اسی دوست نے اس کو لفظ بہ لفظ مجھے فون پر پڑھ کر سنادیا۔ اس سفارت کار کے تبصرہ سے اسرائیل نواز سرگرم کارکن پریشان ہوجائیں گے جن میں سے اکثر کا خیال ہے کہ محکمہ دفاع اور محکمہ داخلہ دونوں اسرائیل دشمن عربوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اگر کبھی ایسا تھا بھی تو اب نہیں ہے۔ اس سفارت کار کا خیال ہے کہ ان دونوں محکموں میں نہ صرف اسرائیل نواز سرگرم کارکنوں کو بڑے پیمانے پر راز افشاء کئے جاتے ہیں بلکہ یہ امر "بہت دہشت انگیز اور ہمارے قومی مفاد کے لئے سخت مضر" ہے۔ ہمہ وقت موجود Zerox کاپی مشین کی وجہ سے تمام سفارت کار یہ فرض کر کے پیغامات بھیجتے ہیں کہ وہ جتنی بھی رازداری سے کام لیں، ان کے پیغامات کی فوٹو کاپیاں دلچسپی رکھنے والوں تک پہنچ ہی جائیں گی۔ یہ عنصر ان خفیہ رازوں کے افشاء کی مزید حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ اسرائیل کو خفیہ معلومات مہیا کرتے پکڑا بھی جائے جو کبھی شاذ و نادر ہی ہوتا ہے تو اس کی تحقیقات نہیں ہوتی۔ اسرائیلیوں کو جو بھی تکنیکی یا سیاسی راز درکار ہوتے ہیں وہ بغیر کچھ خرچ کئے ان کو ماخذ سے مل جاتے ہیں۔ وہ اہلکار جن کا کام ہی ہمارے قومی مفادات کی حفاظت کرنا ہے افشاء راز کا کھوج لگا کر روکنے اور ملزوں کو پکڑ کر سزا دلوانے سے بددل ہوچکے ہیں۔ دراصل اب تو وہ اسرائیل کے ہتھکنڈوں کا کھوج لگانے کی طرف مائل ہی نہیں کہ اس طرح یہ لابی انہیں شرارت پسند قرار دے کر ان کی کوششوں پر پانی پھیر دے گی اور ہوسکتا ہے کہ ان کے کیریئر کو نقصان بھی پہنچائے۔

اس لابی کا سراغ رسائی کا جال انتظامیہ کے ان تمام حصوں میں پھیلا ہوا ہے جہاں اسرائیل کے بارے میں کچھ بھی طے ہوتا ہے۔ ان کے رضا کار "مربی" ہر جگہ موجود ہیں۔ ان رازوں کے رستے رہنے کا علم ہی ہے جو کسی بھی عہدہ دار کو چاہے وہ کسی بھی پوزیشن میں ہو، ایسی تجاویز دینے یا فیصلے کرنے سے باز رکھتا ہے جو امریکی مفاد میں ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر کسی اہلکار نے اسرائیلی درخواست کے خلاف کوئی بات کسی ذاتی میٹنگ میں کہی ہو یا اس سے بھی بدتر کہ بین الدفتری Interdepartmental خط میں لکھی ہو...... تو اسے یہ فرض کرنا ہوگا کہ یہ بات جلد ہی اسرائیلی سفارت خانے تک پہنچ جائے گی۔ چاہے براہ راست یا پھر AIPAC کے واسطہ سے۔ اس کے بعد جلد ہی اس اہلکار کو توقع رکھنی چاہئے کہ جب اسرائیلی سفیر، سیکریٹری آف اسٹیٹ یا کسی ممتاز امریکی اہلکار سے ملاقات کرے گا تو اس پر نام لے کر تنقید کی

جائے گی۔

یہ نفوذ اس لحاظ سے اور بھی حیران کن ہے کہ یہ زیادہ تر امریکی شہری ایک غیر ملکی حکومت کے ایماء پر انجام دیتے ہیں۔ اس کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسرائیل کو اپنے اس سراغ رسانی کے جال سے من چاہی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں چاہے وہ امریکی حکومت کا کسی بھی قسم کا فیصلہ ہو یا اس کے ذرائع، وسائل کی تفصیل۔ جب اسرائیل کسی چیز کو حاصل کرنے کی درخواست کرتا ہے تو اسے پینٹاگون سے بھی زیادہ محکمہ دفاع کے ساز و سامان کا علم ہوتا ہے۔

اسرائیل نے ہوائی میں رکھا اسلحہ ڈھونڈ نکالا

۱۹۷۳ء کی مصر شام کے خلاف "یوم کپور" جنگ میں اسرائیل کا ہر طرح کے اسلحہ خصوصاً ٹینکوں کا بھاری نقصان ہوا۔ انہوں نے فوری سپلائی کے لئے امریکہ کی طرف نگاہ اٹھائی۔ ہنری کسنجر ان کا رابطہ تھا۔ نکسن واٹر گیٹ کے قضیے میں پھنسا ہوا تھا اور جلد ہی صدارت سے رخصت ہونے والا تھا۔ لیکن اس کی اجازت سے حکومت نے بھاری تعداد میں ٹینک مہیا کرنے کی حامی بھرلی۔

یہ ٹینک امریکہ کی حاضر سروس یونٹوں، ریزرو یونٹوں حتیٰ کہ پروڈکشن لائن سے سیدھے ہی نکال کر دئے جانے تھے۔ اسرائیلی افواج کی طاقت جلد از جلد مطلوبہ سطح پر لانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ اسرائیل صرف نئے جدید ترین ماڈل کے ٹینک جن پر ۱۰۵ ملی میٹر کی توپ لگی تھی لینا چاہتا تھا۔ لیکن مطلوبہ تعداد امریکی افواج کو بالکل محروم کر دینے سے بھی پوری نہ ہوئی۔ پنٹاگون نے اس کا یہ حل نکالا کہ کچھ ٹینک پرانے ماڈل کے ملا کر تعداد پوری کر دی۔ ان پر ۹۰ ملی میٹر کی توپ لگی تھی۔ جب یہ پہنچے تو اسرائیلیوں نے بڑبڑ کی کہ انہیں "پرانا کباڑ خانہ" دیا جا رہا ہے۔ پھر ان کو پتہ چلا کہ اس کے لئے مناسب گولے تو ہیں ہی نہیں، لہٰذا ۹۰ ملی میٹر گولوں کے لئے فوری اپیل بھجوائی گئی۔

پنٹاگون تلاش کے باوجود یہ حاصل نہ کر سکا۔ پنٹاگون میں انٹرنیشنل سیکورٹی ایجنسی کے ساتھ کام کرنے والے ایک افسر Thomas Byanka کا کہنا تھا کہ "ہم نے دیانتداری سے وہ اسلحہ تلاش کیا۔ ہر جگہ اور ہر فوجی برانچ، آرمی، نیوی، میرینز میں کھوجا۔ ہمیں کہیں بھی ۹۰ ملی میٹر کے گولے نہ ملے۔" اسرائیل کو یہ بری خبر بھیج دی گئی کہ یہ گولے امریکہ کے پاس کہیں بھی نہیں۔ چند دن بعد

اسرائیلیوں نے ایک حیران کن پیغام دیا "جی ہاں! یہ آپ کے پاس ہیں۔ ہوائی کے Marine Corps کے سپلائی ڈپو میں ۱۵۰۰۰ راؤنڈ پڑے ہیں"...... تو گویا اسرائیل نے ۹۰ ملی میٹر گولوں کی وہ امریکی سپلائی ڈھونڈ نکالی جو امریکہ خود بھی تلاش کرنے میں ناکام رہا۔

رچرڈ ہیلمز (۱۹۶۷ء کی جنگ کے دوران سی. آئی. اے کا ڈائریکٹر) کا کہنا تھا کہ ایک دفعہ اسرائیل کی درخواست پر جو اسلحہ بھجوایا گیا اس میں ایک غلط آئیٹم چلا گیا۔ اسرائیلی حکام نے وہ درخواست دوبارہ پیش کی اور اس مرتبہ اس میں وہ تمام مفروضہ طور پر "انتہائی خفیہ" کوڈ نمبر درج تھے اور ساتھ ہی ہیلمز کے لئے ایک نوٹ تھا کہ شاید پنٹاگون کو سمجھ نہیں آیا کہ کیا کیا آئیٹم درکار ہیں۔ "گویا وہ مجھے احساس دلا رہے تھے کہ ان کو جو چاہئے تھا وہ اس کے بارے میں مکمل معلومات رکھتے ہیں۔" ہیلمز کے خیال میں اس دوران اسرائیل سے کوئی بھی راز پوشیدہ نہ تھا۔

اسرائیلی نہ صرف اپنی مطلوبہ اطلاعات حاصل کرنے کے ماہر ہیں بلکہ وہ اسلحہ حاصل کرنے کے سبھی گر جانتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ پالیسی کا ایک ماہر Les Janka جو سابقہ ڈپٹی اسسٹنٹ سکریٹری برائے دفاع تھا' اسرائیل کی ہٹ دھرمی یوں بیان کرتا ہے:

"وہ کبھی نہ سننے پر تیار ہی نہیں ہوتے۔ کبھی ہمت نہیں ہارتے۔ یہ غیر ملکی نمائندے ہر وقت مطلوبہ فوجی ساز و سامان کی شاپنگ لسٹ تیار رکھتے ہیں۔ کچھ ایسی آئٹمیں بھی ہوتی ہیں جو کہ اتنی ترقی یافتہ ہوتی ہیں کہ کسی اور ملک کے پاس نہ تھیں۔ ان میں سے کچھ ایسے خفیہ آلات تھے جس کی وجہ سے ہمیں اپنے دشمنوں پر سبقت حاصل تھی۔ یہ آلات برائے فروخت نہ تھے۔ یہ ان ملکوں کو بھی مہیا نہیں کئے گئے تھے جن کے ساتھ ہمارے بیحد قریبی تعلقات اور باقاعدہ فوجی معاہدے تھے۔ مثلاً NATO ممالک۔" لیکن Janka کو پتہ چلا کہ اسرائیل کو فوجی سامان کی فروخت پر ایسی کوئی پابندی نہیں بقول اس کے "اسرائیل کو فروخت بالکل جدا تھی بہت مختلف۔" Janka کو بڑی اچھی طرح یاد تھا کہ کس طرح ایک اسرائیلی ملٹری لیزان آفیسر اسرائیل کے سفارت خانہ سے آیا اور ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ سے ایک ایسا خفیہ آلہ خریدنے کی اجازت طلب کی جو ممنوعہ فہرست پر تھا۔ اس میں کوئی بہت جدید ترین خفیہ تکنیک استعمال کی گئی تھی۔ میں نے اسے پنٹاگون کا سرکاری جواب دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ اس کا جواب نہ میں ہے۔ ہم یہ تکنیک ظاہر نہیں کریں گے۔" اس اسرائیلی افسر نے تمام سفارتی آداب کا خیال رکھا اور کسی بھی نچلے درجے کے اہلکار کو ناراض نہیں کیا کہ مبادا وہ اس فروخت کو روکنے کے لئے

کوئی قدم نہ اٹھالے۔ اس نے جواب دیا بیحد شکریہ' اگر یہ آپ کی سرکاری پوزیشن ہے تو ہمیں احساس ہے کہ آپ ہمیں وہ نہیں دے سکتے جو ہم چاہتے ہیں۔ برائے مہربانی برا نہ مانئے گا' ہم اس بات کو اوپر لے جائیں گے۔ مطلب یہ کہ وہ Janka کے حکام بالا کے پاس محکمہ دفاع میں جائے گا یا پھر سیدھا وہائیٹ ہاؤس۔

جب جانکا سے پوچھا گیا کہ آیا کوئی ایسا واقعہ اسے یاد ہے جب کہ اسرائیل کو اس کی مطلوبہ چیز نہ ملی ہو؟ تو اس نے قدرے توقف کے بعد سوچ کر جواب دیا "نہیں' آخر کار نہیں۔"

جانکا اسرائیلی خریداری افسروں کی کارکردگی کا معترف ہے اور کہتا ہے:

"آپ یہ سمجھیں کہ پنٹاگون میں اسرائیلی بہت پیشہ ورانہ مہارت سے کام کرتے ہیں اور ہر وقت موجود۔ ان کے پاس ایسے لوگوں کی معتدبہ تعداد ہے جو ہمارے نظام کو سمجھتے ہیں اور انہوں نے ہر سطح پر دوستی پال رکھی ہوتی ہے۔ یعنی اوپر سے نیچے تک' وہ اس نظام کے ساتھ ہمہ وقت لگاتار منسلک رہتے ہیں جس سے دباؤ برقرار رہتا ہے۔"

کارٹر کے دنوں میں وہائیٹ ہاؤس نے کچھ لگام دینے کی کوشش کی۔ کارٹر کے نیشنل سیکورٹی اسسٹنٹ Zbigniew Barzezinsky نے ایک انٹرویو میں کہا کہ ڈیفنس سکریٹری ہیرالڈ براؤن نے تکنیکی مہارت منتقل نہ کرنے پر حد لگانی چاہی۔ وہ اسرائیل کی اسلحہ اور اس کے سسٹم کی درخواستوں پر بہت سخت گیر رویہ رکھتا تھا اور بیشتر درخواستیں نامنظور کر دیتا تھا۔" لیکن یہ حتمی آخری بات نہ تھی۔ اس کی ایک بہت ہی قابل ذکر مثال دیتے ہوئے برزنسکی کا کہنا تھا کہ براؤن نے اسرائیل کو متنازعہ کلسٹر بم فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ بم افراد کے خلاف استعمال ہوتے ہیں باوجود اس کے کہ اسرائیل نے اس بم کو محدود پیمانے پر استعمال کرنے کی تحریری ضمانتیں دیں تھیں۔ اس نے انہیں لبنان میں دو مرتبہ استعمال کر کے شہریوں کا بھاری جانی نقصان کیا۔ براؤن نے اس کے ردعمل کے طور پر اس مہلک ہتھیار کی دوبارہ سپلائی روک دی' لیکن اس درخواست پر بھی آخر کار جیت اسرائیل ہی کی ہوئی۔ صدر ریگن نے کارٹر پالیسی تبدیل کر کے کلسٹر بم کو پھر منظور شدہ لسٹ میں شامل کر دیا۔

کئی اور لوگ بھی جو انتظامیہ میں اعلیٰ عہدوں پر کام کر چکے ہیں صاف گوئی سے بیان دینے پر تیار تھے لیکن Janka کے برعکس ان کا اصرار تھا کہ ان کے نام صیغہ راز میں رکھے جائیں۔ ایک نے کہا کہ میرے عہدہ کی میعاد ابھی باقی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ یہ ختم ہو جائے۔ میرا نام شائع کر دینے سے

میرا کیریئر ٹھپ ہو جائے گا۔ گمنام رکھے جانے کے وعدہ پر کئی دوسرے عہدے دار ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ اور دوسرے محکموں میں اسرائیلی لابی کے سراغ رسانی کے ذرائع اور تفصیلات پر سے پردہ اٹھانے پر رضامند ہوئے۔

بعض دفعہ یہ ایک معمولی چوری ہوتی ہے۔ ایک اہل کار کا کہنا تھا کہ "کچھ اسرائیلی ایک دفعہ پنٹاگون کے اندر غیر مجاز دستاویزات سمیت پکڑے گئے۔ بعض دفعہ (آمد) والے باسکٹ سے کاغذات نکال لئے جاتے تھے۔" اسے یاد تھا کہ کئی اسرائیلی اہل کاروں کو ملک بدر کیا گیا لیکن باقاعدہ الزامات کسی پر بھی کبھی عائد نہ کئے گئے۔ اسرائیل نے ایسے ہر ملک بدری کے واقعے کو کوئی ذاتی وجہ یا فیملی کی خرابی صحت بتا کر پردہ پوشی کی۔ ہمارے حکومت نے بھی ایسے واقعات کو کبھی الم نشرح نہیں کہا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمارے ملک میں اسرائیلی سراغ رسانی کی سطح اس سے بہت بلند ہے جتنی کہ حکومت نے کبھی کھلے عام تسلیم کی ہو۔ اس اہل کار کو ایک دن ایک فہرست ملی۔ یہ وہ اسلحہ تھا جو اسرائیل خریدنا چاہتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ اسرائیل کے لئے پنٹاگون ایک ایسی دکان کی مانند تھا جو "آؤ اور پاؤ" کہلاتی ہے۔ اس نے خود ہی یہ فرض کر لیا کہ اسرائیلیوں نے اجازت حاصل کر لی ہوگی۔ چنانچہ اس نے معمول کے مطابق ضابطہ کی کارروائی کرتے ہوئے وہ فہرست پنٹاگون کے مختلف دفاتر میں بانٹ دی کہ اس پر معمول کے مطابق نظر ثانی اور جانچ پڑتال ہو جائے۔ اس نے کہا:

> "ایک دفتر نے وہ لسٹ فوراً مجھے واپس کی اور ساتھ نوٹ لکھا کہ ان میں سے ایک چیز اتنی زیادہ خفیہ ہے کہ تمہیں بھی حق نہیں یہ جاننے کا کہ یہ معرض وجود میں ہے۔ مجھے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ اس درخواست کی تمام کاپیاں ضائع کر دوں اور ان کے ساتھ لکھے گئے کوڈ نمبر بھی۔ مجھے یہ علم نہ تھا کہ وہ کون سی چیز تھی۔ یہ ایک طرح کی Electronic Jamming Equipment تھی جو کہ "انتہائی خفیہ" تھی۔ اسرائیلیوں کو کسی نہ کسی طرح اس کا علم تھا اور انہوں نے اس کی خصوصیات' قیمت اور انتہائی خفیہ کوڈ نمبر بھی حاصل کر لئے ہوئے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ انہوں نے ہمارے حساس ترین مقامات یعنی ریسرچ اینڈ ڈیویلپمنٹ لیبارٹریز تک رسائی حاصل کر لی تھی۔"

اس قدر دل دوز انکشاف کے باوجود یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ افشاء راز کس نے کیا' کوئی سرکاری ایکشن نہ لیا گیا۔

ان کی خواہش ہمیشہ پوری ہوتی ہے

اسرائیلی ایجنٹ امریکن نظام کا بہت گہرا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر اسے اپنے فائدہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ خفیہ معلومات چوری چھپے حاصل کرنے کے علاوہ وہ کھلے عام لگاتار اور بھرپور انداز میں انتظامیہ کے ذیلی دفاتر پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ ایک ہتھیاروں کے ماہر نے ان کی تکنیک یوں بیان کی:

"اگر ان کو ہتھیاروں کی کسی درخواست پر ۳۰ دن کے بعد جواب دینے کا وعدہ کیا جائے تو وہ اکتیسویں دن آدھمکتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے یہ درخواست دی تھی' یہ منظور نہیں ہوئی' کیا وجہ ہے؟ ہم نے ۳۰ دن انتظار کیا ہے۔ بیشتر دوسرے ممالک کے ساتھ ہم ایسے مسائل کو آسانی سے ڈیسک پر پڑے ایک بکس میں رقعہ ڈال کر ختم کر سکتے ہیں لیکن اسرائیل کے لئے اب اس بکس میں کچھ بھی نہیں رکھ سکتے۔" اس کا کہنا تھا کہ اسرائیلی سفارت خانے کو ٹھیک ٹھیک علم ہوتا ہے' کب کس بارے میں کیا عمل ہوگا۔ یہ معاملات پر اس قدر بھرپور نگاہ رکھتے ہیں کہ شہر میں دوسرا کوئی سفارت خانہ ایسا نہ ہوگا۔ انہیں آپ کے ایجنڈا کا علم ہوتا ہے۔ آج اس پر کیا ہے' کل کیا تھا اور کل کیا ہوگا؟ انہیں علم ہوتا ہے کہ آپ کیا کر رہے ہیں کیا کہہ رہے ہیں؟ انہیں تمام ضابطوں اور قوانین کے الٹے سیدھے تک کا علم ہوتا ہے۔ انہیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ حتمی تاریخیں (Deadlines) کون کون سی ہیں؟"

وہ اسرائیلیوں کے دباؤ ڈالنے کی مہارت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"وہ اسرائیلی اخبارات میں اپنی منظوری ملنے کے سلسلے میں درپیش مشکلات کو Leak کر دیتے ہیں۔ پھر ایک رپورٹر اسٹیٹ یا ڈیفنس میں آ کر اتنی تفصیل سے سوالات پوچھے گا جو صاف ظاہر کریں گے کہ اسرائیلی اہل کار نے تحریک دی ہوگی۔ بعض مرتبہ دباؤ رپورٹروں کے بجائے AIPAC کی طرف سے آئے گا۔ اگر معاملہ کچھ زیادہ ہی اٹک جائے تو کیپٹل ہل سے خطوط اور فون کالز آنے میں دیر نہیں لگتی۔ وہ پوچھیں گے یہ آئٹم پنٹاگون کیوں منظور نہیں کر رہا؟ خط عموماً اس کانگریس ممبر کی طرف سے ہوگا جس کے حلقہ میں یہ آئٹم تیار ہوتی ہے۔ وہ یہ دلیل دے گا کہ متعلقہ آئٹم اسرائیل کی سلامتی کے لئے ضروری ہے۔ وہ اغلباً یہ بھی پوچھے گا یہ کون بدطینت شخص ہے۔ پنٹاگون یا اسٹیٹ میں جو اس منظوری کی

راہ میں روڑہ اٹکا رہا ہے؟ مجھے اس کا نام دیں۔ کانگریس یہ جاننا چاہے گی۔ یہاں پر امریکن دفاع کا ماہر اپنی بات پر زور دینے کے لئے قدرے رکا اور کہا "کوئی بھی بیوروکریٹ یا فوجی افسر یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی کانگریس ممبر اس کو گھیر لے اور اسے اپنی پیشہ ورانہ فرائض بیان کرنے پڑیں۔"

اس نے صدر کارٹر کے سکریٹری دفاع ہیرالڈ براؤن کا ایک واقعہ سنایا:

"مجھے یاد ہے ایک دفعہ اسرائیل نے ممنوعہ لسٹ پر درج ایک آئٹم مانگی۔ میں نے جواب دینے سے پہلے سکریٹری براؤن سے رابطہ کیا۔ اس نے کہا: نہیں، ہرگز نہیں۔ ہم ان حرام زادوں کے سامنے اس پر ہرگز نہ جھکیں گے' لہٰذا میں نے انکار کر دیا۔ لیکن ذرا ملاحظہ کریں۔ مجھے چند دن بعد ہی براؤن کی کال آئی' وہ کہنے لگا کہ اسرائیلیوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ مجھے (سنیٹر ہنری) Scoop جیکسن کی کال آئی ہے کہ ہم کیوں اسرائیل کے ساتھ تعاون نہیں کر رہے؟ اسے جانے ہی دو۔"

جب جمی کارٹر صدر بنا تو اسرائیلی AIM-9L بڑی تعداد میں حاصل کرنے کی کوشش میں تھے۔ یہ امریکہ کی جدید ترین فضا سے فضا میں مار کرنے والی میزائل تھی۔ پنٹاگون بار بار کہتا رہا "نہیں' نہیں' نہیں' یہ ابھی امریکن فوجی دستوں کو بھی نہیں ملی۔ اس کی پروڈکشن کی رفتار اتنی بھی نہیں کہ یہ امریکن ضرورت پوری کر سکے۔ یہ اتنی حساس ہے کہ ہم اس کے گم ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔" اس کے باوجود صدر کارٹر نے اوائل ہی میں پنٹاگون کے فیصلے کو مسترد کرتے ہوئے یہ میزائل اسرائیل کو دے دیئے۔

ایک سابقہ انتظامیہ اہل کار اسرائیل کی فطانت کی ایک اور مثال دیتے ہوئے کہتا ہے:

"اسرائیل نے ایک آئیٹم یعنی گولیاں بنانے والی مشین مانگی۔ یہ ایک بھاری اور وزن دار مشین تھی اور تھی بھی صرف ہمارے پاس۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ یہ کسی دوسرے ملک حتی کہ اسرائیل کے بھی پاس ہو۔ ہم جانتے تھے کہ اگر ہم نے انکار کیا تو اسرائیلی ہم سے بالا بالا ہی کسی نہ کسی طرح منظوری لے ہی لیں گے۔ چنانچہ ہم یہ کہتے رہے کہ ہم اس درخواست پر غور کر رہے ہیں لیکن ہمیں بیحد حیرانی ہوئی جب ہمیں پتہ چلا کہ اسرائیلیوں نے یہ مشین خرید بھی کر لی ہے اور یہ نیویارک کے ایک ویئر ہاؤس میں پڑی ہے۔"

اسرائیلیوں کے پاس اس مشین کو جہاز پر لے جانے کا اجازت نامہ نہیں تھا لیکن پھر بھی انہوں نے یہ خرید لی تھی۔ جب محکمہ دفاع نے ان سے باز پرس کی تو انہوں نے کہا "ہم سے چوک ہوگئی، ہمیں یقین تھا کہ ہاں ہو جائے گی اس لئے ہم نے خرید لی۔ اب اگر آپ نہ کہتے ہیں تو یہ رہا اس کو اسٹور میں رکھنے کا خرچہ اور یہ خرچ آئے گا اس کو فیکٹری واپس بھجوانے میں۔" تھوڑی ہی دیر بعد ایک اہل کار نے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے فون کر کے کہا "او! لے جانے دو ان کو۔" اور ساتھ ہی ایک موٹی سی گالی دی۔

یہ عالم مایوسی بعض مرتبہ بالکل چوٹی تک جا پہنچتا ہے۔ ۷۷-۱۹۷۴ء کے دوران اسرائیل کو غیر محدود سپلائی نے ہم پر برا اثر ڈالا۔ یہ وہ وقت تھا جب امریکی افواج ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے نقصانات کی تلافی کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس لڑائی میں امریکہ نے اپنی فوج اور اپنی ایئر فورس کو غیر مسلح کر کے ہتھیار اسرائیل کو بھجوائے۔ اس امریکی قحط کے دنوں میں بھی اسرائیل والے اپنی فرمائشیں لگاتار بھجواتے رہے۔ اس اہلکار کا کہنا تھا کہ پنٹاگون والے اصرار کرتے کہ نہیں، جو آپ مانگ رہے ہیں وہ فی الحال ہم نہیں دے سکتے۔ سال بھر کے لگ بھگ بعد پتہ کیجئے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ تقریباً ان سبھی معاملات میں وہائیٹ ہاؤس نے سیاسی بنیاد پر پنٹاگون کے فیصلے کو مسترد کر دیا۔ اس سے پنٹاگون والے آزردہ دل تو ہوئے لیکن بدتر بات یہ تھی کہ ہماری قومی سلامتی متاثر ہوئی۔ محکمہ دفاع کے اعلیٰ ترین پیشہ ورانہ معیار کے مطابق کئے گئے فیصلوں کو صرف اسرائیل کی خواہش پوری کرنے کے لئے دریا برد کر دیا گیا۔

یک طرفہ لین دین

اسرائیلیوں کو ہمدرد اہل کاروں سے فائدہ اٹھانے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ اس کی تشریح ایک سابقہ پنٹاگون افسر اس طرح کرتا ہے:

"پنٹاگون کے تقریباً سبھی دفاتر میں اسرائیل کے ہمدرد موجود ہیں۔ بہت سے فوجیوں نے اسرائیل میں ڈیوٹی کی ہے۔ وہاں ان کے دوست بھی بنے اور پھر یہاں کی ملٹری اکیڈمیوں میں کئی اسرائیلی زیر تربیت رہتے ہیں۔ پنٹاگون میں اسرائیلیوں کی قوت، ہمت اور ہنر کی

بہت قدر ہے۔ اسرائیلی ہمارے ساز و سامان کی کارکردگی کا ریکارڈ ہمیں بھجوانے میں بھی
بہت اچھے ہیں۔ ہمارے ملٹری اسکولوں میں اسرائیلی طلباء بڑی تعداد میں ہوتے ہیں۔ وہ
ہمارے لوگوں کے ساتھ بہت گہرا پیشہ ورانہ رابطہ پیدا کر لیتے ہیں۔"

برسہا برس سے امریکہ اور اسرائیل کے درمیان فوجی افراد کا تبادلہ جاری ہے۔ کاغذات میں تو یہ لین دین دکھائی دیتا ہے لیکن درحقیقت صرف اسرائیل ہی فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ معاملہ دراصل قومی کردار کا ہے نہ کہ کوئی خفیہ بات۔ اسرائیلی افسر عام طور پر انگریزی بولتے ہیں لہٰذا ان کے لئے امریکی افسران سے رابطہ پیدا کر لینا کوئی عجب بات نہیں' لیکن اس کے برعکس شاید ہی کوئی امریکی افسر عبرانی زبان بولتا ہو۔

صرف زبان کا فرق ہی ایک مسئلہ نہیں۔ امریکیوں کا سلامتی کے معاملات میں قانون سے لاپرواہی برتنا بھی اتنا ہی مسئلہ ہے۔ بہت سے اسرائیلی کسی حساس گوشے میں سال بھر گذارتے ہیں..... کسی امریکی کمانڈ میں یا پھر کسی ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ لیبارٹری میں۔ شروع میں انہیں یہ بتلایا جاتا ہے کہ وہ کچھ مخصوص جگہوں میں داخلے کے مجاز نہیں۔ پھر آہستہ آہستہ قوانین میں رعایت کر دی جاتی ہے۔ ایک سابقہ اہل کار محکمہ دفاع کا کہنا ہے:

"اسرائیلی نوجوان انگریزی طریقے سے بولتا ہے۔ پسندیدہ اوصاف رکھتا ہے۔ امریکیوں کا تو
آپ کو پتہ ہی ہے' وہ جلد ہی ان کا دوست بن جاتا ہے۔ جلد ہی یوں ہوتا ہے کہ قاعدے
قانون بھلا دیئے جاتے ہیں اور اسرائیلی افسران کو ہر جگہ داخلہ مل جاتا ہے۔ ہماری لیبارٹریز'
ہماری ٹریننگ درس گاہوں حتیٰ کہ ہمارے Operational Bases پر بھی۔"

اس اہل کار کا کہنا تھا کہ اس کے برعکس دوسری طرف کسی بھی قسم کی رعایت قاعدے قانون میں نہیں دیے جاتے:

"اس کا مطلب یہ ہے کہ افسران کے تبادلے کا یہ پروگرام ایک یکطرفہ سڑک ہے۔
ہمارے افسران کو چاہے وہ عبرانی بولتے ہوں یا نہیں' اسرائیل والے حساس فوجی مقامات پر
جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ بہت سے مقامات بالکل ہی ممنوعہ ہوتے ہیں' اس معاملے
میں وہ بیحد سخت ہیں۔ ہمارے افسران کو اس وقت بھی حاضری کی اجازت نہیں جب کوئی
امریکہ کا سپلائی کیا گیا اسلحہ یا ساز و سامان وہاں پہلی مرتبہ اتارا جا رہا ہو۔"

امریکی افسران جو تبادلے کے پروگرام کے ماتحت اسرائیل جاتے ہیں ان کو وہاں اکثر اوقات کسی ہال میں کہیں ایک میز کرسی دے کر بٹھا دیا جاتا ہے اور صرف اسی قدر کام دے دیا جاتا ہے کہ وہ مصروف رہیں اور دل برداشتہ نہ ہوں۔ عبرانی نہ جاننے کی وجہ سے ان کے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا کہ ہو کیا رہا ہے۔"

باہمی گرم جوشی کا بھی اس میں کچھ حصہ ہے۔ انتظامیہ کے بہت سارے ملازمین چاہے وہ یہودی ہوں یا غیر یہودی' یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان معاملات میں اسرائیل اور امریکہ باہم اکٹھے ہیں' لہٰذا وہ غیر محدود تعاون پیش کرتے ہیں۔ بہت سوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اسرائیل ہمارے لئے ایک اہم فوجی اثاثہ ہیں اور جو ہتھیار اور تکنیکی امداد اسے دی جاتی ہے وہ امریکہ کے مفاد میں ہے۔ یہی وہ احساسات ہیں جن کی بناء پر معلومات کے تبادلے پر سرکاری پابندیاں اکثر یا تو نرم کر دی جاتی ہیں یا پھر آسانی سے بھلا دی جاتی ہیں۔ ایک محکمہ دفاع کے اہل کار نے یوں اظہار کیا "قاعدے قانون فائلوں میں گہرے دفن ہوتے جاتے ہیں۔"

"ایک حساس دستاویز اسرائیلی افسر کے ہاتھ آتی ہے اور محکمہ دفاع کا اہل کار چشم پوشی سے کام لیتا ہے۔ نہ کچھ لکھا جاتا ہے اور نہ کچھ کہا جاتا ہے اور امریکی اہلکار کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ دریں اثناء اسرائیلی مزید طلب کرتے رہتے ہیں۔"

اس کھلی سخاوت کے باوجود اسرائیل والے جاسوسی کر کے حساس معلومات حاصل کرنے سے باز نہیں آتے۔ امریکہ نے چند سال پہلے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔

اس جال میں موساد کا حصہ

ایک مرتبہ اور صرف ایک ہی مرتبہ' ایک امریکی حکومت کے ملازم کو اسرائیل کو حساس نوعیت کے راز مہیا کرنے پر سزا دی گئی اور یہ تیس سال پہلے کی بات ہے۔ ۱۹۵۴ء میں محکمہ خارجہ کا ایک کیریئر آفیسر Fred Waller اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں اسرائیل' اردن ڈیسک کا انچارج تھا۔ اس نے ایک خفیہ دستاویز میں پڑھا کہ ایک دوست جو کہ اسرائیلی سفارت خانے کا اہل کار تھا' F.B.I. نے اس کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر ملک بدر کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس پر جاسوسی کرنے کا شبہ تھا۔ Waller نے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ یہ الزامات غیر منصفانہ ہیں اور جیسا کہ اس پر بعدازاں الزام لگایا

گیا۔ اس نے اسرائیلی سفارت خانے میں اپنے دوست کو آگاہ کر دیا۔ اس بات پر پہلے تو Waller کو برطرف کیا جانے لگا تھا لیکن پھر بعد میں اسے صرف ریٹائرمنٹ پر بھیج دیا گیا۔ اس کے جانشین Don Burgus کے کہنے کے مطابق وہ اسے ایک بھی پیسہ دیئے بغیر نکال باہر کرنا چاہتے تھے۔ یہ امریکہ میں میکارتھی ازم کے وہ سال تھے جب ایف. بی. آئی دھڑا دھڑ یہ سفارشیں بھیج رہی تھی کہ بہت سارے لوگوں کو ناپسندیدہ قرار دے دیا جائے۔ وہ بیحد مسرور تھے اس بات پر کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان کی ان سفارشات پر عمل کون کرے گا۔

Burgus نے بتلایا کہ اسرائیل کو بہت ساری معلومات بغیر جاسوسی کے ہی مل جاتی تھیں۔ اس کے الفاظ تھے "بہت ساری اطلاعات رضاکارانہ پیش کر دی جاتی تھیں۔ سیب نکال کر میز پر رکھ دیئے جاتے تھے اور میں اسرائیل کو اس کا الزام نہیں دے سکتا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر لے لیتے تھے۔"

Waller کے بارے میں تحقیقات اس زمانے میں ہوئی جب ہماری حکومت کی امریکہ میں اسرائیل کی جاسوسی سرگرمیوں کے بارے میں تشویش عروج پر تھی۔ چونکہ آئیزن ہاور انتظامیہ اسرائیل اور دوسرے مشرق وسطیٰ کے ممالک کو اسلحہ سے محروم رکھنے کی کوشش کر رہی تھی' لہٰذا زبردست کوشش کی گئی کہ خفیہ معلومات صیغہ راز میں ہی رہیں۔ ایک اور سینئر سفارت کار کہتا ہے "ہمارے اسٹیٹ اور دفاع کے محکموں کے ملازمین کو بڑے پیمانے پر ناجائز کام کروانے کے لے رشوتیں دی جا رہی تھیں۔ ہماری حکومت کو اسرائیل جا کر یہ مطالبہ کرنا پڑا کہ اسے فوراً بند کیا جائے۔"

Waller قضیہ کے بعد اعلیٰ سطحی مذاکرات کے بعد اسرائیل اور امریکہ میں ایک غیر تحریری معاہدہ طے پایا کہ آئندہ دونوں حساس معلومات کے ایک بڑے اور زیادہ حصے کا تبادلہ کریں گے اور ایک دوسرے کے علاقے میں خفیہ آپریشن بالکل محدود کر دیئے جائیں گے۔ اس سفارت کار کا کہنا تھا کہ یہ معاملہ سمجھا تو دو طرفہ جاتا تھا "اس سودے میں ہمیں بھی ان سے زیادہ وصول ہوتا اور امید یہ تھی کہ اس سے امریکی ملازمین کی چوری اور رشوت ستانی ختم ہو جائے گی۔"

لیکن اسرائیل کے ساتھ اس سمجھوتہ سے بھی معاملہ ختم نہ ہوا۔ اسرائیلی امریکہ کو یہ حق دینے کو تیار ہی نہ تھے کہ وہ خود فیصلہ کرے کہ کون کون سی حساس اطلاعات اسرائیل کو دی جا سکتی ہیں۔ اسرائیل نے کبھی بھی اس معاہدے کا پاس نہیں کیا اور امریکہ میں وسیع پیمانے پر اپنی جاسوسی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ یہ Waller والے ڈرامے کے ۲۰ سال بعد بھی سچ ہے۔ اس بارے میں کارٹر انتظامیہ

کے سفیر برائے اقوام متحدہ Andrew Young جو کہ پہلے اٹلانٹا کا میئر رہ چکا ہے کا کہنا تھا "میں نے تو یہ فرض کر کے کام کیا کہ اسرائیلیوں کو ہر بات کی فوراً خبر ہو جائے گی۔ ہر بات کے بارے میں یہ فرض کیا جاتا کہ اس کو Monitor کر لیا گیا ہوگا۔ اس بات کا خاصا باقاعدہ بندوبست تھا۔"

اگست ۱۹۷۹ء میں Andrew Young کو استعفیٰ دینا پڑا جب یہ انکشاف ہوا کہ اس نے Zuhdi Terzi جو کہ پی۔ ایل۔ او۔ کا نمائندہ تھا' سے ملاقات کی تھی۔ اس بارے میں اخبارات کا یہ کہنا تھا کہ اس ملاقات کی خبر اسرائیلی سراغ رسانی کے محکمہ نے جان بوجھ کر اخبارات میں مشتہر کروائی جس سے سفارتی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا اور ینگ کو استعفیٰ دینا پڑا۔

اسرائیل نے اس بات سے انکار کیا کہ Young-Terzi ملاقات کا اس کے ایجنٹوں کو پیشگی علم تھا۔ اسرائیلی سفارت خانہ کے پریس قونصلر نے تو واشنگٹن اسٹار میں یہاں تک کہا کہ ہم امریکہ کے اندر کسی قسم کی بھی جاسوسی نہیں کرتے۔ امریکی سراغ رسانی ماہرین کے لئے یہ تردید یقیناً خوشی کا باعث بنی ہوگی۔ ان کا کہنا تھا کہ Mossad کے ایجنٹ امریکہ کے ہر محکمے میں گھسے ہوئے ہیں اور ان کا کارکردگی نسبتاً KGB (روسی خفیہ پولیس) سے بھی بہتر ہے۔ یہ "نیوز ویک" سے بات کرتے ہوئے ایک ماہر نے کہا جس کی شناخت رسالے نے نہ کی۔ "نیوز ویک" نے مزید کہا:

> "حکومت کے اندر یا باہر امریکی یہودیوں کی مدد سے Mossad اس بات کا دھیان رکھتی ہے کہ امریکی حمایت میں کمی نہ آنے پائے اور اگر کوئی تکنیکی راز اسرائیل کو دینے میں لیت و لعل کرے تو وہ بھی مہیا کرنے کی کوشش کرتی ہے اور بقول ایک سابقہ .C.I.A ایجنٹ کے موساد کسی بھی ممتاز امریکی یہودی سے رابطہ کر کے مدد طلب کر سکتی ہے۔ اور ان کی اپیل سادہ الفاظ میں یوں ہوتی ہے کہ "جب مدد کے لئے پکارا گیا اور کسی نے پرواہ نہ کی تو نتیجہ قتل عام تھا۔"

امریکہ اپنی سرزمین پر موساد کے آپریشن کو محض اس لئے گوارا کرتا ہے کہ وہ امریکہ کے یہودی فرقے کو ناراض نہیں کرنا چاہتا اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ موساد امریکی سراغ رسانی کے لئے اکثر ایک قیمتی ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

اسرائیل کا عمل دخل اس قدر زیادہ ہے کہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایک سینئر اہل کار نے جو مشرق وسطیٰ کے بارے میں اعلیٰ ترین مناسب پر فائز رہ چکا ہے' رازداری سے بتلایا کہ میں نے کئی مرتبہ

یہ تجویز دی کہ امریکہ کو کچھ بھی اسرائیل سے خفیہ رکھنے کی کوشش ترک کردینی چاہئے۔ لینے دیں انہیں سب کچھ، جو وہ چاہتے ہیں وہ لے ہی لیتے ہیں۔ جب بھی ہم کچھ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ الٹا پڑتا ہے۔

موساد سے امریکی، اسرائیلی جاسوسی معاہدے کے ۲۵ سال بعد یعنی ۱۹۷۹ء میں بھی CIA کی ایک تجزیاتی رپورٹ میں ایسا کوئی اشارہ نہیں کہ موساد نے امریکہ کے اندر اپنی سرگرمیوں میں کچھ کمی کی ہو۔ اس ۴۸ صفحے کی خفیہ دستاویز میں، جس کا عنوان "اسرائیل غیر ملکی جاسوسی اور سر رشتہ ہائے سلامتی" ہے، کے مطابق امریکہ اب بھی موساد کی توجہ کا مرکز ہے۔

اپنا مشن انجام دینے کے لئے جو مثبت جاسوسی معلومات یہ اکٹھی کرتے ہیں اس کے لئے موساد عرب ممالک اور ان کے سرکاری نمائندوں اور تنصیبات کے علاوہ دنیا بھر میں اور خصوصاً مغربی یورپ اور امریکہ میں اپنے ایجنٹوں کو استعمال کرتے ہیں۔

اسرائیلی محکمہ سراغ رسانی کے لئے مغربی ممالک کے مقاصد بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے کہ سوویت روس اور مشرقی یورپ کے۔ موساد مشرق وسطیٰ کے بارے میں مغربی ممالک ویٹیکن اور اقوام متحدہ کی پالیسیوں کی معلومات جمع کرتی ہے۔ اسرائیلی دفائی فوج کے لئے ہتھیاروں کے سودے طے کرتی ہے اور مغرب میں اسرائیل مخالف گروپوں کا منہ بند کرنے کے لئے اعداد و شمار جمع کرتی ہے۔

اسی کتابچے میں "طریقۂ عمل" کے عنوان کے ماتحت CIA یہ بیان کرتی ہے کہ موساد کس طرح اسرائیل نواز گروپوں کو استعمال کرتی ہے۔ موساد کے سالہا سال سے ان ممالک کے اکابرین اور دفاتر سے قریبی تعلقات قائم ہیں جو اسرائیل کے لئے اہمیت رکھتے ہیں۔ ہر ملک کی یہودی آبادی میں کچھ صیہونی یا دوسرے ہم خیال پائے جاتے ہیں اور یہ ذرائع معلومات کا کام کرتے ہیں۔ یہ کئی دوسرے مقاصد کے لئے بھی کام کرتے ہیں۔ مثلاً پروپیگنڈہ اور فریب.......... موساد کی سرگرمیاں عام طور پر اسرائیلی سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کے ذریعے انجام پاتی ہیں۔ کچھ ادارے اور تجارتی فرمیں جاسوسی کے نقطہ نظر سے بنائی جاتی ہیں۔ کچھ خاص اسی مقصد کے لئے ہوتی ہیں اور کچھ کو حسب موقع اور حسب ضرورت ڈھالا جاسکتا ہے۔ پھر غیر صیہونی یا بین الاقوامی ادارے جو یہودیوں کے ہیں اس میں بھی رسائی حاصل کی جاتی ہے۔

جو سرکاری ادارے بطور ظاہری پردہ کے استعمال کئے جاتے ہیں وہ ہیں: اسرائیلی خرید و

فروخت مشن' اسرائیلی سرکاری سیاح' اسرائیلی تعمیراتی فرمیں' El-Al and Zim Oficers' صنعتی ادارے اور بین الاقوامی تجارتی تنظیمیں بھی غیر سرکاری اوٹ مہیا کرتی ہیں۔ ایسے افراد جو اندر گھسے ہوتے ہیں جو کثیر المیعاد اور زیادہ نازک ہوتے ہیں یا جن کے بارے میں اسرائیلی حکومت کبھی بھی تسلیم نہ کرنا چاہے گی۔

اسرائیلی محکمہ سراغ رسانی غیر ممالک میں آباد مختلف یہودی گروپوں یا تنظیموں پر اپنے جاسوس بھرتی کرنے یا معلومات اکٹھی کرنے کے لئے بہت زیادہ انحصار کرتا ہے۔ صیہونیت کی جارحانہ نظریاتی اساس جو ہر یہودی کو اسرائیلی شہری بننے اور اسرائیل مراجعت پر مجبور کرتی ہے۔ سراغ رسانی کے عمل میں حمایت حاصل کرنے کے لئے رکاوٹ بھی بن سکتی ہے کیونکہ دنیا بھر کے یہودیوں میں صیہونیت کے خلاف مخالفت بھی پائی جاتی ہے۔

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسرائیلی سراغ رسانی اہل کاروں کو یہ ہدایت ہے کہ یہودی آبادیوں کے اندر بیحد احتیاط سے کام کریں تاکہ اسرائیل کے لئے کسی ندامت کا باعث نہ بنیں۔ وہ صیہونیت مخالف حلقوں کے اندر نفوذ کی کوشش بھی کرتے ہیں تاکہ انہیں بے اثر بنا سکیں۔

اس سلسلے میں سائنسی راز چرانا بھی موساد کا ایک خاص ہدف ہے۔ یہ کام اکثر مقامی ایجنٹوں کی امداد سے کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر سے کھلے عام اور بڑے پیمانے پر مطبوعہ سائنسی پیپرز اور تکنیکی رسائل کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسرائیلی اپنے خفیہ آپریشنز کا معتد بہ حصہ سائنسی اور تکنیکی معلومات چرانے پر صرف کرتے ہیں۔ اس میں مغرب اور امریکہ کے بعض خفیہ دفاعی پراجیکٹوں کے بارے میں راز حاصل کرنا بھی شامل ہے۔

اسرائیلی سلامتی اداروں کے اہل کار (اسرائیل کے اندر) ناجائز رومانوی تعلقات کی کھوج میں رہتے ہیں تاکہ ان کے ذریعے سے تعاون حاصل کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔ ایسی ہی ایک مثال میں Shin Beth (مقامی اسرائیلی خفیہ ادارہ) نے یروشلم کے امریکی قونصلیٹ جنرل کے دفتر میں رسائی کی کوشش کی اور ایک ایسے دفتری اہل کار کے واسطے سے جو ایک اسرائیلی لڑکی سے معاشقہ چلا رہا تھا' انہوں نے اپنی امداد میں بھرتی کے لئے ایک چھوٹا اسقاط حمل کا کیس بنایا لیکن ناکام رہے۔ اس بلیک میل کرنے کی کوشش سے قبل انہوں نے اس اسرائیلی لڑکی کے ذریعے راز حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔

CIA کے مطابق اسرائیلی جاسوسی کوششوں میں امریکی سفارت خانے (تل ابیب میں) کے میرین گارڈ کو رقم کا لالچ دے کر بھرتی کرنے جیسے اوچھے ہتھکنڈے بھی شامل تھے۔ اسی رپورٹ میں بتلایا گیا تھا کہ ۱۹۵۴ء میں امریکی سفیر کے دفتر میں ایک پوشیدہ مائیکروفون پایا گیا تھا جو کہ "اسرائیلیوں کا نصب کردہ" تھا اور دو سال بعد امریکہ کے ملٹری اتاشی ریٹائرڈ سفارت کار Don Bergus کے گھر کے دونوں ٹیلی فون ٹیپ شدہ پائے گئے۔ اس نے بتلایا کہ امریکی سفیر Ed. Lawson نے یہ رپورٹ واشنگٹن بھیجی کہ "ہمارے پچھلے چھ ماہ کے تمام خطوط اور تار کے بارے میں یہ فرض کیا جائے کہ وہ اسرائیلیوں کو معلوم ہیں۔ ایڈ نے تمام تاریں اپنی سکریٹری کو لکھوائی تھیں۔

۱۹۸۰ء کے یرغمالی بحران میں کالم نگار جیک اینڈرسن نے "امریکی خفیہ رپورٹوں" کا حوالہ دیتے ہوئے (جبکہ درحقیقت AIPAC کے واسطے سے اسرائیلی سفارت خانے نے مہیا کی تھیں) لکھا کہ پی. ایل. او. نے کسی ممکنہ امریکی کوشش نجات کا سدباب کرنے کے لئے سفارت خانے میں بارودی سرنگیں بچھادی تھیں۔ یہ خفیہ رپورٹیں بوگس ثابت ہوئیں۔ جب ایک اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اہل کار سے موساد کی موجودہ سرگرمیوں کے بارے میں پوچھ گیا تو اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا:

> "ہمیں یہ فرض کرنا چاہئے کہ وہ سارے شہر میں ٹیلی فون ٹیپ کرتے ہیں۔ مجھے اپنے کام کے دوران اکثر ایسے افراد سے واسطہ پڑتا ہے جن سے مجھے دوران گفتگو ایسی بیحد حساس معلومات ملتی ہیں جن کے بارے میں ان افراد کا استحقاق نہیں بنتا کہ وہ انہیں معلوم ہوں اور جب میں اچنبھے کا اظہار کرتا ہوں کہ یہ کس نے ٹیپ کرلیا؟ تو وہ کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں لیکن کم از کم ہم نے نہیں کیا۔" اس اہل کار کا کہنا ہے کہ وہ کبھی بھی کوئی حساس اطلاع اپنے دفتری فون پر نہیں دیتا۔ "آپ کو ان کی ذہانت کی قدر کرنی چاہئے۔ موساد والوں کو کسی بھی سسٹم میں گھس جانے کا ڈھنگ آتا ہے۔"

ایسی مصیبت کس کو چاہئے؟

خفیہ معلومات کا افشاء راز ہمارے پالیسی سازوں کے لئے ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ایک ایسے ہی اہل کار (جسے میں نے نام ظاہر نہ کرنے کا قول دیا) نے بتلایا کہ کارٹر انتظامیہ کے دوران تو اس کے

ساتھی کسی چھوٹی سی نجی محفل میں بھی کھل کر بولنے سے گھبراتے تھے۔ ایسی Inter-Agency میٹنگوں میں بھی جن میں پندرہ اہل کار شامل تھے۔ ان سبھی کو معلوم تھا کہ یہ گفت و شنید انتہائی خفیہ ہے۔ اسرائیلی درخواستوں کو نامنظور کیا گیا تو چند گھنٹوں کے اندر اندر اسرائیلی ملٹری اتاشی' پولیٹکل آفیسر یا سفیر یا تینوں بیک وقت احتجاج کر رہے ہوتے تھے۔ ان سب کو ٹھیک ٹھیک معلوم تھا کہ کس کس نے کیا کیا کہا؟ حالانکہ ہم کچھ بھی احاطہ تحریر میں نہ لاتے تھے بقول اس کے ایسی مصیبت کون چاہے گا سمیٹنا؟

اس نے کہا کہ بین الاقوامی سلامتی کے لئے اسسٹنٹ سکریٹری دفاع David McGiffert کو اکثر دباؤ کا سامنا رہتا تھا۔ اسرائیلی سفارت خانہ اس سے اکثر ان دستاویزات کی کاپی طلب کرتا جو کہ ابھی ڈرافٹ کی شکل میں تھیں اور اس کی میز تک پہنچی بھی نہ تھیں۔ اسی قسم کے افشاء راز کو روکنے کے لئے بعض افسران نے خود ہی احتیاطی تدابیر اختیار کر رکھی تھیں۔

گو افشاء راز کی صورت میں کبھی کسی اہل کار کو الزام نہیں دیا جاتا کہ راز اس نے اسرائیل کو مہیا کیا لیکن ایسے افراد کو خفیہ دستاویزات کی تقسیم میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ان کا نام فہرست ترسیل میں سے حذف کر دینے کے لئے رازداری سے کہہ دیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک ایسا ہی اہل کار کارٹر اور ریگن انتظامیہ میں تھا اور وہ اب بھی ایک اہم اور حساس خارجہ پالیسی عہدہ پر ہے۔ جب کارٹر انتظامیہ میں وہ ایک سینئر عہدہ پر تھا تو اس کے حکام بالا کو ہدایت تھی کہ وہ اہم حساس اور خفیہ دستاویزات جو مشرق وسطیٰ کے امور کے متعلق ہوں اس کے دفتر کے واسطہ سے کلیئر نہ کریں اور اس کی موجودگی میں ایسے معاملات پر گفتگو کرتے وقت بیحد احتیاط سے کام لیں۔ اس کا ایک ساتھی اہل کار اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ بیحد ہونہار ہے۔ اسے حکومت کا حصہ ہونا ہی چاہئے' لیکن جہاں تک اسرائیل کا تعلق ہے اس بارے میں وہ Slind Spot رکھتا ہے۔

اسرائیل نواز لابی ایسے سرکاری اہل کاروں کو جن کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ وہ اس کے کام میں روڑے اٹکاتے ہیں' الگ تھلگ کر کے ذاتی حملوں کا نشانہ بناتی ہے حتیٰ کہ ان کے کیرئر کا بیڑہ غرق کرنے سے بھی نہیں چوکتی۔ جنوری ۱۹۷۷ء میں صدر کارٹر کے آتے ہی ایک عمومی تطہیر کا عمل شروع کیا گیا۔ اس کا بندوبست کرتے والا فلوریڈا کا ڈیموکریٹ سینیٹر Richard Stone تھا جو اسرائیل کا پرجوش حامی تھا۔

جب وہ نیا نیا سینیٹ کی مشرق وسطیٰ ذیلی کمیٹی کا چیرمین بنا اور وہائیٹ ہاؤس ملنے آیا تو ایک ہٹ لسٹ ہمراہ لایا۔ اس کے خیال میں پندرہ اہل کار ایسے تھے جنہیں اسرائیل اور اس کی اسلحہ کی ضروریات سے پوری ہمدردی نہ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کا تبادلہ دوسرے دفاتر میں ایسی جگہوں پر کر دیا جائے جہاں ان کے نظریات اسرائیل کے لئے کسی رکاوٹ کا باعث نہ بنیں۔ اس میں Berzezinski کا مشرق وسطیٰ امور کا اسسٹنٹ William Quandt اور فورڈ کے ماتحت نیشنل سیکورٹی کونسل کا ممبر Less Janka شامل تھے۔ چند اور ملٹری آفیسر تھے۔ زیادہ تر اسٹون کے یہ مطالبات برزنسکی نے نامنظور کر دیئے اور وہائیٹ ہاؤس کے ایک سینئر اہل کار کے مطابق کئی دن کے مناسب اصرار کے بعد سینیٹر نے اس بات کو چھوڑا۔ یہ مطالبات گو ناکام رہے لیکن اس سے ہلچل پیدا ہوئی۔ ایک افسر کا کہنا تھا کہ "یہ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ ایک امریکن سینیٹر امریکن صدر کے قومی سلامتی کے مشیر کے پاس جائے اور کہے کہ ان امریکنوں کو اس بنیاد پر نوکری سے نکالا جائے کہ یہ ایک اور ملک کی وفاداری کا پورا دم نہیں بھرتے۔

امریکن خارجہ پالیسی کو تلپٹ کرنے والے افشاء راز

پچھلے چند سالوں میں چار مرتبہ ہمارے تعلقات اسرائیل کے ہمسایہ ممالک سے بری طرح متاثر ہوئے صرف اس وجہ سے کہ اسرائیل کو ہماری خفیہ اطلاعات سے آگاہ کر دیا گیا۔ پہلے سے ہمارے اردن کے ساتھ وہ تعلقات ختم ہوگئے جو سالہاسال سے امریکی سیکورٹی کے مفاد میں چلے آ رہے تھے۔

ایک دیرینہ خفیہ معاہدے کے تحت اردن کے شاہ حسین کو CIA کے خفیہ فنڈ سے مالی امداد دی جاتی تھی۔ یہ برطانیہ کے کیئے گئے بندوبست کا ہی تسلسل تھا۔ اس کے ماتحت شاہ حسین جیسے اعتدال پسند لیڈر مفید کاموں کے عوض امداد پاتے تھے اور جس کے باعث بغیر مقامی طور پر کسی کا مرہون منت ہوئے اپنا سیاسی اثر ورسوخ برقرار رکھ سکتے تھے۔

کارٹر انتظامیہ کے اوائل میں ہی وہائٹ ہاؤس نے تمام خفیہ آپریشنز پر نظر ثانی کا حکم دیا۔ اس میں سی آئی اے کی مشرق وسطیٰ میں ادائیگیاں بھی شامل تھیں۔ فروری ۱۹۷۷ء کے اوائل میں انیس لوگوں نے اس نظر ثانی میٹنگ میں شرکت کی۔ ان میں سے ایک سینئر افسر کا کہنا تھا کہ اس وقت مجھے ڈر تھا کہ افشاء راز ہو کر رہے گا۔ چند روز بعد واشنگٹن پوسٹ میں شہ سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی

کہ سی آئی اے نے شاہ حسین کو لاکھوں ڈالر ادا کئے۔ مصنف Bob Woddward کے کہنے کے مطابق پچھلے بیس برسوں میں CIA نے شاہ حسین کو مجموعی طور پر لاکھوں ڈالر ادا کئے تھے جو خفیہ سالانہ ادائیگیوں کی شکل میں تھے۔ بقول اس کے ۱۹۷۶ء میں ادائیگی کی یہ رقم ۷۵۰۰۰۰ ڈالر تھی۔ اس انکشاف سے بین الاقوامی قضیہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ساؤتھ ڈیکوٹا کے سینیٹر James G. Abourezq نے واشنگٹن پوسٹ کا یہ مضمون پڑھ کر قومی سلامتی کونسل کے ایک اہل کار Harold Saunders سے فون پر پوچھا تو اس نے تصدیق کی کہ CIA خفیہ فنڈ میں سے اردن اور اسرائیل دونوں کو ادائیگیاں ہوتی رہی ہیں۔ Saunders کے کہنے کے مطابق جس عرصہ میں شاہ حسین کو تقریباً دس ملین ڈالر دیے گئے اسی دوران اسرائیل کو ادائیگی ۷۰ ملین ڈالر بنتی تھی۔ یہ انہی رقوم کا ثمر تھا کہ اسرائیل اپنے خارجی امدادی پروگرام برائے افریقی ممالک کو بڑھاوا دے سکا اور اغلباً اب بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ حسین نے وہ رقوم اپنے بدو قبائل کی وفاداری قائم رکھنے کے لئے خرچ کی۔

ان اطلاعات کی تصدیق کے بعد ابورزق نے بوب وڈورڈ کو فون کرکے دریافت کیا کہ جب اس نے وہ اردن کی رقوم کی ادائیگی کا مضمون لکھا تو اس وقت اسے علم تھا کہ CIA اسرائیل کو بھی امداد دیتی تھی؟ ابورزق کا کہنا تھا کہ وڈورڈ نے تسلیم کیا کہ اسے اسرائیل کو ادائیگیوں کا علم تھا لیکن اس کیس میں حالات مختلف تھے۔ لہٰذا اس نے اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ابورزق کو اس امن پسند انصاف پر بے حد طیش آیا اور اس نے فون پر چلا کر کہا کہ میرے خیال میں تو یہ فیصلہ کرنے کا حق واشنگٹن پوسٹ کے قارئین کو ہے۔ ابورزق نے کئی ماہ تک واشنگٹن کے صحافیوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ سی آئی اے اسرائیل کو بھی رقوم دیتا رہا ہے۔ کئی ماہ بعد جب یہ ہلچل ختم ہو چکی تھی تو جیک اینڈرسن نے اپنے سنڈیکیٹ کالم میں اسرائیل کو رقوم کی ادائیگی کا ذکر کیا لیکن اس بار کوئی عوامی ردِّعمل سامنے نہ آیا۔

Brazezinsky کے بقول اردن کے ساتھ CIA کا یہ معاملہ USA کے حق میں "بہت مفید" تھا، لیکن اس تشہیر کے بعد یہ معاملہ ختم کرنا پڑا۔ حسین کو بھی ندامت اٹھانی پڑی اور امریکہ کے عربوں کے ساتھ تعلقات کو بھی زک پہنچی۔

اس سے اگلے افشاءِ راز سے امریکہ، سعودی تعلقات میں جو ندامت اٹھانی پڑی کہ ایک کیریئر سراغ رسانی افسر کو سعودی عرب سے دیس نکالا ملا۔ ۱۹۷۹ء میں شاہ ایران کے سقوط کے بعد اس بارے میں حاشیہ آرائی کی جا رہی تھی کہ اغلباً سعودی حکومت بھی سقوط پذیر تھی۔ سعودی عرب میں

CIA کے اسٹیشن چیف نے ایک خفیہ تار واشنگٹن بھیجی جس میں اس افواہ کا ذکر تھا لیکن بطور پیشین گوئی نہیں! اس کو بنیاد بنا کر اور دوسری رپورٹوں اور تجزیہ کی روشنی میں سی آئی اے نے ایک پیپر تیار کیا اور اس کی سرکاری پالیسی ساز افراد میں محدود پیمانہ پر تشہیر کی۔ اس پیپر میں سعودی حکومت کے استحکام کو موضوع بحث بنایا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ذرائع ابلاغ کو جان بوجھ کر یہ راز افشاء کیا گیا کہ سعودی عرب میں سی آئی اے اسٹیشن چیف کی پیشین گوئی کے مطابق سعودی حکومت چھ ماہ کے اندر اندر سقوط پذیر ہو سکتی ہے!

ان دنوں سعودی عرب میں John C. West بطور امریکی سفیر تعینات تھا۔ یہ ساؤتھ کیرولینا کا سابقہ گورنر تھا۔ بقول اس کے "اس میں کوئی شک نہیں کہ اس رپورٹ میں ہرگز کوئی پیشین گوئی نہ تھی کہ سعودی عرب کا زوال ہوگا لیکن جو مضمون چھپا وہ اسی نوعیت کا تھا۔" اس داستان در داستان نے سعودی دارالحکومت میں انتہائی غم و غصہ کو جنم دیا اور سی آئی اے اسٹیشن چیف کو ملک بدری کے احکام ملے۔

West کو اور بھی افشاء راز کے مسائل پیش آئے۔ ایک مرتبہ ۱۹۸۰ء میں ایک سرکاری ملازم کے افشاء راز نے سعودی عرب بھیجے جانے والے ایک حساس مشن کا بیڑہ غرق کر دیا تھا اور West کے خیال میں یہ صدر اور سینیٹ کے مابین ایک نقصان دہ مناقشہ کا سبب بنا۔ یہ افشاء راز ایک مختصر سی لیکن خفیہ وہائیٹ ہاؤس میٹنگ کے سلسلے میں ہوا جہاں ویسٹ اور چند سینئر اہل کاروں نے مل کر سعودی عرب کی ہتھیار خریدنے کی کئی درخواستوں کے بارے میں فیصلے طے کیے۔ West کا کہنا تھا کہ یہ سودے امریکہ کے حق میں بیحد اہم تھے اور یہ کہ یہ بہت اہم تھا کہ بطور ایک سنجیدہ خریدار کے ان کو کسی بھی ندامت کا سامنا نہ ہو۔ جب ہم مختلف آئیٹمز پر نظر ڈال رہے تھے تو میں نے کہا کہ چاہے کچھ بھی ہو ہمیں سعودیوں کو کسی بھی آئیٹم کے بارے میں صاف انکار نہیں کرنا چاہیے۔ مجموعی انکار سے کنارہ کشی ہمارے لئے بیحد اہم ہے۔ اس گروپ نے چار درخواستیں تو منظور کر لیں لیکن دو کے بارے میں سخت اختلاف رائے تھا۔ سعودی ہمارے جدید ترین ٹیکنالوجی والے AWACS (جاسوسی معلومات جمع کرنے والے ہوائی جہاز) اور اپنے ملکیتی F-15 جنگی طیاروں کے لئے Bomb Racks خریدنا چاہتے تھے۔ اس فروخت سے اسرائیل جیسے ہمسایہ ملک میں طوفان اٹھ کھڑا ہونا قدرتی بات تھی۔ کارٹر انتظامیہ دونوں میں سے کسی بھی حکومت کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ West نے

ان دونوں مسائل کے حق پیش کیے اور گروپ کو کہا: آیئے ہم اس طرح کہیں کہ "یہ Bomb Racks تو ابھی امریکہ میں بھی مستعمل نہیں ہوئے۔ ابھی کچھ نقائص کا دور کیا جانا باقی ہے۔ ہم کو چاہئے کہ ہم سعودیوں کو بتلائیں کہ ہم ان Bomb Racks کے بارے میں فیصلہ تب کریں گے جب ہماری اپنی ضروریات پوری ہو جائیں گی اور ان کے نقائص رفع ہو جائیں گے۔ یہ وضاحت کرنے سے سعودی مان جائیں گے۔"

AWACS کے بارے میں بقول ویسٹ کے "نہ جانے ماندن نہ پائے رفتم" والا معاملہ تھا۔ اس کی پیشین گوئی تھی کہ اگر امریکہ پھر وہی کام شروع کر دے جو شاہ ایران کے سقوط کے بعد والے تشویش زدہ دنوں میں کیا گیا تھا۔ یعنی سعودی مخبری کی ضروریات اپنے AWACS ہوائی جہازوں کو سعودی اڈوں سے پرواز کرا کر سعودی حکومت کو ان سے جمع شدہ معلومات مہیا کرنا تو سعودی عرب یہ جہاز خریدنے کی درخواست واپس لے لے گا۔ ویسٹ نے اس گروپ کو بتلایا کہ میں سعودیوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دوں گا کہ امریکہ یہ نئے جہاز ۱۹۸۵ء سے پہلے مہیا نہ کر سکے گا اور تب تک یہ ٹیکنالوجی فرسودہ ہو چکی ہو گی۔

West کی سفارشات مان لی گئیں کہ سعودیوں کو چار غیر متنازعہ آئیٹم فروخت کر دی جائیں گی اور بقیہ دو کے بارے میں التواء کی وجوہ ایسی بیان کی جائیں گی کہ وہ ناراض نہ ہوں۔ ویسٹ کو ہدایت کی گئی کہ وہ سعودی عرب واپسی کے بعد یہ فیصلے ذاتی طور پر بتلائے' لیکن اس مرتبہ بھی ایک حساس اطلاع کا افشاء توڑ مروڑ کر کیا گیا۔ بقول ویسٹ کے "جس دن میں واپس روانہ ہوا عین اسی دن نیویارک ٹائمز نے ایک اسٹوری شائع کی اور عنوان رکھا کہ کارٹر نے ہتھیاروں کی سعودی درخواست رد کر دی۔ دوسری نیوز سروسوں نے رپورٹ دی کہ وہائٹ ہاؤس کے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں سعودی درخواست کو نامنظور کر دیا گیا اور کئی دنوں کی بحث و مباحثہ کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ویسٹ کو کہا جائے کہ وہ سیدھا سادھا نہ کہہ دے۔ جب میں سعودی عرب پہنچا' مجھے اس افشاء راز کا بالکل علم نہیں تھا۔ مجھے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق سعودی حکام سے ملاقات کرنی تھی۔ یہ نیوز اسٹوری جہاز سے اترتے ہی میرے منہ پر ماری گئی' میرے لئے یہ بیحد مشکل مرحلہ تھا۔"

The Times اسٹوری نے وہی منفی جواب اکھڑ پن سے چھاپ دیا تھا جو ویسٹ نے کہا تھا کہ کسی بھی قیمت پر نہ کیا جائے۔ "اس سے میری سفارتی کوششوں پر پانی پھر گیا۔" ویسٹ کو علم نہ

ہوسکا کہ یہ نقصان وہ رپورٹ اخبارات کو حاصل کہاں سے ہوئی لیکن اس کے دستاویزات تحریری طور پر تیار کئے گئے تھے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ کہانی جان بوجھ کر توڑ مروڑ کر کسی ایسے شخص نے افشاء کی جو "اس بات پر تلا ہوا تھا کہ امریکہ سعودی تعلقات سنور نے نہ پائیں۔"

چند ماہ بعد کارٹر انتظامیہ نے سعودی عرب میں AWACS کی اڑانیں پھر شروع کر دیں' لیکن ان شائع شدہ سرخیوں کے زیر اثر سعودی حکام نے امریکہ میں ایک تعلقات عامہ کی مہم شروع کی جو دو سال بعد سینیٹ میں ایک زبردست مباحثے کا سبب بنی۔ ویسٹ کا خیال ہے کہ اگر یہ افشاء راز نہ ہوتا تو سعودی کارٹر انتظامیہ کا فیصلہ مان لیتے اور AWACS کا قضیہ کھڑا نہ ہوتا۔ اس صورت میں امریکی ٹیکس دہندگان کو اسرائیل کو مزید 1.2 بلین ڈالر کی امداد نہ دینی پڑتی جو اسرائیلی لابی نے بطور ہرجانہ مانگی' جب سینیٹ میں ان کو AWACS کے ووٹ پر شکست اٹھانی پڑی۔

ویسٹ کا کہنا تھا کہ اسرائیل کو راز افشاء کر دینا اس قدر عام تھا کہ اس نے ذرائع معلومات پر سخت قدغن عائد کی تھی۔ "میں کسی بھی تار میں ایسی کوئی بات درج نہ کرتا جو اسرائیل پر نکتہ چینی نظر آئے' اس کے باوجود اندرونی جاسوسی کی وجہ سے اسرائیلی حکومت سے کچھ بھی پوشیدہ نہ رہتا۔ واشنگٹن اطلاع پہنچنے سے پیشتر ہی اسرائیلیوں کو تقریباً ہر بات کا علم ہو جاتا تھا۔ یہ بات میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ ویسٹ کا کہنا تھا کہ اگر اسرائیل کے بارے میں کوئی ایسی اطلاع دینی ہوتی جو نکتہ چینی کے زمرہ میں آتی تو وہ انتہائی خفیہ تار لکھنے کی بہ نسبت ایک عام ٹیلیفون پر کہہ دینا بہتر سمجھتا تھا۔

لابی کے ساتھ ویسٹ کا مسئلہ اس کے سفارتی سروس سے چلے جانے کے بعد بھی نہ نپٹا۔ ۱۹۸۱ء میں اپنا عدہ چھوڑنے سے پہلے اس نے جدہ میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ اس کے عرصہ سفارت میں اس کے لئے مشکل ترین سوال جو درپیش آیا وہ یہ تھا کہ وہ بطور سفیر اس بات کی وضاحت کرے کہ امریکہ .P.L.O مذاکرات کی اجازت کیوں نہیں ہے؟

جب ویسٹ نجی زندگی کو واپس لوٹا تو اس معمولی سے تبصرے نے قضیہ کھڑا کر دیا۔ جب اسے ساؤتھ کیرولینا یونیورسٹی میں بطور ایک ممتاز پروفیسر برائے مطالعہ مشرق وسطیٰ مقرر کیا گیا تو وہاں کے یہودیوں نے سینیٹر Hyman Rubin کی قیادت میں سخت مخالفت شروع کر دی۔ بقول ویسٹ اس گروہ نے اسے متعصب قرار دے کر یونیورسٹی کے انتظام میں اس قدر خلل ڈالا کہ اس کی تقرری کا اعلان سال بھر کی تاخیر کے بعد ہوا۔ جب ویسٹ کو احتجاج کا علم ہوا تو اس نے Rubin سے کہا کہ وہ

اس گروپ کے ساتھ اس کی ایک ملاقات کا بندوبست کرے۔ اس کے نتیجے میں اس سابقہ سفیر (جو اب پروفیسر تھا) اور ۲۰ نکتہ چینیوں کے درمیان دو گھنٹے کا بے لاگ تبادلہ خیالات ہوا۔ اس کے بعد یہ قضیہ دب گیا اور اس نے اپنے عہدے پر کام شروع کر دیا۔

۱۹۸۳ء میں اسرائیلی سفارت خانے نے خود ایک افشاء راز کا اہتمام کیا لیکن اپنا تعلق خفیہ رکھا۔ اس سے اردن میں قائم کی جانے والی سریع الحرکت فوج کے لئے امریکی امداد کا راستہ مؤثر طریقے سے بند کر دیا گیا۔ وہائیٹ ہاؤس ذاتی طور پر سوچ رہا تھا کہ اردن میں امریکی امداد سے ایک ایسا فضائی دستہ تیار کیا جائے جو بوقت ضرورت کسی بھی ہمسایہ عرب ملک کو خطرہ کی صورت میں فوری امداد مہیا کر سکے۔ وہائیٹ ہاؤس کے نمائندے کا کہنا تھا:

> "جب ایرانی بحران کے دوران بحرین والوں نے مدد مانگی تو اردن مدد دینے کی خواہش رکھنے کے باوجود وہاں مدد پہنچانے پر قادر نہ تھا۔ اردن میں فوج کا قیام ایک معقول تجویز تھی۔ عربوں کو اپنے علاقے کے دفاع کے قابل ہونا چاہئے۔ خلیج فارس سے سریع الحرکت فوجی دستے کے آنے کے بجائے ان کو خود یہ کام کرنا چاہئے۔ بہتر تو یہی ہے کہ مسلمان ہی اسلامی علاقے کا دفاع کریں نہ کہ امریکی لونڈے۔"

اردن میں سابق سفیر Dean Brown کا کہنا تھا کہ یہ تجویز خلیج کے چھوٹے ممالک کے لئے خدائی تحفہ ہوتی۔ اردن کو صرف C-130 مال بردار طیارے درکار تھے تاکہ وہ ہلکے ہتھیاروں کو ہوائی جہاز سے لے جا سکے۔

پہلے تو اسرائیل نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ Moshe Arens جو ان دنوں امریکہ میں اسرائیل کا سفیر تھا' اس تجویز کو سن کر خاموش رہا۔ اس پراجیکٹ کے ساتھ منسلک ایک اہل کار کا کہنا تھا کہ ہم نے Arens کو بتلایا تھا کہ ہم اسرائیلی مفاد پر نگاہ رکھیں گے' لیکن عملدرآمد شروع کر دیں گے ایسے طریقے سے کہ اسرائیل کو زک نہ پہنچے۔ اسرائیل کی جانب سے الخاموشی کو نیم رضا سمجھ لیا گیا چنانچہ کانگریس کی سراغ رساں کمیٹی سے اجازت حاصل کر کے ریگن انتظامیہ نے خفیہ مذاکرات شروع کر دئیے۔ جب Arens نے اسرائیل واپس جا کر بطور وزیر دفاع عہدہ سنبھالا تو یہ تجویز مشکلات کا شکار ہونی شروع ہو گئی۔ جب نئے سفیر Meir Rossene کو سکریٹری آف اسٹیٹ Shultz نے اس تجویز کے سلسلے میں ترقی کے بارے میں آگاہ کیا تو اس نے فوراً اعتراض کیا۔ اسرائیلی سفارت خانہ نے

ایک اسرائیلی ریڈیو اسٹیشن کے آپریٹر کو اس کی بھنک ڈال دی اور اسے کہا کہ وہ پوری کہانی جاننے کے لئے House Appropriation Sub Committee کے چیئرمین کانگریس ممبر Clearance Long سے رابطہ کرے۔ یہ ذیلی کمیٹی اسرائیل کو دی جانے والی امداد طے کرتی ہے۔ لانگ نے تعاون کیا اور اسرائیلی ریڈیو نے یہ اسٹوری نشر کر دی۔ ادھر اسرائیل میں مناقشہ اٹھ کھڑا ہوا اور ادھر AIPAC اکھاڑے میں کود پڑی۔ جب یہ الم نشرح ہو گیا تو شاہ حسین نے بھی دامن کھینچ لیا کیونکہ اسے بھی امریکن کٹھ پتلی کا کردار پسند نہ تھا۔ اس وہائیٹ ہاؤس اہل کار کا کہنا تھا کہ اس کے ساتھی اس بات کے قائل تھے کہ یہ سب افشاء راز اسرائیلی سفارت خانے نے نہایت احتیاط و ہوشیاری سے جان بوجھ کر کیا۔ اس کے لئے Arens کے واشنگٹن سے جانے کے وقت تک تاخیر کی گئی۔ یہ کیرم شاٹ تھا جو اسرائیل ریڈیو تک Doc. Long سے منعکس ہو کر پہنچا تھا اور ایسے طریقے سے کہ اس کا منبع یعنی لگانے والا تلاش کرتے کرتے آپ اسرائیلی سفارت خانے پر انگشت نمائی نہ کر سکیں۔ امریکی سفیر Mr. Brown نے اسرائیلیوں کے اس افشاء راز کو پر مقصد قرار دیا۔

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ چھلنی کی طرح ٹپکتا ہے

اسی طرح کے ایک افشاء راز نے ہمارے شام میں متعین سفیر Talcott Seelye کو ۱۹۸۱ء میں بڑی مصیبت میں مبتلا کیا۔ ایوان نمائندگان میں خارجہ امور کمیٹی کے ایک ممبر اسٹیفن سولارز نے ان دنوں ایک قرارداد پیش کی تھی۔ سولارز نیویارک کی نمائندگی کرتا تھا جہاں پر شامی یہودیوں کی ایک کثیر تعداد آباد ہے۔ اس قرارداد میں شام پر نکتہ چینی کی گئی تھی کہ وہ مزید یہودیوں کو ہجرت کی اجازت کیوں نہیں دے رہا؟ ہمارے سفیر نے اس موضوع پر ایک خفیہ تار اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو بھجوائی۔ اس تار میں Seelye نے خبردار کیا کہ اس قرارداد کی منظوری شام کے تعاون میں کمی کا باعث ہوگی' زیادتی کا نہیں۔ Seelye کا کہنا تھا کہ میری تار میں درج تھا کہ اگر سولارز یہودیوں کو شام سے نکل آنے میں مدد کرنے کے بارے میں مخلص ہے تو یہ قرارداد پیش نہ کرے۔ لیکن اگر وہ محض اپنے ووٹروں میں نمبر بنانا چاہتا ہے تو کچھ بھی اور کر لے یہ تار سولارز کو پہنچا دی گئی جس نے سکریٹری آف اسٹیٹ Vance سے یہ مطالبہ کیا کہ Seelye کو وہاں سے فوراً تبدیل کر دیا جائے۔ وانس اس افشاء راز پر بہت سیخ پا ہوا۔ Seelye کا تو کچھ نہ بگڑا لیکن اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اس قرارداد کو نامنظور کروانے کے لئے

کچھ نہ کیا اور جب اس پر رائے شماری ہوئی تو صرف ایک ووٹ نفی میں سنا گیا۔

سولارز کو یہ تار افشاء کر کے پہنچانے والا Ed. Sanders تھا۔ وہ کارٹر کا یہودی فرقے کے لئے سرکاری رابطہ کار تھا اور اس کے دفاتر وہائیٹ ہاؤس اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں دونوں جگہ تھے۔ اسے کسی قسم کی سزا نہ دی گئی۔ صرف ایک مختلف عہدہ پر اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔

اس افشاء راز نے ان سفارت کاروں کے ڈر کی تصدیق کر دی جو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں یہودی لیزان آفس (یا رابطہ دفتر) کے سخت مخالف تھے۔ اس زمانے کے ایک سفارت کار کا کہنا تھا کہ Sanders نہایت نفیس انسان تھا اور پھر صدر کی درخواست پر وہ اس عہدہ پر لگا تھا' لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ اس جگہ جو کام ہوتا ہے وہ اس بلڈنگ سے باہر کسی شخص کو نہ پہنچنا چاہئے۔

ایک عالم فاضل کیریئر مشرق وسطیٰ اسپیشلسٹ Harold Saunder جو کبھی کبھار عربوں کے تفکر کی نمائندگی کر کے مصیبت مول لیتا تھا' ان دنوں اسسٹنٹ سکریٹری آف اسٹیٹ تھا۔ اس نے وانس کو ان الفاظ میں اپنے احساسات سے آگاہ کیا "کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ ہمارے اقتصادی بیورو کے Tariff Office میں U.S. Steel کا کوئی بندہ بیٹھے؟" وانس نے بھی اس بندوبست کی مخالفت کی لیکن یہ دفتر پھر بھی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں کئی ماہ تک رہا۔

Seelye نے اس افشاءراز کے طوفان کی ایک معمولی سی وجہ بیان کی' یعنی فوٹو کاپی مشینوں کی بہتات۔ اس کا کہنا تھا کہ شام میں تعیناتی کے دوران اس نے اس مفروضہ پر عمل کیا کہ وہ جو بھی پیغام واشنگٹن بھجوائے گا وہ اسرائیلیوں کے پاس پہنچ جائے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ چاہے ہم کتنا ہی کنٹرول کیوں نہ کریں کوئی نہ کوئی دفتر اپنے اندرونی استعمال کے لئے مزید کاپیاں بنا ہی لے گا۔ اس کا کنٹرول کرنا بیحد دشوار ہے۔ جہاں دیدہ سرکاری عمال کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں زیادہ الزام سیاسی بنیاد پر اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں اہم عہدوں پر مقرر کردہ سفارت کاروں پر آتا ہے نہ کہ کیریئر سفارت کاروں پر۔

ریگن انتظامیہ کے شروع کے چند ماہ میں قومی سلامتی کے مشیر Allen Richard کو اسرائیلی مفاد کا پرجوش حامی اور ایک قسم کا کلیرنگ افسر سمجھا جاتا تھا جو کلیدی عہدوں پر ایسے افراد کی تقرری کی حمایت کرتا تھا جو اسرائیلی حکومت کو گوارا ہوں۔ Allen کی حکومت سے رخصتی کے بعد ایک سینئر اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ افسر کا کہنا تھا کہ اس کے بدلے میں کسی کو بھی مقرر کرنے کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ ہر اہم دفتر میں اسرائیل نواز افراد جنہیں ہم ہرکارے کہتے ہیں موجود ہیں۔

ایک اور سینئر اہل کار جواب چھٹی پر ہے' کہتا ہے "ان افشاء راز واقعات کا سرا کبھی بھی پیشہ ور خارجہ امور کے افسر سے نہیں جڑتا۔ میرا تجربہ تو یہی ہے کہ ایسے افشاء راز وہی اسٹاف ممبر کرتے ہیں جن کی تقرری سیاسی بنیادوں پر کی جاتی ہے اور ہر انتظامیہ ایسی بہت ساری تقرریاں کرتی ہے۔ یہ ہر جگہ نظر آتے ہیں' یہ بڑبولے اور شوقیہ افراد ساتویں منزل پر جہاں سینئر اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اہل کاروں کے دفاتر ہیں اور وہاں کے پالیسی ساز اداروں کے علاوہ وہائیٹ ہاؤس میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس سے ان کی رسائی حساس مواد تک آسانی ہوجاتی ہے۔" اس کا کہنا تھا کہ بدقسمتی سے ان میں ڈسپلن کا فقدان ہوتا ہے اور ان کا احساس وفاداری پیشہ ور افراد جیسا نہیں ہوتا۔

کچھ افشاء راز کانگریس ممبران اور ان کے عملہ سے بھی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ایک سابقہ اہل کار محکمہ دفاع کا کہنا تھا کہ کیپٹل ہل پر کچھ ایسے افراد بھی ہیں جن کو پنٹاگون اسرائیلی پرنالہ سمجھتا ہے۔ اس میں تو کچھ شک ہی نہیں۔ کئی مرتبہ ہمیں کانگریس ممبران یا سینیٹر حضرات سے خفیہ معلومات حاصل کرنے کی درخواستیں موصول ہوتی ہیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ معلومات وہ اپنی ذات کی بہتری کے لئے نہیں مانگ رہے' بلکہ یہ اسرائیل کو مہیا کی جائیں گی۔ مثال کے طور پر ایک کانگریس ممبر کا خط آئے گا کہ اس نے سنا ہے کہ ہم نے اسرائیل اور اس کے عرب ہمسایوں کی فوجی قوت کا موازنہ کرنے کے معلومات مرتب کی ہیں۔ اسے اس کی ایک نقل درکار ہے۔ ہم جواباً کہتے ہیں کہ ہم نقل تو مہیا نہیں کرسکتے لیکن زبانی بریفنگ دے سکتے ہیں۔ اس کا گھڑا گھڑایا جواب ہوتا کہ معاف کیجئے۔ ہمیں زبانی بریفنگ میں کوئی دلچسپی نہیں۔

اسٹیفن برائن کا معاملہ

ان تمام ذرائع کی رائے میں اسرائیلی اثر و نفوذ سب سے زیادہ ریگن انتظامیہ کے دنوں میں تھا۔ ۱۹۸۴ء میں انتظامیہ میں ہر طرف اور خصوصاً محکمہ دفاع میں ایسے لوگ ملازم رکھے گئے جن کے بارے میں یہ معلوم تھا کہ ان کے اسرائیل سے بہت قریبی روابط ہیں۔ محکمہ دفاع وہ جگہ ہے جہاں عام طور پر خفیہ ترین ہتھیاروں کی ٹکنالوجی اور دوسری حساس معلومات سے نپٹا جاتا ہے۔

اس بیورو کریسی کا سربراہ Fred Ikle ہے جو بین الاقوامی سلامتی کے لئے دفاع کا انڈر سکریٹری ہے۔ اس شعبہ میں تین اہم ترین شخصیات Richard Parle جو کہ اس کا نائب برائے بین الاقوامی

سلامتی پالیسی' Stephen Bryen جو کہ Parle کا Principal Deputy جس کا خاص شعبہ ٹیکنالوجی کی منتقلی تھا اور Noel Koch جو کہ Richard Armitage کا پرنسپل ڈپٹی تھا۔ Armitage اسسٹنٹ سکریٹری برائے بین الاقوامی سلامتی امور تھا۔ Koch پیشتر ازیں امریکی صیہونی تنظیم کا ملازم تھا۔ Perle اس سے پہلے واشنگٹن کے ڈیموکریٹ سینیٹر Henry Jackson کے اسٹاف میں شامل تھا جو کہ اسرائیل کے پر جوش حامی ہونے کی شہرت رکھتا تھا۔ Jackson کے بارے میں عام خیال تھا کہ وہ اسرائیلی پرنالہ برائے حصول اطلاعات ہے Stephen Bryen ان سب میں سے گہرے ترین بادلوں کی اوٹ سے انتظامیہ میں آیا تھا۔

برائن کا دفتر ایک بین الایجنسی رابطہ دفتر ہے جو کہ "National Disclosure Policy Commission" کہلاتا ہے جس کا کام ہتھیاروں کے سسٹم کی ٹکنالوجی کی منتقلی کے معاملات منظور کرتا ہے۔ اس کمیشن کے ممبران میں اسسٹنٹ قومی سلامتی کونسل' سراغ رساں اداروں کے علاوہ محکمہ دفاع کے نمائندے بھی شامل ہوتے تھے۔ ۱۹۷۸ء میں برائن پر یہ کھلا الزام لگایا گیا کہ وہ سعودی عرب کے ہوائی اڈوں کے بارے میں ایک حساس ترین دستاویز اسرائیلی اہل کاروں کے ایک دورہ کرنے والے گروپ کو مہیا کر رہا تھا۔

یہ الزام مائیکل کی رپورٹ سے پیدا ہوا۔ مائیکل ایک صحافی اور قومی تنظیم برائے امریکن عرب کا سابقہ ملازم تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اس نے خود سنا ہے کہ برائن ایک واشنگٹن ریستوران میں ناشتہ کے دوران یہ پیشکش کر رہا تھا۔ مائیکل فوراً FBI کے Lie Detector ٹیسٹ پر رضامند ہو گیا تھا۔ ان دنوں برائن سینٹ کی امور خارجہ کمیٹی کے اسٹاف میں شامل تھا۔ ایک سینئر کیریئر ڈپلومیٹ (سفارت کار) نے یہ مسئلہ جو کہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے اہل کاروں کو درپیش تھا' اس طرح بیان کیا "جب بھی برائن کمرے میں ہوتا تو ہمیں ہمیشہ انتہائی احتیاط سے کام لینا پڑتا۔" اس مناقشے کے دوران برائن کو کمیٹی سے معطل کر دیا گیا لیکن بعد ازاں پھر بحال کر دیا گیا۔ کچھ مدت بعد وہ اس کمیٹی کا عہدہ چھوڑ کر Jewish Inst. of National Security Affairs (JINSA) کا Executive Director بن گیا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ بقول ہفت روزہ The Jewish Week کے اس مقصد سے قائم کیا گیا تھا کہ لوگوں کو قائل کیا جائے کہ اسرائیل اور امریکہ کی سلامتی آپس میں مربوط ہے۔ جب برائن کا تقرر محکمہ دفاع میں ایک عہدہ پر ہوا تو JINSA میں اس کی بیوی Shoshona نے جانشینی کی۔

نو ماہ بعد تفتیشی اٹارنی نے یہ سفارش کی کہ ایک گرینڈ جیوری تشکیل دی جائے جو برائن کے خلاف شہادت کا جائزہ لے۔ محکمہ انصاف کے مطابق کئی گواہوں نے اس کے اسرائیلی رابطوں کی تصدیق کی۔ ۲۶ر جنوری ۱۹۷۹ء کے ایک دستاویز میں محکمہ انصاف کا کہنا تھا کہ جو سوال جواب طلب ہیں اب تک ان میں برائن کا (ا) اسرائیل کے لئے خفیہ معلومات جمع کرنا۔ (ب) اسرائیل کے تسلیم شدہ ایجنٹ کے طور پر کام کرنا اور (ج) اس کے بارے میں جھوٹ بولنا شامل ہیں۔" محکمہ انصاف نے دو سال اس شکایت کے مطالعے میں لگائے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد بھی کہ برائن کے روابط اسرائیل سے بیحد گہرے ہیں' اس کے خلاف کوئی فرد جرم عائد نہ کی گئی اور ۱۹۷۹ء کے اواخر میں فائل داخل دفتر کر دی گئی۔ ۱۹۸۱ء کے اوائل میں اسے پنٹاگون میں Richard Perle کے چیف ڈپٹی کے طور پر تعینات کیا گیا اور وہ تا حال اس حساس عہدہ پر آج بھی موجود ہے۔

Perle خود بھی ایک اسرائیل کے متعلقہ مناقشے کا موضوع رہ چکا ہے۔ ۱۹۷۰ء کی ایک ایف. بی. آئی. کی ٹیپ شدہ گفتگو میں Perle کی اسرائیلی سفارت خانے میں کسی کے ساتھ خفیہ معاملات پر گفتگو کرنے کی رپورٹ شامل تھی۔ ۱۹۸۳ء میں بھی اس پر کافی لے دے ہوئی جب یہ خبر اخبارات میں چھپی کہ وہ ایک اسرائیلی ہتھیاروں کی کمپنی کی نمائندگی کرنے کے عوض بھاری رقوم حاصل کر چکا ہے۔ Perle نے رقم لینے سے تو انکار نہ کیا البتہ یہ بہانہ بنایا کہ یہ ادائیگی اس عرصے کی خدمات کے عوض تھی جو کہ وہ دو سرکاری عہدوں کے درمیانی وقفہ میں اس فرم کے لئے انجام دے چکا تھا اور یہ کہ اس طرح وہ عہدہ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔

ان دو جھگڑوں کی وجہ سے ریگن انتظامیہ میں ان کو ایسے عہدے دیئے گئے تھے کہ جس کی وجہ سے یہ امید تھی کہ ان کا واسطہ اسرائیل متعلق معاملات سے نہ پڑے گا۔ لیکن اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایک مبصر کے موجب ایسا نہ ہو سکا۔ ٹیکنالوجی کی منتقلی کے بارے میں اکثر ایسے حساس معاملات جو اسرائیل کو متاثر کرتے ہوں وہ انہی دونوں Perle اور Bryen کے دفاتر میں طے پاتے تھے۔

ان تفتیشوں کے باوجود برائن کو Security Classification (محکمہ دفاع) کا اعلیٰ ترین درجہ حاصل ہے۔ یہ ایک انتہائی خفیہ Code-World-Classification ہے جس سے اسے کسی بھی سرکاری دستاویز تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔ تقریباً لامحدود' اس رسائی کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ عہدیدار کا کہنا ہے کہ Classification کے باعث نہ صرف برائن

کو اس ٹیکنالوجی تک پہنچ ہے جو امریکہ کے پاس اس وقت موجود ہے بلکہ اسے مستقبل میں خفیہ تحقیق اور ترقی سے جو حاصل ہوتا ہے اس کا بھی علم ہوتا ہے۔

کانگریس سے میں نپٹ لوں گا

ایڈمرل تھامس مورر اسرائیلی لابی کی طاقت بتانے کے لیے اپنے ان دنوں کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے جب وہ جائنٹ چیف آف سٹاف کا چیئرمین تھا۔ ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیلی سفارت خانے کا دفاعی اتاشی Mordecai Gur جو بعد میں اسرائیلی افواج کا کمانڈر ان چیف بنا' مورر کے پاس آیا اور یہ مطالبہ کیا کہ امریکہ اسرائیل کو وہ جہاز دے جن پر فضا سے زمین پر مار کرنے والے ٹینک شکن میزائل Maverick نصب تھے۔ اس وقت امریکہ کے پاس ایسے جہازوں کا صرف ایک ہی اسکواڈرن تھا۔ مورر نے جواباً کہا:

> "ہم آپ کو یہ جہاز مہیا نہیں کر سکتے۔ ہمارے اپنے پاس صرف ایک ہی اسکواڈرن ہے' علاوہ ازیں ہم نے کانگریس کے سامنے یہ گواہی دی ہے کہ ہمیں اس ہتھیار کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اپنا یہ اکلوتا اسکواڈرن آپ کو دے دیں تو کانگریس تو ہماری جان کو آجائے گی۔"

مورر نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا: تمہیں معلوم ہے اس نے مجھے کیا کہا؟ Gur نے مجھے کہا "تم مجھے یہ جہاز دلا دو' کانگریس سے میں نپٹ لوں گا۔" مورر نے یہاں وقفہ دیا اور پھر کہا "اس نے ایسا ہی کہا"...... امریکہ کا اکلوتا اسکواڈرن جس میں Maverick نصب تھیں' اسرائیل بھجوا دیا گیا۔

Univ. Centre for Strategic and International Studies of Georgetown کے سینئر قونصلر کے طور پر اپنے واشنگٹن کے دفتر میں بیان دیتے ہوئے ایڈمرل مورر نے کہا کہ میں نے تو اس بات کی سخت مخالفت کی' لیکن صدارتی سطح پر سیاسی مصلحت کے تحت میرے فیصلے کو رد کر دیا گیا۔ اس کے کہنے کے مطابق اس وقت صدر رچرڈ نکسن واٹر گیٹ قضیے میں الجھا ہوا تھا۔ لیکن بقول اس کے "میں نے کسی بھی صدر کو' چاہے وہ کوئی بھی تھا اس لابی (اسرائیلی) کا سامنا کرتے نہیں دیکھا۔ یہ ہماری سوچ سے ماوراء ہے' وہ ہمیشہ جو چاہتے ہیں وہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اسرائیلیوں کو ہمیشہ یہ علم ہوتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں تو ایسی حالت پر پہنچ گیا تھا کہ کچھ بھی احاطہ تحریر میں نہیں لاتا تھا۔"

"اگر امریکی عوام کو یہ علم ہوجائے کہ ان لوگوں کی گرفت ہماری حکومت پر کس قدر مضبوط ہے تو وہ مسلح بغاوت پر اتر آئیں۔ ہمارے شہریوں کو تو علم ہی نہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟"

ایک اور موقع پر اس لابی کے دباؤ کے خوف نے ایک اور بنیادی فیصلہ کیا کہ اسرائیل کو مزید فوجی ساز و سامان بیچنا جاری رکھا جائے کہ انہیں جان بوجھ کر طاق نسیاں پر رکھوادیا۔ مختلف پیشہ وروں کا اس پر اتفاق تھا کہ ۱۹۷۵ء سے اسرائیل کے پاس کافی فوجی قوت موجود ہے۔ تب تک اسے اس قدر قوت حاصل ہوچکی تھی کہ وہ اپنے علاقے میں ایک غالب قوت بن چکا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۶ء میں Mid. East Arms Transfer Panel نے سکریٹری دفاع Donald Rumsfeld کو ایک رپورٹ دی کہ اسرائیل کو مزید ہتھیار فروخت کرنے کی ضرورت نہیں' لیکن اس نے یہ رپورٹ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو نہیں بھیجی۔ یہ فورڈ انتظامیہ کے آخری ایام تھے اور اس دستاویز کا بطور سرکاری رپورٹ وہاں جانا اور افشاء ہونا اس لابی کی نگاہ میں ڈیموکریٹ کے حق میں زیادہ سازگار ہوتا۔

یہودی گروپوں سے اکثر امریکہ میں سکریٹری آف اسٹیٹ اور دیگر اہل کاروں کو موم کرنے کا کام لیا جاتا ہے' خصوصاً جب اسرائیل کے وزیر اعظم کی آمد ہو۔ محکمہ دفاع کے ایک سینئر اہل کار کا کہنا تھا کہ اسرائیل نے ہمیشہ ایک لمبی شاپنگ لسٹ تیار رکھی ہوتی ہے جو وزیر اعظم پیش کرے گا۔ ہم لوگ یہ طے کرتے تھے کہ کون سی آئیٹموں پر بحث و مباحثہ کرنا سود مند ہے اور کن پر نہیں۔ ہم پیشگی معاملات طے کر کے رکھنا چاہتے ہیں۔" یہ خوف ہمیشہ دامن گیر رہتا کہ وزیر اعظم ان میں سے کوئی معاملہ سیدھا صدر کے پاس ہی نہ لے جائے اور کوشش یہ کی جاتی تھی کہ ایجنڈے پر ہر ممکن شے جو طے ہوسکے وہ کردی جائے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم یہ طے کریں کہ ہمیں یہ فضول قسم کے الیکٹرونکس بکس کا معاملہ صدر تک نہ پہنچنے دینا چاہئے اور ہم اس کو پیشگی ہی منظور کر چھوڑتے۔

ایک ایسے ہی موقع پر صدر کارٹر کے یہودی معاملات کے مشیر Saunders نے قومی سلامتی کونسل کے دفتر میں یہ شکایت پہنچائی کہ مجھے ALQ-95J کے بارے میں یہودی کانگریس ممبران سے لگاتار شکایتیں موصول ہو رہی ہیں' یہ کیا ہیں؟ ہم کیوں اس کے بارے میں اس قدر ترش رو ہو رہے ہیں؟ کیا یہ ہمیں اسرائیل کو دے نہیں دینی چاہئے؟ صدر کو اس معاملے میں کافی دشنام طرازی کا سامنا ہے کیونکہ پنٹاگون اس کو حوالے نہیں کر رہا۔ یہ ایک اعلیٰ تکنیکی Radar Jamming ہتھیار تھا اور جلد ہی اسے اسرائیل بھجوادینا طے پاگیا۔

کارٹر کے ایک اعلیٰ ترقی یافتہ میزائل اسرائیل کو مہیا کرنے سے پیشتر یہودیوں کے گروہ یکے بعد دیگرے بطور جلوس آتے رہے اور ایک ہی بات کی رٹ لگاتے تھے کہ:

"براہ مہربانی ہمیں یہ سمجھائیں کہ پنٹاگون کیوں AIM-9L میزائل اسرائیل کو فروخت کرنے پر تیار نہیں؟ آپ یہ نہیں جانتے کہ اس کا مطلب کیا ہوگا؟ یہ میزائل ضروری ہے تاکہ اسرائیل MIG-21 پر نصب شدہ مخالف میزائل کو نشانہ بنا سکے جو Eight Ball 935 کہلاتی ہے۔"

اس طرح کے دباؤ کا اثر بیان کرتے ہوئے ایک سابقہ دفاعی اہل کار جس کا تعلق سلامتی کے معاملات سے ہے' کہتا ہے "جب ہمیں اپنی پوزیشن روزانہ اور ہفتہ وار لگاتار بتانی پڑے ان یہودی گروپوں کو' کبھی ٹیکساس سے' کبھی شکاگو سے اور کبھی کہیں اور سے تو سمجھ آجاتا ہے کہ ہم کس مخالفت کا سامنا کر رہے ہیں۔ یہ لوگ ملک کے مختلف علاقوں سے آتے ہیں لیکن ہر ایک کے پاس وہی ایک اطلاع' وہی سوالات اور وہی نکتہ چینی ہوتی ہے۔ انہیں یہ تک معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے نجی محفلوں میں کیا کہا؟ وہ کہیں گے کہ مسٹر اسمتھ ہمیں پتہ چلا ہے کہ انٹرایجنسی میٹنگوں میں آپ اکثر اسرائیل کو ٹکنالوجی کی منتقلی کے بارے میں شدید مخالفت کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ وہ آپ کو دفاع پر مجبور کرتے ہیں' چاہے آپ نے معتدل رویہ ہی اپنایا ہو' وہ پھر بھی آپ سے اسرائیل دشمن کے طور پر ہی برتاؤ کریں گے۔"

کیپٹل ہل پر بھی یہ یہودی گروپ یلغار کرتے ہیں۔ "ہمیں کانگریس ممبران سے خطوط ملتے ہیں کہ ہمیں وضاحت درکار ہے۔ ہمیں اپنے رائے دہندگان سے یہ سننے میں آرہا ہے کہ اسرائیل کی سلامتی کو AIM-9L میزائل پنٹاگون سے نہ ملنے کی وجہ سے خطرہ ہے۔ جناب سکریٹری صاحب! کیا آپ ہمیں اس انکار کی وجہ بتا سکتے ہیں؟"

اس طرح کا لابی پریشر ٹیکس دہندگان کے لئے کافی مہنگا پڑ سکتا ہے۔ ایک مثال تو یہ ہے کہ اس نے امریکہ کو اسرائیل سے وہ روسی ساخت اسلحہ واپس لینے سے باز رکھا جو اس نے لبنان سے قبضہ میں لیا تھا۔ ۱۹۸۲ء کے حملہ لبنان میں اسرائیل نے ٹنوں کے حساب سے وہ اسلحہ قابو کیا جو امریکہ نے حکومت لبنان کو دیا تھا۔ اس کا علم ایک انوکھے طریقے سے سال بھر بعد ہوا۔

لبنان کے ایک دورہ میں عزت مآب George Crosseley (Deltona, Florida) کو امریکن ساختہ M-16 رائفلز کے بکس دکھائے گئے کہ یہ بقول اسرائیلی حکام کے فلسطینی فوجوں سے

چھینے گئے تھے۔ Crossley نے نوٹ کیا کہ ان پر سعودیہ کا نشان تھا۔ اس نے اس کے سیریل نمبر نوٹ کر لئے۔ سعودی فوجیوں نے تو یقیناً اس لبنانی لڑائی میں حصہ نہ لیا تھا' اس پادری نے فوراً یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جو رائفلیں سعودی عرب کو امریکہ نے فروخت کی تھیں وہ انہوں نے فلسطینیوں کی فوج کو لبنان میں دے دیں اور پھر یہ اسرائیلیوں نے ان سے چھینی ہیں۔ اگر ایسا تھا تو اس امریکی قانون کی خلاف ورزی تھی جس کے تحت امریکی مہیا کردہ اسلحہ بغیر پیشگی اجازت کے کسی اور ملک کے حوالے کرنا منع تھا۔ Crossley نے اپنے ممبر کانگریس Bill Chappell Jr. کو لکھا جس نے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے وضاحت طلب کی۔ ریکارڈ کے مطالعے سے پتہ چلا کہ امریکن نے کبھی بھی M-16 رائفلیں سعودی عرب کو فروخت نہیں کیں۔ وہ ایک جرمن ساخت رائفل کو ترجیح دیتے تھے' یہ رائفلیں براہ راست لبنانی افواج کو مہیا کی گئیں تھیں۔

اندرونی قصہ اس وقت طشت ازبام ہوا جب امریکی حکومت ایک خطیر رقم خرچ کر کے لبنانی افواج کو دوبارہ مسلح کر رہی تھی۔ وہائیٹ ہاؤس کے ایک اہل کار نے اخبارات میں Crossley Affairs کی رپورٹیں پڑھ کر پنٹاگون کے متعلقہ افسر سے پوچھا کہ امریکہ یہ تمام اسلحہ اسرائیل سے واپس کیوں نہیں مانگتا جو اس نے لبنانی فوج سے چھینا ہے؟ پنٹاگون کے پاس اس تمام اسلحہ کی ایک صحیح فہرست موجود تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اسرائیلی حکومت کو اس بارے میں تعاون کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے اور اس سے امریکہ کے اخراجات میں معتد بہ کمی ہوگی۔

وہ متعلقہ افسر پھٹ پڑا "کیا آپ مذاق کر رہے ہیں؟ کیسے ممکن ہے یہ 'کون یہ مصیبت مول لے؟ میں شاید سکریٹری دفاع کی طرف سے روزانہ سو خطوط لکھتا ہوں گا۔ یہ مختلف کانگریس ممبران کو جواب کے طور پر لکھے جاتے ہیں' جو یہ شکایت کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم لوگ اسرائیل کے ساتھ بدسلوکی کیوں کر رہے ہیں؟ تم چاہتے ہو کہ میں اپنا کام بڑھا لوں اور اس طرح کے ذلیل خطوط کے جوابات لکھنے پر؟ تمہارا خیال ہے کہ میں ایسے عمل کی سفارش کروں گا جو میرے باس کے پاس آنے والی شکایتی ڈاک کو بڑھا دے؟ ہوش کے ناخن لو۔"

اسٹیٹ اور دفاع کے محکمہ کا ہر قابل ذکر اہل کار اس مفروضے کو سامنے رکھ کر کام کرتا ہے بلکہ یقین کے ساتھ کہ اسے ہفتہ میں کم از کم ایک بار ایک یہودی گروپ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک کا کہنا ہے "اس مسلسل دباؤ کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے مشرق وسطیٰ بیورو کے تعلقات

عامہ اسٹاف کا اندازہ ہے کہ ان کا ۷۵ فیصد وقت یہودی گروپوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں خرچ ہوتا ہے۔ ایگزیکٹو برانچ میں ایسے سینکڑوں گروپوں نے ملاقات کا وقت لے رکھا ہوتا ہے۔"

مشرق وسطیٰ کے بارے میں امریکی پالیسی پر اثر انداز ہونے کے خلاف اسرائیلی لابی کو ذرہ بھر مخالفت کا سامنا نہیں۔ دوسرے جو گروپ یا افراد اس لابی کے دباؤ کو متوازن بنانے میں کچھ بھی کردار ادا کر سکتے ہیں وہ اب کچھ منظم ہونا شروع ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر عرب نژاد امریکی ہیں لیکن وہ اندرونی طور پر منقسم ہیں۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا ایک سابقہ اعلیٰ عہدے دار مثال دیتے ہوئے کہتا ہے "جب کوئی گروپ اس بات کی شکایت لے کر آتا ہے کہ امریکہ اسرائیل کی ناجائز حمایت کر رہا ہے تو اکثر اس گروپ کے ارکان آپس میں الجھ پڑتے ہیں۔ ان میں سے ایک فلسطینیوں پر ساری توجہ مرکوز رکھنے پر اعتراض کرے گا تو دوسرا لبنان کے مسائل کو مرکزی حیثیت دینے پر اصرار کرے گا۔ میں خاموش بیٹھا سنتا رہتا ہوں۔ وہ پہلے سے طے کر کے نہیں آتے کہ انہیں کیا کہنا ہے؟"

Les Janaka کا تجربہ بھی ایسا ہی ہے۔ American Enterprise Institute کے منعقدہ ایک جلسہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے عرب مسائل کے ایک ہمدرد گروپ کے بارے میں کہا:

> "ان کی مشکلات بالکل عام نوعیت کی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ امریکہ کو زیادہ متوازن اور منصفانہ ہونا چاہئے یا ہم چاہتے ہیں کہ آپ فلسطینیوں میں زیادہ دلچسپی لیں۔ خاص کچھ بھی نہیں' اس کے برخلاف یہودی گروپ مخصوص مطالبات کی فہرست لے کر آتے ہیں۔ سبھی امریکی عوام خارجہ امور کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کا کھلے عام اظہار نہیں کرتے' لیکن یہودی گروپ اس بارے میں استثناء کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ تیاری کر کے آتے ہیں اور ان کی بریفنگ قابل رشک ہوتی ہے۔ وہ متحد ہو کر کام کرتے ہیں۔ نوکر شاہی کے لئے ان کو ٹرخانا آسان نہیں ہوتا۔"

حملے پہ حملہ

اس کے باوجود کہ اسرائیلی لابی جب بھی چاہے ہماری قوم کے خفیہ راز حاصل کرنے کے لئے مضبوط ترین دفاعی حصاروں کو توڑ سکتی ہے لیکن جب اس لابی کا مقصد کسی اطلاع کو راز میں رکھنا ہو تو یہی دفاعی حصار ناقابل عبور بن جاتے ہیں۔

سترہ سال کا عرصہ گزر گیا لیکن امریکن بحریہ کے ایک ریٹائرڈ افسر Jr. James M. Ennes کو اب بھی بحریہ کی تاریخ میں زمانہ امن کے دوران بدترین حادثہ کے بارے میں دستاویزات حاصل کرنے کے سلسلے میں دقت پیش آرہی ہے۔ اس تلاش میں اسے جن اطراف سے مخالفت کا سامنا ہے ان میں محکمہ دفاع' B'nai B'rith کی اینٹی ڈی فیمیشن لیگ' امریکن اسرائیل افیئرز کمیٹی (AIPAC)' اشاعت کتب کے ادارے' ذرائع ابلاغ اور اسرائیلی محکمہ خارجہ شامل ہیں۔

یہ مخالفت جو کہ اغلباً بین الاقوامی پیمانے پر مربوط کی جارہی ہے' بیحد حیرت ناک ہے کیونکہ Ennes کا مقصد ایک ایسی داستان شجاعت اور المیہ کو منظر عام پر لانا ہے جس کی امریکن تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

امریکہ اور اسرائیل کی یکے بعد دیگرے کئی حکومتوں کے لگاتار اخفاء راز کے سبب شاید ہی کسی کو یاد ہو کہ "U.S.S. Liberty" پر اسرائیلی افواج کے ۸ رجون ۱۹۶۷ء کے تباہ کن حملہ کے بعد جس میں صرف ۳۴ بحری اہل کار ہلاک اور ۱۷۱ زخمی ہوئے' یہ جہاز معجزہ نما طور پر بچالیا گیا تھا جبکہ جہاز پر اتنا نقصان ہوا کہ نہ تو انجن کام کررہا تھا نہ ہی پتوار میسر تھا اور نہ ہی کوئی ذرائع رسل ورسائل۔

Capt. William L. McGonagle اور اس کے عملہ کی جرأت آزما ہمت نے انتہائی مشکل حالات میں "S.S. Liberty" کے لئے امریکی تاریخ میں شاندار نام کمایا لیکن اس کے ڈیک آفیسر Ennes کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود اس بارے میں اندراجات بیحد مدھم رہے۔ اس نے جو

پوری کتاب "Assault on the Liberty" کے نام سے لکھی جس میں اس حملے کا بیان کیا گیا ہے وہ اشاعت کے پانچ سال بعد بھی زبردست حملے کا شکار ہے۔

یہ قصہ اور اس کے نتائج اس قدر ناقابل یقین تھے کہ ایڈمیرل تھامس مورر جو جائینٹ چیف آف اسٹاف کا چیئرمین بن گیا' اس حملے کا اگلے ماہ کہتا ہے کہ یہ حقیقت افسانوی لگتی تھی۔ کسی کو یقین نہ آتا تھا۔

کچھ حقیقتیں بالکل واضح تھیں۔ یہ حملہ ایک حادثہ ہرگز نہ تھا۔ "Liberty" کو دن دہاڑے اسرائیلی فوج نے نشانہ بنایا جبکہ انہیں اس جہاز کی شناخت معلوم تھی۔ یہ ایک جاسوسی اطلاعات جمع کرنے والا جہاز تھا' جس پر دفاع کے لئے صرف مشین گنیں نصب تھیں۔ اس میں جنگی صلاحیت کا فقدان تھا' اس کا امریکی جھنڈا تیز ہوا کی وجہ سے صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ حملہ کوئی دو گھنٹے کے دورانیہ میں کیا گیا۔ پہلے بذریعہ ہوائی جہاز اور بعد ازیں تارپیڈو کشتی سے۔ ان حملوں کی شدت دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا قطعاً دشوار نہ تھا کہ اسرائیلی اس جہاز اور اس کے سارے عملے کو نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے لیکن اس سلسلے میں عوام کو بالکل اندھیرے میں رکھا گیا۔ امریکن عوام تک اس حملے کی خبر پہنچنے سے پیشتر ہی امریکی حکومتی اہل کار اس کا ذکر ایسے لہجے میں کرنے لگے جو اسرائیل کے لئے اطمینان بخش ہو۔

AIPAC نے فوراً ممبران کانگریس کے ذریعے اس معاملہ کی پیش بندی شروع کر دی۔ امریکہ کے صدر L.B. Johnson کے حکم پر اتنا مکمل پردہ پوشی کا اہتمام کیا گیا کہ اس کے عہدہ چھوڑنے کے ۱۶ سال بعد بھی یہ قصہ عوام کی نظر سے اوجھل ہی رہا اور جو افراد اس واقعہ میں زخمی یا فوت ہوئے ان کی بھی کوئی قدر نہ ہوئی۔

حملے والے دن کا آغاز بالکل معمول کے مطابق تھا' یعنی مشرقی بحیرہ روم میں اس جہاز نے آہستہ سے مشرق کی جانب کچھ سفر کیا اور پھر سینائی کے ساتھ ساتھ مغرب کی جانب تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر گیا۔ براعظم پر اسرائیلی ۱۹ سال کے اندر تیسری عرب اسرائیل جنگ میں تباہ کن فتوحات حاصل کر رہے تھے۔ اسرائیلی چیف آف اسٹاف Yitzhak Rabin نے یہ اعلان کرتے ہوئے کہ اسرائیل نے پورے جزیرہ سینائی پر قبضہ کر لیا ہے اور خلیج طیران کا محاصرہ ختم کر دیا ہے۔ یہ کہا کہ ''مصریوں کو شکست ہو چکی ہے'' مشرقی محاذ پر انہوں نے اردن کی افواج پر فتح پالی تھی اور مغربی کنارے کا بیشتر حصہ ان کے قبضہ میں تھا۔

علی الصباح ۶ بجے ایک ہوائی جہاز جسے S.S. Liberty کے عملے نے بطور اسرائیلی Noratlas کے شناخت کیا۔ ان کے جہاز کا آہستہ سے ایک چکر لگایا اور واپس چلا گیا۔ یہ عمل اگلے آٹھ گھنٹوں میں وقفہ وقفہ سے دہرایا جاتا رہا۔ ۹ بجے صبح ایک جیٹ ہوائی جہاز فاصلے پر نمودار ہوا اور واپس چلا گیا۔ ۱۰ بجے دو جیٹ ہوائی جہازوں نے (جن کے پروں پر راکٹ نصب تھے) اس بحری جہاز کے گرد تین چکر لگائے۔ یہ اتنے قریب پرواز کر رہے تھے کہ ان کے ہوا باز کو جیبی دوربین سے دیکھا جاسکتا تھا۔ ان جہازوں پر کوئی نشانات نہ تھے۔ ایک گھنٹے بعد یہ اسرائیلی Noratlas واپس آئے۔ یہ S.S. Liberty کے عین اوپر زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ فٹ بلندی پر پرواز کر رہے ہوں گے اور ان پر چھ کونی داوودی ستارے کا نشان صاف نمایاں تھا۔ جہاز کے Crew ممبران اور ہوا بازوں کے درمیان ہاتھ ہلا کر اشارہ ہوا۔ یہ ہوائی جہاز ہر چند منٹ بعد چکر لگاتا رہا حتیٰ کہ ایک بجے بعد دوپہر کا وقت ہوگیا۔ اس وقت تک بحری جہاز اپنا رخ تبدیل کر کے تقریباً مغرب کی جانب رواں تھا۔

دو بجے بعد دوپہر قیامت ہی برپا ہوگئی۔ تین میراج جنگی جہاز سیدھے S.S. Liberty کی جانب لپکے اور ان کے راکٹوں نے اگلی مشین گنوں اور جہاز کے نشریاتی میناروں کو نابود کر دیا۔ ان کے ساتھ Mystere جنگی جہاز آملے جنہوں نے ڈیک (عرشہ) اور برج پر آتشیں (Napalm) بم گرائے۔ یہ حملہ لگاتار ۲۰ منٹ تک جاری رہا۔ اس جہاز میں کل ملا کر ۸۲۱ سوراخ ہوئے ...... پہلو اور عرشہ پر' ان میں سے ۱۰۰ سے زیادہ راکٹ سائیز کے تھے۔

جونہی یہ ہوائی جہاز پلٹے تو تین آب دوزوں نے حملہ شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک نے جہاز کے ڈھانچے میں ۴۰ فٹ کا سوراخ کر کے ۲۵ ملاحوں کو ہلاک کیا۔ جہاز شعلہ بداماں عین سمندر کے اندر اور خطرناک طور پر جھک کر پانی سے بھر رہا تھا۔ عملہ کو جہاز چھوڑنے کے لئے تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا۔ جونہی لائف بوٹ (بجرے) پانی میں اتارے گئے تو آب دوزوں نے قریب آ کر ان کے پرخچے اڑا دیئے۔ ایک آب دوز نے مشین گن سے ان بجروں کو تاک تاک کر نشانہ بنایا جبکہ یہ ابھی ڈیک پر ہی تھے۔ اس دوران عملہ نیپام بموں کی لگی آگ بجھانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ Petty Officer Charles کے مطابق ان کی کوشش تھی کہ ایک بھی زندہ بچ کر جانے نہ پائے۔

سوا تین بجے سہ پہر آخری فائر کیا گیا۔ جہاز اس وقت تک ایک ہسپتال اور مردہ خانے کا مرکب بن چکا تھا۔ اب جہاز میں نہ تو انجن تھے نہ قوت اور نہ ہی پتوار کپتان McGonagle زخمی

ٹانگوں کے باوجود جہاز کے برج پر ہی رہا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ حملہ دوبارہ ہو گا۔ ایک اسرائیلی ہیلی کاپٹر عرشہ کے پاس سے گزرا۔ اس کا دروازہ کھلا تھا اور کھلے دروازے میں مشین گن لگی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کا عملہ فوجی وردی میں تھا' اگلے گھنٹے بھر میں کئی جہاز آئے اور گذر گئے۔

گو امریکی ہوائی امداد نہ آئی لیکن پہلے حملہ کے پندرہ منٹ کے اندر اندر اور آخری حملہ کے ختم ہونے سے کوئی گھنٹہ بھر پہلے امریکن جہاز U.S.S. Saratoga کے عرشہ سے جنگی جہاز اڑے جن کا مشن حملہ سے بچاؤ کا تھا اور ان کو حکم تھا کہ کسی بھی حملہ آور کو فنا کر دیں یا مار بھگائیں۔ یہ طیارہ بردار جہاز صرف ۳۰ منٹ کی مسافت پر تھا اور اس کے عرشہ پر تیار کھڑے جنگی جہازوں کی وجہ سے وہ فوری امداد دینے کی پوزیشن میں تھا' لیکن یہ امداد خواب و خیال ہی رہی۔ واشنگٹن سے اجازت کے بغیر یہ جہاز پرواز نہیں کر سکتے تھے' چاہے کسی ایسے امریکی جہاز کو بچانا ہی مقصود کیوں نہ ہو جو حملہ کا نشانہ بن رہا ہو۔ اسی علاقے کے نواح میں ایک دوسرے طیارہ بردار جہاز "U.S.S. "America کے کپتان Admiral Donal Engen کا بعدازاں کہنا تھا کہ "صدر جانسن کا کنٹرول بیحد کڑا تھا۔ باوجودیکہ ہمیں معلوم تھا کہ S.S. Liberty پر حملہ ہو چکا ہے۔ پھر بھی ہمیں بچاؤ کے لئے جانے کا حکم نہ تھا۔ یہ جہاز تیار اور دوش بر ہوا ہو چکے تھے جب سکریٹری دفاع میکنامارا کی آواز چھٹے بحری بیڑے کے ریڈیو پر سنائی دی۔ "چھٹے بحری بیڑے کے ہوائی جہازوں کو فوراً واپسی کا حکم دیا جائے۔" انہیں حملہ آور جہازوں کو بھگانے یا فنا کرنے سے باز رکھا گیا۔

تین بجے سہ پہر کے قدرے بعد یعنی S.S. Liberty کی امداد کی اپیل کے گھنٹہ بھر بعد وہائیٹ ہاؤس نے امدادی مشن کی صرف محدود وقتی اجازت دی اور ان دونوں طیارہ برداروں سے جہازوں نے پرواز کی۔ تقریباً عین اسی وقت اسرائیلی حکومت نے تل ابیب میں امریکن نیول اتاشی کو مطلع کیا کہ ایک امریکی جہاز کو غلطی سے مصری جہاز تصور کرتے ہوئے اسرائیلی فوجوں نے نشانہ بنایا ہے اور انہوں نے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ اس معافی کے موصول ہوتے ہی جانسن نے دوبارہ جہازوں کو واپس اترنے کا حکم صادر کیا۔

جب جہازوں کی دوسری ٹکڑی نے پرواز کی تو اس وقت تک کوئی بھی اسرائیلی حملہ آور فنا کئے جانے یا مار بھگانے کے لئے موجود نہ تھا۔ S.S. Liberty اور اس کے زخمی عملہ کے لئے اذیت ناک تنہائی اور کرب کے پندرہ گھنٹے ابھی مزید باقی تھے جس میں انہیں جہاز کو ڈوبنے سے بچانا اور زخمیوں

کو زندہ رکھنے کی جدوجہد کرنی تھی۔ اگلی صبح تک S.S. Liberty کو کوئی امریکی ہوائی یا بحری جہاز دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ صرف ایک چھوٹے سے روسی بحری جہاز نے دوستانہ Visit کی۔ ان کی مدد کی پیشکش کو ٹھکرا دیا گیا' لیکن انہوں نے قریب ہی تیار رہنے اور وقت پڑنے پر مدد بہم پہنچانے کا پیغام دیا۔

اگلی صبح دو امریکی تباہ کن جہازوں کی مدد پہنچی۔ وہ دوائیں اور مرمت کے لئے امداد لے کر آئے۔ زخمیوں کو جلد ہی طیارہ بردار جہاز پر بذریعہ ہیلی کاپٹر منتقل کر دیا گیا۔ یہ تباہ شدہ جہاز پھر مالٹا لے جایا گیا جہاں نیوی "Court of Inquiry" کا انعقاد ہونا تھا۔ یہ تحقیقات بعد ازیں عوام سے پیش آمدہ واقعات او جھل رکھنے کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ آنکھوں میں دھول جھونکنے کا یہ عمل عین اسی لمحے سے شروع ہو گیا جب اسرائیلی حملہ ختم ہوا۔ S.S. Liberty پر آخری حملے کے معاً بعد واشنگٹن میں اسرائیلی حکام نے معذرت کر دی۔ صدر جانسن نے فوراً یہ معذرت قبول کر کے اسرائیلی وزیر اعظم Levi Eshkol کی تعزیت کو بھی نشر کر دیا' حالانکہ اس اسرائیلی اطلاع کے جھوٹ ہونے کے شواہد بہ آسانی میسر تھے۔ CIA کو ایک روز پیشتر اس حملے کا علم ہو چکا تھا کہ اسرائیلیوں نے اس جہاز کو غرقاب کرنا ہے۔ کانگریس کے اکثر ممبران نے صدر کے بیان ہی کو بطور بازگشت دہرایا۔ قوم کو اس وقت اسرائیلیوں کی عربوں پر شاندار اور پے در پے فتوحات کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ ایسے وقت میں بھلا S.S. Liberty کے زخمیوں کو کون پوچھتا؟ "واشنگٹن اسٹار" کے نامہ نگار نے تل ابیب سے لکھا کہ "U.S.S. Liberty پر اسرائیلی حملہ کے ایک ہفتہ بعد تک کسی ایک بھی اسرائیلی نے جن سے اس نمائندے کا واسطہ پڑتا ہے مثلاً ٹیکسی ڈرائیور' سنتر والے' ہوٹل بار کے ملازمین یا سپاہی' اس حملے میں مرنے والے امریکیوں کے بارے میں اظہار غم کی زحمت گوارا نہ کی۔"

پنٹاگون یہ وعدہ کر کے اخباری نمائندوں کو ٹرخاتا رہا کہ Admiral Isaac Kidd کی سرکاری تفتیش مکمل ہوتے ہی ایک مفصل بیان جاری کیا جائے گا۔ Kidd نے عملے کو واضح احکامات دے رکھے تھے کہ کسی سوال کا جواب مت دیں۔ اگر گھیراؤ ہو جائے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا اور اسرائیل معذرت پیش کر چکا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہ کہیں۔ عملہ کے ارکان کو یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ کورٹ آف انکوائری کے خلاصہ کے شائع ہوتے ہی انہیں آزادی سے تبصرہ کرنے کی اجازت ہو گی۔ اس حکم میں بھی بعد میں ترمیم کر دی گئی۔ یعنی ان کو حکم دیا گیا کہ وہ تبصرہ صرف انہی مخصوص الفاظ میں کر سکتے ہیں جو اس خلاصہ میں شائع کئے گئے ہیں۔

ابھی اس تفتیش میں شہادت ہی درج ہو رہی تھی کہ امریکی پریس میں یہ الزام چھپا کہ یہ حملہ جان بوجھ کر کیا گیا تھا۔ ایسوسی ایٹڈ پریس نے مالٹا سے جو اسٹوری فائل کی اس میں کہا گیا تھا کہ جہاز کے سینئر عملے کو یقین تھا کہ حملہ آور اسرائیلی ہوائی جہازوں کے حملہ شروع کرنے سے پہلے انہیں جہاز کے امریکی ہونے کا پورا پورا علم تھا۔ "ہمارا Stars and Strips والا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ انہیں پتہ نہ چلے کہ ہم کون ہیں" بحریہ نے اس کی تردید کرتے ہوئے صرف یہ کہا کہ امریکہ اسرائیلی معذرت کو مکمل طور پر قبول کرتا ہے۔

یہ شہادت جب مکمل ہوئی تو Admiral Kidd نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑے دستاویزات بھرے صندوق کے ساتھ ہتھکڑی لگا کر منسلک کیا اور واشنگٹن پرواز کر گیا جہاں اسے چیف آف نیول آپریشن Admiral McDonald کے علاوہ کانگریس کے لیڈروں کے سامنے پیش ہونا تھا تاکہ بعد ازاں وہ خلاصہ مضمون جاری کر دیا جائے جس کا مدت سے انتظار تھا۔ جب یہ آخر کار جاری کیا گیا تو یہ قطعاً مفصل نہ تھا' اس میں کسی پر الزام کی ذمہ داری ڈالنے کی کوشش ہی نہ کی گئی تھی۔ صرف عملہ جہاز کی کوششوں پر ہی توجہ مرکوز رکھی گئی تھی۔

اس سنسر شدہ خلاصے میں یہ ظاہر ہی نہ کیا گیا کہ حملہ سے پیشتر یہ جہاز کئی گھنٹے اسرائیلی فضائیہ کی قریبی توجہ کا مرکز رہا اور پچھلے ۲۴ گھنٹوں کے دوران اسرائیلیوں نے بار بار امریکیوں کو یہ انتباہ کیا کہ وہ S.S. Liberty کو یہاں سے ہٹالیں۔ اس میں شناخت کے بارے میں غلط فہمی کا ذکر تک نہ تھا۔ بحریہ نے یہ جھوٹ بولا کہ حملہ چھ منٹ جاری رہا جبکہ یہ ۷۰ منٹ تک جاری رہا تھا۔ یہ بھی جھوٹ تھا کہ جب آب دوزیں اتنی قریب آئیں کہ جھنڈا پہچان سکیں تو حملہ بند کر دیا گیا۔ نیپام بم گرانے اور لائف بوٹ پر فائرنگ کا ذکر بھی غائب تھا۔ حد تو یہ کہ ان تیز بحری ہواؤں کا ذکر بھی حذف کر دیا گیا جن کی وجہ سے امریکی جھنڈا صاف صاف نظر آ رہا تھا۔

اس رپورٹ میں البتہ ایک تکلیف دہ انکشاف بھی ہوا۔ وہ یہ کہ حملہ سے پہلے جائنٹ چیف آف اسٹاف نے S.S. Liberty کو یہ حکم جاری کیا تھا کہ وہ ساحل سے اور پرے ہٹ جائے۔ لیکن یہ پیغام بھٹک جانے کی وجہ سے تاخیر کا شکار ہو کر حملہ شروع ہو جانے کے بعد موصول ہوا۔

کئی اخبارات نے پنٹاگون کے خلاصے کو ہدفِ تنقید بنایا۔ نیویارک ٹائمز نے کہا "یہ بہت سے سوالات کے جوابات سے محروم ہے۔" واشنگٹن اسٹار نے پردہ پوشی کے الفاظ برتے اور اس خلاصے کو

توہین آمیز قرار دیتے ہوئے ایک گہرائی اور گیرائی والی تفتیش کرنے پر زور دیا۔ سینیٹر فلبرائیٹ جو کہ امور خارجہ کمیٹی کا چیئرمین تھا' اس نے سکریٹری آف اسٹیٹ ڈین رسک سے خفیہ بریفنگ پانے کے بعد کہا کہ یہ ساری داستان بیحد خفت انگیز ہے۔ واشنگٹن اسٹار نے بحث سمیٹتے ہوئے لکھا کہ "اس کا جو بھی مطلب ہو لیکن خفت کا بہانہ نالائقی کے لئے نہیں چل سکتا۔"

جولائی کے اوائل میں ایسوسی ایٹیڈ پریس نے Micha Lamor کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اسرائیلی بحریہ کے ملاحوں نے تین عدد نمبر دیکھے جب وہ Liberty کے گرد چکر لگا رہے تھے' لیکن ان نمبروں کی انہوں نے قطعاً پرواہ نہ کی۔ یہ حضرت ایک اسرائیلی محفوظ دستہ کے رکن تھے جو ایک حملہ آور آب دوز پر ڈیوٹی کر رہے تھے۔ جب یہ Lamor اسٹوری چھپی تو Lt. James M. Ennes جو کہ خفیہ نویسی کا ماہر افسر تھا اور اس وقت "لبرٹی" کے برج پر تعینات تھا اور اب ہسپتال میں زیر علاج تھا' بیحد حیران ہوا۔ اسے معلوم تھا جہاز کا نام اور نمبر اس کے Hull پر بہت جلی الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔ ہوا تیز ہونے کی وجہ سے جھنڈا بھی لہراتا ہوا صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اسی حملے والے دن ۸ فٹ لمبا اور ۵ فٹ چوڑا نیا جھنڈا آویزاں کرنے کے احکام دیئے تھے۔ آب دوزوں کی آمد تک یہ جھنڈا مار گرایا جاچکا تھا لیکن اس کے بعد مستول پر اس سے بھی بڑا یعنی ۱۳ فٹ لمبا اور ۷ فٹ چوڑا جھنڈا لہرادیا گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ حملہ چاہے سطح سمندر سے ہو یا فضا سے' وہ اس جہاز کے امریکن ہونے سے لاعلم نہیں رہ سکتے تھے۔ سب سے بڑھ کر تو یہ کہ اسے یہ علم تھا کہ Liberty کے نامہ بروں نے اسرائیلی جاسوسی دیکھ بھال والے طیاروں کو اپنے ہیڈ کوارٹر یہ پیغام دیتے سنا تھا کہ یہ جہاز امریکن ہے۔

Limor کی کہانی اور اس پر عوامی عمل' ردّ عمل سے تشویش زدہ ہو کر Ennes نے یہ طے کیا کہ وہ سچی بات کو طشت ازبام کرے گا۔ اپنے Portsmouth (ورجینیا) کے ۴ ماہ کے جبری اخفاء کے دوران اس نے اپنے عملہ کے دوسرے ساتھیوں سے معلومات جمع کیں' بعد ازاں جب وہ جرمنی میں تعینات تھا تو اس نے دوسرے Crew Members کی یادداشتوں کو بھی ٹیپ پر ریکارڈ کیا۔ جب وہ تبدیل ہو کر واشنگٹن آگیا تو اس نے سرکاری رپورٹیں آزادی اطلاعات کے قانون کے تحت حاصل کیں۔ اس نے کورٹ آف انکوائری کی مکمل رپورٹ بھی حاصل کی جو کہ ۹ سال بعد ۱۹۷۶ء میں انتہائی خفیہ فہرست سے خارج ہو کر قابل حصول ہو چکی تھی۔

ان سب کا نتیجہ Ennes کی کتاب "Assault on Liberty" کی صورت میں ظہور پذیر ہوا

جو اس نے اپنی بحریہ سے ریٹائرمنٹ کے دو سال بعد یعنی ۱۹۸۰ء میں شائع کی۔ Ennes نے اس انکوائری رپورٹ کو بیحد سطحی پایا۔ اس شہادت پر غور ہی نہ کیا گیا تھا جو یہ ظاہر کر رہی تھی کہ یہ حملہ طے شدہ منصوبے کے مطابق تھا...... ان دو اسرائیلی ریڈیو پیغامات کو بھی درخور اعتناء نہ سمجھا گیا جن میں اسرائیلی جاسوسی ہوائی جہازوں کے پائلٹ اس جہاز کے امریکی ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے سنے گئے تھے۔

اس عدالت نے جہاز کی لاگ بک کے اندراجات کو نظر انداز کرتے ہوئے...... جن میں درج تھا کہ ہوا کافی تیز چل رہی تھی......' اور عملے کے بیانات کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے یہ طے کیا کہ حملہ آوروں کو شاید جھنڈا نظر نہ آیا ہو کیونکہ ہوا ساکن اور جھنڈا پول سے لپٹا ہوا تھا' اور وہ اس کو پہچان نہ سکے ہوں۔

Ennes کے بیان کے مطابق اسرائیل کی نیت اس حملہ میں یہ ہو سکتی تھی کہ وہ ایک ایسے جہاز کو تباہ ہی کر دیں جو اسرائیل کی خفیہ کاروائی یعنی جولان کی پہاڑیوں پر قبضے کو اپنے حساس آلات کے ذریعے طشت ازبام کر سکتا تھا۔ (اسرائیل نے اس حملے کے اگلے دن ہی شام پر حملہ کر دیا' حالانکہ وہ ایک دن پہلے اپنے عرب دشمنوں کے ساتھ جنگ بندی قبول کر چکا تھا۔)

Ennes کو پتہ چلا کہ عملے کے افراد کو اس معاملے کی پردہ پوشی کی کوششوں کا اس وقت ہی احساس ہو گیا تھا جبکہ ابھی اس بارے میں مالٹا میں شہادتیں جمع کی جا رہی تھیں۔ اس نے George Golden کے بارے میں شناخت کر کے کہا کہ وہ Liberty کا انجینئرنگ آفیسر اور قائم مقام کمانڈنگ آفیسر تھا اور اسی نے ایسوسی ایٹیڈ پریس کو وہ کہانی مہیا کی تھی جس میں الزام لگایا گیا تھا کہ حملہ جان بوجھ کر کیا گیا' حالانکہ گولڈن بھی یہودی تھا لیکن وہ زبان بندی کے احکامات پر اس قدر سیخ پا ہوا کہ اس نے ان کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا خواہ اس بات سے اس کا بحریہ میں کیریئر تباہ ہی کیوں نہ ہو جائے' اسے اپنے ملک کی عزت کا زیادہ پاس تھا۔

تل ابیب میں امریکی سفارت خانے سے واشنگٹن کو ایک مفصل بیان موصول ہوا جو اس حملے کی تصویر کا اسرائیلی رخ تھا۔ یہ اسرائیلی عدالتی انکوائری رپورٹ اسرائیل ابتدائی تفتیش ۶۷' ا تھی۔ سفارت خانے کے پیغام میں یہ سفارش بھی درج تھی کہ اسرائیلی حکومت کی یہ درخواست ہے کہ اس رپورٹ کو امریکی عوام پر ظاہر نہ کیا جائے۔ Ennes کا خیال ہے کہ اغلباً دونوں حکومتوں کو اس بات کا

احساس تھا کہ شناخت میں غلطی کر جانے والا بہانہ نہایت ہی بودا ہے۔

رازداری کی ایک اور درخواست دستی طور پر Eugene Rostow (سیاسی امور کے انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ) کے حوالے کی گئی۔ یہ تل ابیب سے بذریعہ سفارت خانہ آئے ہوئے پیغام کی تصدیق تھا اور کہا گیا تھا کہ اسرائیلی کورٹ آف انکوائری کی رپورٹ کو صیغہ راز میں رکھا جائے کیونکہ اگر وہ حالات جو فائل میں بیان کئے گئے ہیں مان لئے جائیں تو اس سے اسرائیلی بحریہ الف ننگی ہو جائے گی۔ گو Ennes اس پیغام کو ۱۹۷۷ء میں فائل میں دیکھ چکا تھا لیکن ۱۹۸۴ء تک یہ ہر سرکاری فائل میں سے غائب کیا جا چکا تھا۔ Ennes کا خیال تھا کہ اسرائیلی حکومت اس معاملے میں اپنی بحریہ کو قربانی کا بکرا بنا رہی تھی کیونکہ بحریہ پر یہ الزام لا دینے سے جس کا اسرائیلی فوجوں میں کمترین اثر و رسوخ اور درجہ تھا کم ترین خفت ہوتی۔ انہوں نے پھر امریکہ سے یہ درخواست کی کہ ان کی بے عزتی کی زیادہ تشہیر نہ کی جائے۔ امریکی حکام نے یہ مان لیا کہ وہ یہ رپورٹ عام نہیں کریں گے۔

قانونی مشیر کی رپورٹ انتہائی خفیہ بن گئی

اسی دوران یعنی S.S. Liberty پر حملہ کے مابعد والے ہفتوں میں Carl F. Salans جو کہ سکریٹری آف اسٹیٹ کا قانونی مشیر تھا، ایک رپورٹ بنام "اسرائیلی ابتدائی تفتیش ۶۷ ا" تیار کی۔ یہ Eugene Roston کے لئے تیار کی گئی تھی۔ یہ رپورٹ جسے ۱۹۸۳ء تک انتہائی خفیہ رکھا گیا سکریٹری آف اسٹیٹ ڈین رسک کے سرسری معائنے سے ہی گذر پائی۔ اس رپورٹ میں اسرائیلی رپورٹ کی صحت کی جانچ کی گئی تھی اور Liberty پر اسرائیلی حملہ کے بارے میں امریکی حکومت کا رویہ سمجھنے کے لئے اس سے بہتر دستاویز نہ ملے گی۔ یہ ایک ایسی انتہائی قیمتی دستاویز تھی جس کی تشہیر ممکن نہ تھی۔

اس رپورٹ میں Salans نے اسرائیلی عذر گناہ کی دھجیاں سلسلہ وار اڑائی تھیں۔ چونکہ یہ رپورٹ حملہ کے مابعد تیار کی گئی تھی لہٰذا اس کا زیادہ تر انحصار Admiral Isaac Kidd کی "کورٹ آف انکوائری" کی مندرجات پر تھا۔ اسے Ennes یا Golden یا اور دوسرے بڑے گواہوں کے بیانات سننے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ اسے اسی ایک رپورٹ میں کافی کچھ مل گیا جو اسرائیل کو جھٹلانے کے لئے کافی تھا۔ Salans نے جن چیزوں پر توجہ مرکوز کی وہ تھیں S.S.Liberty کی رفتار اور سمت، ہوائی معائنہ، اسرائیلی جہازوں سے شناخت، آبدوز کشتیوں سے شناخت، جھنڈا اور شناختی نشانات اور حملوں کا اوقات

وقت۔ ان تمام امور میں عینی شاہدوں کے بیانات اسرائیل کے اس دعویٰ کی نفی کرتے تھے کہ ان سے سہواً یہ غلطی سرزد ہوئی تھی۔

مثال کے طور پر اسرائیلی رپورٹ میں الزام تھا کہ "Liberty" ۲۸، ۳۰ ناٹ کی رفتار سے سفر کر رہا تھا لہٰذا مشکوک تھا' جبکہ واقعتاً اس کی رفتار صرف پانچ ناٹ تھی۔ اسرائیلی جاسوسی جہازوں کے صرف دو معائنہ پروازوں کا ذکر تھا یعنی 6.00 اور 9.00 بجے صبح۔ جبکہ ان جہازوں نے Liberty کے اوپر آٹھ مرتبہ پرواز کی تھی۔ پہلی مرتبہ 5.15 بجے صبح اور آخری مرتبہ 12.45 بجے بعد دوپہر۔

اسرائیلی رپورٹ میں الزام تھا کہ S.S. Liberty نے اپنی شناخت کروانے سے انکار کر کے فائر کھول دیا تھا۔ Capt. McGonagle نے شہادت دی تھی کہ صرف آب دوزوں نے ۲۰۰۰ گز دور سے سگنل دیا تھا جبکہ تارپیڈو چلائے جاچکے تھے اور وہ S.S. Liberty کی طرف رواں تھے۔ یہ Blinker Signal دھوئیں اور شعلوں کی وجہ سے پڑھے جانے مشکل تھے۔ جب Liberty یہ سگنل پڑھ ہی نہ سکتا تھا تو جواب کیا دیتا؟ اس کے معاً بعد اسے تارپیڈو لگا اور ۲۵ سیلرز لقمہ اجل بن گئے۔

اسرائیلی رپورٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ S.S. Liberty پر شناختی نشانات اور جھنڈا نہ لگا تھا۔ اس کے عملہ کے پانچ ارکان نے شہادت دی تھی کہ انہوں نے اس دن صبح سے لے کر بوقت حملہ جھنڈا لہراتا دیکھا تھا اور تارپیڈو کا حملہ شروع ہونے سے پیشتر ایک اس سے بھی بڑا جھنڈا لہرا دیا گیا تھا۔ جہاز کے Hull پر نشانات حال ہی میں پینٹ کیے گئے تھے۔ اسرائیلیوں نے یہ کہہ کر ذمہ داری سے بچنے کی کوشش کی تھی کہ انہیں یہ اطلاع ملی تھی کہ ساحلی علاقوں پر سمندر کی جانب سے گولہ باری ہو رہی تھی۔ Salans کے بقول کوئی بھی تربیت یافتہ مبصر بہ آسانی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ S.S. Liberty کی ہلکی مشینیں ساحلی گولہ باری کے قابل ہی نہ تھیں۔

Salans کی رپورٹ ۲۱ ستمبر ۱۹۶۷ء کو انڈر سیکریٹری فار اسٹیٹ Rostow کو بھجوائی گئی تھی۔ گویا انتظامیہ کے حکام بالا کو S.S. Liberty پر حملہ کے بارے میں اسرائیلی دعووں کے باطل ہونے کا ثبوت اسی دن مل چکا تھا۔

ایک ایسی دستاویز کے ہاتھ آجانے کے بعد جو اسرائیلی دعوے کو اتنی شدت سے مسترد کر رہی ہو' اگلا قدم تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ یہ رپورٹ اسرائیلی حکومت کو تبصرہ کے لئے بھیجی جاتی اور پھر اس کے نتائج کو شائع کر دیا جاتا۔ لیکن اس کے برعکس اس پر انتہائی خفیہ کی مہر لگا کر عوام کی نگاہ سے اوجھل

کردیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ دوسرے حکام اور فوجی افسروں کی توجہ بھی اس رپورٹ سے ہٹادی گئی اور اس سے بھی جو اسرائیل نے بھجوائی تھی۔ اس وقت کے سکریٹری آف اسٹیٹ ڈین رسک کا کہنا ہے کہ اسے واضح طور پر یاد نہیں کہ اس نے Salans رپورٹ دیکھی ہو۔ لیکن اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ کبھی بھی اسرائیلی بہانہ بازی سے مطمئن نہ تھا جو اس نے S.S. Liberty کے معاملے میں بھجوائی تھی۔ Salans رپورٹ اور دوسرے پہلوؤں کی پردہ پوشی نے امریکہ کی سلامتی کے سلسلے میں جلد ہی تکلیف دہ پیچیدگیاں پیدا کردیں۔

اگر ہماری بحریہ اپنے اندرونی حلقوں میں ہی Liberty کی داستان کے بارے میں صدق بیانی' صاف گوئی سے کام لیتی تو ہمیں ۵ ماہ بعد "Pueblo" کے بارے میں ندامت کا سامنا نہ ہوتا۔ یہ وہ جہاز ہے جس کو شمالی کوریا نے مع سارے عملہ کے قبضہ میں لے لیا تھا اور ایک ملاح کو ہلاک بھی کردیا تھا۔ یہ مصیبت تب ختم ہوئی جب عملے کو سال بھر کی تکلیف دہ قید کے بعد رہا کیا گیا۔

Pueblo کے کپتان Lloyd M. Bucher کا بیان تھا کہ اگر اسے بحیرۂ روم میں واقع ہونے والے اس بحران کے بارے میں حقیقت کا علم ہوتا تو وہ Pueblo کو گرفتار بلا ہونے سے بچاسکتا تھا۔ ۱۹۶۷ء کے موسم گرما کے آخر میں جب وہ ابھی خشکی پر ہی تھا یعنی Pueblo کی کمانڈ لینے سے پیشتر اسے S.S. Liberty کے بحران کے بارے میں علم ہوا۔ اس نے یہ سوچ کر کہ Pueblo کا کوریا کے قریب ویسا ہی مشن اس تجربہ سے سبق حاصل کرسکتا ہے اس کے بارے میں تفاصیل کا مطالبہ کیا۔ اسے بتایا گیا کہ یہ ایک بھیانک غلطی تھی اور اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ بعدازاں جب اس نے Ennes کی کتاب پڑھی تو اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے جہاز کو عین پکڑے جانے سے قبل تقریباً اسی طرح کے مسائل درپیش تھے جو Liberty کے عملے کو پیش آئے تھے۔ دونوں جہازوں میں خفیہ دستاویزات اور آلات کو تلف کرنے کے انتظامات ناکافی تھے اور بحران کی صورت میں جہاز کو تباہ کرنے کے انتظامات بھی نہ تھے۔ گویا دونوں میں Control Procedure نقائص سے پاک نہ تھے۔

Bucher کا کہنا تھا کہ اعلیٰ ترین سطح پر نااہلی حملہ کے دوران مدد کی پکار پر عدم امداد اس مصیبت کی ذمہ دار تھی۔ اس نے کہا :

"ہمارا ایک آدمی ہلاک اور ۱۴ زخمی تھے۔ اس کے بعد سال بھر کی وحشیانہ قید اور سلوک جس سے بچا جاسکتا تھا' اگر مجھے معلوم ہوتا کہ S.S. Liberty پر کیا گزری' یہ صرف اس

وجہ سے ہوا کہ اس واقعہ کی اس قدر مکمل پردہ پوشی کی گئی۔"

Liberty کے واقعہ کی پردہ پوشی کا ایک اور طرح سے بھی ذاتی اثر ہوا۔ بحریہ کی سفارش پر صدر جانسن نے Liberty کے کپتان William L. McGonagle کو امریکہ کا اعلیٰ ترین اعزاز یعنی Congressional Medal of Honour دیا جانا منظور کر دیا تھا۔ Ennes کے بیان کے مطابق کپتان دوران حملہ رات بھر گولیوں کی بوچھاڑ اور آگ لگانے والے بموں کو نظرانداز کرتے ہوئے Bridge پر ڈٹا رہا۔ یہ اسی کی قیادت تھی کہ عملے کے ۸۲ ارکان جو موت اور زخموں سے بچ گئے تھے جہاز کے ایک طرف ۴۰ فٹ کا سوراخ ہونے کے باوجود اس لولے لنگڑے جہاز کو بحفاظت بندرگاہ پر پہنچانے میں کامیاب رہے۔

McGonagle ایک سچا ہیرو تھا لیکن افسوس' اس کو یہ اعزاز روایتی شان و شوکت اور عزت و شہرت کے ساتھ ملنا نصیب نہ ہوا۔ یہ اعزاز صدر نے بذات خود نہ دیا اور نہ ہی یہ تقریب وہائیٹ ہاؤس میں منعقد ہوئی۔ بحریہ کو یہ ہدایت کی گئی کہ اس دعوت کا کہیں اور انتظام کیا جائے' صدر حصہ نہ لیں گے۔ بحریہ خود ہی کوئی اور مناسب جگہ تلاش کر لے۔ Adml. Thomas Moorer جو اس حکم نامے کے آنے سے کچھ پہلے ہی بحریہ کا سربراہ بنا تھا' اس پر بہت جز بز ہوا۔ اس کے تجربہ میں ایسا اور کوئی واقعہ نہ تھا کہ کانگریس میڈل آف آنر وہاہیٹ ہاؤس کے ماسوا دیا گیا ہو۔ اس نے سکریٹری برائے دفاع رابرٹ میکنامارا سے احتجاج کیا لیکن حکم قائم رکھا گیا۔ مجالس قانون ساز کے دونوں ایوانوں سے ایک بھی آواز احتجاج میں نہ اٹھی۔ ایڈمرل تھامس کو اور بھی تاؤ آتا' اگر اسے معلوم ہوتا کہ وہائیٹ ہاؤس نے میڈل کی منظوری میں تب تک تاخیر کی جب تک کہ اس بات کا اسرائیل کی طرف سے اشارہ نہ ملا۔ Ennes نے ایک بحریہ کے افسر کے حوالے سے لکھا کہ ہماری حکومت اسرائیل کے معاملے میں بیحد حساس ہے۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اسرائیلی سفیر سے یہ تک معلوم کیا کہ کہیں اس کی حکومت کو کوئی اعتراض تو نہیں کہ McGonagle کو یہ تمغہ ملے۔ اسرائیل نے کہا: ہرگز نہیں' بھلا انہیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا جبکہ تمغہ کے ہمراہ ملنے والی دستاویز میں اسرائیل کا نام تک نہ آیا تھا۔

سکریٹری برائے بحریہ نے یہ میڈل واشنگٹن کے بحری اڈے میں ایک مختصر سی خاموش تقریب میں دیا۔ ایڈمرل مورر نے بعد میں کہا کہ اسے ان احتیاطوں پر قطعاً کوئی حیرانی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو لگاتار اس کی مکمل پردہ پوشی کر رہے تھے' بلکہ مجھے تو حیرانی ہے کہ اس صورت حال میں انہوں نے یہ

تمغہ 14th: St. Bridge کے نیچے کیوں پیش نہ کیا۔

یہ پردہ پوشی ''آرلنگٹن قبرستان'' کے کتبوں تک محیط تھی۔ McGonagle کی سند میں اسرائیل کا ذکر تک نہ تھا۔ پندرہ سال تک S.S. Liberty کے چھ اراکین عملہ کی قبروں کے کتبہ پر صرف اس قدر درج تھا ''مشرقی بحیرہ روم میں وفات پائی۔'' نہ حالات کا کوئی ذکر' نہ جہاز کا کوئی نام اور نہ اسرائیل کی طرف اشارہ تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ قدرتی طور پر وفات پائی ہو گی۔ آخر کار اس جہاز کے بچ جانے والوں نے مل کر "USS Liberty Veterans Association" قائم کر کے ایک تحریک شروع کی جس کے نتیجہ میں صورت حال میں معمولی سی بہتری آئی۔ اس پردہ پوشی کو معمولی سا سر کا کر کتبوں پر لکھا گیا ''وفات یو ایس ایس لبرٹی'' اس بات کو بھی اسی قدر خاموشی سے سرانجام دیا گیا جتنا کہ چند سال پیشتر McGonagle کے تمغہ دیتے وقت کیا گیا تھا۔ حکومت امریکہ کا واحد سول عامل سینیٹر لیری پریسلر تھا جس نے Liberty کے واقعہ کی مزید تحقیقات کا وعدہ کیا لیکن دو سال گذر جانے پر بھی اس نے کچھ نہ کیا۔

اس قومی پردہ پوشی نے ہلاک شدگان کے پس ماندگان کو جاری شدہ خطوط کو بھی متاثر کیا۔ ایسے حالات میں عموماً صدر کی طرف سے ایک خط لکھا جاتا ہے جس میں مرحوم کی قربانی اور ایثار و بہادری کو خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ درحقیقت ایسے سینکڑوں خطوط ان دنوں جنگ ویتنام میں روزافزوں ہلاکتوں کے بعد ان کے ورثاء کو لکھے جا رہے تھے۔ لیکن وہائیٹ ہاؤس کے اعلیٰ حکام کے خیال میں اسرائیل کی گولہ باری سے مرنے والے ویٹ کانگ کے ہاتھوں مرنے والوں سے مختلف تھے۔ Liberty پر حملہ کے چند روز بعد صدر جانسن کے یہودی فرقہ سے رابطہ کے انچارج Harry McPherson کو وہائیٹ ہاؤس کے رکن عملہ Jame Cross سے ایک خط موصول ہوا جس کے بقول:

> ''بحریہ کے اکتیس اراکین عملہ USS Liberty پر مارے گئے جو کہ اسرائیلی افواج کے بناء بر غلطی حملہ کا نتیجہ تھا۔ ملفوفہ تعزیتی خطوط جو کہ ویتنام جنگ میں کام آنے والوں کے لئے منظور شدہ نمونے پر تحریر کئے گئے ہیں وہ اس بارے میں مجھے غیر موزوں لگتے ہیں۔ عرب اسرائیل معاملے کی حساس ترین نزاکت اور ان ہلاکتوں کے واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ سے درخواست ہے کہ آپ ان دستاویزات پر نظر ثانی کریں اور مجھے نو یا دس مختلف طرز کے دستاویزات بنا کر بھجوائیں جو اس خاص صورت حال سے مناسبت رکھتے ہوں۔''

میکفرسن نے فوراً اتفاق کیا کہ یہ "خاص صورت حالات" تعزیتی پیغام کے کئی پیراگراف کو غیر موزوں بنادیتی ہے۔ اس نے کئی ایسے محاورے تجویز کئے جن میں لڑائی کا ذکر حذف کیا گیا تھا۔ اسرائیلی رول کا ذکر عنقا تھا حتیٰ کہ قربانی کا ذکر بھی گول تھا۔ اسرائیل کے ساتھ روابط کی حساس نزاکت کے پیش نظر صدر کے عملہ نے عرصہ سے تسلیم شدہ روائیت کو بھی پس پشت ڈال دیا' جس کی رو سے جنگ میں ہلاک شدگان کی قربانی کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ میکفرسن نے مشورہ دیا کہ صدر ان ہلاک شدگان کے لئے اپنے خط میں امن کی کوشش میں ہاتھ بٹانے کے لئے اظہار تشکر کریں اور کہیں کہ صدر جانسن نے عرب اسرائیل جنگ روکنے کی کوشش کی تھی۔

اسی دوران جب واشنگٹن یہ عجیب و غریب پردہ پوشی کرنے میں مصروف تھا تو Liberty کے اراکین عملہ ایک فخریہ لمحے کو یاد کر رہے تھے چاہے وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ تھا۔ ۱۰ر جون ۱۹۶۷ء کی سہ پہر کو جب یہ تباہ حال جہاز USS America کو الوداع کہہ کر مالٹا کی جانب رواں تھا (برائے مرمت اور کورٹ آف انکوائری) تو اس طیارہ بردار جہاز کے کپتان Donald Engen نے اس حملہ میں ہلاک شدگان کے لئے ایک یادگاری سروس منعقد کی۔ یہ USS America کے عرشہ پر ہوئی جہاں ۲۰۰۰ ملاح جمع ہوئے۔ یہ سروس جذبات سے بھرپور تھی' بعدازاں جب جہاز اپنے اپنے راستہ پر ہونے لگے تو Engen نے Liberty کے عملہ کے لئے تین نعرہ ہائے تحسین (Three Cheers) بلند کئے۔ لبرٹی کے عرشہ پر Petty Officer جیفری کارپینٹر ایک اسٹریچر پر صاحب فراش تھا۔ وہ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ عملہ کے ایک رکن Stan White نے اس کے اسٹریچر کو ایک طرف اٹھایا کہ وہ دیکھ سکے اور سن سکے کہ یہ طیارہ بردار کیا' نعرے بلند کر رہا تھا۔ Engen کا کہنا تھا کہ سمندر ان نعرہ ہائے تحسین سے گونج رہا تھا۔ یہ ایک یادگار جذباتی لمحہ تھا' بس صرف یہی ایک حوصلہ بلند کرنے والی بات تھی جو اس بہادر عملہ کے خراج تحسین کی صورت میں ان کے نصیب میں آئی۔

یہ تو سراسر قتل ہے

کئی کتب کے واسطہ سے Liberty کے بارے میں فرضی کہانیوں کو دوام حاصل ہو چکا ہے۔ اسرائیل کے اس وقت کے فوجی کمانڈر Yitzhak Rabin نے اپنی ۱۹۷۹ء میں شائع شدہ یادداشتوں

میں کہا کہ Liberty کو غلطی سے ایک مصری جہاز سمجھ کر حملہ کر دیا گیا۔ اس نے اس حملہ کے سلسلے میں اپنے ملے جلے خدشات اور احساسات کا اظہار تو کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اسرائیل نے حملہ کے شکار ہونے والے اراکین کے لئے معاوضہ تو ادا کیا لیکن جہاز کا معاوضہ دینے سے اس بناء پر انکار کیا کہ ان مسلسل غلطیوں کے ارتکاب کے ہم ذمہ دار نہ تھے۔

صدر جانسن کے اپنے سوانح "Vantage Point" میں بھی یہ فرضی واہمہ برقرار رکھا گیا کہ جہاز پر غلطی سے حملہ ہوا تھا۔ اس نے کتاب میں صرف دس ہلاکتوں کا اعتراف درج کیا ہے جبکہ ۳۴ تعزیتی خطوط پر اس کے دستخط ثبت ہیں۔ اس نے ۱۰۰ زخمیوں کا ذکر کیا ہے جبکہ اصل تعداد ۱۷۱ تھی۔ "اس افسوس ناک واقعہ نے اسرائیلیوں کو بھی آزردہ کیا اور ہمیں بھی۔"

جانسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے ماسکو کو ہاٹ لائن پر پیغام بھجوایا تھا کہ جنگی جہاز طیارہ بردار جہاز سے مقام موقوعہ کی جانب جا رہے تھے تا کہ تفتیش کر سکیں۔ اس نے اس بات کو بالکل نہیں چھپایا کہ ان پروازوں کا مقصد جہاز یا اس کے عملہ کی حفاظت کرنا نہیں تھا۔ کمانڈر ان چیف نے اس زمانہ امن کے بدترین حادثہ کے لئے صرف سولہ سطور مخصوص کیں۔

موشے دایان (جسے CIA کی رپورٹ میں اس حملہ کے لئے ذاتی طور پر احکام صادر کرنے والا عامل گردانا گیا تھا) نے بھی اپنی طویل خود نوشت سوانح میں Liberty پر اس حملے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ CIA کی دستاویز کے مطابق دایان نے یہ حکم ایک دوسرے اسرائیلی جرنیل کے اعتراض کو رد کرنے کے بعد دیا تھا جس نے کہا تھا "یہ تو سراسر قتل ہے۔"

اس اخفاءِ راز نے Ennes کو اپنی کتاب کی مارکیٹنگ میں بھی دقت سے دوچار کیا۔ تبصروں میں اعلیٰ تعریفوں کے باوجود کتاب کے لئے بھجوائے گئے آرڈرز پراسرار طور پر غائب ہو جاتے۔ تھوک نرخوں کے بھاؤ کی فہرست میں سے اس کا نام غائب کر دیا جاتا اور اسرائیلی لابی نے اس کے خلاف ایک لمبا چوڑا محاذ کھول دیا۔ سان ڈیگو کے بحری اڈے کی انتظامیہ نے صرف ایک پادری کے اعتراض داخل کرنے پر اس کتاب کا بنڈل واپس کر دیا۔ فوجی وقائع نگار جارج ولسن نے Ennes کو بتلایا کہ جب واشنگٹن پوسٹ نے اس کتاب پر تبصرہ شائع کیا تو ہمارے دفتر کے ہر فون پر کوئی نہ کوئی کال کر کے اس کتاب کے ذکر پر برہمی کا اظہار کر رہا تھا۔

اٹلانٹا جرنل نے Ennes کی کتاب "Assault on the Liberty" کو بحریہ کی نااہلی، حکومتی

چشم پوشی اور اسرائیلی دوغلے پن کی ایک قابل مطالعہ کہانی قرار دیا۔ "کولمبس ڈسپیچ" نے اسے بین الاقوامی سیاسی ریشہ دوانیوں کے پول کھولنے والی داستان قرار دیا۔ نامہ نگار Seymour Hersh نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک ایماندار اندرون خانہ فرد کی کہانی ہے۔ اناپولس کے باوقار بحری انسٹی ٹیوٹ نے اسے اغلباً اس سال کی اہم ترین بحری کتاب قرار دیا۔

اسرائیل نے بڑی پھرتی سے ایسے اقدام کئے کہ امریکی قارئین ان تبصروں کو نظرانداز کر دیں۔ اسرائیلی وزارت خارجہ نے Ennes پر الزام تراشی کرتے ہوئے کہا کہ Ennes اپنے واضح بغض کو معروضی حالات کے بے لاگ تجزیہ پر حاوی ہونے سے باز نہ رکھ سکا اور یہ کہ اس کے تجزیہ میں فوجی حقائق اور منطق کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ Ennes کا کہنا تھا کہ بعینہٖ یہی الزامات B'nai B'rith کی Anti Defamation League نے امریکہ کے طول و عرض میں اپنے حامیوں کو لکھ کر تقسیم کئے۔ ایک AIPAC کو کال کرنے والے کو بتلایا گیا کہ یہ کتاب ایک منصوبہ کے تحت لکھی گئی ہے اور جھوٹ کا پلندا ہے جسے نیشنل ایسوسی ایشن آف عرب امریکن مالی امداد دے رہی ہے۔ Ennes کے بیان کے مطابق اس کی کتاب کی فروخت اور حسب حال بحث اس جذباتی پروپیگنڈہ سے بیحد منفی طور پر متاثر ہوئی۔

Ennes کو اپنے ریڈیو پروگرام اور لیکچروں کے دورہ کے بعد امریکہ کے طول و عرض سے یہ شکایات موصول ہوئیں کہ ان کو یہ کتاب خریدنے میں کامیابی نہیں ہو رہی۔ بہت سے پرچون کتاب فروش جنہوں نے اس کتاب کے ناشر Random House کو اپنا آرڈر بھجوایا' ان کو جھوٹی اطلاعات فراہم کی گئیں۔ کسی کو کہا گیا کہ ایسی کوئی کتاب چھپی ہی نہیں۔ کسی کو بتلایا گیا کہ یہ ابھی تقسیم ہونا شروع نہیں ہوئی۔ کسی کو کہا گیا کہ یہ اب دستیاب نہیں یا پھر یہ کہ اسے واپس لے لیا گیا ہے کیونکہ مقدمہ بازی کا خدشہ ہے۔

ریڈیو پروگرام کے ایک میزبان مسٹر Ray Taliaferro نے جب ۱۹۸۰ء کی ایک اتوار کی شام کو یہ اعلان کیا کہ وہ اگلے اتوار Ennes کا انٹرویو نشر کرے گا تو سان فرانسسکو کے ریڈیو اسٹیشن پر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ پانچ سو سے زائد احتجاجی خطوط کا طومار بندھ گیا لیکن پروگرام حسب وعدہ نشر ہوا۔ عوام کا ردِّعمل بیحد ہمت افزائی والا تھا۔ دو گھنٹے کا یہ پروگرام ختم ہو جانے کے گھنٹہ بھر بعد بھی فون کالوں کا تانتا بندھا رہا۔ ٹیلی فیرو کو دو عدد فون کالیں قتل کی دھمکی کی موصول ہوئیں جن میں

سے ایک اس کی ذاتی خفیہ لائن پر تھی۔

"جرنل آف الیکٹرونک ڈیفنس" کے مدیر Paul Backus کی دعوت پر Ennes نے ایک مہمان اداریہ لکھا جس میں کہا کہ بعض اوقات دوست ممالک کو بھی مجبوراً معاندانہ اقدامات کرنے پڑجاتے ہیں۔ اس Liberty کیس میں "چونکہ یہ دوست ملک اسرائیل ہے جو کہ امریکہ بھر میں انتہائی پرجوش اور مہنگی عقیدت کا حامل ہے اور شاید اس لئے بھی کہ موزوں تحقیقات سے کمانڈ' کنٹرول اور کمیونیکیشن کی انتہائی ذلت آمیز ناکامی کا راز افشاء ہونے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا مناسب تحقیقات کے لئے ابھی بھی سازگار سیاسی ماحول میسر نہیں۔" Backus ہکا بکا رہ گیا جب اسے مالکان جریدہ کی جانب سے یہ ہدایت ملی کہ وہ یہ اداریہ شائع نہ کرے۔ یہ پرانے ملٹری' دفاعی عہدہ داروں کا گروپ تھا جسے The Association of Old Crows کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ان کے نمائندہ Gus Slayton نے Backus کو لکھا کہ اداریہ یوں تو بہت عمدہ ہے لیکن موجودہ شدید کشیدگی کے حالات میں جیسا کہ مشرق وسطیٰ میں اس وقت ہیں اس کا اجراء مناسب نہ ہوگا۔ Backus نے جو کہ ایک ریٹائرڈ نیوی آفیسر تھا یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا کہ وہ کسی ایسی تنظیم سے واسطہ نہ رکھنا چاہے گا جو سچائی کو چھپانے میں حصہ لیتی ہو۔ Ennes کا یہ مضمون بعد میں ایک حریف جریدے میں نمایاں طور پر شائع کیا گیا جس کا نام Defence Electronics تھا۔ اس کا یہ مضمون بعد میں تین ڈالر فی کاپی کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بکا۔

۸۲-۱۹۸۱ء کے دوران Ennes نے اپنے لیکچر ٹور کے دوران مختلف انداز میں مخالفت کا سامنا کیا۔ حالانکہ اکثر لوگ مثبت ردعمل کا اظہار کرتے تھے لیکن کبھی اسے جھوٹا اور Anti Semite پکارتے تھے اور کیمپس کی انتظامیہ سے احتجاج کرتے تھے کہ اسے کیوں یہ موقع فراہم کیا گیا۔ لیکچر کے اشتہارات کو عموماً اکھاڑ پھینکا جاتا تھا۔ تقریباً ہر جگہ لوکل جیوش طلباء یونین نے جو پمفلٹ شائع کرکے بانٹے ان میں ہو بہو وہی زبان' الزام استعمال کئے گئے تھے جو کہ اسرائیلی حکومت اور B'nai B'rith نے اس کتاب کے بارے میں کئے تھے۔

Ennes کی اس کتاب کے بارے میں نکتہ چینی قومی ...... بلکہ بین الاقوامی طور پر مربوط کی جارہی تھی۔ جب "قومی عوامی ریڈیو" نے اس کتاب کا پورا متن اپنے نیٹ ورک پر نشر کیا تو لوکل اینٹی ڈی فیمیشن لیگ کے چاق و چوبند نمائندوں نے اس سیریز کے خاتمہ پر ۱۰ منٹ کا حق تردید مانگا

جو کہ انہیں ملا۔ Seattle میں جو تردیدی بیان نشر کیا گیا وہ حرف بحرف وہی تھا جو کہ اسرائیل کی وزارت خارجہ نے یروشلم میں جاری کیا تھا اور یہ دونوں تردیدی بیانات حرف بحرف ملتے تھے۔ اس تنقیدی خط سے جو کہ جیکسن ول (فلوریڈا) کے جریدے "Times Union" میں شائع ہوا۔

۱۹۸۲ء جون میں Ennes نے ستم ظریفی کا ایک اور تھپڑ کھایا جب ABC کے پروگرام "Nightline" نے اپنے پروگرام کا وہ حصہ منسوخ کر دیا جو کہ Liberty کے عملے کی ۱۵ سالہ ملن پارٹی پر مشتمل تھا۔ اس پروگرام پر اسرائیل کے لبنان پر حملے کی خبروں کو سبقت دی گئی جو ۱۹۸۳ء کے اوائل میں کیا گیا۔ Nightline نے اس کو دوسرا وقت ۱۹۸۳ء کے شروع میں الاٹ کیا لیکن اسرائیل کی رکاوٹ پھر آڑے آئی۔ اس مرتبہ امریکہ میں اسرائیل کے نئے متعین شدہ سفیر Moshe Arens نے یہ طے شدہ وقت لے لیا۔ اسی دوران اسٹوڈیو لائبریری سے اس پروگرام کی تیار شدہ ٹیپ اور فام پروگرام کی ۱۵ ریلیں غائب ہو چکی تھیں۔ (ہوسکتا ہے Ennes کی کتاب نے ABC پر نشر ہونے والے پروگرام "Good Morning! America" پر بدقسمت "Pueblo" کے کپتان کے انٹرویو کا کباڑا بھی کیا ہو۔ پابلو کے کپتان Bucher کو بعد از گرفتاری حالات بتانے کے لئے انٹرویو دینے نیویارک بلوایا گیا تھا لیکن معاً یہ انٹرویو ختم کر دیا گیا۔ اسٹوڈیو کے ایک فرد نے صرف یہ بتلایا کہ اس بارے میں اعلیٰ سطح پر مشکلات سننے میں آئی ہیں، لیکن پھر اس نے Bucher سے پوچھا کہ آیا تم نے کوئی تبصرہ کسی کتاب پر واشنگٹن پوسٹ میں شائع کروایا ہے؟ جو یقیناً اس نے کروایا تھا اور وہ Ennes کی کتاب کی تعریف میں تھا۔

۱۹۸۳ء کے آخر میں Jewish War Veterans کی تنظیم نے اس وقت احتجاج کیا جب Veterans of Foreign Wars نے Liberty پر مارے گئے عملے کو مناسب اعزاز دینے کے سلسلے میں Ennes کی حمایت کی۔ اور اس وقت بھی احتجاج کیا جب James R.Carriao (جو کہ V.F.W. کا نیشنل کمانڈر تھا) نے اس واقعہ کو "قاتلانہ اسرائیلی حملہ" قرار دیا۔ اسے اس وقت مزید یہودی غصے کا سامنا ہوا جب اس نے VFW میگزین میں صدر ریگن کے نام ایک خط شائع کیا کہ وہ قبرستان میں ایک نمائندہ بھیجیں تاکہ شہداء کی مناسب عزت افزائی ہو۔ اس کا کوئی جواب نہ آیا۔

"Assault on Liberty" کو شائع ہوئے چار سال سے زائد ہو چکے ہیں لیکن Ennes کو آج بھی لگاتار خطوط اور فون کال موصول ہو رہے ہیں۔ اس Episode کے بارے میں اسے اس

کے بحری جہاز کے ساتھیوں نے اپنا سرکاری تاریخ دان چن لیا تھا اور وہ The USS Liberty News Letter کا مدیر مقرر ہوا۔ آج کل وہ ایک اور مختلف کتاب پر کام کر رہا ہے تاکہ اس واقعے کو بھلا سکے اور ہمہ وقت اسی میں نہ ڈوبا رہے' لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں' اس کتاب کا اٹھایا گیا طوفان تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔

ایک اور ریٹائرڈ آفیسر Admiral Thomas L. Moorer نے بھی اس کتاب کی تعریف کی اور تحقیقات کا مطالبہ دہرایا۔ وہ شناخت میں غلطی کے امکان کی تھیوری کو پائے حقارت سے ٹھکراتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شاید کانگریس تحقیقات کرے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو بحریہ کو دوبارہ تحقیقات شروع کرنی چاہئے۔ اس کا کہنا تھا کہ میں تو چاہوں گا کہ ایسا ہو لیکن امکان غالب یہی ہے کہ ایسا ہونے نہیں دیا جائے گا۔

جب مورر سے پوچھا گیا کہ صدر جانسن نے کیوں اخفاء راز کا حکم دیا؟ تو اس نے بغیر لگی لپٹی کے کہا کہ یہ احکام سلامتی کے معاملات پر مبنی نہ تھے بلکہ ان کی وجہ مقامی سیاست تھی۔ اس بارے میں تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور کیا وجوہ ہو سکتے تھے؟ صدر جانسن کو یہودی ووٹروں کا ڈر تھا۔ مورر کے خیال میں یہ حملہ یقیناً جان بوجھ کر کیا گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ امریکی عوام حقیقت کا انکشاف ہوتے ہی بپھر جائیں گے۔

باب ہفتم

جامعی آزادی کو درپیش چیلنج

امریکی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مشرق وسطیٰ کے بارے میں تشہیر' اطلاعات اور آراء سازی کا جو کلیدی کردار ہے اس پر اسرائیلی لابی خصوصی توجہ مرکوز رکھتی ہے۔ لابی کی تنظیمیں نہ صرف مشرق وسطیٰ کے بارے میں پروگرام پر نظر رکھتی ہیں' بلکہ طلباء یونینوں کے اخباروں کی مدیرانہ پالیسی اور کیمپس آکر تقریر کرنے والے اسرائیل مخالف مقرروں پر بھی نظر رکھتی ہیں۔ تین مختلف طرح کی جائز حکمت عملیوں کے ساتھ ...... جیسا کہ کیپٹل ہل پر بھی کرتی ہیں۔ یہ اسرائیل نواز تنظیمیں اور شدت پسند گروہ کیچڑ اچھالنے سے باز نہیں آتے' جس کی وجہ سے مختلف نکتہ ہائے نظر اور خیالات کا آزادانہ تبادلہ ناممکن ہو جاتا ہے۔

OPEC نے ۱۹۷۳ء میں تیل کی قیمتوں میں اضافہ کیا تو حکومت علمی حلقوں اور عوام میں مشرق وسطیٰ کے بارے میں آگاہی بڑھ جانے کے بعد AIPAC اور امریکن جیوش لیگ جیسے اداروں نے خاص پروگرام اور پالیسیاں وضع کیں تاکہ کالج کیمپسوں پر اسرائیل مخالف تنقید کا توڑ کیا جا سکے۔

کیمپس پر ماحول کو پرخطر بنا دینا

۱۹۷۹ء میں AIPAC نے اپنا "سیاسی راہ نما سازی" کو فروغ دینے کا پروگرام شروع کیا جس میں طلباء کو کیمپس پر اسرائیل نواز ماحول کو مزید سازگار بنانے کی تربیت دی جاتی تھی۔ کوآرڈی نیٹر Jonathan Kessler نے حال ہی میں یہ رپورٹ دی کہ AIPAC نے تمام ۵۰ ریاستوں کے ۳۵۰ کیمپسوں میں پچاس ہزار طلباء کو اس پروگرام میں شامل کیا ہے۔ یہ لوگ نہایت تنظیم کے ساتھ کیمپس پر اسرائیل مخالف گروپوں کا لگاتار محاسبہ کرتے اور جامع حکمت عملی سے جواب دیتے ہیں۔

یہ دعوے چاہے کتنے ہی مبالغہ آمیز یا خودستائی پر مبنی ہوں' حقیقت یہ ہے کہ AIPAC ہر کیمپس پر B'nai B'rith, Hillel foundation کے ساتھ بہت قریبی رابطہ رکھ کر کام کرتی ہے۔ کیسلر کا تعارف کرواتے وقت کیمپس حاضرین کو بتلایا جاتا ہے کہ اس نے ہزاروں طلباء کی ٹریننگ کی ہے۔ کیمپس پر اس کے نمائندے اس کو پابندی سے ٹیپ یا تحریری نوٹ بھجواتے رہتے ہیں جو ان کے خیال میں فلسطین نواز یا اسرائیل مخالف ہوتے ہیں۔ وہ اسے آئندہ تقریری پروگرام سے بھی باخبر رکھتے ہیں۔ کیسلر یہ نوٹ فائل میں رکھتا ہے اور جب بھی اسے خبر ملتی ہے کہ کوئی خاص مقرر کسی کیمپس پر آ رہا ہے تو وہ اس مقرر کے عمومی دلائل اور نکات ...... اس کا سوال و جواب کا انداز اور مخاصمانہ اقتباسات ...... یا مجوزہ اقتباسات پچھلی تقریر سے نکال کر وہاں بھجوا دیتا ہے۔ کیسلر اس بات میں خصوصی مہارت حاصل کر چکا ہے کہ کون سا مقرر کن کن سوالات کا جواب دینے میں ہچکچائے گا اور یہ کہ کون سے سوالات نہ کئے جائیں کیونکہ وہ مسکت جواب دینے کا اہل ہے۔

اگر طلباء یونین یا سنیٹ ہال کو مخصوص کرنے کا اختیار رکھتے ہوں تو کیسلر ان میں اسرائیل نواز نمائندے نامزد کروانے پر توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ اگر یہ اختیار انتظامیہ کے ہاتھ میں ہو تو مقررین پر تشدد پر اکسانے کا الزام لگایا جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ پچھلی کسی تقریر کا حوالہ دیا جاتا ہے یا پھر ان پر فلسطین نواز ہونے کا لیبل چسپاں کیا جاتا ہے۔ AIPAC طلباء یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ بعض فورم مثلاً یادگاری لیکچرز کو سیاسی رنگ نہیں دینا چاہئے۔ اس سے ہر دفعہ تو کامیابی شاید نہ ہو لیکن کیسلر کی فہمائش ہے کہ اگر آپ ماحول کو خاصا کشیدہ بنا دیں تو کم از کم آئندہ ایسی محفلیں کرنے سے انتظامیہ کترانا شروع کر دے گی۔ کیسلر کے طلباء کو رول پلے اور پروپیگنڈہ Response مشق کے ذریعے سے تربیت دی جاتی ہے کہ اسرائیل مخالف دلیلوں کا کس طرح توڑ کرنا ہے۔ اس تربیتی مشقوں میں مخاصمت اور اسرائیل نواز' اسرائیل مخالف اطلاعاتی جدولوں اور عوامی فورم کا سوانگ بھرا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ جب پکا AIPAC گروپ قائم ہو جاتا ہے تو وہ طلباء کانفرنسوں میں حصہ لیتے اور دوسرے طلباء گروپوں کے ساتھ مشترکہ محاذ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے باعث AIPAC ایسے اسرائیل نواز ریزولیوشن منظور کروانے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اسرائیل نواز اشتہارات جاری کر سکتی ہے جو کہ Americans for Democratic Action جیسے (لبرل) امریکن یا Young Americans for Freedom جیسے (قدامت پسند) امریکنوں کے دستخطوں سے جاری ہوئے ہوتے

ہیں۔ اس ورکشاپ ہینڈ آؤٹ میں درج ہے کہ "حالات کا مؤثر استعمال کریں۔ کوشش کر کے غیر یہودی افراد تلاش کر کے ان سے مدیران کے نام خطوط لکھوائیں' کیونکہ یہ بہت زیادہ مؤثر اور قابل اعتبار ہوں گے۔"

۱۹۸۳ء میں AIPAC نے ملک بھر میں طلباء اور فیکلٹی کو سیاسی محرکیت کے لئے ۱۰ صفحے کا سوالنامہ بھجوایا۔ اس کی ہدایات میں درج تھا کہ براہ مہربانی اس منفرد فیکلٹی کا نام بتلائیں جو اسرائیل دشمن گروپوں کو امداد دیتی ہے۔ یہ امداد کس صورت میں مہیا کی جاتی ہے؟ پروپیگنڈہ کا وزنِ ہیئت کیا ہوتا ہے؟ ان سروے رپورٹوں کے نتائج کو AIPAC کے پمفلٹ بموسومہ College Guide: Exposing the Anti Asrael Compaign on Campus" میں اپریل ۱۹۸۴ء کو شائع کیا گیا۔

ایک طرف تو AIPAC یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ آزادیِ اظہار رائے کے حق میں ہے لیکن اس پمفلٹ کے دس مجوزہ طریقہ ہائے ردِّعمل جو فلسطینی نواز حالات اور مقررین کو کیمپس پر زچ کرنے کے لئے اختیار کیا جائے اس میں نمبر ۸ میں درج ہے۔ "روکنے کی کوشش کریں" اسی فہرست میں نمبر ۱۰ کے آگے درج ہے "انوکھا لبادہ" واشنگٹن میں ۱۹۸۳ء کے شروع میں فلسطین کے حق میں تقریر کرتے اس "انوکھے لبادے" کا یوں سامنا ہوا۔

وہ آڈیٹوریم کے دروازے پر کھڑے نیلے رنگ کا ایک پمفلیٹ بانٹ رہے تھے جو کہ بظاہر تحریری پروگرام لگتا تھا لیکن درحقیقت اس میں دہشت گرد کے طور پر میری خدمت درج تھی۔ اس میں کچھ P.L.O. کے حوالے درج تھے۔ میری کہی گئی باتیں اور ان کے خیال کے مطابق یہودیوں کو قتل کرنے کے بارے میں P.L.O. کا جو موقف تھا وہ گڈمڈ کیا گیا تھا۔ مقصد مجھے اور سامعین کو ڈرا دھمکا کر باز رکھنے کا تھا۔

سعید نے یونیورسٹی آف فلوریڈا میں بھی ایسے ہی ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ یہاں پر ایک فلسفہ کا پروفیسر احتجاجی مظاہرین کے گروہ کی قیادت کر رہا تھا تاکہ سعید کا لیکچر نہ ہو سکے۔ اس کا کہنا تھا کہ انہوں نے میٹنگ کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش کی اور آخر کار پولیس کو مداخلت کر کے اس پروفیسر کو باہر لے جانا پڑا۔ یہ انتہائی مکروہ مظاہرہ تھا وہ لوگ صرف نعرہ بازی اور مداخلت ہی پر اکتفا نہیں کر رہے تھے بلکہ کھڑے ہو کر شور وغل مچا رہے تھے۔ یہ مکمل فاشزم تھی' سیدھی سادی غنڈہ گردی۔

ایسا ہی ایک واقعہ سعید کے ساتھ Connecticut' ہارٹ فورڈ Trinity College میں

پیش آیا۔ ۱۹۸۲ء کے موسم خزاں میں سعید نے وہاں تقریر کی۔ اسے شعبہ دینیات نے مدعو کیا تھا۔ موضوع تھا "فلسطین کی اہمیت عیسائیوں' مسلمانوں اور یہودیوں کے لئے" جوں جوں تقریر کا وقت قریب آتا گیا' شعبے کو ہارٹ فورڈ میں آباد ممتاز یہودی افراد اور یہودی فیکلٹی ممبران کے احتجاجی خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ مخالفین کا کہنا تھا کہ سعید فلسطین نواز ہے اور اسرائیل دشمن ہے۔ ایک معترض نے تقریر کا انعقاد کرنے والوں سے سوال کیا تھا "نازی قتل عام سے بچ جانے والے دو یہودیوں کے فیکلٹی ممبر ہوتے ہوئے آپ کو یہ جرأت کیسے ہوئی؟"

سعید کی تقریر کے بعد شعبہ دینیات کو مزید احتجاجی خطوط موصول ہوئے' اس بات کی بھی کوشش کی گئی کہ اس شعبہ کو دس لاکھ ڈالر کی وہ امداد نہ مل پائے جس سے Jewish Studies کی نئی چیئر قائم کرنا مقصود تھا۔ کئی ماہ بعد یہ احتجاج دھیما پڑ گیا لیکن اس کے اثرات باقی رہ گئے۔ ایک مرتبہ شعبہ کے نمائندہ سے پوچھا گیا کہ جو کچھ یہودی ردِعمل سامنے آیا تھا اس کو دیکھتے ہوئے وہ دوبارہ سعید کو مدعو کریں گے؟ تو اس کا جواب تھا "جی نہیں' میرا خیال ہے کہ ہم نہیں کریں گے۔"

AIPAC کالج گائیڈ میں امریکہ کے ۱۰۰ عدد جامعات کا نقشہ کھینچا گیا ہے جس میں دکھلایا گیا ہے کہ وہاں پر اسرائیل دشمن مہم نہایت عروج پر اور وسیع ترین ہے۔ کئی جامعات پر Anti Semitism جذبات کی فراوانی عروج پر اور وسیع ترین ہے۔ کئی جامعات پر Anti Semitism جذبات کی فراوانی کا ذکر ہے۔ مثال کے طور پر درج ہے کہ کولوریڈو اسٹیٹ یونیورسٹی کے کیمپس پر "The Collegeon" جریدے میں Anti Semitic خطوط ایڈیٹر کی ڈاک کے کالم میں چھاپے گئے ہیں لیکن جو شہادت پیش کی گئی ہے وہ صرف "یہودی لابی کے امریکہ میں ذرائع ابلاغ پر اثر کے بارے میں توجہ مبذول کرانے کی ہے۔"

لابی کے کیمپس پر کام کی ایک اور مثال یوں ہے جو ۱۹۸۲ء کے موسم بہار میں دیکھی گئی۔ امریکن انڈین لاء اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (AILSA) نے ان دنوں ہارورڈ لاء اسکول میں ایک کانفرنس کی میزبانی کی جس کا موضوع تھا "قدیم باشندوں کے حقوق بین الاقوامی قانون میں۔" انہوں نے Deena Abu Lughod (دینا ابو الغود) کو بھی مدعو کیا تھا جو اقوام متحدہ کے فلسطینی مشن میں بطور ایک ریسرچ اسکالر نوکری کرتا تھا۔ ہارورڈ جیوش لاء اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (HJLSA)' جس کے اندازے کے مطابق صرف ۲۰ ہی عملی ممبران ہیں' نے پہلے تو AILSA کو یہ مطالبہ پیش کیا کہ

ابوالغود کو مقررین کی فہرست سے ہٹادیا جائے۔ جب اس میں ناکامی ہوئی تو اس یہودی گروہ نے لاء اسکول کے ڈین سے بھرپور احتجاج کیا اور طلباء کے ڈین سے کہا کہ وہ اس کانفرنس کے لئے مہیا کی جانے والی رقم کو منسوخ کردیں جسے اس نے یہ کہہ کر رد کردیا کہ میں طلباء کانفرنس پر قدغن لگانے کا کام نہیں کرتی۔ البتہ لاء اسکول کا ڈین جس نے خطبہ افتتاحیہ پڑھنا تھا وہ پیچھے ہٹ گیا۔ AILSA کے کئی ممبران اور ہارورڈ فاؤنڈیشن کے ایک ڈائریکٹر کو (جو کہ اس کانفرنس کے مدعوئین میں سے تھا) موت کی دھمکیاں فون پر موصول ہوئیں۔ ایک فون کال کرنے والے نے کہا کہ وہ ہارورڈ جیوش طلباء کی طرف سے کہہ رہا ہے' لیکن جب HJLSA سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہم سے جیوش ڈیفنس لیگ نے رابطہ کیا تھا لیکن ہم نے اس کانفرنس کو تلپٹ کروانے میں کسی بھی قسم کا حصہ لینے سے انکار کردیا تھا۔

یہ کانفرنس مقررہ وقت پر منعقد تو ہوئی لیکن منتظمین میں سے ایک کا کہنا تھا کہ "ماحول بیحد کشیدہ تھا۔ ہمیں دینا کی جسمانی حفاظت کے ساتھ ساتھ اپنی جسمانی حفاظت کی بھی فکر تھی۔ ہمارے پاس سات پولیس والے تعینات تھے اور بہت سارے مارشل اور ایک جامع حفاظتی نظام' ہم نے داخلے کے وقت تلاشیاں لیں اور ہتھیار برآمد کئے۔ چاقو جیبی قلم تراش نہیں بلکہ بوچڑ کے استعمال میں آنے والے چاقو' ہم نے جاسوس کتوں سے ہال میں دھماکہ خیز مواد کی تلاش بھی کروائی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کانفرنس منعقد ہو کر رہی لیکن بہت ہی ڈراونے ماحول میں۔

اس سے اگلے موسم بہار میں تھرڈ ورلڈ طلباء تنظیموں نے ہارورڈ میں P.L.O. کے واشنگٹن میں تعینات افسر اطلاعات حسن عبدالرحمٰن کو مدعو کیا کہ وہ "فلسطین: مشرق وسطیٰ میں امن کا راستہ" کے موضوع پر تقریر کرے۔ اس مرتبہ پھر HJLSA نے احتجاج کا بندوبست کیا لیکن اس مرتبہ احتجاجیوں نے ہال میں نشستوں پر قبضہ کرکے میٹنگ کو تہس نہس کرکے چھوڑا۔ ایک موقع پر اندر موجود طالب علم کا کہنا تھا کہ اندر ایک پاگل خانہ کا سا منظر تھا۔ عبدالرحمٰن نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک تقریر کی لیکن اس تمام دوران اسے لگاتار طعنوں' مذاق' ہجو' چیخوں' چنگھاڑوں اور لعن طعن کا سامنا رہا۔ جریدے "ہارورڈ لاء ریکارڈ" کے بموجب مقرر کا سوانحی خاکہ پیش کرنے کے لئے ہارورڈ عرب اسٹوڈنٹس سوسائٹی کے نمائندے کو کافی جدوجہد کرنی پڑی۔ ماحول انتہائی ڈراونا تھا۔

"ہم نے بڑی مشکل سے حالات کو قابو میں رکھا۔ ان واقعات کا وقوع پذیر ہونا ہی ہماری

مستقل مزاجی کا رہین منت تھا' وگرنہ خوفزدہ کرنے والوں کی کمی نہ تھی اور یہ دھمکیاں دینے والے کھلے بندوں کر رہے تھے اور نہایت زوردار طریقے سے کر رہے تھے۔"

ان دونوں واقعات میں احتجاج کرنے والوں نے جو مواد استعمال کیا وہ B'nai B'rith کی اینٹی ڈی فیمیشن لیگ نے مہیا کیا تھا۔

ایسے ہی ایک اور واقعہ میں ہارورڈ لاء فیکلٹی کی ایک ممبر نے اسرائیلی مقبوضہ غربی کنارے کا دورہ کیا جس پر اسے "فلسطینی یونیورسٹیوں کے شمالی امریکہ کے دوست" نامی انجمن نے مدعو کیا تھا۔ اس نے واپس آکر کیمپس پر ایک تقریر کی۔ اس تقریر سے پیشتر HJLSA کا وفد اس پروفیسر کے دفتر میں آیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اس بات کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ اسے تمام حقائق کا علم ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ ایک متوازن منظر کشی نہیں کرے گا تو وہ اس کے فنکشن کی ناکہ بندی کریں گے۔ یہ چیز وہ تقریر سے پہلے ہی کہہ رہے تھے۔ حال ہی میں جب اس پروفیسر سے پوچھا گیا کہ آیا اس دھمکی کی وجہ سے اس نے اپنی تقریر کو تبدیل کیا تھا؟ تو اس نے کہا کہ نہیں۔ لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے پیشگی علم تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ چاہے وہ میرے دفتر میں آتے یا نہ آتے۔ مجھے یہ علم تھا کہ وہ وہاں پر موجود ہوں گے اور میں صورت حال سے باخبر تھا۔ اس کا بیان تھا کہ ان بھپرے جذبات والے لاء اسٹوڈنٹس کی موجودگی نے اس کے لیکچر کی ماہیت کو تبدیل کر دیا تھا بجائے اس کے کہ یہ بیان کیا جاتا کہ وہاں فلسطینیوں کے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہے' اس میں قوت اور علم کے باہمی روابط کو علامتی طور پر بیان کیا گیا' وہاں بھی اور کئی اور جگہوں پر بھی۔ اس تقریر کے بعد HJLSA کے نمائندوں نے اسے خط لکھ کر اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ اس نے بہت متوازن طریقے سے مسئلہ بیان کیا تھا جس سے مجھے یہ خیال آیا کہ لیکچر کچھ زیادہ ہی متوازن ہو گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ عرب اسرائیل مناقشہ کے بارے میں اس کیمپس پر کبھی بھی کھلا اور کامیاب مباحثہ نہیں ہو پایا۔ پروفیسر کا کہنا تھا کہ گو وہ مرعوب تو نہ ہوا تھا لیکن اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک ایسے مقام پر ہے جہاں اس کے اظہار خیال پر قدغن عائد تھی۔ AIPAC صرف اکیلی ہی اسرائیل نواز تنظیم نہیں جو مقررین کی فائلیں بنا کر رکھتی ہے۔ B'nai B'rith کی A.D.L. نے بھی فائلیں کھول رکھی ہیں۔ M.I.T. کے ایک مشہور عالم زبان دانی کے پروفیسر Noam Chomsky (جس نے مشرق وسطیٰ پر دو کتابیں لکھی ہیں) کو اس کی فائل افشاء راز کر کے پہنچائی گئی۔ اس میں تقریباً سو صفحات کا مواد تھا۔ چومسکی کا کہنا تھا کہ میری تقریباً ہر

تقریر کا محاسبہ کیا گیا تھا اور اس کے مبینہ اندراجات (بعض مضحکہ خیز حد تک بھونڈے طریقے سے بگاڑے ہوئے) میری فائل میں درج کرنے کے لئے A.D.L. کو بھجوائے گئے تھے۔

چومسکی کا بیان تھا "میں جب بھی یونیورسٹی یا کسی جگہ تقریر کرتا تو ایک گروہ عام طور پر غیر دستخط شدہ ایک اشتہار تقسیم کرتا جس میں میرے خلاف مواد درج ہوتا ہے۔ اس میں "مسالے" کے طور پر میری ادھر ادھر کہی گئی (اکثر بناوٹی، جھوٹی گھڑی گئی) باتوں کا حوالہ درج ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا منبع ADL ہوتی ہے اور جو لوگ یہ غیر دستخط شدہ اشتہار تقسیم کر رہے ہوتے ہیں وہ اکثر اس کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ یہ مذموم طرزِ عمل کئی لوگوں کو خوف زدہ اور ہراساں بھی کر دیتا ہے۔ یہ بالکل غیر قانونی تو نہیں۔ اگر ADL اس طرزِ عمل کو اپنانا چاہتی ہے تو بھلے سہی، لیکن اس کے اس طرز عمل کو طشت از بام بھی کرنا چاہئے۔"

طلباء کی مطبوعات کو بھی زیر نظر رکھا جاتا ہے۔ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے کے ماہانہ میگزین "برکلے گریجویٹ" جو گریجویٹ طلباء کے لئے خبریں اور اظہار رائے مہیا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اپریل ۱۹۸۲ء میں اسرائیلی وزیر اعظم Menachem Begin کے بارے میں نکتہ چینی پر مبنی کئی آرٹیکل چھپے تو اس رسالے کے دفتر میں گمنام اور تحقیر آمیز فون کالوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک کال کرنے والے نے کہا کہ اس کے ایڈیٹر James Schamus کو بذریعہ اگلی ٹرین Auschwitz کے لئے روانہ ہو جانا چاہئے۔ یہ سلسلہ ہفتوں جاری رہا۔ (Auschwitz یہودی عالمی پروپیگنڈہ کے بموجب یہودی نسل کشی کا نازی Concentration Camp تھا)۔

کیمپس پر جیوش اسٹوڈنٹ بورڈ نے اپریل کے شمارہ کے خلاف ایک احتجاجی مراسلہ گشت کروایا جس میں اس کے ایڈیٹر پر Anti Semitic ہونے کا الزام عائد کیا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ایڈیٹر James Schamus خود بھی یہودی ہے۔ ایڈیٹر نے جیوش اسٹوڈنٹ بورڈ کے ممبران سے ملاقات کر کے ان کو اگلے شمارہ میں چار ہزار الفاظ پر مشتمل اس کا ردِّ عمل شائع کرنے کی پیشکش کی لیکن وہ پھر بھی مطمئن نہ ہوئے۔

اگلے ہی ہفتے گریجویٹ اسمبلی میں جیوش اسٹوڈنٹ بورڈ نے ایک بل پیش کیا جس میں اپریل کے شمارہ کے مندرجات پر تاسف کا اظہار کیا گیا تھا اور یہ مطالبہ کیا کہ اگر ایک نظر ثانی کمیٹی (Oversight Committee) بنا کر شمارہ کے مندرجات کو چھپائی سے پیشتر ہر شمارہ کی نظر ثانی کا

بندوبست نہ کیا گیا تو "گریجویٹ" کو صفحہ ہستی سے نابود کردینے والے اقدامات کئے جائیں گے۔ اسمبلی نے گو یہ ریزولیوشن تو رائے شماری کے بعد نامنظور کردیا لیکن ایک معطل شدہ نظر ثانی بورڈ دوبارہ قائم کردیا گیا تاکہ اداریہ پالیسی پر نظر رہے۔ اس بل کے مخالفین نے "گریجویٹ" کے اس حق کا بھرپور دفاع کیا کہ اسے "پیشگی سنسر" کئے بغیر اشاعت کا حق حاصل ہے۔ کیمپس کے کئی دوسرے جرائد کے مدیر بھی اس میں شامل تھے۔

اگلے ہی دن اسٹوڈنٹ سینیٹ نے بمشکل ایک بل کو نامنظور کیا جس میں گریجویٹ کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس بل کی پہلی خواندگی میں سینیٹ کو کہا گیا تھا کہ وہ اس اشاعت کی مذمت کریں۔ اس بل میں ترمیم کی گئی۔ یونیورسٹی کے مین طلباء اخبار ڈیلی کیلیفورنین کے ایک اداریے میں اسے ایک "نامعقول مذمت" اور ذہین اقدام کی بجائے "کسی ایسے خیال کے خالق کو غیر منطقی طور پر سزا دینا جس سے ہم متفق نہ ہوں" قرار دیا گیا۔

گریجویٹ کے مئی ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں Schamus کے پہلے مضمون کا جواب آں غزل شائع کیا گیا۔ مصنف نے ٹیپ کا بند یہ رکھا کہ "گریجویٹ" کا اپریل کا شمارہ ایک صاف' سیدھا سادہ Anti Semitism کا مظہر تھا' مطلب کے لحاظ سے بھی اور نیت کے لحاظ سے بھی۔ مئی کے آخر میں Schamus دو ماہ کی رخصت پر چلا گیا۔ اس دوران گریجویٹ اسمبلی نے انتظامی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کو طلباء فنڈ سے ملنے والی رقم میں ۵۵% کٹوتی کردی اور مالیاتی ضابطوں میں ایسی تبدیلیاں کیں کہ یہ جریدہ ٹھپ ہو جائے۔

Schamus نے مع اپنے ادارتی اور انتظامی عملے کے استعفیٰ دے دیا۔ جریدہ "San Francisco Examiner" میں شائع شدہ ایک انٹرویو میں Schamus نے کہا کہ بیگن کے خلاف مضامین ہماری خاموشی کی وجہ بنے۔ اس نے ڈیلی کیلیفورنین کو بتلایا کہ یہ سارا پلان طلباء گورنمنٹ سنسر نے صرف اس لئے بنایا تھا کہ اس جریدہ سے چھٹکارہ پاکر اگلے سال ایک نیا جریدہ اپنے خیالات کے مطابق ڈھال کر چلا سکیں۔ گریجویٹ اسمبلی کے صدر کا کہنا تھا کہ کوئی سازش نہیں بنائی گئی بقول اس کے "اسرائیل کے مسئلے کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔"

البتہ اس کا یہ کہنا تھا کہ اسرائیلی مسئلہ سے گریجویٹ میں اشاعتی مواد کا معاملہ عیاں ہوا۔ آج کل "گریجویٹ" صرف ایک واقعات کا کیلنڈر ہے جو کہ سال میں چار پانچ مرتبہ شائع ہوتا ہے۔

اسٹوڈنٹ ایڈیٹر تنقید کی زد میں

ایک اور ایڈیٹر جسے ایسا تجربہ ہوا وہ Tuscon میں یونیورسٹی آف ایری زونا کے جریدہ "Arizona Daily Wildcat" کے ایڈیٹر John D'Anna تھے۔ فروری ۱۹۸۳ء میں ۲۲ سالہ D Anna نے ایک اداریہ لکھا جس کا عنوان تھا "بیروت کا بوچڑ بھی ایک جنگی مجرم ہے" اس میں اس نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ سابقہ اسرائیلی وزیر دفاع کو یہ معلوم ہو جانے کے بعد بھی اسرائیلی کابینہ کا رکن رہنے دیا گیا کہ وہ صابرہ اور شطیلہ مہاجرین کیمپوں میں نہتے فلسطینی شہریوں کے قتل عام میں بالواسطہ ذمہ دار پائے گئے تھے۔ D'Anna نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ اگر نازی جنگی مجرم Klaus Barbie (مشہور زمانہ بوچڑ آف Lyon) پر انسانیت کے خلاف مظالم کرنے پر مقدمہ چل سکتا ہے تو بیروت میں قتل عام کروانے والوں پر کیوں نہیں؟

D'Anna کو اپنے اداریہ پر حیرت ناک ردّ عمل کا سامنا کرنا پڑا۔ "شہر کی فون ڈائرکٹری میں صرف میرے ہی اجداد بنام John D'Anna درج تھے۔ ان کو رات کے وقت لیٹ کالز کر کے زچ کیا گیا۔ مجھے ذاتی طور پر بھی اس طرح کی دھمکیاں ملیں کہ اگر تم کبھی اکیلے ہمارے ہاتھ آ گئے تو! مجھے قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ مجھے نفرت بھرے خطوط ملے' کچھ خطوط اتنے تلخ تھے کہ الاماں۔"

اخبار کو تسلسل سے یہ خطوط آنے لگے کہ D'Anna نے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ نفرت کو ہوا دی ہے' تشدد پر اکسایا ہے۔ مقامی B'nai B'rith کی Hillel Foundation نے لکھا کہ D'Anna کے اداریے نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے۔ نیم سچے مفروضوں پر قیاس کر کے گمراہ کیا ہے۔ اس تمام شور شرابہ کی وجہ سے D'Anna نے آئندہ ایک شمارے میں معذرت نامہ لکھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گو اسے اپنی رائے پر بھروسہ تھا لیکن شاید اپنی رائے کو مختلف الفاظ میں بیان کرنا چاہئے تھا۔ اس نے اپنے کچھ نقادوں سے اتفاق کیا کہ یہ ایک اچھا اداریہ نہیں تھا اور وہ یہی خیالات بغیر جذبات بھڑکائے اور بغیر سیاست کے ظاہر کر سکتا تھا۔

بہر حال جس دن D'Anna کا معذرت نامہ چھپا' دوسرے دن میں مقامی جیوش گروہوں نے یونیورسٹی صدر کو تحریری مطالبہ پیش کیا کہ "Wildcat" کے مدیر کو اس کے Anti Semitic اور اسرائیل دشمن اداریہ کی وجہ سے مستعفی کروایا جائے یا برخواست کیا جائے اور اگر اگلی سوموار کی دوپہر تک نہ ہٹایا گیا تو یہ گروہ Wildcat کو اشتہار دینے والے اداروں کو یہ بتلائے گا کہ یہ جریدہ نفرت کا

پرچار کر رہا ہے۔ انہیں یہ امید تھی کہ وہ اشتہاروں کے آرڈر منسوخ کر دیں گے۔ اس گروپ کا ترجمان Edward Tennen تھا جو کہ مقامی جیوش ڈیفنس لیگ کا صدر تھا جسے Meir Kahane نے قائم کیا تھا جو کہ اسرائیل سے عربوں کو بزور طاقت خارج کرنے کا پرچار کرتا ہے۔ JDL کو AIPAC اور دوسرے یہودی گروپ قدرے دوری پر رکھتے ہیں۔

جب وہ سوموار گزر گیا اور D'Anna وہیں موجود رہا تو اس گروپ نے اپنا نام "United Zionist Institution" رکھ کر بائیکاٹ کیا اور مقامی مشتہرین اداروں اور ایجنسیوں کو کہا کہ Wildcat کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیں کیونکہ اس کا ایڈیٹر Anti Semitic ہے اور وہ جان بوجھ کر متعصب ہے۔ اس خط میں D'Anna کو P.L.O. کو سازشی کہا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ آپ اپنے ضمیر کو ٹٹولیں اور وہ کر گزریں جو کہ کرنا چاہئے۔ D'Anna نے یہ نوٹ کیا کہ اس گروپ کے پہلے حروف سے UZI بنتا تھا جو کہ اسرائیلی مشین گن کا نام تھا۔

اس دوران مقامی یہودی گروپ کے تقریباً ۲۵ ممبران نے جو کہ زیادہ تر کیمپس Hillel تنظیم سے تعلق رکھتے تھے' یونیورسٹی کے اشاعتی بورڈ کی میٹنگ میں شمولیت کر کے شکایات پیش کیں۔ سابقہ ایڈیٹر کا کہنا تھا کہ مجھے دو گھنٹے جلتے توے پر بیٹھنا پڑا۔ میں نے ان کے تمام سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی لیکن وہ عملی اقدامات پر اصرار کرتے رہے۔ میں نے پوچھا کہ کون سے اقدامات؟ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایک نظر ثانی بورڈ چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بہت اچھا۔ آپ لوگ اشاعت کے بعد ہر ایک شے پر نظر ثانی کر سکتے ہیں' لیکن وہ نہ مانے اور اصرار کرتے رہے کہ وہ اشاعت سے پہلے نظر ثانی کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ میں نے مطلقاً رد کر دیا۔ اخیر میں بائیکاٹ کی کوشش غیر مؤثر ثابت ہوئی کیونکہ صرف دو اداروں نے اپنے اشتہارات منسوخ کئے۔ علاوہ ازیں D'Anna کو یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے انچارج سے (جو کہ خود بھی یہودی تھا) اور جریدے کے اسٹاف سے پوری پوری حمایت ملی۔ لیکن بقول D'Anna اس احتجاج کا اثر ہو کر رہا۔ یہ ایک حد تک مؤثر رہا۔ میں اندرونی طور پر خوفزدہ رہا اور عرصہ دراز تک کسی بین الاقوامی موضوع کو نہ چھیڑا۔

یہ سیاست لگتی تھی

ہارٹ فورڈ' Connecticut کی ہارٹ فورڈ سیمیناری (مذہبی مدرسہ) میں امریکہ کا قدیم ترین

اسلامی مطالعہ کا پروگرام موجود ہے۔ ۱۹۷۱ء کے اوائل سے Seminary کے صدر کو یہودیوں کی جانب سے یہ شکایات ملنی شروع ہوئیں کہ یہ پروگرام یہود دشمن ہے۔ ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ پروگرام الفتح کا امدادی دستہ ہے۔ حال ہی میں سیمیناری کے مطالعہ اسلام اور مسلم' کرسچین تعلقات کے ڈائریکٹر Willem A. Bejelfeld کو مقامی جریدے "Hartford Courant" نے یاسر عرفات پر شذرہ لکھنے کی درخواست کی۔ ۱۹۸۳ء کے یوم سال نو پر یعنی اس شذرہ کی اشاعت کے اگلے ہی دن Bejelfeld کو ایک فون کال موصول ہوئی اور کال کرنے والے نے صرف "جیوش" کے طور پر اپنا تعارف کروایا۔ اس نے کہا کہ سیمیناری ایک مدت سے یہودی مخالفت پروپیگنڈہ کا گڑھ بنی ہوئی ہے۔ اس نے Bijelfeld پر الزام لگایا کہ وہ یہودیوں کے قتل اور اسرائیل کو ختم کرنے کا پرچار کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے NBC کی Jessica Savitch کی انتہائی دردناک موت پر خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے خیال میں یہ آسمانی انصاف کا مظہر تھا کہ Jessica موٹر کار کے حادثہ میں لقمہ اجل بنی' کیونکہ اس نے ۱۹۸۲ء کے لبنان پر اسرائیلی حملے کے دوران بے گھر اور دربدر ہونے والے لبنانیوں کی تعداد بیان کرنے میں جھوٹ بولا تھا۔ اس کال کرنے والے کا کہنا تھا کہ اسے پورا یقین ہے کہ اسرائیل کے ہر دشمن کو ایسی ہی سزا ملے گی۔ Bijelfeld کا بیان تھا کہ اس کے لئے ایک واضح اشارہ پنہاں تھا۔

لابی کا ایک اور ہتھیار معاشرتی مقاطعہ (حقہ پانی بند کرنا) ہے۔ اقبال احمد ایک پاکستانی نژاد امریکی اسکالر ہے جس نے پرنسٹن یونیورسٹی سے دو عدد ڈاکٹریٹ ڈگریاں حاصل کی ہوئی ہیں۔ ایک پولیٹیکل سائنس اور دوسری اسلامیات میں۔ وہ واشنگٹن کے انسٹی ٹیوٹ آف پولیٹیکل اسٹڈیز کا فیلو بھی ہے۔ نیویارک ٹائمز کے صفحات پر اقبال کے مشرق وسطیٰ کے بارے میں بہت سارے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اقبال احمد کا کہنا تھا کہ اسرائیل پر تنقیدی مضامین اور فلسطینیوں کے حقوق کی حمایت کرنے پر اسے علمی حلقوں میں مقاطعہ کا سامنا ہے۔

"یہ صرف مادی سزا ہی نہیں جو لوگوں کو دی جاتی ہے' بلکہ غیر معمولی مطابقت کا ایسا ماحول بنا دیا جاتا ہے کہ اگر ہم اختلاف رائے کریں تو اس کا بدلہ قید تنہائی قرار پاتا ہے۔"

اقبال احمد نے ۱۹۶۵ء میں کارنل یونیورسٹی کی فیکلٹی میں شمولیت اختیار کی۔ اس کا بیان تھا کہ میں عمومی طور پر ایک ہر دلعزیز نوجوان پروفیسر تھا' حالانکہ میں نے ویتنام جنگ کے خلاف مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ لیکن یہ قدامت پرست لوگ پھر بھی میرے ساتھ نرمی اور گرم جوشی کا برتاؤ

کرتے تھے۔

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد اقبال احمد نے اسرائیل کے عرب مفتوحہ علاقے واپس نہ کرنے پر نکتہ چینی کی اور فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کے حق میں کئی درخواستوں پر دستخط کیے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے بعد کے پورے دو سالوں میں ساری فیکلٹی کے ممبران میں سے صرف چار نے اس کے ساتھ کلام کیا۔ یہ اس کے وہاں آخری دو سال تھے۔ "میں اکثر فیکلٹی لاؤنج کی لنچ ٹیبل پر بیٹھا ہوتا اور پر ہجوم ہونے کے باوجود میں چھ افراد والی میز پر اکیلا ہوتا۔" اقبال کا کہنا تھا کہ جو چار اس سے دوستانہ رویہ رکھتے تھے ان میں سے تین یہودی تھے۔

مسئلہ یہودی بمقابلہ غیر یہودی نہیں ہے۔ علمی حلقوں میں اسرائیل کے بارے میں ایک خاموش مفاہمت ہے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس مفاہمت کی خلاف ورزی کرنے والوں میں بڑی اکثریت یہودیوں کی ہے نہ کہ غیر یہودیوں کی۔

۱۹۸۳ء میں اقبال احمد کا نام B'nai B'rith کے جریدہ "امریکہ میں عرب موافق پروپیگنڈہ: کارساز اور نمائندے" میں شائع ہوا۔ اقبال کا کہنا تھا کہ وہ یہ سلوک ایک ایسے شخص کے ساتھ کر رہے تھے جو کسی بھی عرب حکومت یا تنظیم کا تنخواہ دار یا ممنون نہ تھا۔ بقول اس کے اس کی تقریباً ایک چوتھائی آمدنی ان لیکچروں سے حاصل ہوتی تھی جو وہ مختلف یونیورسٹیوں میں دیتا تھا۔ جب سے اس کا نام B'nai B'rith کی فہرست دشمناں میں شائع ہوا ہے اس کے لیکچروں کی تعداد آدھے سے بھی کم رہ گئی ہے۔ اقبال احمد کا کہنا تھا کہ مجھے یہ دعوتیں میری اس شہرت کی بناء پر ملتی تھی کہ میں ایک بے لاگ مبصر ہوں۔ میرے خلاف یہ پروپیگنڈہ کر کے وہ میری بے لاگ اسکالر والی حیثیت کو داغدار کر رہے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں کارنل چھوڑنے کے بعد اسے کوئی بھی باقاعدہ تدریسی ملازمت نہ مل سکی' ورنہ کسی کالج میں بطور وزٹنگ پروفیسر کام ہر سال مل جاتا۔ اسے نیویارک کے Rutgers University College میں ۸۳-۱۹۸۲ء کی آخری ٹرم میں باقاعدہ ملازمت ملنے ہی والی تھی لیکن عین آخر دم اسے ترک کر دیا گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ مجھے ذاتی طور پر بتایا گیا کہ صیہونی پروفیسروں نے مخالفت کی تھی۔ ڈین کو بتلایا گیا کہ یہ شخص Anti Semitic ہے اور جہاں پڑھا رہا تھا وہاں Anti Semitic ماحول پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ لہٰذا اس کو منظوری کے ووٹ نہ ملیں گے۔ مجھے یہ سب کچھ زبانی بتلایا گیا تحریری طور پر میرے پاس کچھ نہیں۔ شعبہ پولیٹکل سائنس کے صدر S.C.

Whittaker جس نے اسے بطور وزٹنگ پروفیسر بھرتی کیا تھا کا کہنا تھا "جب پروفیسر اقبال احمد کو مستقل پروفیسر کا عہدہ دیے جانے کا سوال اٹھا' میں موجود نہ تھا۔ جب میں واپس آیا تو مجھے بتایا گیا کہ اس کے لیکچر بیحد کامیاب رہے اور حاضری ناقابل یقین حد تک زیادہ تھی لیکن جب اس کی فیکلٹی پر مستقل تقرری کا سوال آیا تو اس کو نامنظور کر دیا گیا۔ لگتا ہے اس بارے میں سیاست کارفرما تھی۔"

عرب سرمایہ شجر ممنوعہ

۱۹۷۷ء میں امریکہ کے تین چھوٹے کالجوں یعنی Swarthmore, Haverford اور Bryn Mawr نے ایک پرائیویٹ عرب تنظیم سے مالی مدد لینے کا منصوبہ بنایا تاکہ وہ مشرق وسطیٰ کے بارے میں ایک مشترکہ پروگرام کر سکیں۔ یہ تینوں برادر اسکول جو کہ فلاڈلفیا کے متمول مضافاتی علاقے میں واقع تھے پہلے ہی ایک روسی مطالعاتی پروگرام اشتراک سے کر رہے تھے۔

اس منصوبہ کی داغ بیل ان کالجوں کے احکام کی باہمی بات چیت میں پڑی۔ Swarthmore کا ایک پرانا طالب علم Willis Armstrong جو کہ پہلے اسسٹنٹ سکریٹری آف اسٹیٹ رہ کر حال ہی میں Triad Foundation کا سکریٹری بنا' اس کا داعی تھا۔ یہ فاؤنڈیشن ایک مالدار عرب عدنان خشوگی نے قائم کی تھی' جس کے مقاصد بقول اس کے مختلف ممالک کے درمیان مفاہمت کے پل تعمیر کرنا تھے۔ عدنان خشوگی ایک خوش باش ارب پتی تھا جس نے بطور ایک مڈل مین کے غیر ملکی کمپنیوں سے خوب کمایا تھا۔ ان میں دفاعی سامان والی کئی بڑی بڑی وہ کمپنیاں بھی شامل تھیں جو سعودی عرب میں تجارت کرنا چاہتی تھیں۔

یہ سہ سالہ ۵۹۰۰۰۰ ڈالر کا پروگرام جو کہ آرم اسٹرانگ نے ترتیب کیا تھا' ہر نقطہ نظر سے تسلی بخش تھا۔ اس پلان کے مطابق مستحق عرب طلباء کو غیر ملکی وظائف دینا' کالجوں کے کتب و رسائل کے ذخیرہ میں مشرق وسطیٰ کے بارے میں اضافہ کرنا اور مشرق وسطیٰ کے بارے میں جاری کورسوں کو امداد دینی شامل تھی۔ اس کے تقریباً ایک چوتھائی حصہ کی مالیت سے ایک Rotating Professorship قائم کرنا مقصود تھی۔ اس کے تحت مدعو کئے گئے مہمان پروفیسروں کو مشرق وسطیٰ کے بارے میں پڑھانا تھا۔ خاص طور پر اس کے Anthropology' آرٹ ہسٹری' معاشیات' تاریخ' پولیٹکل سائنس اور مذہب کے حوالے سے۔

پانچ برس بعد (یعنی ۱۹۸۲ء) کو یاد کرتے ہوئے Swarthmore کے وائس پریزیڈنٹ Kendall Landis کا کہنا تھا کہ "یہ انتہائی بے ضرر اور قیمتی منصوبہ تھا۔ Haverford کے صدر Stephen Cary نے اس کو "علمی ترقی کے لئے مفید" قرار دیا تھا۔ Haverford کے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر ڈیولپمنٹ نے اسے طلباء کی استعداد برائے مشرق وسطیٰ بڑھانے والا منصوبہ قرار دیا تھا۔

اغلباً اس اسکیم کا پرجوش مداح Bryn Mawr کا صدر Harris Watford تھا۔ ایک سابقہ ڈائریکٹر Peace Corps کے طور پر Watford کی شہرت بطور ایک بین الاقوامی مفاہمت بڑھانے والے کی تھی۔ اس نے اس مشرق وسطیٰ مطالعاتی تجویز کو بیحد سراہا۔ اس گرانٹ کی تجویز میں مکمل علمی آزادی کی گارنٹی شامل تھی۔ آرمسٹرانگ کا کہنا تھا کہ سب کچھ اعلیٰ ترین معیار کے مطابق ہونا تھا۔ کالجوں نے خود وزٹنگ پروفیسر چننے تھے۔ خود کتب خریدنی تھیں اور خود ہی ان طلباء کا انتخاب کرنا تھا جنہیں وظائف دیئے جاتے۔ مزید براں گشتی پروفیسرز رکھنے کا مطلب یہ تھا کہ کوئی بھی اتنی زیادہ دیر نہ ٹکے کہ جڑ پکڑ لے۔ ہم نے سرتوڑ کوشش کی کہ ہم مکمل میانہ روی اختیار کریں۔ دوسروں کے علاوہ یہودی پروفیسروں کو بھی مدعو کرنے کا پروگرام تھا۔

"Triad فاؤنڈیشن کی جانب سے کبھی بھی کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا گیا اور نہ ہی یہ اشارہ دیا گیا کہ اس پروگرام میں اسرائیل شامل نہ ہوگا' لہٰذا میں نے Triad Foundation والوں پر کبھی نکتہ چینی نہ کی۔" یہ الفاظ Haverford کے مسٹر Cary کے تھے۔

یہ معاہدہ تین کالجوں کے مابین تقریباً طے پا گیا تھا۔ اب صرف یہ رہ گیا تھا کہ یہ تجویز باقاعدہ رسمی طور پر Triad Foundation کو پیش کر دی جاتی اور آرمسٹرانگ کا کہنا تھا کہ یہ منظور ہو جائے گی اور وہ اس رقم کا چیک جاری کر دیں گے۔

لیکن امریکن جیوش کمیٹی کے Ira Silverman جیسے کچھ لوگ بھی تھے جو اس تجویز میں خطرہ پنہاں دیکھتے تھے۔ اسے Swarthmore کے پولیٹکل سائنس کے پروفیسر James Kurth نے فون پر اس گرانٹ منصوبے سے آگاہ کیا تھا۔ سلورمین نے ایک خفیہ مراسلے میں جو اس نے AJC کی نیشنل کمیٹی کو بعنوان "عرب اثر و نفوذ امریکہ میں" لکھا یہ درج تھا:

پروفیسر Kurth جو یہودی نہیں ہے' کا خیال ہے کہ مجوزہ پروگرام AJC کی توجہ کے لائق ہے کیونکہ یہ نہ صرف موجودہ دنیائے عرب کے مطالعے کو وسعت دے گا بلکہ واضح طور پر عرب ـ

سیاست کا پیغام کیمپوں میں پہنچ جائے گا۔ پروفیسر Kurth نے ہماری توجہ اس پروگرام کی جانب مبذول کرائی اور اس پروگرام کو روکنے میں امداد طلب کی۔ ہم نے اس معاملہ پر غور کیا۔ طے یہ پایا کہ مناسب ترین طریقہ اس کو دفن کرنے کا یہ ہے کہ پس پردہ ان کالجوں کے اسٹاف سے بات چیت کر کے اس پروگرام کو منصۂ شہود پر آنے سے پہلے ہی غفر لہ کر دیا جائے۔ اس پروگرام کی مخالفت صرف یہودیوں کا عربوں کے خلاف ہونا نہ ہو بلکہ خشوگی کی طرف سے مالی اعانت کو ان تین عالی شان کالجوں کے مفاد کے خلاف ظاہر کیا جائے۔

سلورمین نے فوراً خشوگی اور Triad کے خلاف محاذ ترتیب دے دیا۔ اس کا کہنا تھا: میں نے فوراً Prof. Kurth کو خشوگی کے بارے میں معلومات پر مبنی ایک فائل بھجوادی، اس میں Triad Corp. اور Triad Foundation کے بارے میں بھی مواد تھا اور یہ AJC کے Trends Analysis نے تیار کی تھی۔ میں نے AJC کے فلاڈلفیا برانچ کو بھی ان حالات سے باخبر کیا تاکہ وہ Kurth کے ساتھ رابطہ رکھیں اور مقامی یہودی کمیونٹی لیڈران اور ان کالجوں کے سابقہ طالبعلموں اور متعلقہ افراد کے ذریعے اس گرانٹ کے بارے میں اعتراضات اٹھائیں۔

AJC کی اس مہم برائے "پروگرام تباہ کرو" کے حیرت ناک نتائج ظاہر ہوئے۔ سلورمین کے مہیا کردہ مواد کو بنیاد بنا کر Swarthmore کے "The Phoenix" (طلباء اخبار) میں ایک مضمون چھپا جس میں یہ جھوٹا الزام لگایا گیا کہ خشوگی پر ایک "مقدمہ فیڈرل گرینڈ جیوری" میں چلنے والا ہے جس میں اس پر Lockheed کو کچھ ادائیگیاں کرنے کا الزام ہے۔ ایڈیٹر James Platt سے جب پوچھا گیا کہ اس مضمون کا کیا اثر پڑا اس معاملے پر تو اس نے کہا کہ Phoenix نے یہ معاملہ عوامی سطح پر اٹھایا۔ کم از کم ان طلباء اور سابقہ طلباء کے لئے جنہیں اس کا علم نہ تھا تاکہ وہ فون کال کر سکیں اور اپنی پریشانی کا اظہار کر سکیں۔" اس نے اپنی خبر کے ذرائع کی تصدیق کرنے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ پہلے پہل میں نے لوگوں سے بات کر کے پوچھا کہ اس بارے میں کوئی مسئلہ تو نہیں؟ لیکن اس وقت یہ اطلاع خفیہ تھی۔

اس مضمون کے The Phoenix میں چھپنے سے پیشتر Swarthmore کے صدر Theodore Frind نے نمائندگان شعبہ جات کی ایک مجلس بلائی تھی تاکہ اس پروگرام کی رسمی منظوری لی جا سکے۔ کچھ ممبران نے اس پروگرام پر اعتراضات کئے لیکن اس مضمون کی اشاعت کے

اگلے دن شام کو کالج کے ڈائننگ ہال میں ایک عرضداشت تقسیم کی گئی جس میں خشوگی کو اسلحہ کا سوداگر اور مشرق وسطیٰ میں رشوتیں لینے کا ملزم گردانا گیا تھا۔ اس پر ۲۳۰ طلباء اور کئی فیکلٹی ممبران کے دستخط تھے۔ تقریباً عین اسی وقت فلاڈلفیا جیوش فیڈریشن کا ایک خط صدر کی میز پر پہنچا۔ اس تمام واقعہ کو یاد کرتے ہوئے ایک قریبی مبصر کا کہنا تھا "یہ سب کچھ ساڑھے اٹھارہ منٹ کے اندر اندر ہو گیا بالکل جیسے انقلاب فرانس میں خوف کی ایک لہر سارے فرانس میں پھیل گئی تھی۔"

۳؍نومبر ۱۹۷۷ء کو فلاڈلفیا کے دو اخبارات Philadelphia Inquirer اور The Evening Bulletin میں بیک وقت مضامین شائع ہوئے۔ مؤخر الذکر نے عنوان رکھا "کالجوں کا اسکینڈل کے بارے میں حیض بیض" ۴؍نومبر ۱۹۷۷ء کو Bryn Mawr اور Haverford کے مشترکہ شائع ہونے والے طلباء جریدے نے اس مجوزہ گرانٹ کی تفصیلات اور خشوگی کا پس منظر بیان کیا۔ اسی شمارے میں اداریہ کا عنوان تھا "Triad کو انکار کرو۔"

ایک مشترکہ اعلامیہ جو کہ جیوش کمیونٹی ریلیشنز کونسل، امریکن جیوش کمیٹی اور B'nai B'rith کی ADL نے شائع کیا وہ یہ تھا "یہ بہت ہی مناسب ہے کہ اسکول ایسی کسی امداد کی وصولی کو سنجیدگی سے پرکھیں جو کہ کسی قابل اعتراض منبع سے حاصل کی جا رہی ہو اور خاص طور سے جب اس کی روح رواں عدنان خشوگی جیسی شخصیت ہو۔"

آخر کار AJC کے واشنگٹن آفس نے پروفیسر Kurth کا کانگریس ممبر James Schener سے رابطہ کروا دیا جو Swarthmore کا سابقہ طالب علم اور یہودی تھا۔ آرمسٹرانگ کے بیان کے مطابق Schener نے کالج کے صدر Friend سے کالج کے بورڈ آف منیجرز کی فہرست بمعہ فون نمبروں کے طلب کی تاکہ وہ ان کو فوراً کر کے اس نامعقول رویہ سے باز رکھ سکے۔ کئی اور گروپوں نے بھی اس رکوانے والی مہم میں حصہ لیا۔

ان تینوں میں سب سے پہلے Haverford کالج نے کھلے عام اس مشترکہ اقدام سے علیحدگی اختیار کی۔ صدر کیری نے کہا کہ کالج اس امداد کی پیشکش کا خیر مقدم کرتا ہے لیکن Haverford بطور ایک Quaker پس منظر رکھنے والے ادارے ہونے کے کسی ایسی امداد کا طلبگار نہیں ہو سکتا جو اسلحہ کی تجارت سے حاصل کی گئی ہو، جس کی ہم مذمت کرتے ہیں۔ اس کے معابعد Swarthmore نے کنارہ کشی اختیار کی۔ اس فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے صدر فرینڈ نے کہا کہ ایک ایسے وقت جبکہ ہم

کڑی معاشی تنظیم کر رہے ہوں' اپنے سلیبس کو جانچ رہے ہوں تو مشرق وسطیٰ کے بارے میں ایک وقتی سا تجربہ ہماری ترجیحات سے لگا نہیں کھاتا۔

The Phoenix کے ایک رپورٹر سے بات کرتے ہوئے اس Triad گرانٹ کے خلاف احتجاج کرنے والے مزاحمتی لیڈر Peter Cohan کا کہنا تھا کہ اس بیان سے تو صرف موجودہ مسئلہ کے بارے میں رائے کا اظہار ہوتا ہے۔ کوئی اصول تو متعین نہیں کیے گئے۔ جریدے کے اسی شمارے میں Swarthmore وائس پریزیڈنٹ Landis کا مضمون بھی شائع ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ Triad کی گرانٹ کے بارے میں فیصلہ احتجاج کے ایک طوفان کے باعث کیا گیا جس میں خشوگی صرف ایک عنصر تھا۔ اس کی اور بھی کئی وجوہ تھیں۔

Phoenix میں بذریعہ خط اظہار کرتے ہوئے Ben Rockfeller نے Landis سے اتفاق کرتے کہا "یہودی طلباء کو راک فیلر کے طریقہ تجارت پر کوئی اعتراض نہیں' کیونکہ وہ کسی کے بھی طریقہ تجارت سے سروکار نہیں رکھتے۔ مسٹر خشوگی کے پیشہ ورانہ کردار پر اعتراض صرف ایک حیلہ ہے تاکہ عرب دشمن جذبات ظاہر نہ ہونے دیے جائیں۔"

صرف Bryn Mawr نے اس امداد کا پیچھا جاری رکھا۔ پروفیسر Watford نے اس کالج کے فیصلے کا دفاع کرتے ہوئے کہا "سرمایہ کے منبع سے ہمارا سروکار نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ ایک پیچیدہ امر ہے۔" اس نے طلباء کے اخبار The News (جو کہ گرانٹ کا مخالف تھا) میں لکھا کہ Bryn Mawr میں کسی نے یہ رائے ظاہر نہیں کی کہ خشوگی کا ریکارڈ کھنگالا تھا اور جو اطلاعات حاصل ہوئیں انہیں مشتہر کیا۔ اب اگر کوئی نئی اطلاع سامنے آئی ہے تو احتیاط سے اس کا جائزہ لینا چاہئے لیکن جیسا کہ The News میں تجویز کیا گیا ہے ہمیں Triad کو صرف 'نہ' نہیں کہنا چاہئے۔ میرے خیال میں تو ہمیں تمام حقائق کا مل کر جائزہ لینا چاہئے۔ اگلا قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں تعصب کے مظاہرے سے باز رہنا چاہئے اور غیر مصدقہ اطلاعات یا ذاتی انا کی تسکین کی خاطر فیصلہ نہ کرنا چاہئے۔ کیا یہ تعصب نہیں کہ ہم Lockheed سے تو چندہ لیں جس پر بے ایمانی کا جرم ثابت ہو چکا ہے' لیکن Triad کو انکار کر دیں حالانکہ اس پر جرم ثابت ہونا تو کجا الزام بھی نہیں لگا۔

"Philadelphia Inquirer" نے Bryn Mawr کی حمایت کی۔ اپنے ایک اداریہ بعنوان "پیسے میں کوئی بو نہیں ہوتی' میں اس نے کہا کہ اس کے خیال میں ان تینوں کالجوں کو اس ۵۹۰۰۰۰

ڈالر امداد پر ناک بھوں چڑھانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہمارے خیال میں تو انہیں مشہور عالم امریکی فلاسفر Woody Allens کی ہدایت پر عمل کرنا چاہئے کہ رقم جھپٹو اور لے بھاگو۔ Watford کی طرح اس اخبار نے بھی کہا کہ اعلیٰ تعلیم کے لئے چندہ کے چند ہی ذرائع قابل تفتیش ہیں۔ Jewish Committee کی دستاویز کے مطابق گو B.Mawr نے چندہ کا پیچھا جاری رکھا لیکن کافر کمتر سطح پر۔ درحقیقت ان کی یہ درخواست آخر کار رائیگاں گئی کیونکہ خشوگی زک اٹھا چکا تھا۔ اس نے وہ فاؤنڈیشن ہی ترک کر دی۔ نہ رہا بانس.........۔

اس تنازعہ کو یاد کرتے ہوئے Watford نے کہا "ہماری پوزیشن خاصی مضبوط تھی کیونکہ اسی سال ہم نے Bryn Mawr میں یہودی تعلیمی پروگرام میں حصہ لینے والوں کے لئے اسرائیلی بونڈ خریدنے کے پروگرام میں شرکت کی دعوت دی تھی جسے یہودی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا تھا۔ درحقیقت مجھے اسی سلسلے میں اسرائیلی بونڈ تنظیم کی جانب سے Eleanor Rosevelt Award سے بھی نوازا گیا تھا۔" جب اس سے یہ پوچھا گیا کہ دوسرے دونوں کالجوں کے ساتھ چھوڑ دینے پر اس کا کیا ردِّعمل تھا؟ تو اس نے کہا "ہمیں یوں لگا گویا ان دونوں نے ہمیں دغا دیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ انہوں نے بغیر تسلی بخش پیشگی صلاح مشورہ کے اعلان عام کر دیا اور دوسری یہ کہ ہم اس پہلو پر سوچ بچار کر چکے تھے کہ ایک متوقع چندہ ملنے کے ذریعہ کو کیوں دھتکارا جائے۔"

Willis Armstrong نے اپنے ایک خط میں صدر فرینڈ کو لکھا:

> "Swarthmore نے اپنے اصولوں کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ انہوں نے اجنبیوں سے نفرت کرنے والے ایک متعصب گروہ کے دباؤ پر گھٹنے ٹیک دیئے ہیں جو رائے عامہ کو توڑنے مروڑنے میں مہارت رکھتا ہے۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتا کہ امریکہ کیونکر مشرق وسطیٰ میں امن بحال کر سکتا ہے۔ جب تک وہ عربوں کا اعتماد حاصل نہ کر لے اور اپنی افہام و تفہیم والی بے لاگ معروضیت ظاہر نہ کرے۔ ایک Quaker ادارے کا ایک ایسے موقع کو کھو دینا جس سے یہ مفاہمت حاصل ہو سکے، انتہائی مایوس کن امر ہے۔"

Haverford کے صدر کیری بھی یہودی فرقے کے دباؤ میں آکر اس امداد کے بارے میں انکار کرنے کی تردید کرتے ہوئے کہتا ہے: مجھے چند خطوط پرانے یہودی طلباء کے ملے تو تھے کہ ہمیں اس سے کچھ سروکار نہیں رکھنا چاہئے لیکن ان کا میرے فیصلے سے کوئی تعلق نہ تھا۔

Haverford کا پرووسٹ یعنی Tom D'Andrea اس یہودی مخالفت کو یوں دیکھتا تھا:

"یہودی تنظیموں کی طرف سے سخت مخالفت ایک اہم عنصر تھا۔ میرے خیال میں اس کا تعلق عربوں کے اثر و نفوذ اور مشرق وسطیٰ کے حالات سے تھا۔ لیکن یہ بھی بات ہے کہ تعلیمی اداروں کی آزادی کا گمبھیر مسئلہ درپیش آجاتا ہے یعنی آزادی اظہار رائے۔ بہرحال ایسے معاملوں میں پہلو بچانے کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ احتجاج کو کسی اور نکتہ پر مرکوز کر دیا جائے اور Quaker نکتہ نظر کا لحاظ کرتے ہوئے اسلحے کا کاروبار ایک مناسب نکتہ تھا۔"

Ira Silverman اپنی اس کامیاب کوشش (جس میں امریکن جیوش کمیٹی مشرق وسطیٰ اسٹڈیز پروگرام ان تینوں کالجوں میں رکوانے پر کامیاب رہی) کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتا ہے:

"اس میں ہمارے حصہ لینے کا عام طور پر چرچا نہ درس گاہوں میں ہوا اور نہ ہی ہماری حسب خواہش اس کا ڈھنڈورا عوامی پریس میں پیٹا گیا۔ درس گاہوں میں عربوں کے اثر و نفوذ کو محدود کرنے کے بارے میں یہ ایک اچھی مثال ہے۔ لیکن ان درس گاہوں کے Quaker پس منظر اور خشوگی کی بطور تاجر اسلحہ دھندلی شہرت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ دل خوش کن انجام دوسری جگہوں پر دہرانا اتنا آسان نہ ہو گا۔"

ان تینوں کالجوں نے ۷۸-۱۹۷۷ء کے بعد سے اب تک اس میدان میں مزید پیش رفت نہیں کی۔ ایک اور کالج نے جو کہ تقریباً سو میل پر واقع تھا' زیادہ جرات کا مظاہرہ کیا۔

مانگے ہوئے تحائف کی واپسی

Centre for Contemporary Arab Studies (CCAS) آف جارج ٹاؤن یونیورسٹی' امریکہ کا وہ اوّلین پروگرام تھا جو عصر حاضر کی دنیائے عرب کے مطالعہ پر مرکوز تھا۔ ۱۹۷۵ء میں قائم شدہ یہ مرکز جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے School of Foreign Service کا جزو تھا۔ CCAS نہ صرف عربی علوم میں ایم.اے. کی ڈگری کی تیاری کرواتا تھا بلکہ دوسرے بین الاقوامی امور کے طلباء کے لئے شمالی افریقہ' وادی نیل' ہلال زرّیں اور جزیرہ نمائے عرب میں آباد ۱۷۰ ملین (سترہ کروڑ) لوگوں اور ۲۲ سیاسی اداروں کے مطالعے کا موقع فراہم کرتا تھا۔

چونکہ اس ادارہ کو قائم کرنے کے لئے دو مرتبہ وفاقی امداد مانگی لیکن دونوں مرتبہ انکار ملا'

لہٰذا جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے مجوزہ مشرق وسطیٰ مرکز کے ڈائریکٹروں نے پیشتر ہی یہ فیصلہ کیا کہ ذاتی ذرائع سے امداد حاصل کی جائے۔ انہیں امید تھی کہ عرب حکومتوں سے تقریباً نصف رقم مہیا ہو جائے گی۔ جارج ٹاؤن کے اسکول آف فارن سروس کے ڈین Peter F. Krogh نے اصلی پلان کا خاکہ بتلاتے ہوئے کہا کہ ہمارا نکتہ نظریہ تھا کہ ہمیں عرب حکومتوں میں جانبداری سے کام نہ لینا چاہئے کہ کسی حکومت سے تو مدد طلب کریں اور کسی سے نہیں۔ اس سے تو یہ تاثر ملتا ہے کہ تعلیمی پروگرام بھی جانبدار نہ ہوگا۔

اس بارے میں اس وقت کے صدر یونیورسٹی اور دفتر برائے تعمیر و ترقی سے اجازت لے کر Rev. R.J. Henle اور Dean Krogh نے واشنگٹن میں قائم تمام عرب سفارت خانوں کا دورہ کیا اور اس مرکز کے قیام کا مقصد بتلا کر امداد کی درخواست کی۔ Dean Krogh کا کہنا تھا کہ میں سب کے پاس گیا چاہے ان کے امریکہ سے تعلقات تھے یا نہیں' انتہا پسند تھے یا میانہ رو' جو جیسے بھی تھے اس مطالعاتی پروگرام کے صدر نے بھی اس امداد مانگنے کے فلسفہ کو کچھ اس طرح بیان کیا کہ ہم یہ یقینی بنانا چاہتے تھے کہ کوئی بھی ہمیں کسی کا پٹھو نہ کہہ سکے۔

عمان امداد دینے والا اولین ملک تھا پھر متحدہ امارات' مصر اور سعودی عرب سے مدد ملی۔ پھر مئی ۱۹۷۷ء میں لیبیا نے ۷۵۰۰۰۰ ڈالر کا وعدہ کیا جو کہ پانچ سالوں پر محیط تھا' جس سے عرب ثقافت پر ایک Professorial Chair قائم کرنا مقصود تھی۔

لیبیا کی امداد پر اختلاف رائے اٹھ کھڑا ہوا۔ بقول ایک فیکلٹی ممبر کچھ حکام اور ٹرسٹیوں میں اس سے شدید بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ طلباء کے اخبار The Georgetown Voice میں کالم نویس Art Buchwald کا ایک خط چھپا' اس نے اس امداد کو دنیا کی ایک بدنام ترین حکومت کی طرف سے خون بہا قرار دیا۔ لیکن جارج ٹاؤن ایگزیکٹو وائس پریزیڈنٹ برائے تعلیمی امور Aloysius P. Kelley Rev. نے واشنگٹن پوسٹ کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ لیبیا کی اس امداد سے ہمیں اس مرکز کے بنیادی مقاصد حاصل کرنے میں مدد ملے گی یعنی امریکہ میں عرب دنیا کے بارے میں علم میں اضافہ کرنا۔

ڈین کروغ کا کہنا تھا کہ لیبیا اس عام درخواست کے جواب میں ہمیں امداد دے رہا تھا جس میں ہم نے تمام عرب ممالک سے مدد کی درخواست کی تھی۔ یہ ایک عطیہ تھا۔ انہوں نے چیک

بھجوادیا اور ہم نے بینک میں جمع کروادیا۔ انہوں نے نہ کبھی پوچھا اور نہ حساب مانگا۔ انہوں نے تو Stewardship Report تک نہ مانگی۔ سنٹر کے ڈائریکٹر مائیکل ہڈسن نے بطور خاص اخباری انٹرویوز میں اس بات پر زور دیا کہ اس عطیہ کے ساتھ کسی قسم کی شرائط منسلک نہ تھیں کہ کون پروفیسر اس چیئر پر تعینات ہوگا اور وہ کیا پڑھائے گا۔ ہم تعلیم اور سیاست کو خلط ملط نہیں کرتے۔

بعد ازاں جن حکومتوں نے چندہ دیا ان میں اردن' قطر اور عراق شامل تھے۔ عراقی ۵۰۰۰۰ ڈالر کا عطیہ ۱۹۷۸ء کے موسم بہار میں آیا۔ یہ غیر مشروط چندہ تھا جسے سنٹر نے بعد ازیں ایک "اسلامی اخلاقیات" کے ایک ماہر کی خدمات حاصل کرنے کے لئے مختص کیا۔ اسی دوران Henle سبکدوش ہوگیا اور یونیورسٹی کا صدر Rev. Timothy S. Healy مقرر ہوا۔ جولائی ۱۹۷۸ء میں Healy نے ایک انتہائی غیر معمولی قدم اٹھاتے ہوئے عراق کا یہ ۵۰۰۰۰ ڈالر کا عطیہ واپس کر دیا اور طرہ یہ کہ مرکز کو اپنی اس نیت سے پیشگی آگاہ بھی نہ کیا۔ رسمی طور پر اس کی وجہ یہ لکھی گئی کہ ایک اور عطیہ دینے والے نے اس مد میں عطیہ دیا ہے۔ عراقی مرکز اطلاعات و تحقیق کو ایک خط میں Healy نے لکھا "میرا ضمیر مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں یہ فیاضانہ چیک جو ہز ایکسی لینسی نے بھجوایا ہے' لوٹا دوں۔ مجھے امید ہے کہ ایسا کرنے سے ہم باہمی تعلقات جاری رکھ سکیں گے اور یونیورسٹی کے لئے یہ ممکن ہو گا کہ وہ عراقی حکومت کی سخاوت کی آئندہ کبھی پھر طلبگار ہو اور اسے اس کا شکریہ ادا کرے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس معاملے میں یونیورسٹی کی نزاکت حالات کو مدنظر رکھیں گے۔" لیکن CCAS کے فیکلٹی ممبران کا کہنا تھا کہ وہ اس نزاکت کو نہیں سمجھ پائے۔ عرب مطالعہ کے ڈائریکٹر John Ruedy کا تبصرہ تھا "اس یونیورسٹی کے نمائندہ کے طور پر ہم نے عراق سے امداد طلب کی لیکن اس یونیورسٹی کے صدر نے یہ رقم بغیر ہماری اجازت کے واپس کر دی۔ اس کی اس معاملہ میں مداخلت بہت ہی غیر معمولی بات تھی۔" ڈین کروغ نے پریس کو بیان جاری کرتے ہوئے کہا "میرے یہاں قیام کے دوران یہ پہلا موقع ہے کہ امداد کی رقم واپس کی گئی ہے" اور یہ بھی کہا کہ معاملہ میرے ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔

واشنگٹن اسٹار کے بموجب اس معاملہ میں عراقی امداد کے حمایتی اور مخالفین دونوں اس بات پر متفق تھے کہ اس فیصلہ کی وجوہ سیاسی تھیں۔ Ruedy نے کہا کہ مجھے علم نہیں کہ اس انکار کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ CCAS کے فیکلٹی ممبران کا الزام تھا کہ Healy کی اسرائیل نواز پالیسی کے

ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے اسرائیل نواز ممبران کا دباؤ اور یہودی لیڈروں کا اثر و نفوذ اس عطیے کی واپسی کا سبب بنا۔

Ruedy کا کہنا تھا کہ نہایت غلط وقت پر یہ فیصلہ کیا گیا۔ ہمیں سخت صدمہ ہوا۔ ہم کئی ماہ سے اس موضوع پر Healy سے بحث و تکرار کر رہے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بھی اسے پسند نہیں کرتا۔ اسے اس پر الجھن تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم اسے قائل کر چکے ہیں کہ وہ یہ عطیہ خاموشی سے قبول کر لے کیونکہ یہ ہم نے خود طلب کیا تھا اور اس اختیار کے ساتھ جو کہ اس کے پیش رونے ہمیں دیا تھا۔ بقول ایک فیکلٹی ممبر کے مرکز کے مسائل نے Healy کی آمد کے ساتھ ہی سر اٹھانا شروع کیا۔ اس کا پورے کا پورا سیاسی معاشرتی نظریہ برائے مشرق وسطیٰ نیویارک سٹی کے تناظر میں ڈھلا ہوا تھا جہاں کی وہ پیدائش تھا۔ وہ صاف کہتا تھا کہ اگر اس مرکز کے ابتدائی دنوں میں وہ یہاں موجود ہوتا تو یہ معرض وجود میں ہی نہ آتا۔ وہ مرکز کے مخالفین کے لئے ایک نہایت آسان شکار تھا۔ وہ لگاتار اور مسلسل دباؤ ڈالتے رہتے تھے۔ اس پر انتہائی شدید دباؤ تھا۔ Father Healy نے اس موضوع پر پریس میں کوئی تبصرہ کرنے سے انکار کر دیا کہ ایسا کرنے سے اس ادارے کو نقصان ہی پہنچے گا۔ یونیورسٹی کے ایگزیکٹو وائس پریزیڈنٹ برائے تعلیمی امور Rev. Aloysius P. Kelley نے بھی براہ راست تبصرہ سے انکار کیا کہ آیا یونیورسٹی نے اس عمومی عطیہ کو کسی اور مقصد کے لئے استعمال کرنے کا بھی جائزہ لیا تھا یا نہیں؟

Healy کے اس عطیہ کی واپسی کے باوجود جارج ٹاؤن کے اس نئے عرب مطالعہ مرکز پر اعتراض وارد ہوئے۔ رسالہ The New Republic نے جو Martin Perftz کی ملکیت میں آنے کے بعد بےحد اسرائیل نواز بن چکا تھا' جون ۱۹۷۹ء میں لکھا "یہ مرکز عربوں کے حق میں پروپیگنڈہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ یہ شذرہ Nicholas Lemann نے لکھا تھا کہ دوسری یونیورسٹیوں میں پہلے سے قائم شدہ مشرق وسطیٰ مطالعاتی مراکز کے برعکس جارج ٹاؤن مرکز اس مطالعے کو متوازن بنانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ یہ نہ تو اسرائیل کا مطالعہ عربوں کے ساتھ شامل کرتا ہے اور نہ کسی اسرائیلی اسکالر کو اس کے لئے مقرر کرتا ہے۔" سنٹر کے ڈائریکٹر Hudson اور ڈین کروغ نے اس الزام کا جواب تیار تو کیا لیکن اسے شائع نہ کیا:

"مثلاً ایسا کبھی ہوا ہے کہ چین کے بارے میں مطالعاتی مرکز سوویت یونین کا مطالعہ کرے

اور سوویت اسکالرز ملازم رکھے؟ یہ مرکز عربوں کا مطالعہ کرتا ہے اور یہ اسکالرز کو معروف طریقوں سے بذریعہ یونیورسٹی اور اسکول بھرتی کرتا ہے جس میں کسی بھی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ اگر اس ملک کو کوئی خاص مفاد پرست گروہ عربوں کے مطالعہ سے باز رکھتا ہے اور ان معیاروں پر کام نہیں کرنے دیتا جو کہ دوسری بڑی اقوام اور تہذیبوں کے سلسلے میں روا رکھے جاتے ہیں تو اس ملک کا علم اور بین الاقوامی تعلقات ان مخصوص ممالک کے گروہ کے بارے میں ناقص اور خطرناک حد تک قابل افسوس ہوگا۔"

The New Republic کے مضمون میں کہا گیا تھا کہ جارج ٹاؤن مرکز کو لگاتار عالمانہ معروضی معیار کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ واضح نہیں کیا جاتا کہ یہ الزام کون لگا رہا ہے؟ Lemann کا کہنا تھا کہ اس مرکز کے نکتہ چیں خفیہ حملہ آوروں کی طرح گمنام رہنا پسند کرتے ہیں۔

ہڈسن اور کروغ نے اپنے غیر مطبوعہ جواب میں لکھا تھا:

"سراغ رساں Lemann کو داد دینی چاہئے کہ اس نے لوگوں کے ایک غیر رسمی گروہ کو اس مرکز کو شرمسار کرنے کے لئے خفیہ طریقوں سے مصروف عمل پایا' لیکن اس کا یہ رویہ قابل مذمت تھا کہ اس نے انہی کی طرح اس کھلے عام بننے والے تعلیمی پروگرام کے خلاف انہی کے الزامات دہرا دیئے۔ زیادہ مناسب تو یہ ہوتا کہ وہ ان غیر رسمی گروہوں کے ممبران' طریقہ کار اور خفیہ مقاصد کو طشت از بام کرتا۔ ہمارے خیال میں تو عوام کو گہری دلچسپی ہونی چاہئے ایک ایسے خفیہ گروپ کی حرکات میں جو عربوں کے بارے میں علم حاصل کرنے اور تعلیم دینے میں روڑے اٹکاتا ہو۔ ہمیں یقیناً Mr.Lemann (یا اسکے ناشر Mr.Martin Peretz) کی ایسی معلومات میں دلچسپی ہوگی جو وہ اس بارے میں مہیا کر سکیں۔"

عراقی امداد واپس کر دینے کے باوصف جارج ٹاؤن کو لگاتار عرب امداد ملتی رہی جس میں کویت اور عمان کے ایک ایک ملین ڈالر شامل تھے جو انہوں نے ۱۹۸۰ء موسم خزاں میں دیئے۔ واشنگٹن پوسٹ کے مضمون میں ALC کی Ira Silverman رقمطراز تھیں کہ جارج ٹاؤن کے Arab Studies Centre کو کویت سے جو امداد مل رہی ہے اس کی وجہ سے وہ واضح طور پر عرب موافق اور اسرائیل مخالف رویہ کا حامل ہے اور یہ چیز اس کے نصاب تعلیم' فیکلٹی ممبران کے تعین اور مقررین کے انتخاب میں صاف جھلکتی ہے۔ اس کا مزید کہنا تھا کہ ایک ہی سیاسی سوچ رکھنے والے

ذرائع سے امداد لینے سے امریکی یونیورسٹیوں کی ایک قیمتی متاع یعنی ان کے کردار کی راست بازی کو داؤ پر لگایا جا رہا ہے۔

جارج ٹاؤن کے اہل کاروں نے اس تنقید کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ان عرب نواز اسکالرز کے اس عرب مطالعہ سنٹر میں ہوتے ہوئے دوسرے شعبوں میں اسرائیل نواز اسکالر موجود تھے' خاص طور پر Centre for Strategic and International Studes میں۔

۱۹۸۱ء میں ایک مرتبہ پھر صدر Healey نے ایک عرب عطیہ رد کیا جو کہ عرب مطالعہ مرکز نے خود طلب کر کے لیا تھا۔ اس مرتبہ یہ چار سال پیشتر کا دیا گیا لیبیا کا عطیہ تھا۔ ساڑھے سات لاکھ ڈالر میں سے چھ لاکھ ڈالرز مل چکے تھے۔ Healey بذات خود اس رقم کا چیک جس میں تقریباً ۴۲۰۰۰ ڈالر کا اس عرصہ کا سود بھی شامل تھا' لے کر لیبیا کے سفارت خانے گیا۔ Healey کا کہنا تھا کہ لیبیا کا بین الاقوامی پالیسی میں تشدد کے استعمال کی حمایت اور دہشت گردی کی روز افزوں امداد...... جارج ٹاؤن کے کردار سے لگا نہیں کھاتی تھی۔

اس مرتبہ بھی عام طور پر اس سرکاری وجہ پر اعتبار نہ کیا گیا۔ عرب مرکز کے ایک پروفیسر کا کہنا تھا کہ یہ ایک اخلاقی فیصلہ تھا اور بہت دیر بعد کیا گیا تھا۔ John Ruedy کا کہنا تھا: اگر آپ یہاں پوچھیں تو غالباً کوئی بھی عراقی صدر صدام حسین کی پالیسیوں کو پسند نہیں کرتا لیکن ہم نے اس حکومت کے ساتھ اس حد تک تعلقات رکھنے کی کوشش کی ہے اور جس حد تک ممکن ہوا اس کے عوام سے بھی۔ ہمارے خیال میں یہی ہمارا مطمح نظر (Mission) ہے اور میں لیبیا کے بارے میں بھی یہی رویہ رکھتا ہوں۔ میں قذافی کی اکثر باتوں کو قابل نفرین پاتا ہوں لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے' یہ عطیہ لیبیا کے عوام کی طرف سے تھا۔" پروفیسر ہشام شرابی کا واشنگٹن پوسٹ کو کہنا تھا کہ یہ سارا معاملہ ایک بلائے بے درماں تھا اور بعید عجیب وغریب۔

ڈین کرورغ نے اس رقم کی واپسی کی مخالفت تو کی لیکن اس پر اڑا نہیں۔ اس نے پریس میں بیان بازی سے اجتناب کیا اور صرف یہی کہا کہ ہمیں لیبیا کی حکومت سے قطعاً کسی دباؤ کا سامنا نہ ہوا کہ اس رقم کو کیسے خرچ کیا جائے۔ لیکن اس کا کہنا تھا کہ ڈین آخر کار ڈین ہوتا ہے اور صدر صدر ہی ہوتا ہے' صدر اپنی من مانی کرتا ہے۔

AJC کی Ira Silverman جارج ٹاؤن کے اس فیصلہ پر پھولی نہ سمائی' علاوہ ازیں اسی دن

جب یہ عطیہ واپس کیا گیا تو نیویارک سٹی کی سرمایہ کاری بینکنگ کمپنی .Bear Stearn and Co نے جارج ٹاؤن کو ایک لاکھ ڈالر کا عطیہ دیا۔ اس کے سینئر مینجنگ پارٹنر Alan Greenberg کا کہنا تھا کہ ہم ان کی تعریف کرتے ہیں اور یہ ہمارا ایک معمولی سا اظہار تشکر ہے۔

Healey کا Post میں کہنا تھا کہ لیبیا کو یہ رقم واپس کرنے کے لئے اس پر قطعاً کوئی دباؤ یا جبر نہ تھا لیکن مجھے یہ بات کھٹکتی تھی۔ آپ مجھے کاہل سست کہہ سکتے ہیں لیکن مجھے رفتہ رفتہ اس بات کا احساس ہوا کہ لیبیا کا رویہ جارج ٹاؤن کے ساتھ لگا نہیں کھاتا' البتہ رسالہ Washingtonian کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نے زیادہ صاف گوئی سے کام لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ لیبیا کے اس عطیہ کو بادل ناخواستہ منظور کیا گیا تھا اور یہ ایک وبال جان تھا۔ اس سے عرب اسرائیل جنگ کے ایک زبانی Version میں گھر گیا تھا۔ Washingtonian نے لکھا:

> "اس کے یہودی دوست ذاتی ملاقاتوں میں لعن طعن کرتے تھے۔ AJC نے یونیورسٹی کی مذمت میں ایک کھلا بیان جاری کیا۔ اس کے دلداری اور توازن بحال کرنے والے تمام اقدامات مثلاً اسرائیل کا نیک نیتی' خیر خواہی والا دورہ' امریکہ میں اسرائیلی سفیر کو اعزازی ڈگری دینا' عراق کے عطیہ کی واپسی اور کیمپس پر یہودی عبادت کے دوران یہودی نشان پہننا۔ کسی بھی چیز سے لیبیا کے عطیے کے خلاف غصہ ٹھنڈا نہ ہو سکا۔"

دراصل لیبیا کے عطیے سے پہلے Healey پر انتہائی شدید دباؤ تھا۔ یہودی پادریوں کے ایک گروہ نے اس کے دفتر آ کر ملاقات کی۔ یونیورسٹی کے متولیوں میں سے ایک بااثر یہودی ممبر Max Kampleman نے براہ راست مداخلت کی۔ ہلسنکی معاہدہ کے ایک سفیر کی حیثیت میں اس کا گہرا اثر تھا۔ اقوام متحدہ میں سابقہ سفیر آرتھر گولڈ برگ نے بھی اپنا پورا وزن اس دباؤ میں شامل کر دیا۔ John Ruedy کا کہنا تھا کہ Healey کو ڈھیروں خطوط موصول ہوئے جسے ایک دوسرے پروفیسر نے نفرت کی ڈاک کا نام دیا۔

لیبیا کے عطیہ کی واپسی کے بعد عرب مطالعے پر تنقید میں یقیناً معتد بہ کمی ہوگئی۔ ایک پروفیسر کا کہنا تھا: اگر لیبیا کا عطیہ واپس کرنے سے ہمیں کچھ دم لینے کی مہلت ملی اور اس بلا سے چھٹکارا حاصل ہوا تو یہ گھاٹے کا سودا نہ تھا' لیکن اس کے بعد عرب حکومتوں نے ہاتھ کھینچ لئے۔ بقول Ruedy ہمیں یہ علم ہے کہ یہ اہانت آمیز رویہ کی وجہ تھے۔ ایک معطی کا عطیہ واپس کرنا درحقیقت تمام پروار تھا۔

دوسری جانب جارج ٹاؤن یونیورسٹی نے عرب مطالعہ خود اپنے خرچ سے جاری رکھا ہوا ہے۔ ۱۹۸۳ء میں یہ یونیورسٹی کے ان نو پروگراموں میں شامل تھا جنہیں عمدہ معیار کے لئے نامزد کیا گیا تھا۔ Ruedy کا کہنا تھا کہ ایسے لگتا ہے کہ ہم نے دریائے شور عبور کرلیا ہے۔ بقول اس کے جارج ٹاؤن کے عرب مطالعاتی مرکز کا جاری رہنا اور تنازعہ کے باوجود ترقی کرنا اس کے ایک پرائیویٹ یونیورسٹی کے ساتھ الحاق کا مرہون منت ہے۔ اگر یہ ایک عوامی ادارہ ہوتا تو عرب مطالعہ کا پروگرام نہ ہوتا بلکہ یہودی مطالعاتی پروگرام یقیناً ہوتا۔ درحقیقت وہ سیاسی طور پر بیحد مفید ہوتا۔ جارج ٹاؤن اور Jesuits یہودی احتیاج سے کوسوں دور ہیں۔

اصل تکلیف کا باعث لفظ "عرب" تھا

ایک دوسری یونیورسٹی میں بھی عرب مطالعہ کا پروگرام ہے وہ پنسلوینیا کی .Villanova Univ ہے اور یہ بھی کیتھولک ادارہ ہے۔ ۱۹۸۳ء میں Villanova نے ایک ادارہ برائے عصری عرب اور اسلامی مطالعہ قائم کیا۔ اس کا ڈائریکٹر Father Kailellis ایک لبنانی نژاد آگسٹینین پادری ہے۔ ان کا یہ پروگرام چھوٹا سا ہے اور اس میں کسی بیرونی امداد کا عمل دخل نہیں۔ اس میں دوسرے علوم میں ڈگریاں حاصل کرنے والے زیر تعلیم طلباء کو عرب مطالعہ کا سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے۔ یہ ادارہ کانفرنسوں، لیکچرز اور ثقافتی تقریبات کا بھی انتظام کرتا ہے۔ بقول فادر ایلس "ہمارا مقصد طلباء کو عرب اسلامی دنیا کی تاریخ، زبان، سیاسیات اور ثقافت سے روشناس کرانا ہوتا ہے۔"

اس پروگرام کے اتنا چھوٹا ہونے اور عرب امداد کے بغیر چلنے پر بھی یونیورسٹی کے اندر کافی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں پولیٹکل سائنس کا شعبہ پیش پیش تھا۔ یہ دباؤ براہ راست نہ تھا بلکہ ہمیشہ پس پردہ ہوتا۔ اس شعبہ کے چند ایک افراد ہی اس بارے میں فعال تھے اور وہی مخالفت کی روح رواں تھے۔ اس شعبہ سے ابتداء ہی میں اس ادارہ کے قیام کے بارے میں مشورہ طلب کیا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں ایک اقلیتی اختلافی نوٹ منسلک تھا جس میں ایک پروفیسر نے یہودی فرقے پر اس پروگرام کے تاثر کے بارے میں لکھا تھا:

> "Villanova ایک بڑے طبقے کے اندر ہے جس پر اس کا معاشی اور سیاسی انحصار ہے۔ یہ بڑا طبقہ زیادہ تر پروٹسٹنٹ، کیتھولک، کچھ یہودی اور صرف چند مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اگر

Villanova نے اسلامی مطالعے کا ادارہ قائم کیا تو اس کا کچھ بھی منفی یا مثبت اثر پروٹسٹنٹ اور کیتھولک افراد پر نہ ہوگا' لیکن چونکہ یہ معاملہ جذباتی طور پر بیحد حساس ہے لہٰذا میرے خیال میں اس کے یہودیوں پر سخت منفی اثرات ہوں گے اور یہودی گو Villanova کے علاقے میں بہت تھوڑی تعداد میں ہیں لیکن معاشی اور سیاسی طور پر بہت بااثر ہیں۔ اس ادارہ کے قائم ہونے کی وجہ سے اغلباً یونیورسٹی کا صدر اپنی Holocaust Committee میں رول ادا کرنے کے لئے اتنا موزوں' مؤثر نہ رہ سکے۔ حالانکہ اس سلسلے میں اس کی خدمات کو یہاں کے یہودیوں نے بیحد سراہا ہے۔ میری رائے میں تو ایسا ادارہ قائم کرنے سے ہم یہودیوں کی معاشی اور سیاسی امداد سے محروم رہ جائیں گے۔"

ایک دوسرے پروفیسر کا تبصرہ تھا:

"مشرق وسطیٰ میں سیاسی طور پر اسرائیل امریکہ کا سب سے بڑا اتحادی ہے۔ اس کے USA کے ساتھ بہت قریبی اور وسیع اقتصادی اور تجارتی تعلقات ہیں۔ یہ لاکھوں امریکیوں کا ثقافتی اور مذہبی وطن ہے۔ اس مجوزہ پروگرام میں اسرائیل کے مطالعہ کو خارج کرنا ایک غلطی ہوگی اور اس سے داخلہ کم ہو جائے گا۔"

Ellis نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ تجویز یہ تھی کہ پروگرام کو عرب مطالعہ سے وسیع تر کر دیا جائے یعنی تکلیف کے باعث لفظ "عرب" تھا۔

جارج ٹاؤن کے John Ruedy کو Villanova والوں نے مدعو کیا کہ وہ ان کے عرب مطالعہ کے پروگرام کی تیاری میں بطور مشیر شرکت کرے۔ بقول اس کے اس کی مخالفت بہت دلچسپ تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اصل مسئلہ صیہونیت کا تھا لیکن کوئی یہ کہنے کا روادار نہ تھا۔ میں اپنے تجربہ کی بناء پر اس کا ادراک کر سکتا تھا۔ پہلی دفاعی لائن علمی میدان میں مخالفت کی ہوتی ہے لیکن جب آپ تمام تر اعتراضات کا شافی جواب دے چکتے ہیں تو پھر وہ اپنے اصلی روپ میں آ کر کہتے ہیں "یہ اسرائیل مخالف اور Anti Semitic ہے اور یہ چیز یونیورسٹی کے مفاد میں نہ ہوگی۔ ہمیں یہودی مخیر حضرات سے واسطہ رہتا ہے' وغیرہ وغیرہ۔" Villanova میں بھی بعینہٖ ایسا ہی ہوا۔

جب یہ ادارہ کھل گیا تو فادر ایلس کو امریکن پروفیسرز برائے امن مشرق وسطیٰ کی طرف سے جو کہ ایک اسرائیل نواز قومی تنظیم ہے' ایک خط موصول ہوا۔ اس کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر George

Kohen نے اس نقشہ پر اعتراض کیا جو کہ ان کے اشتہار میں چھپا تھا۔ اس نقشہ پر واضح انداز میں لکھا ہوا تھا "عرب اور دنیائے اسلام" اس میں مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک کو گہرے سبز رنگ میں اور غیر عرب ممالک یعنی ترکی' افغانستان' پاکستان وغیرہ کو ہلکے سبز رنگ میں دکھلایا گیا تھا۔ Cohen نے پوچھا کہ آیا اسرائیل کو غلطی سے نظر انداز کر دیا گیا ہے یا کہ اسے سیاسی طور پر شامل نہ کرنے کا پیغام دینا مقصود ہے؟ ایلس نے جواب دیا کہ اس نقشہ سے ان عرب اور اسلامی ممالک کو دکھلانا مقصود تھا جن کے بارے میں پروگرام ہے۔ بقول اس کے ہمارا مقصد ہرگز کوئی سیاسی بیان کسی بھی ملک یا اسرائیل کے بارے میں نہ تھا۔ مثلاً ایتھوپیا' سائپرس' مالی' شادیا پھر ترکمانستان' ازبکستان یا تاجکستان جو کہ سوویت یونین کے اندر ہیں لیکن ان سب میں مسلمانوں کی معتدبہ تعداد بستی ہے لیکن یہ بھی اس نقشہ سے خارج تھیں۔"

Cohen نے جواباً لکھا کہ اس جواب سے اس کی تشفی نہیں ہوئی اور ایلس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اس معاملہ کو اپنے شعبہ میں اٹھائے' پیشتر اس کے کہ وہ خود کوئی مزید اقدام کرے۔ Cohen نے یہ نہ بتلایا کہ وہ کون سے خصوصی مزید اقدام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور نہ ہی اس نے اس دوسرے خط کا جواب دیا۔ اس دوران .Villanova Univ کے علمی حلقوں میں Institute of Contemporary Arab and Islamic Studies سے دلچسپی بڑھتی گئی۔ اس دوران مشرق وسطیٰ کا مطالعہ کرنے والے علمی حلقے بتدریج بڑھتی ہوئی مخالفت کا شکار ہوتے گئے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ کسی ایک یا دو اداروں کے خلاف نہیں بلکہ قومی بنیاد پر ہیں۔

سوچنے والا مورچہ زد میں

پچھلے بیس سالوں میں امریکہ بھر میں جو "Think Tank" بنے ہیں ان میں جارج ٹاؤن یونیورسٹی کا Centre for Strategic and Interl. Studies ایک خاص امتیاز کا حامل ہے۔ ۱۹۶۵ء میں شائع شدہ اس CSIS کا اسٹاف اب بڑھ کر ۱۵۰ ہو چکا ہے۔ بجٹ ۶۰ لاکھ ڈالر کا اور شائع شدہ عنوانات ۲۰۰ سے زائد ہو چکے ہیں۔ اس مرکز کے روسٹر پر ممتاز ناموں میں ڈاکٹر ہنری کسنجر' ہاورڈ کے . اسمتھ' Lane Kirkland اور John Glenn شامل تھے۔ CSIS ایک غیر منافع بخش اور ٹیکس سے مستثناء تنظیم تھی جو کہ روایتی رویہ کی شہرت رکھنے کے علاوہ اپنے مشاورتی بورڈ میں

ڈیموکریٹ اور ریپبلکن دونوں اراکین کو شامل رکھتی تھی۔ واشنگٹن میں واقع اس ادارے کا ایک اہم ترین کام سرکاری لیڈروں کو ماہرانہ تحقیق اور تجزیہ مہیا کرنا تھا۔ CSIS جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے ناطے سے تدریسی، تعلیمی حلقے کا لازمی حصہ گردانا جاتا تھا۔ اس مرکز کی تمام Activities میں ماہرین کی شمولیت سے ہی گہرائی اور گیرائی سے تمام مسائل پر سیر حاصل بحث ہوسکتی تھی۔

اس مرکز کے اشتہار (Brochure) میں یہ درج ہے کہ ہم بین الشعبہ جاتی اور سیاسی وابستگیوں سے بالاتر سطح پر کام کرنے کے لئے موزوں ترین ہیں۔ اس کے باوجود اس کے Oil Field Security Studies Projects کے ڈائریکٹر کی ۱۹۸۱ء میں تیارہ شدہ رپورٹ عین اس وقت دبادی گئی جب کہ سعودی عرب کو AWACS مہیا کرنے کا مسئلہ پیش تھا۔ مرکز کے باہر اسرائیل کے حامیوں کو یہ ڈر تھا کہ اگر اس رپورٹ کے مندرجات کا علم کانگریس کو ہوگیا تو وہ شاید منظوری دے دیں جو کہ انہیں گوارا نہ تھا۔ چھ ماہ بعد اس ناخوش گوار رپورٹ کے خالق کو نہ صرف برطرف کردیا گیا بلکہ شہر بدر ہونے پر مجبور کردیا گیا۔

اس مظلوم کا نام مظہر حمید تھا جو کہ سعودی عرب کا باشندہ تھا۔ اس نے Fletcher School of Law and Diplomacy سے ڈگری حاصل کی ہوئی تھی اور بین الاقوامی حفاظتی امور کا ماہر تھا۔ امریکہ کے سابق سفیر برائے سعودی عرب Mr. James Atkins نے ۱۹۸۳ء میں مظہر حمید کے بارے میں لکھا تھا کہ اس ملک میں اس سے بڑھ کر بصیرت، ایمانداری، تجزیاتی صلاحیت اور مشرق وسطیٰ اور خصوصاً جزیرہ نما عرب کے بارے میں عمیق علم رکھنے والا شخص میرے تجربے سے نہیں گزرا۔ حمید کو ۱۹۸۰ء میں اس مرکز نے بطور ریسرچ فیلو ملازم رکھا تھا اور اس کا موضوع سعودی عرب کے تیل کے میدانوں کی سیکورٹی کے پراجیکٹ پر تحقیق کرانے کی ذمہ داری تھی۔ تعیناتی خط میں CSIS کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر Amos Jordan نے لکھا تھا، اس خط کو تیل کے میدانوں کی سیکورٹی پراجیکٹ کی منظوری بھی تصور کیا جائے۔

اس پراجیکٹ کے خدوخال مہینہ بھر پیشتر تیار شدہ خط میں Wayne Berman نے لکھ کر Jordan کو بھجوائے تھے اور وہی اس سلسلے میں فنڈ جمع کرنے کا ذمہ دار تھا۔ اس خط میں یہ درج تھا کہ مشرق وسطیٰ کے تیل کے میدانوں کی غیر محفوظ حالت کے سیاسی اور فوجی پہلوؤں پر توجہ مرکوز کی جائے گی۔ کن کن اطراف سے حملے ہونے کا امکان تھا؟ سیکورٹی پلاننگ کیا تھی؟ اور تکنیکی دفاعی

نقطہ نظر کیا تھا؟ (کویت میں جو چھ سو سے زائد تیل کے کنووں میں آگ ۱۹۹۱ء کی عراق' کویت جنگ کے بعد لگائی گئی اور جسے بجھانے میں اڑھائی سال سے زائد عرصہ لگا اور کھربوں ڈالر نقصان کے علاوہ جو عالمی ماحول کی تباہی ہوئی وہ مدنظر رہے۔ مترجم)

Amos Jordan نے خود حمید کو AWACS, F-15 کے Enhancement Package کی طرف توجہ دلائی تھی جبکہ Capital Hill پر ابھی یہ معاملہ زیر بحث بھی نہ آیا تھا۔ اگلے نو ماہ تک حمید نے اپنی تحقیق جاری رکھی اور اپنے نتائج کو تحریری رپورٹوں کی شکل میں ڈھالا۔ یہ تحریری رپورٹیں مرکز کے نائب صدر Amos Jordan اور صدر David Abshire کے علاوہ کئی بیرون مرکز ماہرین کو بھی دکھلائی گئی تھیں۔ حتمی رپورٹ CSIS نے شائع کرنی تھی۔

Jordan نے حمید کی رپورٹ پڑھ کر اس کی انتہائی تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ وہ مزید اسی معیار کی اعلیٰ رپورٹیں اس مرکز سے جاری ہوتے دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ Abshire نے بھی اس کی رائے سے اتفاق کیا تھا۔ Jordan نے ذاتی طور پر ان تحریروں کا ایک ابتدائی ڈرافٹ William Clark کو دیا تھا جو کہ اس وقت ڈپٹی سکریٹری آف اسٹیٹ اور بعد ازاں صدر ریگن کا نیشنل سیکیورٹی کا مشیر بنا۔ چند دوسرے مشرق وسطیٰ کے ماہرین جنہوں نے اس رپورٹ کی تعریف کی' ان کے نام کچھ یوں ہیں: Anthony Cordesman جو کہ Arms Forces Journal کے بین الاقوامی شعبہ کا مدیر تھا اور William Quandt جو کہ Brookings Institute کے انرجی اور نیشنل سیکیورٹی پراجیکٹ کا ڈائریکٹر تھا۔

۱۹۸۱ء میں Abshire اور Jordan اکٹھے ٹوکیو کے سفر پر گئے۔ وہ حمید کا حتمی ڈرافٹ ہمراہ لے گئے۔ Jordan نے بذریعہ ایک ٹیلکس وہاں سے کہا "میں نے دوران پرواز حمید کا سعودیہ سیکورٹی پیپر پڑھا۔ یہ ایک معلومات افزا اور خوبصورت تحریر ہے۔" اس ٹیلکس میں درج تھا کہ رپورٹ میں جو AWACS, F-15 دینے کی بھرپور وکالت کی گئی ہے اس کا لہجہ قدرے دھیما کرنے کی ضرورت ہے۔ Jordan نے لکھا تھا کہ یہ تحریر بھرپور وکالت ہے لیکن زائد از ضرورت نہیں' لیکن پیشتر اس کے کہ CSIS اس کو اندرونی طور پر شائع کرے اس نکتہ پر محتاط ایڈیٹنگ کی ضروت ہے۔ ۳۰۰ کاپیاں اور ۱۰' ۱۵ ستمبر ٹھیک رہے گا۔

ان ہدایات کی پیروی میں حمید نے مرکز کے سینئر ایڈیٹر Jean Newsom اور فوجی اور

سیاسی امور کے ڈائریکٹر William Taylor سے مل کر حتمی ڈرافٹ پر کام شروع کیا۔ دریں اثناء Newsom نے McGraw Hill ادارے کے ساتھ بات چیت کا آغاز بھی کر دیا تاکہ اس رپورٹ کی اشاعت ہو سکے۔

جب Newsom سے یہ دریافت کیا گیا کہ آیا وہ McGraw Hill کے ساتھ اس رپورٹ کی اشاعت کے بارے میں بات چیت کر رہی ہے تو اس نے پس و پیش سے کام لیا۔ ایک ٹیلیفونی انٹرویو میں اس نے کہا کہ ہم McGraw Hill سے مذاکرات نہیں کر رہے۔ صرف یہ پتہ کرنے کی کوشش ہے کہ آیا وہ دلچسپی لیں گے؟ لیکن حمید کے ایک ریسرچ اسسٹنٹ Trish Wilson کا بیان تھا کہ وہ قیمت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ انہوں نے McGraw Hill کو اس کتاب کی فروخت کے لئے تخمینہ بھی دیا۔

ستمبر' اکتوبر میں یہ ایڈیٹنگ اور مذاکرات بیک وقت جاری رہے۔ اکتوبر میں مرکز کے کنٹرولر David Wendt نے بالکل اچانک حمید کو یہ بتلایا کہ David Abshire نے کیلیفورنیا سے فون پر یہ حکم دیا ہے کہ مذکورہ رپورٹ شائع نہ کی جائے۔ وہ ٹوکیو سے واپسی پر وہاں چھٹی منا رہا تھا۔

حمید کو تشویش ہوئی اور اس نے مرکز میں Jordan اور دوسرے کئی اصحاب سے پوچھا۔ بقول اس کے ان کا کہنا تھا کہ اس مرکز کو بڑی بڑی امداد دینے والے جب یہ رپورٹ دیکھیں گے جو بقول ان کے معروضی حقائق پر مبنی نہیں تو وہ برافروختہ ہو جائیں گے۔ ریسرچ اسسٹنٹ Paul Sutphin کا کہنا تھا کہ مجھے یاد ہے کہ یہ ہمارے لئے اچنبھے کا باعث تھا کہ مرکز کو اس رپورٹ کو شائع کرنے میں معاً کوئی مسئلہ درپیش آ ئے۔ عین آخری وقت پر پھڈا پڑ گیا۔ حمید کا کہنا تھا کہ مرکز کی حاکیت اعلیٰ والوں نے دفعتاً اس رپورٹ کی اشاعت سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ Trish Wilson کو بھی یہ واقعہ یاد تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ اس کو ہرگز شائع نہ کرے' ذاتی طور پر بھی نہیں۔

حمید کے ایک ریسرچ اسسٹنٹ George Smalley کو بھی جو اکتوبر کے اوائل میں ہی تنخواہ کی بنیاد پر تعینات کیا گیا' بتلایا گیا تھا کہ اس کی حیثیت تبدیل کر دی جائے گی۔ بجٹ مشکلات کی بناء پر اس کو پیشگی منظور شدہ مراعات سے محروم کر کے فیس کی بنیاد پر ملازم رکھا جائے گا۔ ان پیشگی مراعات میں سوشل سیکورٹی بمع تنخواہ چھٹی' بیماری کی چھٹی اور سال بھر کے بعد جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں بغیر ٹیوشن فیس پڑھنے کی شقیں شامل تھیں۔ Smalley کو یقین تھا کہ حمید کی رپورٹ اور اس

کے ساتھ یہ سلوک آپس میں کچھ رابطہ رکھتے تھے۔

اس مرحلہ پر حمید نے پیش قدمی کا فیصلہ کیا اور کہا کہ میری خواہش ہے کہ میری رپورٹ AWACS کا معاملہ کانگریس میں پیش ہونے سے پہلے شائع ہو جائے۔ یہ دستاویز اس معاملے سے براہ راست تعلق رکھتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ کیپٹل ہل اس کو سامنے رکھے۔

حمید نے اس ۸۵ صفحات پر مشتمل رپورٹ کی کاپیاں ان تمام بڑی کارپوریشنوں کو بھجوائیں جو مرکز کو مالی امداد دیتے تھے۔ اس نے لکھا تھا کہ مجھے یہ بتلایا گیا ہے کہ آپ لوگ اس رپورٹ کی اس مرکز سے تشہیر پر جزبز ہوں گے۔ اس وقت تک حمید کا ان کمپنیوں سے کچھ بھی واسطہ نہ تھا۔ مرکز نے اسے خصوصی طور پر منع کیا تھا کہ وہ ان اداروں کے پاس مالی امداد کے لئے ہرگز نہ جائے کیونکہ مرکز کے ان اداروں سے دیرینہ روابط تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس میں کچھ رخنہ پڑے۔ حمید کا کہنا تھا کہ ان لوگوں نے پہلی مرتبہ میرا ذکر سنا، رپورٹ دیکھی، برانگیختہ ہوئے اور مرکز سے پوچھنا شروع کیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ بقول ان کے یہ دستاویز نہ صرف یہ کہ دلچسپ تھی بلکہ ایک منفرد نقطہ نظر کی حامل اور بروقت تھی۔ حمید نے یہ تسلیم کیا کہ ان میں سے کچھ کمپنیاں AWACS کی فروخت کے لئے حمایت حاصل کرنے میں مصروف تھیں۔ انہیں یہ چیز بہت مفید اور کارآمد دکھائی دی۔ میں نے یہ اثر و نفوذ ایک سمجھوتہ حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا۔ سمجھوتہ یہ تھا کہ مرکز نے مجھے یہ رپورٹ اپنی ذاتی حیثیت میں شائع کرنے کی اجازت دے دی لیکن وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ میں مرکز کے ساتھ اپنے رشتہ کا ذکر کروں۔ صرف یہ کہوں کہ میں پروگرام کا ڈائریکٹر تھا لیکن پروگرام کا نام نہ لوں۔ Paul Sutphin کے بقول وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ بتلایا جائے کہ یہ تحقیق اس مرکز کے سایہ تلے کی گئی تھی کیونکہ اس طرح یہ مزید معتبر قرار پاتی۔

حمید نے اس شرط کو مان لیا۔ بقول اس کے "میرا بنیادی مقصد تو اس رپورٹ کی اشاعت اور تشہیر تھا۔ اس دستاویز میں جو کہا گیا تھا وہ باقی تمام پہلوؤں سے زیادہ اہم تھا۔" چنانچہ حمید نے یہ رپورٹ اپنے ذاتی خرچہ پر شائع کر کے جاری کر دی۔

حکومتی حلقوں میں اس رپورٹ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ بقول حمید نہ صرف اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے مزید کاپیاں طلب کیں بلکہ کیپٹل ہل اور نیشنل سیکیورٹی کونسل (NSC) والوں نے بھی۔ اگلے ماہ جب مصری صدر انور السادات کا قتل ہوا تو اس کی تدفین میں شرکت پر جاتے ہوئے ولیم کلارک نے

اس کی کاپیاں سابقہ صدر یعنی نکسن' فورڈ اور کارٹر کو بھی مہیا کیں تاکہ وہ اپنا مشرق وسطیٰ کے بارے میں علم تازہ رکھیں۔ کلارک نے خاص طور پر Amos Jordan کو فون کر کے اس بارے میں اطلاع دی۔ Jordan نے یہ اطلاع خود حمید تک پہنچائی اور ساتھ ہی کہا کہ مرکز کا چیئرمین David Abshire بھی اس بارے میں رطب اللسان ہے۔

۲۸ر اکتوبر کو سینیٹ نے ۵۲ بمقابلہ ۴۸ ووٹ کی اکثریت سے وہ قرارداد مسترد کر دی جس میں سعودی عرب کو AWACS فروخت کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ حالانکہ ایوان نمائندگان بھی دو ہفتے قبل اسی طرح کی تحریک منظور کر چکا تھا اور اس فروخت کو روکنے کے لئے دونوں ایوانوں کی مجموعی اکثریت درکار تھی۔ سینیٹ کا یہ ووٹ اسرائیل نواز لابی کے لئے ایک نادر المثال شکست تھی۔ ایسی شکست جسے وہ بھلانے پر تیار نہ تھے۔

نومبر میں Steve Emerson نے Jordan سے ملاقات کی۔ یہ حضرت سینیٹر فرینک چرچ کے معاون رہ چکے تھے' جب چرچ سینیٹ فارن ریلیشنز کمیٹی کے ممبر تھے۔ اب وہ اس کی لاء فرم میں کام کرتے تھے۔ Emerson نے Jordan سے بہت تیکھے سوالات کئے' مرکز کی سرگرمیوں کے بارے میں جن میں سے کچھ حمید کے پراجیکٹ سے متعلق تھے۔ اس نے اس کو بتلایا کہ وہ The New Republic میں "Petro Dollar" کے اثر و نفوذ کے بارے میں ایک مضمون لکھ رہا تھا۔ اسے حمید کی رپورٹ میں دلچسپی تھی اور وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کے لئے اسے کس کس نے رقم مہیا کی تھی۔ اس انٹرویو کے بعد Jordan نے حمید کو فون کر کے بتلایا کہ وہ اپنی حفاظتی بیلٹ باندھ لے کیونکہ کچھ ہنگامہ متوقع تھا۔ بقول Jordan یہ انٹرویو ایک علامت خوفزدگی تھا۔ اس نے بعدازاں حمید کو بتایا کہ صاف ظاہر تھا کہ ایمرسن کے سوالات جارحانہ تھے اور ہمیں یہ فکر تھی کہ ہم پر الزاموں کی بوچھاڑ ہوگی۔

ایمرسن بمعہ حواریوں کے مرکز میں آیا اور The New Republic میں شائع کئے جانے والے مضمون کا مسودہ دکھلایا۔ یہ ایمرسن کے ایک سلسلہ مضامین کی پہلی کڑی تھی جس میں یہ دکھلانا مقصود تھا کہ عرب کس طرح امریکی رائے عامہ پر اثرانداز ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس میں اس طرف توجہ مرکوز کروائی گئی تھی کہ کس طرح وہ پالیسی "Think Tank" جو عرب تجارتی مفادات رکھنے والی تیل کی کارپوریشنوں سے رقوم وصول کر رہے تھے۔ وہ ان کمپنیوں کے سیاسی مفادات کا

تحفظ کرنے کے پابند تھے۔اس مسودہ میں CSIS پر براہ راست انگشت نمائی نہیں کی گئی تھی اور مرکز کے عاملوں کو یہ توقع تھی کہ وہ آسانی سے حمید کی اس رپورٹ کے ہنگامے میں سے صحیح سلامت گزر جائیں گے۔

حمید جو کہ جسمانی اور ذہنی طور پر نڈھال ہو چکا تھا۔ دسمبر میں تعطیلات پر روانہ ہوا۔ Jordan نے اسے یقین دہانی کروائی تھی کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ حمید کا کہنا تھا کہ میں جنوری میں واپس لوٹا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرات ایک مرتبہ پھر مرکز تشریف لائے تھے اور اس مرتبہ The New Republic کے مضمون کا مسودہ مرکز پر خصوصی انگشت نمائی کا مظہر تھا۔ مرکز کے ایک سینئر اسٹاف Jon Vondracek نے حمید کو یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ The New Republic کے ناشر Martin Peretz سے رابطہ رکھے ہوئے تھا اور اس کے خیال میں مرکز کا اثر ورسوخ اس رسالے کو کوئی نقصان پہنچانے سے باز رکھے گا۔

اس دوران ایمرسن نے حمید کے دفتر فون کر کے رپورٹ کے بارے میں تفتیش کی اور خاص طور پر یہ دریافت کیا کہ اس پراجیکٹ کے لئے کس نے رقم مہیا کی تھی؟ جب حمید نے رقوم کی فراہمی کے ذرائع کا انکشاف کرنے سے معذرت کی تو ایمرسن نے دھمکی دی کہ وہ CSIS اور Petro Dallrs کے درمیان تعلق کے الزام کو مشتہر کر دے گا۔ حمید نے اسے کامیابی کا دعا دی۔ حمید اور اس کے اسٹاف کو فون کرنے کے علاوہ اس نے متعدد کارپوریشنوں سے بھی رابطہ کیا تاکہ اس تحقیق کے لئے رقوم مہیا کرنے والوں کا کھوج لگایا جاسکے۔ حمید کا کہنا تھا کہ مزے کی بات تو یہ تھی کہ میرے پراجیکٹ میں رقوم دینے والی وہ کمپنیاں ہرگز نہ تھیں جن کی آپ توقع کرتے ہوں گے۔ مجھے یہ احساس تھا کہ مجھے ایسی کمپنیوں سے رابطہ نہیں رکھنا چاہئے جو میرے کام پر اثر انداز ہو سکتی ہوں۔ مجھے جو کہنا تھا اس کے لئے مجھے کسی بھی گروپ کے اثر ونفوذ کی ضرورت نہ تھی۔ خصوصاً وہ جو رقوم مہیا کر رہی تھیں۔ مجھے یہ خیال تھا کہ کسی بھی قسم کا دباؤ ظاہر نہ ہو۔ جب میں نے خود اس قدر احتیاط کا دامن تھامے رکھا تھا تو آخر کار یہ سب ہنگامہ کیوں؟

۱۷ر فروری ۱۹۸۲ء کو دی نیو ریپبلک میں ایمرسن کے مضامین کی پہلی قسط بعنوان "The Petro-Dollar Connection" شائع ہوئی۔ رسالے میں یہ کہا گیا تھا کہ آئندہ اقساط میں تحقیقی اداروں اور یونیورسٹیوں کے Policy Think Tanks کے لئے مشروط رقوم فراہم کرنے والوں کو

طشت از بام کیا جائے گا۔

اگلے ہی روز مرکز پر ایک اور جانب سے وار ہوا۔ McGraw Hill کے ایک معقول ذیلی جریدے Platts Oilgram News میں ۱۸ر فروری کو ایک آرٹیکل حمید کی رپورٹ کے بارے میں شائع ہوا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ CSIS نے اس رپورٹ کو چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ عنوان تھا "جارج ٹاؤن اسٹڈی" اسرائیل امریکہ پر دباؤ ڈالنے کے لئے سعودی تیل کی رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے۔ اس بارے میں رپورٹ کے اس سیکشن کا حوالہ دیا گیا جس میں سعودی عرب پر ہمسایوں کی طرف سے درپیش خطرات پر بحث کی گئی تھی۔ CSIS کے ڈائریکٹر اسی طرح کے مندرجات کے بارے میں انتہائی فکر مند تھے کیونکہ اس میں اس نکتہ کی وضاحت کی گئی تھی کہ اسرائیل چونکہ سعودی عرب کو ایک متحارب ملک تصور کرتا ہے لہٰذا وہ پیش بندی کے طور پر سعودی عرب کے فوجی اور معاشی مفادات پر ضرب لگا سکتا ہے۔ Oilgram کے مضمون میں درج تھا کہ اس مطالعہ میں کہا گیا ہے کہ اسرائیل پہلے ہی سعودی عرب کے کچھ علاقوں پر قابض ہے (Tiran اور Sanafir کے جزائر) اور ۱۹۷۶ء سے اسرائیلی جنگی جہاز سعودی عرب کے تبوک ہوائی اڈہ پر حملے کی مشقی پروازیں کرتے رہے ہیں اور کئی مرتبہ انہوں نے اپنے خالی تیل کی ٹنکیاں بھی اس پر گرائیں' علاوہ ازیں اسرائیل کا بھی یہ کہنا ہے کہ ہماری ایئر فورس اپنے طور پر تیل کی ترسیل کی ناکہ بندی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے یعنی سعودی عرب کے تیل کے کارخانوں کو تباہ کر کے۔

Platts Oilgram News کے مدیر Onnik Maraschian کو یہ معلوم نہ تھا کہ رپورٹ کس نے لکھی ہے اور یہ کہ ذاتی طور پر کئی ماہ پہلے مشتہر ہو چکی تھی۔ بقول Maraschian کے "ہمیں صرف یہی علم تھا کہ ایسی رپورٹ ہے۔ اس کا مسودہ CSIS رپورٹ کے طور پر تقسیم کیا گیا تھا' لیکن بعد میں واپس لوٹایا گیا۔ لیکن ہم نے پھر بھی شائع کر دیا کیونکہ یہ CSIS کا پراجیکٹ تھا۔"

اس مضمون کی اشاعت کے بعد CSIS کے لوگوں کی طرف سے فون پر کاپی فراہم کرنے کی درخواستیں ملنی شروع ہو گئیں۔ اب مرکز کے لئے یہ خاصی شرمندگی والی بات تھی۔ کیا ان کو اقرار کر لینا چاہئے کہ انہوں نے یہ رپورٹ دبالی تھی؟ وہ اس بات کی کس طرح وضاحت کر سکتے تھے کہ یہ انہوں نے کبھی شائع ہی نہیں کی؟ نائب صدر A. Jordan نے متعلقہ اسٹاف کو ایک میمورنڈم جاری کیا جو بدحواسی کا شاہکار تھا۔ اس میں اسٹاف کی توجہ اس آرٹیکل کی طرف دلائی گئی تھی جو

Platts میں شائع ہوا تھا اور یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ تمام معلومات مانگنے والوں کو مندرجہ ذیل سطور پر جواب دیا جائے:

مرکز نے پچھلے موسم خزاں میں سعودی سیکورٹی اور امریکی مفادات پر سایہ فگن خطرات کے عنوان والی سٹڈی مکمل نہیں کی۔ ہم سال بھر سے زائد عرصے سے تیل کے کنوؤں کی سیکورٹی پر تحقیق کر رہے تھے جو کہ ہنوز جاری ہیں۔ اس پراجیکٹ سے کئی تحقیقی ٹکڑے تخلیق ہوئے ہیں جن میں سے ایک وہ ادھورا ڈرافٹ ہے جس کا مندرجہ بالا عنوان ہے۔ لیکن یہ ہمارے مرکز کی تحقیق کی نمائندگی نہیں کرتا۔ یہ تو مسئلہ کا ایک چھوٹا سا گوشہ ہے اور وہ بھی بالکل ابتدائی مرحلہ میں۔ جب یہ اسٹڈی اس سال کے اواخر میں تکمیل پذیر ہوگی تو اس کو بطور ایک CSIS رپورٹ کے عوام کے سامنے پیش کیا جائے گا۔"

Maraschian کا کہنا تھا کہ وہ یہ دیکھ کر حواس باختہ ہوگئے کہ ہم وہ رپورٹ کام میں لے آئے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ جب انہوں نے اس شخص کو یہ کام سونپا تو انہیں اس کی قابلیت و لیاقت کا علم تھا' تو سال بھر تک کیوں اس کا دم بھرا اور پھر ہاتھ کھینچ لیا؟ اس کے خیال میں دیکھیں نا جس شے نے انہیں بھنا دیا وہ اسرائیل کی طرف سے بطور پیش قدمی حملے کا امکان تھا۔ دلچسپی کی بات تو یہ ہے کہ اس پیش قدمی کے لئے یکطرفہ حملہ جو کہ اسرائیل کر سکتا تھا سعودی عرب پر۔ اس کے بارے میں صرف حمید ہی کے خیالات ایسے نہ تھے۔ گورنمنٹ کی ایک رپورٹ کے خفیہ متن میں جس کا عنوان تھا "اسرائیل کے لئے امریکی امداد" اور جو ۱۹۸۳ء جون میں پریس کو افشاء کی گئی تھی۔ اس میں CIA کا یہ موقف بطور انتباہ درج تھا کہ مستقبل میں عرب افواج کو جدید تر بنانے کے ردّعمل کے طور پر اسرائیل آئندہ کسی بحران کے موقع پر پیشگی حملہ کر سکتا ہے۔ درحقیقت سالہا سال سے اسرائیل کے فوجی کارندے سعودی عرب کے خلاف ایسے ہی حملے کا کھلے عام ذکر کرتے رہتے ہیں۔

Platts کے مضمون کی ندامت اور اس ڈر سے کہ اسرائیلی لابی اس مرکز کو بدنام نہ کر دے۔ Jordan اور Abshire نے آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ حمید اس مرکز کے لئے زیادہ بھاری پتھر تھا' حالانکہ یہ دونوں سعودی عرب کو AWACS کی فروخت کے حامی تھے۔ ہفتہ بھر بعد مرکز کے کمپٹرولر نے حمید کو آگاہ کیا کہ اس کو اپنے دفتر کے لئے دی گئی جگہ کے لئے ۱۵۷۰ ڈالر ماہوار اضافی سرچارج دینا ہوگا۔

پراجیکٹ ڈائریکٹر کے طور پر حمید پہلے ہی اپنے فنڈز کا ۲۴ فیصد دفتری متفرق اخراجات کے لئے اور ۲۰ فیصد مرکز کے عمومی اخراجات کی مد میں ادا کر رہا تھا۔ یہ نئی ادائیگی اس کے ماسواء تھی۔ حمید کا کہنا تھا کہ میں نے ایس و آن تو کی لیکن آخر کار مان گیا' اس کے بعد دھماکہ ہوا۔ انہوں نے اس کو ۱۸ ماہ پیشتر سے لاگو قرار دے دیا۔ Vendt نے حمید کو بتلایا کہ نئے اضافی اخراجات کے ساتھ اس کے ذمہ ۴۰۰۰۰ ڈالر بقایا تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے یہ خسارہ حکام کو بتلانا پڑے گا اور شاید حمید کا پراجیکٹ لپیٹ دیا جائے۔

حمید سناٹے میں آگیا اور ایک سینئر اسٹاف ممبر John Shaw سے رابطہ کیا۔ اس نے رازداری سے حمید کو بتلایا کہ David Abshire غصے میں بھرا بیٹھا ہے لیکن نہ جانے کیوں؟ دن بھر کمیٹی کے اجلاس جاری رہے' اغلباً اسی مسئلے سے نمٹنے کے لئے۔ حمید کو پتہ چلا کہ اس کا حل صرف اس کا رضاکارانہ استعفیٰ تھا۔ اپریل میں حمید Jordan سے ملا تو اسے غیر متوقع طور پر سرد مہر اور روکھا پایا۔ Jordan کا کہنا تھا کہ اسے اس خسارے کی تشویش تھی اور حمید کا پراجیکٹ مالی مشکلات کا شکار تھا۔ چند روز بعد حمید کو Jordan نے بذریعہ خط مطلع کیا کہ پراجیکٹ کو اگلے ماہ کے اواخر میں ختم کر دینا ہوگا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بڑی خوشی سے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرلے گا' اگر حمید ایک کافی معتدبہ رقم کی امداد کا خود بندوبست کر لے۔

یہ خط وصول کرتے ہی حمید نے Jordan سے ملاقات کی۔ اسے اب بھی امید تھی کہ پراجیکٹ کو بچایا جاسکتا ہے۔ وہ اب بھی Jordan کو بطور ایک دوست کے سمجھتا تھا جس نے ذاتی اور پیشہ ورانہ طور پر اس کی مدد کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید Jordan کو اس کی رقوم حاصل کرنے کے بارے میں معلومات توڑ مروڑ کر پیش کی گئی ہیں' لیکن Jordan ٹس سے مس نہ ہوا اور کہنے لگا کہ یہ اضافی چارجز ضابطہ کی کاروائی کے تحت لاگو ہوئے ہیں اور وہ اس معاملے میں بے بس تھا۔ حمید نے اسے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ اس پراجیکٹ کو سمیٹنے کے لئے اسے تین چار ماہ کا عرصہ دیا جائے لیکن بات نہ بنی۔

حمید نے مرکز کے چند دوسرے ممتاز لوگوں سے بات کی تاکہ پراجیکٹ کو بچایا جاسکے۔ ایک نے مشورہ دیا "اس وقت دبکے رہو' جب یہ طوفان گزر جائے گا تو پھر شاید ہم تمہیں دوبارہ بلا سکیں۔" لیکن حمید کا کہنا تھا کہ بنیادی بات یہ ہے کہ کسی نے بھی میری حمایت نہ کی۔ سبھی نے منہ پھیر لیا اور

ایسا ہونے دیا۔ انتقام کی آگ بھڑک چکی تھی۔

۵ مارچ کو جب حمید یہ سن کر دفتر آیا کہ اس کی ملازمت ختم ہونے والی ہے تو اس نے دیکھا کہ اس کے دفتر میں گذشتہ شب نقب لگائی جاچکی تھی۔ کسی نے تین مقفل دروازے توڑ کر حمید کے ڈیسک کے ساتھ والی فائلوں کی الماری بھی قفل توڑ کر کھول لی تھی۔ نقب زن کو پہلے دفتر کی عمارت میں داخل ہونا تھا جو کہ الیکٹرونک نگہبانی کے نظام سے آراستہ تھی۔ یہ سسٹم سیکورٹی کارڈوں کے ذریعے کھلتا تھا پھر اسے اندرونی دفتر کا تالہ کھولنا پڑتا تھا اور آخر میں حمید کے دفتر کا تالہ۔ یہاں توڑ پھوڑ کر کے گھسنے کے کوئی آثار نہ تھے لیکن فائلوں والی الماری تڑی مڑی تھی اور دراز زبردستی باہر دھکیل نکالے گئے ہوئے تھے۔ بقول Paul Sutphin اس میں عام نقب زنی' ڈاکہ کے کوئی آثار نہ تھے۔ وہاں کئی دوسری قیمتی اشیاء تھیں جن کو ہاتھ نہ لگایا گیا تھا۔ درحقیقت کچھ بھی نہ لیا گیا تھا۔ Trish Wilson کا کہنا تھا کہ یہ بالکل ظاہر طور پر ایک بھونڈی کوشش تھی اور اغلباً صرف ہمیں خوفزدہ کرنے کے لئے کی گئی تھی۔

اگلے دن حمید کو پتہ چلا کہ اس کا پوسٹ آفس بکس (جو وہ کچھ خط و کتابت کے لئے استعمال کرتا تھا) بھی توڑ دیا گیا تھا۔ چند روز بعد اس کا گھریلو پوسٹ بکس بھی توڑ کھولا گیا۔ حمید نے بتلایا کہ کئی عجیب و غریب واقعے ہوئے۔ مثلاً میں اختتام ہفتہ پر گیا اور جب گھر لوٹا تو کئی اوپری اشیاء جیسے Contact Lenses وہاں موجود پائے۔ یہ تمام واقعات حمید کے لئے بیحد تشویشناک تھے۔ خاص طور پر یہ Contact Lenses والا بھونڈا مذاق' کیونکہ حمید اندھا ہے۔

حمید نے یہ مرکز مارچ کے آخر میں چھوڑ دیا۔ مئی اور جون میں دوسری اور تیسری اقساط The New Republic نے شائع کیں جس میں امریکہ میں پیٹروڈالرز کے اثر و نفوذ کا ذکر تھا۔ اس میں وہ انکشافات برائے "پالیسی تھنک ٹینک کو مشروط عطیات" موجود نہ تھے جن کا وعدہ کیا گیا تھا۔

حمید کے CSIS والی داستان کا آخری باب مئی ۱۹۸۲ء میں وقوع پذیر ہوا جب اسے یہ مرکز ترک کئے کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ حمید کے کئی احباب سے مرکز کے انتظامی افسران نے رابطہ کر کے اس پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی۔ ایک نے تو حمید کی شہریت کے سلسلے میں ایک سینئر عہدیدار کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ کئی کارپوریشنوں نے اس واقعہ کے بعد جارج ٹاؤن یونیورسٹی کو دی جانے والی اپنی امداد میں کمی کر دی اور واضح کر دیا کہ یہ حمید کے ساتھ روا رکھے گئے سلوک کا

شاخسانہ تھا۔

Amos Jordan سے جب حمید کے لگائے گئے الزامات کے بارے میں پوچھا گیا تو اس کا کہنا تھا کہ یہ تمام واقعات محض حادثاتی طور پر بیک وقت وقوع پذیر ہوئے تھے اور حمید کو صرف کارکردگی کی بناء پر فارغ کیا گیا تھا۔ اس نے لابی کے دباؤ کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے الزام سے انکار کرتے ہوئے کہا "میں نے اپنی بساط سے بڑھ کر حمید کی حمایت کی باوجود اس خسارہ کے۔ مجھے اس بات کی فکر تھی کہ مرکز پر صیہونیت کی چھاپ نہ لگے۔"

یہ اس اسکالر کے لئے سخت ابتلاء کا وقت تھا۔ چند ہفتوں کے قلیل عرصے میں اسرائیل نواز رسالے کے لوگوں نے مرکز کو نرغے میں لے لیا۔ وہ پیٹرو ڈالرز کے اثر و نفوذ کو طشت ازبام کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ IRS کے ضابطوں کے تحت مرکز کے Tax-Status کے بارے میں دھمکی اور حمید کے پراجیکٹ کے بارے میں رقوم کی فراہمی پر سوالات کی بوچھاڑ' انہی واقعات سے پیشتر اور بعد ازاں اس رپورٹ کا اخفاء' حمید کی ذات کو ہراساں کرنا اور اس کے احباب و ساتھیوں کو پریشان کرنا اور حمید کی برخاستگی جیسے واقعات ہوئے۔ اگر یہ تمام واقعات یونہی اچانک اکٹھے وقوع پذیر ہوئے تھے تو یہ ایک نہایت اچنبھے والی بات تھی۔

William Quandt نے اپنے قیام CSIS کا ذکر کرتے ہوئے کہا "جس طریقے سے انہوں نے اس کا تعلق توڑا وہ قدرے عجیب تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کے ساتھ انتہائی گھٹیا سلوک کیا گیا۔" وہ حمید کا ذاتی دوست اور Brooking Inst. کا سینئر فیلو تھا۔ مشرق وسطیٰ امور کے ایک سابقہ اسپیشل اسسٹنٹ برائے وہائٹ ہاؤس Les Janaka کا کہنا تھا "CSIS کو اپنے نام سے ایک نہایت مفید پیپر شائع کرنے کی توفیق نہ ہوئی جس کا عوامی بحث میں قابل قدر کردار تھا۔"

باب ہشتم

"ٹسکن"... دھاندلی کی ایک نظیر

نومبر ۱۹۸۰ء میں ایریزونا یونیورسٹی کے مشرق قریب مرکز کی بیرونی رابطہ کار Sheila Scoville کے دفتر میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی آیا جس کا ماتھا بال گرنے سے پھیل رہا تھا۔ اس کا فوری مقصد تو ایک کتاب مستعار لینا تھا لیکن جاتے وقت اس نے کہا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ ایک عرب نواز پروپیگنڈہ نیٹ ورک چلا رہی ہیں۔

یہ شخص Boris Kozolchyk تھا جو ایروزینا یونیورسٹی میں قانون کا پروفیسر اور ٹسکن کی جیوش کمیونٹی کونسل کی کمیونٹی ریلیشنز کمیٹی کا نائب صدر تھا۔ Kosolchyk کا یہ بیان مشرق قریب مرکز پر ایک تین سالہ حملہ کا پیش خیمہ تھا جس کا اختتام مرکز کے ڈائریکٹر کے استعفیٰ اور مقامی پبلک اسکولوں سے اس مرکز کے تحقیقی تعلیمی مواد کے اخراج پر منتج ہوا۔ یہ حملہ مقامی جیوش کمیونٹی لیڈروں کے لگاتار ہاؤ ہو سے کامیاب ہوا حالانکہ ملکی سطح کے جانے پہچانے ممتاز مشرق وسطیٰ ماہرین کا یہ کہنا تھا کہ اس پروگرام پر اسرائیل مخالف ہونے کا الزام قطعاً بے بنیاد تھا۔

ٹسکن کی اس لمبی مہم کی داستان اس طریقہ واردات کی ایک درخشاں مثال ہے جو اس کمیونٹی کے اسرائیل نواز سرگرم کارکن لگاتار دباؤ ڈالنے اور نت نئے طریقے اختیار کرنے کے لئے عمل میں لاتے ہیں۔

یونیورسٹی کا یہ مشرق قریب مرکز ان گیارہ اداروں میں سے ایک ہے جن کو وفاقی مالی امداد میسر ہے اور جو مشرق وسطیٰ کے بارے میں ہماری مفاہمت اور علم بڑھانے کے لئے کام کر رہے ہیں۔ وفاقی مدد کا مستحق بننے کے لئے یہ شرط ہے کہ ان میں سے ہر مرکز اپنی صلاحیتوں کا ایک حصہ مقامی کمیونٹی کے لئے Outreach یعنی خارجی نظر اور تعلیمی پروگراموں کے لئے وقف کرے۔ یہ فلموں کی شکل میں پبلک لیکچرز، اطلاعاتی اور مشاورتی سروس، تاجروں کے لئے سیمینار یا پھر پبلک اسکولوں کے

نصاب کی ترقی کی صورت میں ہوں۔

Sheila Scoville کو ایریزونا یونیورسٹی کے لئے اس پروگرام کی رابطہ کار کے طور پر کام کرتے ہوئے چار سال بیت چکے تھے جب ٹسکن کی جیوش کمیونٹی کونسل نے اس کی شکایت کرنی شروع کی۔ تاریخ مشرق وسطیٰ میں ڈاکٹریٹ (U.C.L.A.) کی حامل شیلا اس عہدہ کے لئے پوری استعداد رکھتی تھی۔ اس نے ٹسکن کے Outreach پروگرام کو ملک کے بہترین پروگراموں میں جگہ دلائی تھی۔ اس پست قد سنہری بالوں والی پختہ عمر لڑکی نے مڈل ایسٹ Outreach کونسل کے بھی چھکے چھڑا دئے تھے۔ یہ کونسل ان تمام گیارہ اداروں کے درمیان رابطے کا کام کرتی تھی۔

- فروری ۱۹۸۱ء میں ٹسکن جیوش کمیونٹی کونسل (T.J.C.C.) کے تین نمائندوں اور Kozolchyk نے William Dever سے ملاقات کی۔ ولیم اس شعبہ مشرقی مطالعہ کا چیئرمین تھا جس کا یہ مرکز مشرق قریب ایک جزو تھا۔ انہوں نے ولیم سے کہا کہ شیلا سکوول اور مشرق وسطیٰ کا ڈائریکٹر Ludwing Adamec دونوں ہی اسرائیل مخالف رجحان رکھتے ہیں جس سے ان کی مشرق وسطیٰ کے بارے میں معروضیت قابل اعتبار نہیں رہتی۔ Dever کا کہنا تھا کہ Outreach پروگرام پر وفاقی حکومت کا اختیار تھا کیونکہ رقوم کا معتدبہ حصہ وہ مہیا کرتے تھے۔ اس کی تجویز تھی کہ یہ گروہ ایک باقاعدہ کمیٹی بنا کر بلا کسی قدغن کے اس مشرق قریب مرکز کے Outreach مواد کا معائنہ کریں۔ اس نے یہ تک کہہ دیا کہ وہ خود ذاتی طور پر وہ تمام مواد لائبریری کے شیلفوں سے اٹھا دے گا جو TJCC کے خیال میں قابل اعتراض ہو۔ بعد ازاں ایک میٹنگ میں Adamec نے خود یہ پیشکش کی کہ وہ خود ان تمام کتب کا معائنہ کرے گا جو ان کو قابل اعتراض لگتی ہیں اور اگر وہ ایسی ہوئیں تو وہ شیلا کو کہے گا کہ ان کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دے۔ لیکن Kozolchyk اور اس کے ساتھیوں نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ ان کے عزائم اس سے کہیں بلند تھے۔

Dever کی رائے پر عمل کرتے ہوئے TJCC نے چار عورتوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جس نے اپنے آپ کو متعلقہ اساتذہ کا نام دیا۔ (ان میں سے صرف دو واقعی استانیاں تھیں اور وہ بھی ٹسکن کی ایک نجی عبرانی اکادمی میں) Dever نے انہیں شیلا سے متعارف کروایا اور اسے کہا کہ انہیں اس تفتیش کے سلسلے میں حتی المقدور امداد مہیا کی جائے۔

ان چار میں Carol Karsch نامی محترمہ بھی تھیں جو کہ TJCC کی کمیونٹی ریلیشنز کی نائب

صدر اور ٹسکن کی قدیم ترین قدامت پسند یہودی عبادت گاہ (Synagogue) کے صدر کی اہلیہ بھی۔ بعد ازاں Karsch نے ہی Kozolchyk کے ہمراہ اس Outreach پروگرام کے خلاف حملہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس گروپ نے پہلے تو شیلا کو مل کر اس کی تمام مصروفیات کے بارے میں اس پر تند و تیز جرح کی۔ انہوں نے اس کی ڈاک کی لسٹ کی کاپی طلب کی' پھر ان اساتذہ کے نام مانگے جنھوں نے لائبریری سے کتب 'لٹریچر نکلوایا تھا۔ پھر اس گروپ کو دفتری اوقات کے بعد مشرق قریب دفتر میں داخل ہو کر لائبریری کے مواد کی چھان پھٹک کی اجازت دے دی گئی۔ ماہ مئی تک ان چار خواتین نے ایک ابتدائی رپورٹ تیار کی۔

انہوں نے اپنی رپورٹ Dever کو دینے کی بجائے براہ راست امریکہ کے محکمہ تعلیم کو ارسال کر دی۔ Carol Karsch نے واشنگٹن کو جو خط لکھا اس کے ہمراہ یہ رپورٹ لف کر دی اور اس میں وفاقی فنڈ کو ایک ایسے مقصد کے لئے استعمال کرنے پر اعتراض کیا جو بقول اس کے "گنجلک مسائل کا شکار اور باہمی آویزش کا مرکز ہو جیسا کہ مشرق وسطیٰ" اس رپورٹ میں زور دار طریقہ سے یہ تجویز دی گئی کہ TJCC کا مقصد اس Outreach پروگرام کو کلیتاً ختم کرانا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر اسرائیل کے مفاد اور اس کے بارے میں معروضی حقائق بیان کرنے والا مواد کافی تعداد میں رکھ بھی دیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ وہ سارا مواد یکسر خارج کر دیا جائے جو عرب مفاد کا ترجمان اور پروپیگنڈہ پر مبنی ہے تو مسئلہ پھر بھی جوں کا توں برقرار رہے گا۔ یہ تو Outreach پروگرام کو ہٹانے کا مسئلہ ہے۔ (نہ کہ کسی ایک ادارے کے ذریعہ سے اس پروگرام کے عمل پذیر ہونے کا۔)

محکمہ تعلیم نے جواباً TJCC کو بتلایا کہ Outreach پروگرام کے مواد یا اس کی عالمانہ حیثیت کا تعین اس کی ذمہ داری نہ تھی بلکہ یہ یونیورسٹی کا کام تھا۔ چنانچہ TJCC نے پھر اپنی توجہ یونیورسٹی پر مرکوز کی۔ کونسل کے ایک وفد نے یونیورسٹی کے صدر John Schaefer کو مل کر یہ شکایت کی کہ انہیں اس پروگرام کے مواد میں تعصب جھلکتا نظر آتا ہے۔ صدر نے وفد کو یقین دلایا کہ ایسا تمام مواد یونیورسٹی کے معیار کے مطابق ہوگا اور معاملہ لبرل آرٹس کالج کے ڈین Paul Rosenblatt کے حوالے کر دیا۔ روزن بلاٹ نے ۵/ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو TJCC کے نمائندوں اور شعبہ مطالعہ شرقیہ کے ممبران فیکلٹی کے درمیان ملاقات کا اہتمام کیا۔ شیلا سکوول کو مدعو نہ کیا گیا۔ اس میٹنگ میں شعبہ کے نئے صدر Robert Gimello نے تجویز کیا کہ TJCC اپنے خدشات کو ذرا پوری وضاحت سے

تحریر کر کے پیش کرے تا کہ وہ اس کا جواب اپنے شعبہ سے تیار کروا سکے۔ اس کے ساتھ ہی Gimello نے شعبہ مطالعہ شرقیہ میں ایک ایڈہاک کمیٹی بنانے پر بھی رضامندی ظاہر کی جو Outreach پروگرام پر نظر ثانی کرے۔

TJCC نے یہ موقعہ غنیمت جانا اور مزید لائبریری مواد سے مسلح ہو کر اس رپورٹ پر جت گئی۔ اس نظر ثانی کرنے والوں میں سے کوئی بھی مشرق وسطیٰ کے بارے میں علمی مہارت نہ رکھتا تھا۔ ۱۹ مارچ ۱۹۸۲ء کو انہوں نے تقریباً سو صفحات پر مشتمل رپورٹ یونیورسٹی کو پیش کی۔ اس میں مرکز کی پندرہ تصنیفات، پانچ پمفلٹوں اور سوانح اور دو اساتذہ گائیڈ بکس پر تبصرہ شامل تھا۔ اس میں ایک کتاب میں فلسطین کو عربوں کا روایتی وطن لکھے جانے پر اعتراض تھا اور دوسری جگہ P.L.O. کو فلسطینیوں کی واحد جائز نمائندہ تنظیم لکھے جانے پر اعتراض تھا۔ ایک نقشہ کو اس بناء پر قابل اعتراض قرار دیا گیا کہ اس میں یروشلم کو اسرائیل کے دارالحکومت کے طور پر نہ دکھلایا گیا تھا۔ حالانکہ ابھی امریکہ کی حکومت نے بھی اس کی حیثیت تسلیم نہ کی تھی۔ مزید یہ کہا گیا کہ اس تمام مواد میں یہودیوں کو ایک ایسے علاقے پر ناجائز قابض کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو حقیقت میں عربوں کا وطن تھا۔

ان بارہ ضمیموں میں جو رپورٹ کے ہمراہ لف تھے ایک قانونی میمورنڈم بھی شامل تھا جو ایک ٹسکن اٹارنی Paul Bartlett کا تیار کردہ تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ یہ Outreach مرکز امریکن دستور کی اوّلین ترمیم کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور وفاقی مالی امداد کا مستحق نہ تھا کیونکہ یہ عرب اسرائیل تنازعے کے بارے میں پبلک اسکولوں اور پریس کو اسرائیلی نکتہ نظر سے محروم رکھنے کا مرتکب ہو رہا تھا۔ اس میں یہ بھی دعویٰ کیا گیا تھا کہ پروگرام دستور کی خلاف ورزی کر رہا ہے یعنی مذہب اور ریاست کو جدا نہیں رکھ رہا۔ کیونکہ یہ مشرق وسطیٰ کے بارے میں مذہبی ترجیح کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ اسلام کی حمایت میں ہے اور دانستہ طور پر یہودیوں کے مشرق وسطیٰ سے تعلق کی اہمیت کو گھٹاتا ہے۔

یہ رپورٹ Karsch اور Kozolchyk نے چار رضاکاروں کی مدد سے مشترکہ طور پر تیار کی تھی۔ ان میں سے ایک یہودی ربی، ایک زراعتی ماہر معاشیات جس نے اسرائیل میں تعلیم پائی تھی اور ایک غیر یہودی جوڑا (خاوند وکیل اور بیوی بچوں کے اسکول کی استانی) شامل تھے۔

Gimello نے رپورٹ کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہ خیال انگیز نیک نیتی پر مبنی کیمونٹی کا ردّعمل تھا۔ اس کی اپنی کمیٹی اس پروگرام کی ماہرانہ تحقیق کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ اس کے پانچ

ممبران میں سے ایک جاپانی لسانی ماہر' ایک ہندوستانی دیہی علم الانسان کا ماہر اور خود وہ بدھ مت کا ماہر تھا۔ یعنی پانچ میں سے صرف دو ممبران مشرق وسطیٰ کا پس منظر رکھتے تھے۔ ایک عربی ادب کا ماہر اور دوسرا یہودی تاریخ کا۔ Adamec نے کمیٹی کے کام میں شمولیت نہ کی کیونکہ وہ دریں اثناء چھ ماہ کے یہودی تبلیغی دورہ پر پاکستان روانہ ہو چکا تھا۔ شیلا سے کسی نے مشورہ ہی نہ کیا۔

مارچ میں ایڈہاک کمیٹی نے TJCC کی رپورٹ ملنے کے بعد تقریباً دو ماہ تک اس مواد کی نظر ثانی کی جو اس نکتہ چینی کی زد میں آیا تھا اور یہ طے کرنے کی کوشش کی کہ اس کا کیا کیا جائے۔ مئی ۱۹۸۲ء میں (جبکہ تعلیمی سال کا اختتام قریب تھا اور کمیٹی کے کئی ممبران نے تعطیل پر روانہ ہونا تھا) کمیٹی نے ایک حیران کن عارضی فیصلہ دیا "جب تک ہمارے غور و خوض کا آخری مرحلہ طے نہیں ہوتا تو حتمی فیصلے کو محفوظ رکھتے ہوئے مشرق وسطیٰ مرکز اپنا مواد ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کو تقسیم کرنا بند کر دے۔"

اس Outreach پروگرام کی معطلی TJCC کے لئے ایک غیر متوقع فتح تھی۔ انہوں نے Karsch اور Kozolchyk کو جون میں سالانہ ایوارڈ ڈِنر میں "Man and Woman of the Year" کے لئے نامزد کیا۔ ان چاروں رضاکاروں کو بھی خصوصی تعریفی ایوارڈوں سے نوازا گیا کیونکہ ان کا کام بہت عالمانہ اور معروضی تنقید کا حامل تھا۔ لیکن یہ فتح کا جشن بہت قبل از وقت ثابت ہوا۔

جب ڈائریکٹر مشرق قریب مرکز Ludwing Adamec اگست کے وسط میں پاکستان سے لوٹا تو وہ مشرق اسٹڈیز شعبہ کے اس اقدام پر بیحد سیخ پا ہوا۔ اس نے تمام شعبہ جات کو میمو بھیج کر ان کی توجہ TJCC کی Outreach پروگرام کے خلاف چلائی گئی مہم کی جانب مبذول کرائی۔ اس نے کہا کہ یہ رپورٹ قطعاً عالمانہ نہیں تھی بلکہ بچکانہ اور اغلاط سے بھرپور تھی۔ اس میں نامعقول اعتراضات کی بھرمار اور نقلی نقائص کا ذکر تھا۔ اس کی رائے میں اس پروگرام کی بندش انتہائی غیر مناسب' قبل از وقت اور کمیٹی کا ماہرانہ مشورہ حاصل کئے بغیر کی گئی تھی۔ اس کے خیال میں یہ انتہائی احمقانہ بات تھی کہ علماء کی کمیٹی جو اس میدان میں مہارت نہ رکھتی ہو اس بات میں حکم لگائے۔ طلباء اخبار کے ستمبر کے شمارے میں ابتدائی رپورٹ کی یہ شہ سرخی دیکھ کر "شعبہ نے اسرائیل مخالف مواد خارج کر دیا" Adamec کا پارہ مزید چڑھ گیا۔ اس نے طلباء پیپر کو لکھا کہ ہمارے مرکز میں کوئی اسرائیل مخالف مواد نہیں۔ اس میں مشرق وسطیٰ بشمول اسرائیل کے بارے میں کتب اور دیگر مواد

ہے۔ یہ تمام کتب ماہرین کے مشورہ پر چنی گئی ہیں اور اس معاملے میں ہمیں دوسرے اداروں سے مثلاً یونیورسٹی کی لائبریری سے زیادہ مختلف نہیں ہونا چاہئے' البتہ وہاں جو کتب موجود ہیں اس سے اتفاق ہونا لازمی نہیں۔

قدرتی طور پر ہم ایریزونا کے عوام کے سبھی طبقات سے عمدہ تعلقات رکھنا چاہتے ہیں اور ان کی حمایت کے خواہاں ہیں' اس لئے ہم سبھی طبقات کا سنجیدگی سے خیال رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں ایک ایسے معاملے کے بارے میں جواب طے ہو چکا ہے' سنسنی خیز سرخیاں لگانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ معاملہ طے ہونے سے کوسوں دور تھا۔ Adamec کے زوردار اصرار پر Gimello نے ایک دستاویز تیار کی جس میں Outreach سنیٹر کی معطلی کے فیصلے کو کالعدم قرار دیا گیا۔ اس میں ایڈہاک کمیٹی کی TJCC رپورٹ کے بارے میں حتمی رپورٹ شامل تھی۔ مختلف فرقوں کے تنقید اور تبصرہ برائے Outreach پروگرام کا حق تسلیم کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ شعبہ مشرقی مطالعہ کے ممبران یہ حق اپنے لئے محفوظ رکھتے ہیں کہ وہ کسی پروگرام کی علمی قدر کے بارے میں فیصلہ کریں۔ اس دستاویز میں شیلا سکوول اور Ludwig Adamec کے بارے میں TJCC کی ذاتی تنقید پر کڑی نکتہ چینی کی گئی' خصوصاً ان کے اوپر سیاسی جانبداری کا الزام دھرنے پر۔

> "یوں تو دونوں اسکالرز ان الزامات کی تردید کرتے ہیں لیکن ان الزامات کے جھوٹے یا سچے ہونے سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ درحقیقت یہ لاتعلق اور ضابطہ کے خلاف ہیں۔ ہمارے شعبہ کے ممبران کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہیں سیاسی خیالات رکھیں۔ کسی بھی آزاد اور کھلے معاشرہ میں یونیورسٹی بحث و مباحثہ اور مناقشہ کا گھر ہوتی ہے اور کمیونٹی Outreach پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے یہ اس مباحثہ' مناقشہ سے مبرا نہیں ہو جاتی۔ ان تمام وجوہ کی بناء پر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمارا یہ پروگرام بند نہیں کیا جائے گا اور نہ وہ تمام کتب جو اس پروگرام میں استعمال ہوتی ہیں ترک ہوں گے' تالہ بند ہوں گی یا جلائی جائیں گی۔"

اس میمو میں اس بات کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا تھا کہ معاشرے کو مشرق وسطیٰ کے بارے میں مختلف حلقہ ہائے خیال سے متعارف کرایا جائے۔ ایک ایسی بوقلمونی جس سے ہر شہری واقف ہو پیشتر اس کے کہ وہ کوئی آزاد اور مبنی بر ذہانت ذاتی رائے قائم کرے۔ اس ایڈہاک کمیٹی کی رپورٹ میں

درج تھا کہ اس پروگرام کے سارے مواد میں سیاسی جانبداری کا شائبہ تک نہ تھا اور نہ ہی کسی بھی گروہ کی سیاسی وابستگی کو یہ مواد چنتے وقت بطور معیار سامنے رکھا گیا۔

TJCC نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ یہ مواد یونیورسٹی کے اندر تو استعمال کے لئے موزوں تھا لیکن باہر ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کے لئے ناموزوں کیونکہ کم عمر طلباء ان معاملات کی نزاکت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ Gimello نے اپنے اس بیان میں اس طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ پروگرام مواد کا ہدف یہ کم عمر طلباء نہیں بلکہ اساتذہ تھے۔ اب یہ ان کی صواب دید پر منحصر تھا کہ وہ اپنے طلباء کو اس میں سے کیا پڑھائیں۔

تب Carol Karsch نے Gimello کے پیش رو William Dever پر ذاتی حملے شروع کر دیے جو کہ اس سے قبل شعبہ مشرقی علوم کا سربراہ تھا۔ Dever ماہر آثار قدیمہ تھا اور اسے اسرائیل میں کھدائی کا وسیع تجربہ تھا۔ وہ اگست میں سال سبت گذار کر واپس لوٹا تھا۔ اس کی آثار قدیمہ ریسرچ کا دارومدار اسرائیل کی خیرسگالی پر تھا۔ شعبہ کی حتمی رپورٹ وصول ہوجانے کے تین ہفتے بعد اکتوبر کے اواخر میں Karsch نے ایک مہمان اسرائیلی پروفیسر Shalom Paul (جو تل ابیب واپس جارہا تھا) کو بتلایا کہ Dever اب اسرائیل کا دوست نہیں رہا۔ اس نے کہا کہ واپس جاکر سب کو بتلادو تاکہ Dever کبھی بھی اسرائیل میں کھدائی نہ کر سکے۔ اس کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ پروفیسر پال تو Dever کا ایک قریبی دوست ہے اور یہ پیغام کبھی بھی اسرائیل واپس نہ لے جائے گا' بلکہ اس نے الٹا Dever کو اپنی ٹسکن سے روانگی سے پیشتر ہی اسے Karsch کے ساتھ اپنی اس گفتگو سے آگاہ کر دیا۔

اس سے مطلع ہوتے ہی Dever نے Mrs. Karsch کو ایک خفگی سے بھرا خط ارسال کیا کہ میرے پاس یقین کرنے کی وجوہ ہیں کہ آپ (اور شاید چند اور نے بھی) نے مجھ پر الزام تراشی کی ہے کہ میں نے (۱) اپنی صدارت شعبہ کے دوران Outreach پروگرام کے بارے میں TJCC کی تحقیقات میں روڑے اٹکائے۔ (۲) یہودی مطالعہ کے پروگرام کو بند کرنے کی دھمکی دی' اگر یہ تحقیقات جاری رہی۔ (۳) اگست میں اسرائیل سے واپسی کے بعد اس پروگرام کے دوبارہ جاری کرنے پر اکسایا اور (۴) اس مشرق وسطیٰ مرکز کے Outreach پروگرام کی نگرانی کے لئے بنائی جانے والی نئی تشکیل شدہ کمیٹی میں جان بوجھ کر یہودی فیکلٹی ممبران کی شمولیت روکنے میں حصہ لیا۔ مجھے حال ہی میں ایک سے زیادہ ذرائع اور ایک براہ راست واسطہ سے یہ پتہ چلا ہے کہ مجھے سرعام یہودی

حلقوں میں بطور "Anti Zionist" بلکہ "Anti Semitic" کے طور پر مشہور کیا جا رہا ہے۔

Dever نے ان تمام الزامات کی صحت سے انکار کیا اور کہا "آپ کی تحقیقات میں روڑہ اٹکانا تو کجا، ریکارڈ یہ ظاہر کرے گا کہ میں نے بھرپور تعاون کیا اور بے لاگ رائے دی۔ آپ یا آپ کے گروپ کے ارکان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا۔" Dever نے اپنا روزگار، پیشہ ورانہ وقار اور اپنی ریسرچ کو داؤ پر لگا دیکھ کر Karsch سے کہا کہ وہ اس حملہ کے قانونی دفاع کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ اس نے اس خط کے آخر میں دستخط کرتے ہوئے کہا "آپ کے ردِّعمل کا منتظر Willam Dever۔"

بجائے ردِّعمل موصول ہونے کے Karsch اور Kozolchyk کی طرف سے یونیورسٹی کو ایک تند و تلخ جواب موصول ہوا جو کہ شعبہ مشرقی مطالعہ کے حتمی ردِّعمل کے جواب میں تھا۔ انہوں نے اسے ایک دھوکہ کی ٹٹی قرار دیا اور یہ مطالبہ کیا کہ شعبہ TJCC کے الزامات کا نکتہ بنکتہ جواب دے۔ شعبہ ایک مرتبہ پھر اس پر آمادہ ہو گیا۔ ۱۰ر دسمبر سے لے کر ۲۹ر دسمبر ۱۹۸۲ء تک شعبہ نے ۳۳۰ صفحات پر مشتمل "TJCC رپورٹ برائے مشرق وسطیٰ Outreach، ایریزونا یونیورسٹی پر مفصل اور سیر حاصل تبصرہ" ترتیب دی۔ یہ دستاویز نئے صدر یونیورسٹی Henry Koffler کو پیش کی گئی جو دریں اثناء ستمبر میں Schaeffer کی جگہ تعینات ہو چکا تھا۔

بیرونی ماہرین سے چھٹکارا

صدر Koffler ٹسکن میں نووارد تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ یہاں والوں سے گھل مل جائے۔ اس نے اپنی آمد کے چند ماہ کے اندر ہی زنانہ صیہونی تنظیم Haddasah کی ایک میٹنگ سے خطاب کیا۔ اس نے شعبہ مشرق وسطیٰ کی رپورٹ پر صاد کرنے کے بجائے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ملک بھر میں مختلف جگہوں سے مشرق وسطیٰ کے ماہرین کی ایک پینل کو مدعو کرے گا کہ وہ آ کر TJCC کے الزامات کی چھان بین کریں۔ Outreach مواد پر نظرثانی کریں اور اس جھگڑے میں ثالثی کریں۔

کوفلر نے TJCC اور شعبہ مشرقی علوم سے آٹھ آٹھ ماہرین نامزد کرنے کو کہا۔ اس میں سے طرفین کو ایک دوسرے کے آدھے آدھے نام رد کرنے کا ویٹو تھا۔ آخری حتمی آٹھ ماہرین میں سے کوفلر نے چار ماہرین کا انتخاب کیا۔ (۱) Richard Frye ہارورڈ سے (۲) Carl Brown پرنسٹن سے (۳) William Brinner برکلے سے اور (۴) Nahum Glatzer بوسٹن یونیورسٹی

سے۔ یہ طے پایا کہ یہ چاروں ماہرین ٹسکن میں ۲۹؍جولائی سے یکم اگست تک نشست کر کے Outreach پروگرام کے بارے میں تمام الزامات کی چھان بین کریں گے اور یہ طے کریں گے کہ اس کے مواد میں TJCC نے جس جس آئٹم پر انگشت نمائی کی تھی وہ کس قدر عالمانہ یا محض پروپیگنڈہ نوعیت رکھتی ہے۔

دریں اثناء کوفلر نے حکم دیا کہ شعبہ کے فیکلٹی اور اسٹاف ممبران نہ تو پریس کو کوئی بیان دیں اور نہ اس معاملے کو بیرون یونیورسٹی لے جائیں لیکن TJCC کو اس ماہرانہ فیصلہ کی پرواہ نہ تھی لہٰذا انہوں نے ایسی کوئی پابندی قبول نہ کی۔

اولاً TJCC نے نیویارک کی نیشنل جیوش کمیونٹی ریلیشنز ایڈوائزری کونسل کی وساطت سے معاملے کو واشنگٹن میں امریکی محکمہ تعلیم کے سامنے پیش کیا۔ نیویارک کی تنظیم کے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر نے بعد از ثانوی تعلیم کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر Edmond Elmendorf کو خط میں TJCC کی فہرست الزامات دہرادی۔ TJCC نے اپنی مخالفانہ رپورٹ کی کاپی Elmendorf کے علاوہ نمائندہ امریکہ James McNulty اور امریکی سینیٹر Dennis DeConcini کو بھی ارسال کی۔ یہ دونوں ایریزونا کے تھے۔ محکمہ تعلیم (DOE) کو Deconcini نے لکھا کہ اگر TJCC کے الزامات مبنی برحقیقت ہیں تو محکمہ تعلیم کی طرف سے اس قسم کے پروگراموں کو وفاقی امداد فوراً موقوف کر دینی چاہیے۔ ایریزونا کے سینیٹر نے الزامات کی مکمل وفاقی تحقیقات کا اس خط میں مطالبہ کیا۔

ان دونوں کانگریس ممبران کے مطالبہ کے جواب میں D.O.E. نے کہا کہ مطبوعات اور علمی مواد کا جانچنا معروف علمی حلقوں کا کام تھا اور یہ کہ ماہرین کی پینل جو عنقریب منعقد ہونے والی تھی اس مسئلے کا باہمی تسلی بخش حل تلاش کر لے گی۔

جب Adamec کو TJCC کے ان الزامات کا علم ہوا تو اس نے کوفلر کو تحریری تجویز دی کہ وہ TJCC سے اس بارے میں وضاحت طلب کرے کہ انہوں نے کوفلر کی ثالثی کی کوششوں پر اتفاق کرنے کے باوجود وعدہ خلافی کرتے ہوئے معاملے کو یونیورسٹی کے باہر کیوں ہوا دی؟ Adamec نے اس بارے میں TJCC کی نیت پر شک کا اظہار کیا کہ انہوں نے معاملہ عین اس وقت اٹھایا تھا جب وفاقی امداد کے مقابلے کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ الزام تراشی ہمیں فنڈز سے محروم رکھنے کے لئے کی جارہی تھی۔

جب ان کوششوں کے باوجود بھی مرکز کو اگلے علمی سال کے لئے وفاقی امداد مہیا کر دی گئی تو Deconcini اور McNulty نے ایک مشترکہ خط .D.O.E کے سکریٹری Terrence Bell کو لکھا جس میں انہوں نے یہ شکایت کی کہ امداد کا چکر مکمل ہونے دیا گیا' حالانکہ نظر ثانی کرنے والے گروپ کو TJCC کی وہ دستاویز مہیا نہیں کی گئی جس میں Outreach پروگرام کے ذریعہ ممکنہ پروپیگنڈہ کا ذکر تھا۔ انہوں نے Bell سے یہ درخواست کی کہ آپ ہی وہ اہل کار ہیں جو اس فنڈ کی فراہمی کو وقتی طور پر معطل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ معطل کر کے مکمل تحقیقات کا حکم دیں جیسا کہ DeConcini نے درخواست کر رکھی ہے۔

سکریٹری Bell نے ان دونوں نمائندگان کو جواب میں لکھا کہ وفاقی دخل اندازی نہ صرف غیر معقول بلکہ غیر قانونی بھی ہوگی۔ بقول اس کے یہاں پر آزادی درس و تدریس کے علاوہ تعلیم پر ریاستی اور مقامی کنٹرول کا پہلو بھی اٹھے گا۔ اس معاملے میں واضح رائے رکھنے کے باوجود Bell نے برافروختہ نمائندگان کو قدرے ٹھنڈا کرنے کے لئے یہ بھی لکھا کہ وہ یونیورسٹی کو کہے گا کہ وہ نزاعی مواد کی مزید اشاعت اس وقت تک ملتوی کر دے جب تک مقامی کمیٹی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتی۔

اِدھر TJCC کانگریس کی مدد طلب کرنے میں مصروف تھی اور اُدھر Adamec کو پتہ چلا کہ Kozolchyk اس پر حملے کر رہا ہے۔ یونیورسٹی کے صدر کوفلر کو بذریعہ خط یہ اطلاع Adamec نے دی کہ Kozolchyk میری ذاتی زندگی اور پس منظر کے بارے میں جھوٹی اطلاعات پھیلا رہا ہے۔ خصوصاً اس نے یونیورسٹی کے شعبہ مطالعہ یہودیت کے ممبران کو یہ بتلایا کہ Adamec دوسری جنگ عظیم میں جرمن افواج کا ممبر تھا۔ اس نے پروفیسر Dever کو یہ بھی بتلایا کہ Adamec کو بطور نازی گرفتار کیا گیا تھا۔ Kozolchyk نے آخر کار یہ بھی کہا کہ ایک جلسہ عام میں Adamec نے اسرائیل کو قزاق ملک کہا ہے۔ درحقیقت Adamec کو لڑکپن میں نازیوں نے گرفتار کیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے آبائی وطن آسٹریا سے فرار ہو کر سوئیزرلینڈ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈیڑھ سال جیل میں رہنے کے بعد اسے ایک مشقتی کیمپ میں بھجوا دیا گیا جہاں وہ جنگ کے خاتمے تک رہا۔ اپنے خط میں Adamec نے لکھا کہ یہ تمام الزامات مضحکہ خیز تھے اور کہا کہ میں Kozolchyk سے آشنا نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ ان کردار کش الزامات لگانے سے اس کا کیا مقصد ہے۔ ماسوا اس کے کہ مجھے مشرق وسطیٰ مطالعہ کے پروفیسر اور مشرق وسطیٰ مرکز کے ڈائریکٹر کے طور پر نااہل ظاہر کیا جائے جو کہ

میں ۱۹۷۵ء سے قائم کر کے چلا رہا ہوں۔ اس نے یونیورسٹی کی شکایات کمیٹی سے کہا کہ وہ Kozolchyk کی سرزنش کرے اور اسے الزام تراشی سے احتراز کرنے کا حکم دے۔

لیکن بھلا TJCC اور Kozolchyk کہاں باز آنے والے تھے۔ جب انہیں واشنگٹن کی جانب سے تسلی ملنے میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے اپنی توجہ مقامی کمیونٹی اور خصوصاً لوکل اسکول ڈسٹرکٹ پر مرکوز کی۔ مئی ۱۹۸۳ء میں TJCC نے اپنے Outreach پروگرام پر حملہ کی ایک نقل Jack Murrietta کو دی جو کہ "ٹسکن متحدہ اسکول ڈسٹرکٹ" کا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھا۔ علاوہ ازیں انہوں نے Murrietta کو شیلا سکوول کے موسم بہار سمسٹر میں پڑھائے گئے ایک نئے کورس بموسومہ "مشرق وسطیٰ کا جائزہ" کے بارے میں نئے الزامات گھڑ دیئے۔ Murrietta نے یونیورسٹی کو ان الزامات کے بارے میں جواب دینے کا موقع دیئے بغیر ان آٹھ اساتذہ اور لائبریریز کو میمو جاری کر دیا جنہوں نے شیلا کا یہ کورس کیا تھا۔ اس میں یہ انتباہ کیا گیا تھا کہ اسکول ڈسٹرکٹ نہ تو یہ کورس پاس کرنے والوں کو تنخواہ میں اضافہ دینے کا پابند ہوگا جب تک کہ تحقیقات مکمل نہیں ہو جاتی اور نہ ہی وہ اس کورس کو درسی کتب اور تدریسی مواد کو اپنے سپروائزر کی مرضی کے بغیر استعمال کرنے کے مجاز ہوں گے۔ ان میمو وصول کرنے والوں میں سے ایک Robert Gimello بھی تھا۔ شعبہ مشرقی علوم کے سربراہ کو اس بات پر بہت غصہ آیا کہ اسکول ڈسٹرکٹ نے ایسا قدم بغیر اس کے شعبہ سے مشورہ کئے کیوں اٹھایا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ یہ کورس نیا تھا اور TJCC کے ۱۹۸۲ء احتجاج میں اس کا ذکر نہ تھا۔ علاوہ ازیں شیلا سکوول نے قصداً موجودہ جاری مناقشے میں اضافہ نہ کرنے کی خاطر مشرق وسطیٰ کی تاریخ کا جدید عرصہ نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے اپنا کورس ۱۹۴۸ء پر ختم کر دیا جبکہ اسرائیل ابھی معرض وجود میں آیا ہی تھا۔

Murrieta کو ایک خط میں Gimello نے شیلا کا دفاع اور TJCC کے تازہ الزامات کو رد کرتے ہوئے لکھا کہ درحقیقت داخلے میں ذرّہ بھر تعصب نہیں برتا گیا۔ نہ ہی شامل شدہ مواد میں اور نہ ہی اسے پیش کرنے کے طریقے میں پروپیگنڈہ کا کوئی عنصر شامل ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کورس میں کسی بھی وفاقی ہدایات کی خلاف ورزی نہیں کی گئی۔ اس کے برخلاف دعویٰ کرنا ہماری توہین کے مترادف ہے نہ صرف اس لئے کہ یہ سراسر جھوٹ ہے بلکہ یہ ایک ایسی مہم کا حصہ بھی لگتا ہے جو اطلاعات کے آزادانہ فروغ اور جائز علمی خیالات کی ترویج میں رکاوٹ ہے۔

Murrietta نے اس کے باوجود اس پروگرام کی تالہ بندی جاری رکھی۔ اساتذہ کو اس میمو کی کاپی اس کورس کے فائنل امتحان دے دینے کے بعد ملی۔ وہ بہت جز بز ہوئے اور ان میں سے کچھ نے یہ معاملہ Arizona Civil Liberties Union میں اٹھایا۔ ACLU نے اساتذہ کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے اس معاملہ کو "حقوق آزادی تعلیم" کی خلاف ورزی قرار دیا اور کہا کہ وہ ان کی وکالت کرے گی۔ اس یونین کے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر Helen Mautner نے Murrieta اور ایک دوسرے اسکول ڈسٹرکٹ عامل سے ملاقات کی۔ بعد ازاں اسکول بورڈ کے ممبران اور صدر کو بذریعہ خط مطلع کرتے ہوئے کہا کہ اسکول ڈسٹرکٹ عمال سے بات چیت کے دوران اس کو یہ تاثر ملا کہ وہ لوگ معاملہ کو جان بوجھ کر الجھا رہے تھے یا پھر پہلو تہی کر رہے تھے۔ اس نے انہیں لکھا کہ یہ مایوس کن بات تھی کہ ڈسٹرکٹ نے یہ ایکشن کورس ختم ہو چکنے کے بعد اور معاملات کی تصدیق کی کوشش کے بغیر لیا۔ انہوں نے طرفین سے صلاح مشورہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ اس کے باوجود ACLU نے یہ طے کیا کہ وہ اسکول ڈسٹرکٹ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے سے پہلے اس اعلیٰ سطحی پینل کے فیصلہ کا انتظار کرلے گی۔

اس دوران اس اعلیٰ سطحی پینل کے بارے میں انتظامات کئے جا رہے تھے۔ ہر خط جو TJCC اور کوفلر کے درمیان آتا جاتا تھا وہ مزید پیچیدگیوں کو جنم دینے کا سبب بنتا رہا۔ TJCC جن معاملات کو اس پینل میں زیر غور لانا چاہتی تھی ان میں یہ شامل تھے۔ Outreach کا اپنا مواد اور اس کا Outreach Coordinators کے درمیان تبادلے کا نیٹ ورک۔ وہ اس تقسیم اور پیش کرنے کے عمل میں کن عناصر پر زور دیتے تھے۔ بچوں پر اس کا اثر غیر ملکی حکومتوں اور تیل کمپنیوں کی اس پروگرام کی کفالت' یونیورسٹی کے صاد کرنے کا تاثر' اساتذہ کے لئے شیلا کا کورس اور اس کا نیا سروے' رقوم کی فراہمی' Outreach پروگرام پر عملدرآمد اور نگرانی اور اس پروگرام کا شعبہ علوم مشرقی کا دفاع۔ کوفلر نے TJCC کے ساتھ ان کی رضامندی سے یہ طے کیا کہ یہ پینل کچھ معاملات کو زیر غور لائے گی اور بقیہ نکات پر یونیورسٹی الگ سے تحقیقات کرے گی۔

۱۵ر جولائی کو یونیورسٹی آف ایریزونا کا یہ مناقشہ منظر عام پر آ گیا۔ اس مرتبہ پھر TJCC نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے مقامی پریس کو اپنی رپورٹ کی کاپیاں تقسیم کر دیں۔ دو بڑے مقامی اخباروں میں آرٹیکل چھپے اور ٹی وی پر ایک مباحثہ' انٹرویو ہوا۔ جس میں Karsch (TJCC)' Sylvia

Campoy(ٹسکن متحدہ اسکول ڈسٹرکٹ)اور A. Mautner (ACLU کی اہل کار) نے حصہ لیا۔
اس دوران شعبہ کا ان الزامات کا جواب مقفل ہی رہا' مزید برآں صدر کوفلر کے احکام کی بجا آوری میں Adamec, Gimello اور Scoville نے نہ تو پریس رپورٹروں کے سوالات کے جواب دیئے اور نہ ٹی وی پروگرام میں حصہ لیا۔

اخبارات نے TJCC کی رپورٹ میں سے بڑھ چڑھ کر اقتباسات درج کئے اور یہ تاثر دیا کہ قومی سطح پر حکومتی حلقوں اور عرب مفادات کا گٹھ جوڑ اس Outreach مواد کی تشہیر و ترقی میں مشغول تھا۔ اس مواد کا معتدبہ حصہ کسی نہ کسی حد تک تعصب اور غلطی سے پر تھا۔ Karsch نے اپنے ٹی وی ناظرین کو بتلایا کہ اسرائیل کے بارے میں مواد کو دانستہ طور پر نظرانداز کیا جارہا ہے اور شعبہ مشرقی علوم ایک پیچیدہ اور مشکل سیاسی مسئلے کا صرف ایک ہی پہلو اجاگر کرنے میں مصروف ہے۔

جس دن یہ قصہ بر سرعام ہوا تو سکول کو پریس اور ٹی وی رپورٹروں کی متعدد کالیں موصول ہوئیں جو اس جھگڑے میں شعبہ کا نقطہ نظر جاننا چاہتے تھے لیکن کوفلر کے حکم زبان بندی کے آگے وہ مجبور تھی۔ Robert Gimello بھی اس بارے میں مایوسی کا شکار تھا' اس نے آخرکار کوفلر کو ایک طویل خط لکھا۔ اس نے لکھا کہ ایک رپورٹر نے جس سے وہ دو دن سے جان بچائے پھر تا رہا اسے آخرکار رات کو آ ہی لیا۔ رپورٹر کی باتوں سے صاف ظاہر تھا' جیسا کہ دوسرے دن صبح Star کے آرٹیکل سے بھی صاف جھلک رہا تھا کہ اس کے پاس TJCC کی مہیا کردہ دستاویزات تھیں۔ Gimello نے اسے بھیترا ٹالا حتی کہ جب اس رپورٹر نے سوال کیا کہ آیا شعبہ نے کبھی کوئی جواب بھی دیا ہے؟ تو اس نے کہا:

> "میں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ مجھے مجملاً یہ تو بتا دینا چاہئے کہ شعبہ مشرقی علوم کے خیال میں ان کے Outreach پروگرام سے ہرگز اسرائیل مخالف یا عرب نواز تعصب نہیں جھلکتا جیسا کہ الزام دہرایا جارہا ہے۔ یہ خصوصاً اس لئے بھی ضروری تھا کیونکہ رپورٹر TJCC کی تمام دلیلوں اور الزامات سے مسلح تھا۔ Gimello کا کہنا تھا کہ شعبہ نے ثالثی پینل کے بارے میں طے شدہ اصولوں کی پابندی کر کے ہر قسم کے عوامی مباحثے سے گریز کیا تھا لیکن TJCC نے بالکل پرواہ نہیں کی اور یہ حالیہ پریس بیان بازی ان کے بے ایمانہ رویہ کا تازہ ترین مظہر تھا۔ بقول Gimello کے صورت حال یونیورسٹی کے لئے بد سے

بدتر ہوتی جارہی تھی۔ ہمارے خلاف الزامات پوری تفصیل اور بدنامی سے مشتہر کئے گئے تھے اور نتیجتاً اب مجھے اور میرے ساتھیوں کے لئے یہ انتہائی مشکل تھا کہ وہ پریس میں بیان دے کر اپنا دفاع نہ کریں۔ ثالثی کا عمل تو تبھی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا تھا کہ طرفین قوانین کے مطابق کھیلیں۔ مزید برآں Gimello کا کہنا تھا کہ یہ الزامات نہ صرف جھوٹے اور انتہائی رقیق تھے بلکہ یہ ہمارے لئے حقیقتاً نقصان دہ ہو سکتے تھے۔ اس نے اپنے غمزدہ خط کے اختتام میں کہا کہ اس پینل کا طریقہ عمل شائع کر دینا ہی کافی نہ ہوگا۔ ہمیں اپنے شعبہ کے دفاع میں بھی کچھ کہنا ہوگا۔ Gimello نے صدر یونیورسٹی کو کہا "میرے خیال میں اب ہمیں آپ کی حمایت درکار ہے۔"

اس دوران جب یہ حکم زبان بندی شعبہ علوم شرقی کے نمائندوں کو اخبارات میں شائع شدہ خبروں کو متوازن بنانے سے باز رکھ رہا تھا تو ٹسکن کے دو بڑے اخباروں کو ایسے اساتذہ بھی مل ہی گئے جنہوں نے سکول کا کورس کیا تھا اور وہ اس کے دفاع میں بولنے پر بھی تیار تھے۔ ایک نے کہا کہ TJCC کے الزامات واضح طور پر اہانت آمیز تھے۔ دوسرے نے کہا کہ یہ کہنا کہ ہم کوئی پروپیگنڈہ مواد لے کر آگے طلباء میں بانٹ دیں گے، ہمیں کٹھ پتلی سمجھنے کے مترادف ہے۔ اس نے مزید کہا کہ یہ الزامات مسحورکن ہیں۔ شاید ہم بالکل مختلف پروگراموں کے بارے میں بات کر رہے ہیں کیونکہ جو پروگرام ہم نے Attend کیا ہے اس میں تو کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر اب بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اس ٹیچر نے جو اپنے آپ کو اسرائیل نواز کہتی تھی، کہا کہ سکول کے کورس کے خاتمے پر ایک مختصر سی ویڈیو اسرائیل کے قیام کے بارے میں دکھلائی گئی تھی جو نہایت متوازن اور بہت بہتر تھی۔

TJCC کے الزامات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جو نقشہ دکھلایا گیا اس میں اسرائیل شامل نہ تھا۔ اس ٹیچر نے کہا "یقیناً اس نقشے میں اسرائیل شامل نہ تھا کیونکہ یہ نقشہ سلطنت عثمانیہ کا تھا اور اسرائیل سلطنت عثمانیہ میں شامل نہ تھا۔" ایک لائبریرین جس نے کورس میں حاضری دی تھی کہا کہ اگر کوئی شخص ڈسٹرکٹ تک رسائی حاصل کر کے ان کو بغیر کسی چون و چرا کے ایسے اقدام پر عمل پیرا کروا سکتا ہے تو یہ انتہائی تشویشناک بات ہے۔

ان معدودے چند آراء کے علاوہ پریس میں شعبہ مشرقی علوم کے بارے میں منفی تاثر ہی ابھر رہا تھا۔ علاوہ ازیں Carol Karsch کے اخباری انٹرویو سے یہ صاف عیاں تھا کہ TJCC اپنے اس

اعلیٰ سطحی پینل کے فیصلے کو ماننے کے وعدہ سے مکمل روگردانی کر چکی تھی۔ ایریزونا اسٹار میں اپنے چھپنے والے بیان میں Karsch نے اس ماہرانہ کمیٹی کے بارے میں کہا کہ ہم نے بالکل کسی کمیٹی کے بارے میں نہیں مانا تھا۔

Gimello انگشت بدنداں رہ گیا Karsch کے اس بیان پر' اس نے رپورٹروں کو بتلایا کہ میرے خیال میں چند ماہ پیشتر ہم نے کونسل کے صدر سے معاہدہ کیا تھا۔ اب اگر وہ کہتے ہیں کہ کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا تو یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے۔ درحقیقت Karsch کا بیان اس یقین دہانی کی نفی کرتا تھا جو اس نے صدر کوفلر کو دی تھی۔ کوفلر نے ۱۸ اپریل کے خط میں ممبر ایوان McNulty کو لکھا تھا "میں نے کونسل اور شعبہ دونوں کو ایک بیرونی پینل کا فیصلہ ماننے پر قائل کر لیا ہے۔"

۱۹ جولائی تک یہ اظہر من الشمس تھا کہ TJCC نے کوفلر کو اس بات پر قائل کر لیا تھا کہ وہ ماہرین کی پینل کا احاطہ اختیار نئے سرے سے متعین کرے۔ TJCC کے صدر Sol Tobin کے ہمراہ ایک مشترکہ اعلامیہ میں کوفلر نے کہا کہ یہ پینل حقیقت حال کی تہہ تک پہنچنے کی کوششوں کا صرف ایک جزو تھی اور یہ کہ اس کا فیصلہ حتمی نہ ہوگا۔ بلکہ یہ صرف یونیورسٹی کو Outreach پروگرام کے بارے میں اپنی سفارشات دے گی۔

یہ چاروں ماہرین ۲۹ جولائی سے لے کر یکم اگست تک ایک خفیہ اجلاس میں مصروف رہے۔ انہوں نے TJCC کے الزامات ان کے نمائندوں سے سنے' پھر ایک الگ محفل میں مشرق قریب مرکز نے اپنے Outreach پروگرام کا دفاع کیا۔ ان ماہرین نے اپنی رپورٹ مرتب کر کے کوفلر کو پیش کر دی۔ انہیں اس کی نقول نہ تو خود رکھنے کی اجازت تھی اور نہ ہی کوئی نقول تقسیم کی گئیں۔

اس کے بعد دھماکہ ہوا۔ صدر کوفلر نے اس پینل رپورٹ کو جاری کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اس کی بجائے TJCC کونسل کی رضامندی سے ایریزونا یونیورسٹی کے ایک قانون کے پروفیسر Charles Ares کو نامزد کر دیا کہ وہ یونیورسٹی کی اسی تحقیقات کے دوسرے مرحلے کا آغاز کرے۔ صدر کا کہنا تھا کہ اس نظر ثانی کے دوسرے مرحلے کی تحقیقات مکمل ہونے تک وہ اس رپورٹ کو عام نہیں کرے گا۔

سکوول' Adamec اور Gimello (جنہیں اس رپورٹ کے دیدار سے محروم رکھا گیا تھا) کو یہ حکم صادر ہوا کہ وہ Ares کے ساتھ اس وسیع البنیاد تحقیقات میں تعاون کریں جو کہ TJCC کے

تمام الزامات کے بارے میں کی جائے گی۔ چاہے وہ الزامات اس پینل کے سامنے پیش ہی نہ کیے گئے ہوں۔ اس میں Outreach پروگرام کے فنڈز' انتظامات اور نگرانی بھی شامل تھے۔ شیلا سکوول کے مشرق وسطیٰ سروے کورس پر عائد کیے گئے داخلہ میں دھاندلی اور تعصب کے الزامات تھے۔ اس میں یہ سوال بھی شامل تھا کہ آیا تمام دوسرے شعبہ جات نے شعبہ مشرقی علوم کے Extended Response پروگرام کے بارے میں کلی طور پر اتفاق کیا تھا۔

سکوول کے کہنے کے مطابق Ares نے اس سے اس تمام خط و کتابت کی نقول طلب کیں جو اس نے بطور Outreach Coordinator کی۔ تمام مالیاتی رپورٹس کی بھی کاپی مانگی جس میں نیشنل مڈل ایسٹ Outreach کونسل کا حساب کتاب بھی شامل ہو جس کی وہ خزانچی تھی۔ اس نے بغیر تفصیل میں جائے یہ بھی کہا کہ اس نے میری ذاتی زندگی اور اخلاق و کردار کا بھی محاسبہ کیا۔ Gimello نے Ares سے یہ دریافت کرنے کی کوشش کی کہ شعبہ مشرقی علوم کے تحریری دفاع کے کون کون سے حصے کس کس پروفیسر نے لکھے تھے؟ Gimello کی پیٹھ پر آخری تنکا وہ بات ثابت ہوئی جب اس نے مشرق وسطیٰ مطالعہ ایسوسی ایشن کے بارے میں سوالات پوچھنے شروع کر دیئے۔ یہ مشرق وسطیٰ کے ماہرین کی ایک بین الاقوامی تنظیم تھی جس کا صدر دفتر ۱۹۸۱ء سے اس یونیورسٹی میں قائم تھا۔ Ares کی M.E.S.A. کے فنڈز مہیا کرنے کے بارے میں چھان بین نے Gimello کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک تند و تیز خط میں اس تحقیقات کے علیہ' ماعلیہ کے بارے میں اپنے گہرے خدشات کا اظہار کرے۔ اس نے Ares کو لکھا کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق اس کے M.E.S.A. کے بارے میں اٹھائے گئے سوالات کا جواب نہیں دے سکتا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے وجوہ بیان کرے کیونکہ مجھے شک ہے کہ آپ بغیر سمجھے بوجھے ایسے سوالات پوچھ رہے ہیں جن کی ماہیت کا آپ کو خود بھی علم نہیں۔ اس خط میں مزید درج تھا کہ اس تحقیقات کے آغاز سے ہی میرا اور میرے ساتھیوں کا یہ خیال تھا اور مجھے یقین ہے کہ Outreach پروگرام کے بارُے میں معترضین کے الزامات ایک بہانہ ہیں۔ یہ ایک ابتدائی چال ہے جس کے ذریعے ہمارے شعبہ اور یونیورسٹی کے مشرق وسطیٰ مطالعہ پروگرام کو کنٹرول کرنا اور پھر گلا گھونٹ دینا مقصود ہے۔ گو Kozolchyk اور اس کے ساتھیوں نے بارہا اس بات سے انکار کیا لیکن ہمیں اس پر اعتماد نہیں تھا۔

آج آپ کے MESA کے بارے میں سوالات نے ہمارے شک کی تصدیق کر دی۔

MESA کی ایریزونا یونیورسٹی میں موجودگی اور اس کے Finances کے بارے میں سوالات آپ کی تحقیقات کے زمرہ سے یکسر خارج ہیں' بلکہ TJCC کو بھی ان معاملات سے سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ میں اپنے معترضین کی کسی ایسی کیچڑ اچھالنے والی کوشش میں شمولیت نہیں کرسکتا جو کہ ان کے اپنے بیان کردہ حدود سے بھی متجاوز ہو۔

Gimello کا کہنا تھا کہ TJCC کا MESA کو اس تحقیقات کے دائرہ میں لانا یونیورسٹی کے معاملات میں مداخلت اور علمی آزادی پر قدغن لگانے کی ایک نا قابل قبول کوشش تھی۔

MESA کے ایگزیکٹو سکریٹری Mitchael Bonine کو جب ان تحقیقات کا علم ہوا تو اس نے اس سے بھی سخت الفاظ میں صدر کو فلر کو خط لکھا کہ مجھے MESA کے بارے میں پروفیسر Ares کی جستجو سے ہی بیحد تشویش ہے۔ میرا یہ اندازہ ہے کہ پروفیسر Ares صرف اس لئے MESA کے بارے میں کھوج لگا رہے ہیں کہ ان پر اپنے ساتھی Kozolchyk کا دباؤ اور اصرار ہے۔ یقیناً TJCC کے لئے یہ بات کہ MESA کی شہرت اور پوزیشن یونیورسٹی آف ایریزونا میں خراب ہو' باعث طمانیت ہوگی۔

TJCC کے الزامات غیر ذمہ دارانہ اور اس کے حربے قابل نفرین ہیں۔ خفیہ ٹیپ ریکارڈنگ' ڈائریکٹر Outreach Coordination کے خلاف دشنام پردازی اور زبان درازی' پریس کو جب بھی اپنا مفاد ہو افشاء راز' کلاسز میں جاسوس بھجوانا' شعبہ مشرقی علوم کے سربراہ پر الزام تراشی اور پھر ثالثی کے لئے راضی ہو جانے کے بعد انتظامیہ پر دباؤ ڈال کر تحقیقات کا دائرہ وسیع تر کروالینا۔

اس آخری نکتہ کے بارے میں سب سے زیادہ تشویش کن بات یہ ہے کہ TJCC کا اثر و نفوذ اس قدر زیادہ ہے کہ وہ نہ صرف ایجنڈا کے بارے میں اپنی ہٹ دھری منوا سکتے ہیں بلکہ وہ قواعد بھی تبدیل کروا سکتے ہیں۔

پہلے پہل Adamec نے Ares کے ساتھ تعاون کیا لیکن MESA تک تحقیقات کا دائرہ بڑھانے اور شیلا سکوول کی ذاتی زندگی کی چھان بین پر وہ بھی ہتھے سے اکھڑ گیا۔ اس نے Ares کو لکھ کہ اب یہ قومی سطح پر مشتہر ہو چکا ہے کہ TJCC نے ڈاکٹر شیلا سکوول کی برخاستگی اور مشرق قریب مرکز کو اس وجہ سے بند کرنے کا مطالبہ کیا تھا کہ یہ ان کے خیال میں اسرائیل مخالف ہے۔ اس نے مزید کہا کہ اب جبکہ اسرائیل مخالف ہونے کا الزام ثابت نہیں ہو سکا تو TJCC نے مچھلی کے شکار کی

ٹھانی تھی۔

اغلباً آپ کے ذہن سے اس خیال کا گذر نہیں ہوا اور نہ ہی یونیورسٹی کی انتظامیہ نے سوچنے کی زحمت کی ہے کہ ورکشاپ 'کلاسیں' کانفرنسیں' سیمینار اور ایسے ہی دوسرے علمی مشاغل کو سیاسی معیار پر نہیں پرکھا جاتا۔ اعلیٰ سطحی پینل اپنے اجلاس کر چکی ہے اور ہمیں یہ علم ہے کہ انہوں نے ہمیں بری کر دیا ہے۔ اس تحقیقات کو جاری رکھنا سیاسی ایذا رسانی اور ظلم ہے۔

اس دوران Tuscon Unified School Distt. نے اریزونا یونیورسٹی کے Outreach پر بگرام کے بارے میں اپنی تحقیقات بھی شروع کر دی۔ T.U.S.D. کی متعین کردہ Sylvia Campoy, Compliance Officer نے پریس کو وضاحت کرتے ہوئے کہا "ہمیں (سول رائیٹس ایکٹ) کے Title-VI کا نفاذ کرنا ہے۔ یعنی کہ ہم رنگ و نسل یا عقیدہ کی بنیاد پر کوئی تعصب' تفریق نہیں برتیں گے۔"

TUSD نے پینل کی رپورٹ کا انتظار کئے بغیر اپنے نتائج ۱۳ ستمبر کو شائع کر دیئے۔ اس کی گیارہ صفحات کی رپورٹ میں TJCC کے اصلی الزامات کو حرف بہ حرف بطور تتمہ' حوالہ استعمال کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ مشرق قریب مرکز کے Outreach پروگرام میں خاطر خواہ اسرائیل مخالف تعصب اور عرب نوازی جھلکتی ہے۔ اس میں شیلا سکوول پر الزام دھرا گیا کہ اس نے جان بوجھ کر اپنا مشرق وسطیٰ سروے کورس ۱۹۴۸ء پر لاکر ختم کر دیا تاکہ عرب' اسرائیل تنازعے کا ذکر نہ آنے پائے۔ درسی کتب اور تاریخ کے انتخاب میں اس پروگرام میں سے اسرائیل کا ذکر بہ نسبت عرب ممالک کے نظر انداز کرنے کا تاثر جھلکتا ہے۔

اس رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ عام طور پر اس ڈسٹرکٹ کے Outreach پروگرام میں ایسی سرگرمیاں شامل ہیں جو بلا جواز اور نہایت سیاسی قسم کی ہیں۔ اس میں اساتذہ اور طلباء بلکہ والدین تک کے درمیان مذہبی اور نسلی تعلقات کی خوش گوار ہم آہنگی کو شدید اور بالکل غیر ضروری خطرہ در پیش ہے۔ TUSD کو یہ گوارا نہیں کہ ایک نسلی گروپ' تہذیب' مذہب یا جنس کے بارے میں اچھا تاثر قائم کرنے کے لئے دوسرے نسلی گروپ' تہذیب' مذہب یا جنس کی کردار کشی کی جائے۔

جہاں ایک طرف اس پینل کی رپورٹ رازداری کی دبیز تہوں میں سربستہ راز رہی تو دوسری طرف TJCC کی رپورٹ کی مانند TUSD کی رپورٹ کو پریس میں خوب اچھالا گیا۔ اریزونا ڈیلی

اسٹار نے شہ سرخی جمائی "مشرق وسطیٰ مرکز کا تعلیمی مواد عرب نواز ہے۔ TUSD کا بیان۔" اس شذرہ میں مصنف نے اس رپورٹ کی لکھنے والی Sylvia Campoy کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ سکول کا مشرق وسطیٰ کورس بیحد اعلانیہ طور پر عرب نواز اور غیر مرئی طور پر اسرائیل مخالف تھا اور کہا کہ اغلباً اسرائیلی حکومت سے مواد حاصل کرنے کے سلسلے میں رابطہ ہی نہیں کیا گیا۔ (یہ اس زمانے یعنی ۶۰۰ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک کا ذکر ہو رہا ہے جب اسرائیل معرض وجود ہی میں نہ آیا تھا) خود اس ڈیلی اسٹار کے رپورٹر نے TUSD رپورٹ پر تبصرہ کرنے کے لئے شعبہ علوم مشرقی سے رابطہ نہ کیا' البتہ ان ۷۰۰ الفاظ کے مضمون میں صرف اتنا کہا کہ شعبہ علوم مشرقی نے ان تعصب اور پروپیگنڈہ کے الزامات کا انکار کیا ہے۔

Adamec نے Daily Star کے مدیر کو مزید ایک غصہ بھرا خط لکھا کہ مجھے حیرانی ہے کہ آپ نے تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کی زحمت کئے بغیر یہ مضمون چھاپ دیا۔ اس نے پوچھا کہ ایک کورس جو اسرائیل کے قائم ہونے سے پہلے کے زمانے کے بارے میں ہو' وہ کس طرح اسرائیل مخالف کہلا سکتا ہے؟ اس کورس میں جو درسی کتب استعمال کی گئی وہ تیل کی کمپنیوں یا عرب حکومتوں کے ذرائع نہ تھے جیسا کہ آپ کے شذرہ میں الزام لگایا گیا ہے۔ اور اساتذہ کی فیسوں کو واپس کرنا ایک عام رواج تھا اور اس میں کوئی نامناسب بات نہ تھی۔ اس خط کے آخر میں Adamec نے لکھا "ہمیں یہ احساس ہے کہ اس وقت مشرق وسطیٰ کا مطالعہ ایک متنازعہ موضوع ہے اور وہ لوگ جن کی جذباتی وابستگی ایک یا دوسرے فریق سے ہے وہ اس پر اثرانداز ہونے کی کوشش کریں گے لیکن ہم بطور ایک تعلیمی ادارہ کے ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔"

یہ خط اولاً تو نو دن کی تاخیر سے شائع کیا گیا اور پھر مستزاد یہ کہ مندرجہ بالا آخری سطور چھاپتے وقت حذف کر دی گئیں۔ Tuscon Citizen نے البتہ چند روز بعد ایک زیادہ متوازن تبصرہ شائع کیا اور U.A. کلاس پر لگائے گئے تعصب کے الزامات کو بے بنیاد قرار دیا۔ اس شذرہ میں Gimello کا حوالہ دے کر کہا گیا تھا کہ TUSD کی رپورٹ دیکھ کر وہ سخت حیران ہوا تھا۔ سابقہ سربراہ شعبہ مشرقی علوم William Dever کا کہنا تھا کہ اس پروگرام کے تعصب کو پرکھنے کی تو Campoy اہلیت ہی نہیں رکھتی۔ TUSD اور TJCC کی رپورٹوں کی یکسانیت کو دیکھتے ہوئے Dever نے لکھا "وہی بے بنیاد الزامات حرف بحرف دہرا دئے گئے ہیں بغیر کسی ٹھوس شواہد کے۔"

باقاعدہ تعصب کے آثار عنقا

تقریباً دو ماہ کی تاخیر کے بعد کوفلر نے ۲۳ر ستمبر کو وہ اعلیٰ سطحی رپورٹ شائع کر دی۔ ان ماہرین نے Outreach پروگرام کو مکمل طور پر بری کر دیا۔ اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ اس مواد میں باقاعدہ تعصب کے آثار عنقا تھے اور ان کے چناؤ' طریقہ کار یا ترسیل میں کسی واضح متعصبانہ پالیسی کے شواہد موجود نہ تھے بلکہ اس کے برعکس اس مواد کے چناؤ میں Coordinator نے اکثر اعلیٰ مہارت اور نیک نیتی کا ثبوت دیا تھا۔ ان ماہرین کی رائے میں .U.A کے Outreach پروگرام میں کسی بھی سیاسی گروپ یا حکومت' حکومتوں کے مفاد کو بڑھاوا دینے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ہمیں لائبریری کے مواد میں بھی کسی گروپ کے خلاف کچھ نہیں ملا۔ جہاں تک کسی سرکاری شائع شدہ مواد یا کسی تیل کمپنی کارپوریشن کے جاری کردہ مواد کا تعلق تھا تو یہ مواد مناسب وضاحتوں کے ساتھ قطعاً موزوں تھا۔ TJCC کے اس الزام کا کہ عربوں کو خواہ مخواہ بہتر طور پر دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پینل کا کہنا تھا کہ اس کی سرگرمی یا نقطہ نظر میں بنیادی طور پر کوئی خامی نہ تھی اور نہ ہی ڈگر سے ہٹ کر چلنے کی راہ میں کوئی برائی تھی۔ پینل نے TJCC کے اس الزام کو کہ کچھ عرب حکومتوں کی جانب سے اسرائیل کو اقوام عالم میں ایک غیر قانونی اضافہ بتلایا جائے' قطعاً بے بنیاد پایا۔

اس پینل نے تقریباً سبھی الزامات جو TJCC نے لگائے تھے انہیں مطلقاً رد کر دیا۔ صرف اتنا ضرور کہا کہ جو مواد اس ورکشاپ میں استعمال کیا گیا تھا وہ انہیں عام طور پر سطحی سا اور غیر فکر انگیز لگا اور یہ اس لئے تھا کہ جس Outreach Library سے یہ چناؤ کیا گیا وہ بدقسمتی سے بڑی محدود سی تھی۔ اس پینل کے خیال میں بہتر نگرانی اور چناؤ سے اس پروگرام کو اور بہتر طریقے سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس پروگرام کی ذمہ داری ایک فرد واحد کی بجائے ایک کمیٹی زیادہ عمدہ طریقہ سے نبھا سکے گی۔ انہوں نے اپنی رپورٹ میں کچھ ٹھوس تجاویز بھی دیں کہ کیسے اس پروگرام کی تعمیر نو کر کے اس میں تعاون کو بڑھایا جاسکتا ہے۔

ان ماہرین نے ان چار پیش کردہ امور پر رائے دینے کے بعد اپنی توجہ تعلیم کی آزادی کی طرف موڑ دی۔ رپورٹ کے اس ساڑھے پانچ صفحات پر محیط سیکشن میں TJCC کے حربوں پر بڑی حکمت عملی سے سرزنش کی گئی تھی۔ ملاحظہ ہو:

TJCC نے یونیورسٹی کے بارے میں سوال کرنے کے حق کو استعمال کیا ہے اور یونیورسٹی نے

پورا پورا حق ادا کیا اور جواب دیا۔ TJCC کو یہ حق ہے کہ وہ اس جواب سے اختلاف کرے اور اس بات کا برملا اظہار بھی کرے' لیکن اس بات پر اصرار کرنا کہ یونیورسٹی ان ہی کے بتائے گئے طریقہ کار پر عمل کرے تبھی یہ تحقیقات بند کی جائیں گی' مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ یہ سوال کرنے اور آگاہ ہونے کے جائز حق کے ماورا اور کنٹرول و سنسر کرنے کے ناجائز حق کی طرف سفر ہے۔ TJCC اب اس حد تک پہنچ چکی ہے۔ اس کا مزید اصرار کہ اس کے مطالبات قبول کئے جائیں' اب صرف یونیورسٹی کی خود مختاری پر حملہ اور تدریسی آزادی کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہوگا۔

ہمیں معلوم ہے کہ TJCC کے ممبران تدریسی آزادی پر حملہ آور نہیں لیکن ہماری رائے میں نئے چیلنجوں کا سامنا عوام کو ایذا دہی نظر آئے گا۔ ہمیں یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ یونیورسٹی اور کمیونٹی دونوں کو یہ ایذا دہی دکھلائی دے گا۔

پینل رپورٹ میں شیلا سکول کو بھی بری الذمہ قرار دیا گیا تھا۔ انہوں نے بالواسطہ TJCC کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہا تھا کہ اس کو خواہ مخواہ مسئلہ بنایا گیا۔

ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا اور اب اس نقصان کی تلافی بہ آسانی ممکن نہیں۔ ایک ایسے فرد کی ذہنی دیانت پر شک کیا گیا جو یونیورسٹی کمیونٹی کا جانا بوجھا ممبر اور مطلوبہ تعلیمی معیار کا حامل ہے۔ اس کی اہلیت نہیں بلکہ ایمانداری پر شک کیا گیا۔ ہمیں یقین ہے کہ سبھی متعلقہ فریقین کسی اور مسئلے پر اتفاق کریں یا نہ کریں اس پر ضرور اتفاق کریں گے کہ اس بدقسمتی کی تلافی ضرور ہو۔ تدریسی آزادی ایک کھوکھلا نعرہ ہوگا' اگر یہ ایک ایسے فرد کو حفاظت عطا نہیں کرتی جس کے خیالات اور سرگرمیاں کسی ایک فریق کے لئے ناپسندیدہ ہوں۔

ان لوگوں کو جو سمجھتے ہیں کہ Ares بھی TJCC کا حمایتی ہوگا' یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اس نے اس اعلیٰ سطحی پینل کی رپورٹ کی حمایت کی۔ یہ رپورٹ بھی اسی دن شائع کر دی گئی جب اس پینل کی رپورٹ جاری کی گئی۔ اولاً تو Ares کو شیلا سکول کے مشرق وسطیٰ سروے کورس میں کوئی ایسی شہادت نہ ملی کہ اس نے کسی خاص نکتہ نظر کی وکالت کی تھی یا بطور استاد اپنے شاگردوں کے Leson Plans کو جان بوجھ کر کسی ایسے نکتہ نظر کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔ Ares کو نہ تو کوئی داخلے میں تخصیص کے شواہد ملے اور نہ ہی اس کورس کے لئے اساتذہ کو رقوم کی ادائیگی خلاف ضابطہ لگی۔ بقول اس کے سکول کے خلاف TJCC کا الزام غلط تھا کہ اس نے اسکول ڈسٹرکٹ کے

درسی نظام کو تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔ بقول Ares "تمام موجودہ شواہد کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ ماننے کی کوئی بنیاد نظر نہیں آتی کہ کورس کو ناجائز طریقہ سے چلایا یا پڑھایا گیا ہے۔"

Ares کو اس Outreach پروگرام میں کوئی رقوم دینے یا اسپانسر شپ میں کوئی ناجائز بات نظر نہ آئی۔ مرکز کو کچھ امداد Mobil اور Exxon جیسی تیل کمپنیوں سے وصول ہوئی لیکن ان عمومی مراعات میں کچھ قابل ذکر اعتراض نہ تھا۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ آیا تفصیلی ردّ عمل پر شعبہ علوم مشرقی کے تمام ممبران نے صاد کیا تھا؟ تو Gimello نے الگ الگ سیکشوں کے لکھنے والوں کے نام نہ ظاہر کر کے اس کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ لگتا ہے کہ Ares کو خود بھی اس نامعقولیت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ:

> "اس میں شک نہیں کہ رپورٹ کو سارے شعبہ کا تعاون حاصل ہے۔ اس پر اصرار کیا گیا کہ فیکلٹی کے ممبران کا علیحدہ علیحدہ انٹرویو کیا جائے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ وہ اس کتابی تبصرہ میں ہر ایک بیان پر اتفاق کرتے ہیں یا نہیں؟ یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ لوگ آزاد خیال پختہ عمر کے ماہرین ہیں۔ جب تک اس بات کے شواہد نہ ہوں کہ ان کی ایک بڑی اکثریت اس ردّ عمل کی حمایت نہیں کرتی ان پر اب جرح کرنی انتہائی نقصان دہ ہوگی۔"

اس کے بعد Ares نے اپنی توجہ سکول کی کلاس روم میں اس گفتگو کی طرف مبذول کی جو کہ TJCC کے ایک خفیہ ممبر نے ۱۹۸۲ء میں اس کا کورس کرنے کے دوران ٹیپ کی تھی۔ TJCC نے ان ٹیپوں کی جزوی رپورٹ بنائی تھی جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ اس میں سکول کا تعصب جھلکتا تھا۔ یہ شہادت Ares کو پیش کی گئی لیکن پینل کے سامنے نہ رکھی گئی۔ Ares کا کہنا تھا کہ میں ان کیسٹوں کا ذکر کئی وجوہ سے کرنا چاہتا ہوں:

(ا) یہ جزوی Transcript جاری تو کیا گیا لیکن پینل نے اسے درخور اعتناء نہ سمجھا۔

(۲) ایک جزوی Transcript تو صرف ایک انتخاب ہی ہو سکتا ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ عمومی رجحانات گفتگو کی عکاسی نہیں کرتا۔

(۳) یہ کیسٹ ورکشاپ کے استاد کی پیشگی اجازت اور علم کے بغیر بنائی گئی تھی اور یہ تدریسی آزادی کے کم سے کمتر درجہ کے بارے میں سوال کو جنم دیتا ہے۔

میرے ضمیر میں ان کیسٹوں کی سماعت کے بارے میں خلش تھی لیکن پھر سوچا کہ ان کو سننے

سے انکار کر کے میں حقیقت کی جستجو کے عمل کو اس سے زیادہ نقصان پہنچاؤں گا جتنا کہ ان کی وجہ سے تدریسی آزادی کو پہلے ہی پہنچایا جاچکا ہے۔ لہٰذا میں نے ان کیسٹوں کو سنا اور اس جزوی بیان کو پڑھا۔ البتہ سکوول کو پہلے بتلا دیا تھا کہ اس کو بھی ان کے سننے اور دیکھنے کا موقعہ دیا جائے گا۔ اس نے اب تک اس رعایت سے فائدہ نہیں اٹھایا تب Ares نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا:

"ان کیسٹوں کو سن کر اور جزوی Transcript پڑھ کر پینل کے اس فیصلہ کی نفی نہیں ہوتی کہ اس میں کوئی قابل ذکر تعصب کی جھلک نہیں۔"

دونوں الگ الگ تفتیشوں کے TJCC کے الزامات کو مسترد کر دینے کے باوجود کوفلر کا وہ خط جس کے ذیل میں یہ شائع ہوئیں اس شکست کو بیحد رجائی انداز میں پیش کر رہا تھا۔ اس خط میں نتائج کے عنوان تلے کوفلر کا کہنا تھا کہ TJCC اپنے اس خدشے میں حق بجانب تھی کہ Outreach پروگرام کی نگرانی مناسب طور پر نہیں کی جا رہی تھی۔ اگلے ہی فقرے میں کوفلر نے اہم اور بڑے نتائج جو پینل نے اخذ کئے تھے ان کو نہایت غیر اہم بنا دیا۔ وہ رقم طراز ہے کہ مزید براں جو مواد چنا گیا گو وہ تعصب سے مبرا ہے لیکن پینل کا یہ مشاہدہ ہے کہ شائع شدہ مواد عام طور پر سطحی اور غیر فکر انگیز ہے۔ کوفلر نے اپنے محیطی خط کے خاتمے پر TJCC کے سکوول پر حملے کی ایک بودی سی مذمت کی۔

کونسل (TJCC) نے Outreach Coordinator کی ایمانداری پر کافی شک کیا ہے۔ جو لوگ کسی بھی حساس موضوع پر کام کرتے ہیں ان کی پیشہ ورانہ شہرت کو ہمیشہ روز افزوں نکتہ چینی کا خطرہ رہتا ہے۔ لہٰذا کسی بھی نقاد کو اپنا فیصلہ سناتے وقت اس بات کی بیحد احتیاط کرنی چاہئے کہ اس سے انصاف کا دامن نہ چھوٹے۔ خصوصاً جبکہ یہ فیصلہ پیشہ ورانہ یا ذاتی نقصان کا باعث ہو سکتا ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں اس طرف توجہ دلانا بیحد اہم ہے کہ پینل کی رائے میں Coordinator نے مواد چننے اور تقسیم کرنے میں کسی طور پر بھی تعصب کا دخل نہیں ہونے دیا۔

اس پینل کی رپورٹ اور Ares کے نتائج نے مشرق قریب مرکز اور اس کے Outreach پروگرام کی ساکھ کلی طور پر بحال کر دی تھی۔ TJCC نے جو بھی تبدیلیاں کی تھیں ان میں سے صرف ایک برقرار رکھی گئی۔ مزید نگرانی اور بہتر ترتیب سے پروگرام کا بھلا ہی تھا۔ درحقیقت شعبہ علوم مشرقی مارچ ۱۹۸۳ء میں ہی اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ اس میں اصلاح ضروری ہے۔ وہ صرف پینل کے فیصلہ مشتہر ہونے کا منتظر تھا۔ کوفلر کا کہنا تھا کہ ان اصلاحات کے علاوہ یونیورسٹی نے اور کوئی

ایکشن نہیں لینا تھا۔

ان دونوں رپورٹوں کے شائع ہونے کے بعد Adamec اور Gimello دونوں نے ٹی وی انٹرویو میں اس امید کا اظہار کیا کہ وہ سرخ رو ہو چکے ہیں اور معاملہ طے ہو گیا ہے۔ Karol Karsch نے بھی کیمروں کے روبرو یہی کہا کہ فتح اس کی ہوئی ہے۔ اس کا کہنا تھا:

"ارے کہاں یہ رپورٹ مشرق وسطیٰ مرکز کو بری الذمہ کرتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر آپ اس کو پوری توجہ سے پڑھیں تو ہمارا یہ خدشہ کہ پروگرام ٹھیک طور پر نہیں چلایا جا رہا' کچھ بیجا نہ تھا۔ مشرق وسطیٰ کا بیان بشمول اسرائیل مبنی برصحت ہونا چاہئے' انصاف کا لحاظ رکھا جانا چاہئے' اسے ہمارے امریکی نصب العین سے مطابقت رکھنی چاہئے لیکن ایسا نہ تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یونیورسٹی اس معاملے میں کیا کرتی ہے۔"

TJCC کے ایک اور ترجمان Mark Kobernic کا ریڈیو نیوز رپورٹ پر یہ کہنا تھا کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ پروگرام کی ساکھ بحال نہیں کی گئی اس لئے اس کو موجودہ حالت میں جاری رکھنے کا جواز نہیں ہے۔ اریزونا پوسٹ میں Karsch نے ایک خود ساختہ توصیفی تجزیہ لکھا' یہ ایک یہودی جریدہ ہے۔ اس نے کہا کہ پچھلے دو سال سے یہودی فرقے کو ایک سنگین مسئلے کا سامنا تھا۔ بقول اس کے ہماری اینٹی ڈی فیمیشن لیگ اور امریکن جیوش کمیٹی کی ریسرچ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ عرب اسرائیل تنازعہ کے بارے میں مواد متعصبانہ' پروپیگنڈہ پر مبنی اور واضح طور پر عرب نواز' اسرائیل مخالف جھکاؤ رکھتا تھا۔ پینل اس نتیجے پر پہنچی کہ مواد عالمانہ نوعیت کا نہ تھا' اس نے اسے سطحی اور غیر فکر انگیز قرار دیا۔ یہ اتھلا تھا اور سب سے اہم بات کہ یہ ایک خاص نکتہ نظر کا حامل تھا۔ یہ اغلباً Karsch کا نظریہ تھا۔ پینل کی رپورٹ کے بارے میں جہاں کہا گیا تھا کہ گو کورس کے بعض حصے جنہیں نظر ثانی سے گذارا گیا ایک مخصوص نکتہ نظر کے حامل ہو سکتے ہیں لیکن ہمیں کسی جگہ بھی جان بوجھ کر تعصب بھرا ہوا نہیں ملا۔ Karsch کا مزید بیان تھا کہ ہمیں باریکیوں اور موشگافیوں میں الجھ کر نہیں رہ جانا چاہئے۔ چاہے عرب نواز مواد کو متعصب کہا جائے یا یہ کہا جائے کہ یہ ایک نکتہ نظر کا اظہار ہے۔ تاثر تو وہی رہتا ہے۔

اس کے بعد یہ چونکا دینے والا دعویٰ کیا گیا کہ ڈاکٹر کوفلر کی رپورٹ کا واضح جھکاؤ اس اعتراف میں تھا کہ پروگرام میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ آخر میں Karsch نے دوبارہ

ایک قومی سطح پر اسرائیل مخالف سازش کا ہوا کھڑا کیا:

"ہماری ٹسکن میں یہ ذمہ داری ہے کہ ہم قومی سطح پر ایک عرب نواز کوشش کی جو معتدبہ رقم لگا کر کی جا رہی ہے مخالفت کریں۔ کیونکہ یہ اسرائیل کے وجود کے جائز ہونے پر حملہ ہے۔ یہودیوں کی سلامتی ہمیشہ ہی چوکنا پن پر منحصر رہی ہے۔"

صاف ظاہر تھا کہ یہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی حالانکہ اس کو جاری ہوئے دو سال گذر چکے تھے۔

یہ ایک خوفناک اچنبھا تھا

Ares اور اس اعلیٰ سطحی پینل کے فیصلے کے باوجود TUSD نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو اجلاس کر کے سرکاری طور پر Sylvia Campoy کی Anti-Outreach رپورٹ میں کی گئی سفارشات کو منظور کر لیا۔ Campoy نے فون پر بتلایا کہ اب ہمارا اس پروگرام سے بالکل کوئی واسطہ نہیں۔ بقول اس کے اساتذہ کو نہ صرف سکول کے مشرق وسطیٰ سروے کورس کی کوئی سالانہ ترقی نہیں ملے گی بلکہ مستقبل میں بھی اس پروگرام کے کورس کرنے والوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ کلاس روم میں بھی اس پروگرام کے متعلقہ کسی بھی مواد' کتب کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا۔

چند روز بعد TUSD کی بورڈ میٹنگ میں Gimello اور Dever دونوں نے Campoy رپورٹ پر سخت نکتہ چینی کی اور اسے بھدی' عجلت بھری اور یکطرفہ قرار دیا۔ Gimello نے بورڈ سے کہا کہ اسے امید ہے کہ بورڈ پریشر گروپوں کے حربوں کے آگے گھٹنے نہ ٹیکے گا۔ اسکول بورڈ نے ووٹنگ کر کے یہ طے کیا کہ جن اساتذہ نے شیلا سکول کا کورس کیا تھا ان کی اضافی تنخواہ بحال کر دی جائے گی کیونکہ ان کے خیال میں مؤثر بہ ماضی قانون کا اطلاق اس کیس میں انصاف پر مبنی نہ تھا۔ اس دوران مستقبل کے لائحہ عمل پر کوئی بات نہ ہوئی نہ ہی TUSD انتظامیہ کے اس حکم پر کہ Outreach مواد کلاس روم سے خارج رکھا جائے۔ Merrill Grant نے بطور ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ اسکول بورڈ کے اس فیصلہ کی پوری حمایت کی۔

اس پروگرام کی دردسری صرف اسکول ڈسٹرکٹ تک ہی محدود نہ تھی۔ شعبہ کی سینیٹ میٹنگ کے دوران کوفلر نے کہا کہ (اوائل اکتوبر میں) گو Outreach پروگرام کے مواد میں کوئی

تعصب نہیں پایا گیا لیکن پینل نے TJCC کے اس الزام میں کچھ حقیقت پائی تھی کہ اس کی نگرانی میں کمی تھی۔ خاص طور پر اس پروگرام میں پوری فیکلٹی نے حصہ نہیں لیا تھا' چنانچہ اس کے مدنظر ایک بورڈ آف گورنرز بنانے کا فیصلہ کیا گیا جو اس پروگرام کی نگرانی کرے گا۔ کوفلر نے پینل کا سطحی اور غیر فکر انگیز والا الزام دہراتے ہوئے کہا کہ ایک ایسی رپورٹ جس میں اس پروگرام کے مواد پر نکتہ چینی کی گئی ہو ہمارے مرکز کے لئے قابل فخر نہیں ہو سکتا۔

Adamec کو بیحد غصہ آیا۔ اس نے فیکلٹی سینیٹ کے سب ممبران کو ایک خط لکھا۔ اس نے لکھا کہ یہ الزام کہ Outreach پروگرام کی نگرانی مناسب نہ تھی۔ اس کے لئے اہانت آمیز ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ میں مشرق وسطیٰ مطالعہ کا ایک ایسا ماہر ہوں جو اس موضوع پر ۱۵ کتابوں کا مصنف ہے اور جس کا تجربہ اس میدان میں تیس سال پر محیط ہے۔ ڈاکٹر سکوول کے Outreach پروگرام کی سرگرمیوں کی محکمہ تعلیم کے حکام نے تعریف کی اور اسے نمونہ قرار دیا۔ اور اس کی ایک بڑی وجہ ہمارے پروگرام کا بہترین قرار دیا جانا ہے۔ تبھی تو عرصہ دس سال سے سخت قومی مقابلے کے باوصف یہ پروگرام لگاتار فنڈ حاصل کرنے میں کامیاب تھا۔

کیا اب ہمیں ایک نگران بورڈ کی ضرورت ہے؟ اگر یہ بورڈ ایک مشاورتی ادارہ ہے تو ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ حالانکہ اس یونیورسٹی میں یہ بات صرف اسی ایک ادارے یعنی مشرق قریب مرکز کے بارے میں کہی جا رہی ہے۔

جلد ہی یہ ظاہر ہو گیا کہ یہ بورڈ "مشاورتی" سے زیادہ ہی ہو گا۔ یونیورسٹی کے قائم مقام ڈین کی طرف سے بذریعہ میمو آگاہ کیا گیا کہ یہ بورڈ رقوم کی فراہمی کی درخواست اور اس کا مصرف اور مرکز کے ملازمین کا سلیکشن سب پر نظر ثانی کرنے کا مجاز ہو گا اور ان ملازمین میں ڈائریکٹر یعنی سربراہ بھی شامل ہو گا۔ یہ بورڈ مرکز کے پروگرام کا معیار بھی پرکھے گا اور خاص طور پر Outreach مواد کو چیک کرے گا۔ یہ مرکز کے لئے مستقبل کے پلان بھی بنائے گا اور ان پر نظر ثانی بھی کرے گا۔ مختصر یہ کہ یہ عمومی طور پر نظر رکھے گا اور تمام ان پالیسی معاملات میں دخل دے سکے گا جو مرکز پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

مرکز کی نگرانی کے لئے جو بورڈ تشکیل دیا گیا اس میں مشرق وسطیٰ سے بنیادی تعلق رکھنے والے صرف ایک فیکلٹی ممبر کو نامزد کیا گیا۔ مزید برآں جو دوسرے شعبے شامل کئے گئے ان میں

جنوب مشرقی ایشیا، مشرق قریب آثار قدیمہ، بنجر صحرائی علاقہ، علم الانسان اور شعبہ مطالعہ یہودیت کے پروفیسران شامل تھے اور ان سب کو ووٹنگ کے مساوی حقوق حاصل تھے۔

Adamec کے خیال میں ان تمام اقدامات سے مشرق قریب مرکز کو یونیورسٹی کے اندر پیشتر ازیں جو خود مختاری حاصل تھی اس کو ملیامیٹ کرنا اور اس کو مرکز سے خارج کرنا مقصود تھا۔ ۵ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو Adamec نے قائم مقام ڈین کو اپنا استعفیٰ کا خط بھیج دیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ۱۹۸۴ء کے خزاں سمسٹر کے بعد اس پوزیشن سے کنارہ کشی کر لے گا اور کہا کہ تقریباً تین سال کے لگاتار سیاسی حملوں کے بعد جبکہ ہمارے موقف کو جائز قرار دیا جا چکا ہے۔ آپ نے نئے قائم شدہ بورڈ آف گورنرز کو جو سب سے اہم کام سونپا ہے وہ ملازمین پر نظر ثانی کا ہے۔ یعنی ڈائریکٹر اور Outreach Coordinator کی تبدیلی کا۔

اب مزید یہ گنوانے کا فائدہ نہیں کہ مرکز کے خلاف تعصب اور دق کرنے والے کون سے اقدام کئے گئے۔ میں نے اس مرکز کے ڈائریکٹر کے طور پر جو خدمات انجام دیں وہ بے لوث تھیں۔ ان کا مجھے کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا گیا۔ جنہیں میری جگہ کسی اور کو دیکھنے کی تمنا ہے ان کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ شیلا سکوول نے بھی اسی بناء پر مرکز چھوڑ دیا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد کم ہی امید تھی کہ وفاقی فنڈز مشرق قریب مرکز کو مل سکیں۔ Adamec نے خود ہی پیشین گوئی کی تھی کہ سال بھر بعد اغلباً اس مرکز کے لئے رقم نہ ہو۔ چنانچہ TJCC کو اپنی مراد مل گئی۔ اس نے نہ صرف مؤثر طور پر Outreach پروگرام کو معطل کروا دیا تھا بلکہ اس کا مواد ایریزونا کے سب سے بڑے اسکول ڈسٹرکٹ کے کلاس رومز میں ممنوعہ قرار دلوا دیا۔ مزید برآں صدر کوفلر کی امداد سے ان دونوں کو بھی استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا تھا جو روز اوّل سے ہی ان کا نشانہ تھے۔

William Dever نے TUSD کا فیصلہ سننے کے بعد ایک انٹرویو میں کہا کہ میں سمجھ گیا کہ ہمارا کام تمام ہو چکا ہے۔ TJCC کے پاس غیر محدود وقت، ذرائع اور توجہ ہے جو کہ ہمارے پاس عنقا ہے۔ ہم تو صرف چند افراد ہیں جو کہ اپنے طور پر اپنے اصلی کام سے وقت نکال کر اس مایوس کن لڑائی میں حصہ لے رہے تھے۔ جو چیز ہمارے لئے الجھن کا باعث تھی وہ یہ تھی کہ یہ اس کمیونٹی میں یہ کوئی اِکا دُکا واقعہ نہیں۔ مقامی عوام کو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ایک قومی سطح کی مہم تھی اور ہمیں معلوم ہے کہ کئی دوسرے مشرق قریب مراکز کو بھی ایسے ہی دباؤ کا سامنا تھا۔ اب وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم

نے جیسا ٹسکن والوں سے نپٹ لیا ویسا ہی آپ سے بھی نپٹ لیں گے۔

Robert Gimello نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ میرے خوابوں کی شکست تھی۔ مجھے اس دعوٰی پر کافی شک تھا کہ ہمارے بہت سے عوامی معاملات میں اسرائیلی لابی کا عمل دخل ہے لیکن مجھے پچھلے دو سال کے تجربے نے قائل کیا کہ ایسا ہی ہے۔ میرے لئے یہ ایک خوفناک اچنبھا تھا۔"

یہ البتہ ہرگز اچنبھا نہ تھا کہ TUSD کے اس فیصلہ کرنے والے اہم افراد کو TJCC نے خاص طور پر نوازا۔ TUSD کے پروگرام سے لاتعلقی کے فیصلہ سے چھ ماہ بعد Sylvia Campoy اور دو ممبران بورڈ یعنی Eva Bacal اور Raul Grijalva کو TJCC نے اعزاز سے نوازا۔ Bacal بھی سپرنٹنڈنٹ Merril Grant کی طرح یہودی فرقے میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ایک ڈنر میں Campoy کے بارے میں یکساں مواقع کی فراہمی اور مساوات میں لیڈرشپ کا اعتراف کیا گیا۔ اس موقع پر Carol Karsch صدر نشین تھی جسے سال گذشتہ ہی ٹسکن کی یہودی Woman of the Year تسلیم کیا گیا تھا' یہ اسی پروگرام پر حملہ کرنے کا انعام تھا۔

Campoy کو ابھی اور بھی کچھ ملنا تھا۔ اگلے ماہ یہودی جریدے نے اعلان کیا کہ وہ ہفتہ بھر کے اسرائیل کے دورہ کے لئے یہودی فرقے کے مہمان کی حیثیت میں جائے گی جس کا سارا خرچہ امریکن جیوش کمیٹی اور مقامی جیوش کمیونٹی فاؤنڈیشن برداشت کرے گی اور جس کا انتظام Karsch نے کیا تھا۔

یہ جاننا خالی از دلچسپی نہیں کہ ٹسکن میں Karsch اور اس کے ہمراہی ۱۹۸۱ء میں تب چوکنے ہوئے جب مشرق قریب مرکز کو قائم ہوئے کوئی چھ سال بیت چکے تھے۔ یہ اسی سال ہوا جب امریکن جیوش کمیٹی نے ایک رپورٹ بعنوان "امریکہ کی چنیدہ یونیورسٹیوں میں مشرق وسطٰی مراکز" شائع کی۔ یہ رپورٹ Gary Schiff نے لکھی تھی جو کہ اکیڈمی برائے تعلیمی ترقی کا پراجیکٹ ڈائریکٹر تھا۔ Karsch نے بھی TJCC کو اس طرف سے امداد ملنے کا اعتراف کیا تھا۔ اس رپورٹ میں یہ دعوٰی کیا گیا تھا کہ عرب حکومتوں یا عرب نواز کارپوریشنوں کی طرف سے مالی امداد نے ان مشرق وسطٰی مراکز کے طلباء اور فیکلٹی ممبران پر کم از کم ایک لاشعوری اثر ضرور ڈالا تھا۔

Schiff رپورٹ میں سفارش کی گئی تھی کہ یونیورسٹیاں Outreach پروگرام پر کڑی نگرانی

رکھیں۔ امریکن جیوش کمیٹی نے اپنی طرف سے اعلان کیا کہ وہ مشرق وسطیٰ مراکز کی لگاتار نگرانی جاری رکھے گی۔ وہ تمام ملک میں پروفیسروں' اساتذہ اور مقامی کمیونٹی گروپس وغیرہ کے تعاون سے Outreach پروگرام مواد کو جمع کرنا اور پرکھنا جاری رکھے گی اور جہاں کوئی مسئلہ کھڑا ہوگا وہ یونیورسٹی حکام سے مل کر نظرانداز ہونے والی غلطیوں کی تصحیح اور نظرثانی کے معاملات طے کرے گی۔ Schiff رپورٹ میں اسرائیل کو غیر قانونی ثابت کرنے کی مجموعی کوشش تاکہ اس کو آخرکار نابود کردیے جانے کا بیحد ڈراؤنے طریقہ سے ذکر تھا۔

TJCC کی اس مہم کو لوگوں نے تمام امریکہ میں دوسرے مشرق وسطیٰ مراکز پر حملوں کا پیش خیمہ جانا' Schiff رپورٹ اور دوسرے اداروں مثلاً امریکن جیوش کمیٹی اور B'nai B'rith کی اینٹی ڈی فیمیشن لیگ جیسی قومی تنظیموں کے درمیان پورا پورا تعاون اس تھیوری کو ثابت کرتا ہے۔ چند دوسرے مشرق وسطیٰ مراکز جنہیں وفاقی مالی امداد حاصل ہے وہ ہارورڈ' کولمبیا' کیلیفورنیا' برکلے' پرنسٹن' نیویارک' ٹیکساس' مشی گن' پنسلوینیا' یوٹاہ اور واشنگٹن یونیورسٹیوں میں قائم ہیں۔

ٹسکن کے حملے کی کامیابی نے جلد ہی ایک اور Outreach پروگرام پر حملہ کی راہ ہموار کی۔ ۱۹۸۲ء گرما میں امریکن جیوش کمیٹی کے Arthur Abramson نے Charlotte Albright سے ملاقات کی جو واشنگٹن یونیورسٹی Seattle میں Mid-East Outreach Coordinator تھا۔ اس نے Albright سے پچھلے پانچ سالوں کی سرگرمیوں کی رپورٹ طلب کی' جب اس نے انکار کیا تو Abramson نے اسے کہا کہ ایسی ہی رپورٹ ٹسکن اور لاس اینجلز کے مشرق وسطیٰ مراکز سے بھی مانگی گئی ہیں اور اسے یاد دلایا کہ ٹسکن کا مرکز بند ہوچکا ہے۔ (یہ ان چار ماہ کی معطلی والے عرصہ میں تھا) Abramson نے مزید دعویٰ کیا کہ UCLA کا رابطہ کار Jonathan Friedlander بھی اسے ایسی ہی رپورٹ فراہم کرچکا ہے۔ جب Albright نے فرائیڈ لینڈر سے اس موضوع پر بات کی تو اس نے کہا کہ نہ تو اس سے ایسی رپورٹ مانگی گئی ہے اور نہ اس نے دی ہے۔ جب Abramson کو اس حقیقت کا سامنا کرایا گیا تو وہ کہنے لگا کہ اس کے پاس کہیں نہ کہیں فائلوں میں فرائیڈ لینڈر کی رپورٹ پڑی ہے جو وہ اسے دکھائے گا۔ یہ وعدہ کبھی وفا نہ ہوا۔

۱۹۸۴ء کی Outreach Coordinators کانفرنس سے آکر شیلا سکوول نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دوسرے رابطہ کاروں کا خیال ہے کہ وہ اس قسم کے پریشر گروپ کا سامنا کرسکتے

ہیں۔ میرا تجزیہ یہ کہتا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ مستقبل میں Outreach پروگرام حتمی طور پر سیاسی رنگ اختیار کر لیں گے اور تعلیمی لحاظ سے کسی کام کے نہ رہیں گے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اس کا اپنا مستقبل اس جھگڑے کے باعث غیر یقینی حالت کا شکار تھا۔

ٹسکن کے اس جھگڑے میں ایک حیران کن بات یہ تھی کہ یہودی آبادی میں سے کسی نے بھی TJCC کی مہم کی مخالفت نہ کی۔ اس بارے میں ایک یہودی پروفیسر کا تبصرہ اس بات پر قدرے روشنی ڈالتا ہے کہ عام یہودی کیوں کھل کر بولنے سے عام طور پر کنی کتراتے ہیں۔

جن چار ماہرین کو TJCC کے الزامات کی تحقیق کے لئے بلایا گیا' ان میں سے ایک Richard Frye کو اس پروفیسر نے بتلایا کہ Karsch اور Kozolchyk ان یہودیوں کے پیر تسمہ پا تھے۔ جو بھی ان کے خلاف آواز اٹھائے گا وہ گویا قومی پالیسی اور تنظیم کے خلاف ہے۔ پروفیسر کا کہنا تھا کہ اس پر بے انتہا دباؤ تھا۔ ہمیں آخر کار مالی امداد و گرانٹس مختلف یہودی تنظیموں سے ہی وصول ہوتی ہیں۔ یہ جو کچھ میں آپ کو بتلا رہا ہوں مجھے "بچہ سقہ" کا خطاب دلوائے گا۔

ایک اور یہودی پروفیسر Jerrold Levy سے جب اسکول بورڈ کی میٹنگ کے معاً بعد پوچھا گیا کہ ٹسکن کی یہودی آبادی میں سے کسی بھی آزاد خیال گروہ نے کوئی بھی احتجاج کیوں نہ کیا؟ تو اس کا کہنا تھا کہ میرے خیال میں ہر کوئی سہما ہوا ہے۔ Levy نے بذات خود تین اخبارات کے ایڈیٹروں کو TJCC کے لیڈروں کے جارحانہ رویہ کے بارے میں خطوط ارسال کئے لیکن ایک بھی شائع نہ کیا گیا۔ اس نے اپنی اس جسارت کو یوں بیان کیا:

> "میں اپنے روزگار یا تدریسی کام کے لئے یہودی مالی امداد کا دست نگر نہیں۔ ڈاکٹر اور وکیل جیسے پیشہ ور گروہوں کے لوگ ان سے ڈرتے ہیں۔ میرے دوست اپنے سیاسی خیالات کے بارے میں بیحد اخفاء راز رکھتے ہیں۔ میں ایک بیحد آزاد خیال پیشہ ور کو جانتا ہوں۔ اب جبکہ اس کا کاروبار خوب اچھی طرح سے چل پڑا ہے تو TJCC سے اختلاف ظاہر کرنے سے اجتناب کرتا ہے۔ کچھ متعلقہ افراد بھی منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہیں۔ ہمیں یہاں ایک نہایت ہی منظم ہم مذہب لوگوں کے گروپ سے پالا پڑا ہوا ہے۔ یہاں پر کچھ گھپلا ضرور ہے۔"

Levy کا مزید کہنا تھا کہ جہاں بہت سارے افراد ذاتی طور پر TJCC سے اختلاف رکھتے ہیں

وہاں اس نے ایک اور وجہ بھی بیان کی کہ کیوں یہودی آوازیں اختلاف میں نہیں اٹھتیں یعنی غلط اطلاعات۔ میں نے دو قدیم رفقاء سے بات کی۔ ان کی میرے دل میں بڑی عزت تھی۔ میں نے پوچھا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ان کا جواب عمومی طور پر یہ تھا کہ بھئی جہاں دھواں ہے وہاں آگ بھی ہوگی۔ وہ یہ حملہ شروع نہ کرتے اگر کچھ نہ کچھ گڑبڑ نہ رہی ہوتی۔ جب میں نے پوچھا کہ انہوں نے کیا پڑھا ہے؟ تو کہنے لگے صرف (یہودی) Arizon a Post کے اداریے' اور کچھ بھی نہیں۔ لوگ جانتے نہیں' حقیقت نہیں سمجھتے' Arizona Post نے تو کافی غیر ذمہ دارانہ' متعصب باتیں لکھی تھیں۔

Levy نے کہا کہ اس نے Kozolchyk اور Karsch دونوں کے ساتھ بحث کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جواباً اسے ایک تعلیمی سیریز میں مدعو کیا جو وہ کر رہے تھے۔ موضوع تھا کہ یہودیوں کو کس لئے اسرائیلی وزیر اعظم بیگن کی حمایت کرنی چاہئے۔ یہ ایک شام کے لیکچروں کا سلسلہ تھا جس کو ہم صرف برین واشنگ کا ہی نام دے سکتے ہیں۔ دوسرے لیکچر میں مجھے اٹھ کر کئی غلطیوں کی نشاندہی کرنی پڑی۔ انہوں نے نقشوں میں تحریف کر رکھی تھی اور کئی دوسری باتیں عجیب وغریب تھیں۔ انہوں نے مجھے اس گروپ سے خارج کر دیا۔ سیدھی سی بات تھی' اس گروپ میں اختلاف رائے کی گنجائش نہ تھی۔

Levy یہاں ٹسکن کے عمومی ماحول کا تذکرہ کرتے ہوئے اسی لہجہ میں کہتا ہے:

> "یہ تو میکارتھی والے زمانے کی طرح ہے۔ میں صرف مشرق قریب مرکز (تنازعہ) ہی نہیں بلکہ اسرائیل کے بارے میں سارے رویہ کو اس میں شامل کرتا ہوں۔ یہ تو ۱۹۳۰ء کے عشرہ کے جرمنی جیسی صورت حال ہے۔ ہم یہودی اس کا بہت واویلا کرتے ہیں کہ ہم اسی قسم کے حالات سے آزادی چاہتے ہیں اور اب کون ویسی ہی بات پھر چھیڑ رہا ہے؟ مجھے تو اس بات سے بڑا ہول آتا ہے۔"

باب نہم

مذہب اور حکومت

یہ ۱۹۸۲ء کے خزاں کا انتخابی مہم کا موسم تھا۔ شیلبی کاؤنٹی کا ایک نوعمر کلرک Dwight Campbell شیلبی ریستوران میں منعقدہ ایک جلسہ میں سکون سے بیٹھا تھا۔ میں اپنے انتخابی حلقے کے چند ووٹران سے خارجہ پالیسی کے کچھ نکات پر تبادلہ خیالات کر رہا تھا۔ جب جلسہ اختتام کے قریب تھا اور لوگ جا رہے تھے تو Campbell نے مجھے ایک طرف لے جا کر اپنی گہری تشویش سے آگاہ کیا کہ میں نے اسرائیل کی لبنان میں پالیسی پر نکتہ چینی کیوں کی؟

اس نے اپنے آپ کو عیسائی بتلایا اور مشتعل ہوئے بغیر بیحد ذاتی لہجے میں مجھے انتباہ کیا کہ مشرق وسطیٰ کے بارے میں میرا رویہ نہ صرف سیاسی لحاظ سے غلط تھا بلکہ زیادہ اہم یہ تھا کہ خدا کی مرضی کے خلاف تھا۔ اس نے دردمندانہ لہجہ میں کہا کہ وہ اسرائیل کے بائبل میں بتلائے گئے انجام کے بارے میں کسی دخل اندازی کی حمایت نہ کرے گا۔

اس کے لہجے میں سوز نمایاں تھا۔ عیاں تھا کہ یہ عوامی اہل کار جو اپنی کیمونٹی میں معزز تھا' اسرائیل کی حمایت مجبوری سے نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی اس کی نیت کسی پیشہ ورانہ یا معاشرتی ترقی کی تھی۔ بیشتر تبلیغی مسیحیوں کی طرح یہ جذبات اس کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے تھے۔

Campbell جیسے امریکی اسرائیل کے لئے ایک قدرتی حلقہ انتخاب بن جاتے ہیں اور اسرائیلی لابی کو بے پناہ طاقت کا سرچشمہ فراہم کرتے ہیں۔ ڈیموکریٹ کانگریس ممبر Lee H. Hamilton جو کہ مشرق وسطیٰ ذیلی کمیٹی کا چیئرمین ہے اسے بھی اپنے دیہی انڈیانا حلقے میں ایسے ہی جذبات کے اظہار سننے سے واسطہ پڑتا ہے۔ شہری جلسوں میں ہیملٹن کو اکثر ایسے اراکین حلقہ انتخاب سے واسطہ پڑتا ہے جو کہ پہلے اپنا تعارف بطور ایک عیسائی کے کروا کر اصرار کرتے ہیں کہ وہ اسرائیل کی حمایت پوری پوری کرے۔

بہت سارے امریکی عیسائی (قدامت پرست اور سواد اعظم' دونوں) اسرائیل کی حمایت

کرتے ہیں کیونکہ وہ ان سے سیاسی و معاشرتی ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں۔ مزید برآں ان کے نسل کشی والے عام قتل کا خیال کرتے ہوئے بہت سارے قدامت پرست اسی طرح محسوس کرتے ہیں جیسا کہ شیلبی والے نوجوان نے کیا یعنی کہ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام بائبل کی پیشین گوئی کے مطابق تھا اور یہ یہودی ریاست نظام الٰہی میں اپنا مرکزی کردار ادا کرتی رہے گی۔

عیسائیوں کے بڑے فرقے خصوصاً پروٹسٹنٹ اپنے مذہبی رجحانات کی بدولت اسرائیل نواز رویہ رکھتے ہیں۔ بائبل پر توجہ مرکوز کرنے والے عیسائی مشرق وسطیٰ میں واقعات کو بائبل میں بیان شدہ حالات کا عکس خیال کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کے اسرائیلی انہیں بائبل والے بنی اسرائیل نظر آنے لگے اور فلسطینی ان کو Philistines لگتے۔ یہ طرزِ خیال خطرناک لیکن لاشعوری رویے کا عکاس ہے۔ غربی کنارے پر غاصب آباد کاروں اور حضرت موسیٰ' جوشوا کی قیادت میں ارض کنعان کو ختم کرنے والی عبرانی قوم کے درمیان تمیز مٹتی جا رہی ہے۔

تقریباً سبھی عیسائی مشرق وسطیٰ کے بارے میں سوچتے وقت اسرائیل کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اسرائیلی پالیسی پر کسی بھی نکتہ چینی یا مخالفت کو وہ قدرے شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لابی نے اپنے قومی مقاصد کے حصول میں اس رویہ سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے' خاص طور پر اگر مشرق وسطیٰ کے بارے میں کسی پرانے متعصب رویے یا بغض و عناد کو چیلنج کیا جائے تو اسے لابی کے علاوہ اس کے بہت سے عیسائی حمایتی بھی سیاسی انتہا پسندی Anti Semitic بلکہ عیسائی مخالف رویہ کہتے ہیں۔

بہتیرے امریکنوں کے مذہبی خیالات اسرائیلی لابی کے لئے زرخیز زمین ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مشرق وسطیٰ اور اس علاقہ کے بارے میں امریکی پالیسی پر کوئی بات چیت شروع ہونے سے پیشتر ہی اس کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ مذہبی احساسات اور لابی کی اعلانیہ سرگرمیوں کا ملاپ اس بارے میں معقول بحث کو بھی بہت تنگ حدود میں قید کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔

قدامت پسند عیسائی حمایت پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں

بنیاد پرست اور تبلیغی گروپ اس آزادی اظہار کو محدود کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ Jerry Falwell اور Pat Robertson اسرائیل کے لئے روز افزوں امریکی حمایت کی تبلیغ کرتے

نہیں جھکتے اور دلیل میں بائبل کی آیات بطور سند پیش کرتے ہیں۔ جوں جوں ان قدامت پرست پروٹسٹنٹ گرجوں اور گروپوں کی ممبر شپ میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ (پچھلے دس سالوں میں) توں توں یہ "صیہونی عیسائی" نکتہ نظر اب زیادہ سے زیادہ منبروں سے نشر ہو رہا ہے۔ اس میں مقامی گرجے ہی نہیں بلکہ نظریاتی ادارے حتی کہ ایوان نمائندگان کی محفلیں بھی حصہ لے رہی ہیں۔

AIPAC کی ۱۹۸۱ء کی سالانہ پالیسی کانفرنس کو سینیٹر Robert W. Jepsen (IOWA ریاست سے پہلی دفعہ منتخب ہو کر آنے والا) نے بتلایا کہ اس کی پرجوش اور لازوال حمایت برائے اسرائیل کی بنیاد اس کا مسیحی اعتقاد ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ عیسائی خاص طور پر انجیلی عیسائی اسرائیل کے ۱۹۴۸ء میں قیام سے ہی اس کے بہترین دوست رہے ہیں۔ اس کے خیالات کوئی اِکا دُکا بات نہیں بلکہ اکثر ممبران کانگریس ایسا ہی سوچتے ہیں۔ لیکن اس موقع پر اس کے بیان سے وہ روحانی تعلق جھلکتا ہے جو بعض عیسائی یہودیوں کے بارے میں محسوس کرتے ہیں۔

میرا ایمان ہے کہ امریکہ پر اب تک جو بارانِ رحمت رہا ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ہم نے یہاں آکر پناہ لینے والے یہودیوں سے مہمان نوازی کا سلوک کیا ہے۔ ہم پر رحمت نازل ہوتی رہی کیونکہ ہم نے ہمیشہ اسرائیل کا دفاع کیا۔ ہم پر رحمت نازل ہوتی رہی ہے کیونکہ ہم نے اسرائیل کا حق اس زمین پر تسلیم کیا ہے۔

Jepsen نے پہلے تو سعودی عرب کو AWACS کی فروخت کی مخالفت کی وجہ اپنا بنیاد پرست رویہ بتلایا لیکن سینیٹ میں اس پر ووٹ سے ایک یوم قبل اپنا قبلہ تبدیل کرنے کو خدائی دخل اندازی پر مبنی قرار دیا۔ ۶ر نومبر ۱۹۸۴ء کو IOWA کے رائے دہندگان نے اسرائیلی لابی کی انگیخت پر اپنا قبلہ تبدیل کر لیا اور Jepsen کی دوسری نامزدگی میں اسے رد کر کے انتخاب میں شکست سے ہمکنار کر دیا۔

Jerry Falwell جو کہ Moral Majority کا لیڈر اور Menachem Begin اور Yitzhak Shamir کا ذاتی دوست ہے۔ اس کے بارے میں لندن کے اخبار اکانومسٹ کا کہنا ہے کہ وہ عیسائی نشاۃ ثانیہ کا شیریں دہن آیت اللہ ہے۔

Conservative Digest جریدے میں اسے سال رواں کا کانگریس سے باہر مقبول ترین قدامت پرست قرار دیا گیا تھا (صدر ریگن کا دوسرا نمبر تھا) Falwell اس عیسائی 'صیہونی گٹھ جوڑ کی

مجسم شکل تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ میرے خیال میں امریکہ بنی اسرائیل کو پشت دکھانے کے بعد زندہ نہ رہ سکے گا۔ خدائے تعالیٰ اقوام عالم سے ویسا ہی سلوک کرتے ہیں جیسا وہ اقوام یہودیوں سے روا رکھتے ہیں۔ اس نے کانگریس کی کمیٹیوں کے سامنے بیان دیتے ہوئے اس بات کی حمایت کی ہے کہ امریکہ کو اپنا سفارت خانہ تل ابیب سے یروشلم منتقل کر دینا چاہئے۔ اغلباً Falwell مشہور ترین اسرائیل نواز بنیاد پرست نمائندہ ہے اور وہ اکیلا ہرگز نہیں ہے۔

۱۹۸۳ء کے گرما میں Mide Evans آف ٹیکساس نے گھنٹہ بھر لمبا ٹی وی اسپیشل پروگرام کیا "اسرائیل یعنی امریکہ کی سلامتی کی کنجی" انجیلی Evans نے اس پروگرام میں امریکہ کے سیاسی اور روحانی مقدر میں اسرائیل کا اہم حصہ بیان کیا۔ چونکہ یہ پروگرام مذہبی عنوان سے پیش کیا گیا تھا لہٰذا کرسچین براڈ کاسٹنگ کیبل نیٹ ورک کے علاوہ ۲۵ دوسرے مقامی ریاستی ٹی وی اسٹیشنوں پر بھی اسے مفت وقت دیا گیا۔ صاف ظاہر ہے کہ پروگرام تمام روحانی نوعیت کا نہ تھا۔

Evans نے کئی مشہور عوامی اور فوجی شخصیات کے ساتھ انٹرویو کے دوران جن میں Pet Robertson ' Roberts, Oral اور Jimmy Smaggart شامل تھے۔ الہامی اکتسابات کا حوالہ دیتے ہوئے اسرائیل کے بارے میں کئی دعوے کئے۔ ان دعووں میں یہ بعید از قیاس دعویٰ بھی تھا کہ اگر اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں غصب کئے گئے علاقے اور غربی کنارے کا کنٹرول ہاتھ سے دیا تو یہ اس کی اور امریکہ کی تباہی پر منتج ہو گا۔ یہ بھی کہا گیا کہ اسرائیل سوویت دباؤ کا خاص شکار ہے جو بین الاقوامی دہشت گردی کی شکل میں ہے، جو بصورت دیگر براہِ راست ریاستہائے متحدہ امریکہ اور لاطینی امریکہ کا مقدر ہوتی۔

Evans نے اپنی براڈ کاسٹ کا اختتام اس پر اثر اپیل سے کیا کہ سب عیسائیوں کو دنیا کے اس خطے میں امریکہ کے بہترین دوست کی حمایت کرنی چاہئے اور اسرائیل کے لئے دعائیہ اعلامیہ پر دستخط کرنا چاہئیں۔ اس نے کہا کہ خدائے تعالیٰ نے مجھے واضح طور پر اسرائیل کے لئے یہ پروگرام تیار کرنے کی ہدایت دی۔ Evans کا کہنا تھا کہ یہ اعلامیہ خاص طور پر اہم ہے کیونکہ جنگ ہوا ہی چاہتی ہے اور ہمیں اپنے صدر اور وزیراعظم بیگن کو یہ بتلا دینا چاہئے کہ بطور امریکی ہمارے اسرائیل کے بارے میں کیا احساسات ہیں۔ تب سے وہ یہ اعلامیہ صدر ریگن اور وزیراعظم شامیر کو پیش کر چکا ہے اور ایک حالیہ بیان میں اس نے اپنے حامیوں کا شکریہ ادا کیا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ دنیا میں وہ سب

سے طاقتور لیڈروں پر ہمارا اس قدر اثر ہو گا لیکن ایسا ہے۔

پھر بھی ریگن کے ردّعمل سے اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اگست ۱۹۸۴ء کے اسرائیل کے لئے امداد جمع کرنے والے ایک جلسہ میں اس کا کہنا تھا کہ اسرائیل کی اقتصادی مشکلات کا امریکہ ذمہ دار تھا۔ اسرائیل نے امریکہ کی شہ پر سینائی اور اس کا تیل (بقول اس کے 1.7 Billions ڈالر کا نقصان ہوا تھا) چھوڑا تھا اور مشرق وسطیٰ کے دفاع میں امریکہ کی مدد کرنے کے باعث اسرائیل اقتصادی دیوالیہ پن کے کنارے آلگا تھا۔ بقول اس کے صدر ریگن کو اسرائیل پر پڑے ہوئے شدید دباؤ کو کم کرنے میں پس و پیش تھا۔

Evans کا امریکہ کی بقاء کو اسرائیل کے ساتھ منتھی کرنے کا یہ فارمولا ایک پورے صفحہ کے اشتہار میں بھی شائع کیا گیا۔ اشتہار اسرائیل کے لئے فنڈ جمع کرنے کے لئے نیشنل پولیٹکل ایکشن کمیٹی نے نیویارک ٹائمز کے ۱۸ر دسمبر ۱۹۸۳ء والے شمارے میں شائع کروایا تھا۔ اس میں درج تھا کہ اسرائیل کی بقا میں ہماری بقا بھی مضمر ہے۔ اسرائیل پر ایمان امریکہ کے لئے تقویت کا باعث ہے۔ Swaggart, Kenneth Copelana, Jim Baker اور کئی دوسرے افراد ریڈیو اور ٹی وی نشریات کے ذریعے اسرائیل کی حرمت کا عام طور پر ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔ عام طور پر "عہد نامہ عتیق" یعنی تورات کے حوالہ جات پیش کرتے ہیں اور پھر اپنی طرف سے مزید سیاسی و فوجی مصلحت کی دلیلیں پیش کر کے اس کی ثقاہت میں اضافہ کرتے ہیں۔

ان دلائل سے بیشتر سامعین، ناظرین مرعوب ہوتے ہیں۔ ایک عام اندازہ کے مطابق امریکہ میں انجیلی عیسائیوں کی تعداد ۳ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ Jerry Falwell کا "Old Time Gospel Hour" ٹی وی۔ ۳۹۲ اسٹیشنوں اور تقریباً ۵۰۰ ریڈیو اسٹیشنوں سے ہر ہفتے نشر ہوتا ہے۔ اسرائیل کا سابقہ وزیر اعظم Menachem Begin تو Falwell کو بیس ملین امریکی عیسائیوں کا نمائندہ گردانتے ہیں۔ اور یہ طریقۂ تبلیغ صرف امریکہ تک محدود نہیں۔ اب اس کا اسرائیل نواز پروگرام مشرق وسطیٰ سے بھی نشر ہوتا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں لبنان پر اسرائیلی فوج کشی کے بعد سے جنوبی لبنان میں George Otis کا "ہائی ایڈونچر ہولی لینڈ براڈ کاسٹنگ نیٹ ورک" اپنا "صوتِ امید" ریڈیو اسٹیشن چلا رہا ہے۔ وہ اپنے اس عمل کو ایک ایسے خطہ میں خدا کی آواز پھیلانا جہاں کئی صدیوں سے خدا کا پیغام نہیں پہنچا قرار دیتا ہے۔ Otis نے اپنی وزارت کو جو نام دیا ہے وہ اس کے ذاتی ایمان

کہ "مسیح اعلیٰ مہم (ہے)" پر مبنی ہے مگر پچھلے کئی برسوں سے یہ اسٹیشن ایک اور لادین مہم میں مشغول ہے۔

۱۹۸۲ء کے اسرائیلی حملے سے پیشتر جنوبی لبنان کو کنٹرول کرنے والی اسرائیل پشت پناہی والی ملیشیا کا کمانڈر میجر سعد حداد مرحوم اسی "صوتِ امید" ریڈیو پر اپنے فوجی مقاصد نشر کیا کرتا تھا جس میں شہریوں کے خلاف دھمکیاں بھی ہوتیں۔ انجیلی Otis حداد کے ان قابل نفرت پہلوؤں کو نظرانداز کر کے اسے (Born Again) جنم ثانی والا عیسائی قرار دیتا جو کہ جنوبی لبنان کے لوگوں کے لئے ایک اچھا روحانی پیشوا تھا۔ امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ حداد سدون شہر اور دوسرے شہری علاقوں کو بغیر پیشگی انتباہ کے گولہ باری کرنے کی دھمکی نشر کیا کرتا تھا۔ حداد ان حملوں کی عقلی تاویل یہ کہہ کر کیا کرتا کہ یہ حملے لبنانی حکومت کے اس کو تنخواہ ادا نہ کرنے کی پاداش میں کئے جاتے تھے۔ (لبنان کی حکومت نے حداد کی تنخواہ اس وقت بند کی تھی جب اس کی لبنانی فوج سے بے عزت برطرفی کی گئی۔

۱۹۸۰ء کے موسم بہار میں حداد نے Tyre کے نزدیک منعقدہ ایک بوائے اسکاؤٹ جمبوری پر پانچ امریکی ساختہ شرمین ٹینکوں کے ساتھ حملہ کیا جس میں ۱۶ لڑکے ہلاک ہوئے۔ حداد کے توپچیوں نے ناروے کے ایک طبی ہیلی کاپٹر کو بھی مار گرایا جو زخمیوں کے انخلاء کے لئے آیا تھا۔ یہ اسکاؤٹ اجتماع جو کہ عیسائی مارونطی چرچ نے بلایا تھا آزاد لبنان یعنی حداد لینڈ کے سرحد کے کچھ ہی باہر واقع تھا۔ یہاں حداد کی اسرائیل نواز ملیشیا کا کنٹرول تھا۔ اس موقعے پر حداد نے اعلان کیا تھا کہ وہ اس طرح کے حملے جاری رکھے گا جب تک کہ لبنانی حکومت اس کے علاقے کو مزید بجلی فراہم نہیں کرتی اور اس کے اسکولوں کو تسلیم نہیں کر لیتی۔

اسرائیل کی پشت پناہی اور جنوب میں باقی ماندہ عیسائی افواج کے تعاون سے ہائی ایڈونچر منسٹری جنوبی لبنان میں اپنا ٹی وی اسٹیشن Star of Hope نام سے قائم کرنے کے راستہ پر گامزن ہے۔ Otis کے لئے اسرائیلی امداد ایک معجزہ ہے بقول اس کے کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ یہودی ایک عیسائی اسٹیشن کے لئے امداد دیں گے؟ لیکن یہ ٹی وی اسٹیشن شہری رسل و رسائل کے علاوہ فوجی مقاصد کے لئے بھی زیادہ مؤثر ذریعہ ثابت ہوگا۔ لہٰذا اسرائیل کی حمایت ایک گہری فوجی حکمت عملی کی غماز ہے نہ کہ الہامی۔ دخل اندازی کی Voice of Hope کی مانند یہ Star of Hope بھی شمالی

امریکہ کے معطی حضرات کی مالی اور فنی ساز و سامان کے عطیات پر کھڑا کیا جائے گا اور یہ عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

ان کوششوں سے بالواسطہ امریکی انجیلی نشریات اسرائیلی حکومت کے لئے مدد کا باعث بنتی ہیں۔ ان کی مذہبی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور یہ نشریات مشرق وسطیٰ میں اسرائیل اور ان کے لبنانی حمایتوں کے فوجی مقاصد کو بلاواسطہ بڑھاوا دیتی ہیں۔

جیری فال ویل جنم ثانی والے عیسائیوں کے لئے اسرائیل کے دورے کا وقفہ وقفہ سے انتظام کرتا رہتا ہے۔ گو فال ویل اس بارے میں خاصی احتیاط کرتا ہے کہ Moral Majority کو اسرائیل سے مالی امداد ملنے کا تاثر ابھرنے نہ پائے۔ لیکن اس کا کیا کیجئے کہ سابقہ وزیر اعظم اسرائیل Menachim Begin نے اس کی تنظیم کو ایک عدد جیٹ ہوائی جہاز خاصے ارزاں نرخوں پر فروخت کروا کر اس سے وابستگی کا اظہار کیا۔

فال ویل کے علاوہ بھی کئی عیسائی گروپ اسرائیل کے حمایتی ہیں۔ مشرقی کولوریڈو میں دس سے زیادہ گرجے ایک سالانہ Israel Recognition مناتے ہیں۔ اس میں فلمیں، لیکچر، ثقافتی نمائشیں اور وعظ کئے جاتے ہیں جو ۲۵۰۰ سے زائد ممبران گرجا کو پہنچتے ہیں۔ نیشنل کرسچین لیڈر شپ کانفرنس برائے اسرائیل (NCLCI) واشنگٹن میں سالانہ کانفرنس منعقد کرتی ہے جس میں تمام امریکہ کے عیسائی گروپوں کے ۲۰۰ سے زائد نمائندے شریک ہوتے ہیں۔ NCLCI کے صدر Dr. Franklin H. Littell کا مشاہدہ ہے کہ صرف اسرائیل کی بقاء اور خیریت ہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ان سب تنظیموں نے کبھی باہمی تعاون کیا ہے۔ اس کے علاوہ مشہور واقعہ میں اسرائیل سبت کے ساتھ یکجہتی ہے۔ واشنگٹن کے Beth Shalom Orthodoc Synagogue میں جو اکتوبر ۱۹۸۲ء میں ہوا۔ انجیلی لیڈران نے یہودی پادریوں کے ساتھ مل کر پل سازی کا کام کرتے ہوئے اسرائیل کے ساتھ تال میل کی۔ اور دوسرا واقعہ اسرائیل کے اعزاز میں قومی دعائیہ ناشتہ کا اہتمام ہے جو کہ ہمارے دارالخلافہ میں ایک سالانہ فنکشن بن چکا ہے۔

یکم فروری ۱۹۸۴ء کو جو تیسری ناشتہ کانفرنس کی گئی اس میں ۵۰۰ سے زائد اسرائیل کے گرم جوش حامیوں نے حصہ لیا۔ اسٹیج پر داؤدی ستارے کے اسٹیکرز لگے ہوئے تھے۔ اس کے شائع شدہ پروگرام میں انجیلی اور سیاسی لیڈران کی ایک شاندار لسٹ تھی۔ ان میں Edwin Meese-III بھی

شامل تھا۔(جس کے بارے میں اعلان کیا گیا کہ وہ اس لئے شمولیت نہ کر سکا کہ اسے ابھی ابھی اٹارنی جنرل نامزد کیا گیا ہے۔) اور Meir Rosenne (امریکہ میں اسرائیل کی سفیر) کے علاوہ اس میں قومی براڈ کاسٹرز اور دوسرے قدامت پرست پروٹسٹنٹ گروپوں کے نمائندے بھی شامل تھے۔ اس میں مشی گن کے Mark Siljander (کانگریس میں مشرق وسطیٰ ذیلی کمیٹی کا ممبر) نے ایک انتہائی مؤثر اور دلنشین وعظ کیا جس میں اسرائیل کے ساتھ یک جہتی کا اعادہ کیا گیا۔ اس نے کہا "ہم عرب مخالف نہیں ہیں۔ ہم تو صرف خدائی نظام کے ذریعے امن چاہتے ہیں۔"

یہ ناشتے جس تنظیم کے تحت مربوط کئے جاتے ہیں اس کا نام مذہبی گول میز کانفرنس ہے اور وہ اپنا مقصد ایک ایسی قومی تنظیم جو اخلاقی مقاصد اور مذہبی احیاء کا امریکہ میں فروغ چاہتی ہے' بیان کرتی ہے۔ لیکن اسرائیل کے مفاد پر نظر رکھنا اس کی اوّلین ترجیحات میں سے ہے۔ اس گروپ کے صدر Edward E. Mcateer کو واشنگٹن میں بطور اسرائیل نواز مقرر اور اداریہ نگار کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ وہ اپنے مذہبی مکتبہ فکر سیاسی اقدامات کی پشت پناہی کے لئے استعمال کرتا ہے۔ مثلاً امریکہ اسرائیل فوجی تعاون' عربوں کو ہتھیار کی فروخت پر قدغن اور اسرائیل میں امریکی سفارت خانہ کی تل ابیب سے یروشلم منتقلی۔ ۱۹۸۴ء میں McAteer نے Tennessee سے سینیٹر کا انتخاب لڑا لیکن ناکام رہا۔

واشنگٹن پوسٹ میں ۲/ جنوری ۱۹۸۴ء کو McAteer نے لبنان میں اسرائیلی دخل اندازی کی حمایت اور اپنے مخالفین پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایسے مبتدی میڈیکل طلباء ہیں جو کہ صرف نصف رسولی (یعنی PLO) کو کاٹ پھینکنا چاہتے ہیں کیونکہ جراحی میں خون بہے گا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ کس قدر شہری خون بہا اس حملے میں۔ ہم اس مذہبی گول میز کانفرنس کے صلیبی گھڑ سوار پر کم از کم خون سے ڈرنے کا الزام نہیں دھر سکتے۔

Mike Evans Ministries سے متاثر ہو کر دعائیہ ناشتہ کمیٹی نے اسرائیل کے حق میں دعا کا ایک اعلان ترتیب دیا جو کہ امریکہ کے ۵۰ ملین سے زائد بائبل ماننے والے عیسائیوں کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ اس میں مذہبی اور فوجی' سیاسی نکات کا عجیب و غریب چوں چوں کا مربہ پیش کیا گیا تھا۔ اسرائیل کے ساتھ فوجی تعاون کی اپیل کے مابعد اسرائیل کے خدا کا ذکر ہے جس نے دنیا کو الہامی کتاب' ہمارے نجات دہندہ' فلاح آخرت اور روحانی برکات سے نوازا۔ الہامی کتب کے

اقتباسات پیش کر کے یہودیوں کے زمین پر حقوق الٰہی کی تصدیق کی گئی ہے اور اس کے بعد امریکہ کی اسرائیل نوازی کے خلاف جو دہری وفاداری کا الزام ہے اسے رَد کیا گیا ہے۔ امریکن سفارت خانہ کی یروشلم منتقلی کے ساتھ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ارض مقدس کی الہامی کتب میں بتلائی گئی حدود کو ہر لمحہ بدلتے سیاسی اور معاشی مفادات کی بھینٹ ہرگز نہ چڑھایا جائے۔

قدامت پرست پروٹیسٹنٹوں اور یہودیوں کے مابین تعاون سیاسی ماحول میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اپنے ایک حالیہ خطاب (اسرائیل میں) میں فال ویل نے یہ اعلان کیا کہ وہ دن دور نہیں جب امریکہ میں کوئی بھی امیدوار منتخب نہ ہو سکے گا جو اسرائیل نواز نہ ہو گو Moral Majority کو اپنے چہیتوں کو اقتدار میں لانے کے لئے ۱۰۰ فیصد کامیابی تو نصیب نہ ہوئی لیکن اعلیٰ عہدوں کے امیدواروں کو لامحالہ انجیلی سیاسی ایجنڈا کی تقلید کرنی پڑتی ہے چاہے ان کا اپنا مذہبی رجحان کچھ اور ہی کیوں نہ ہو اور اس میں اسرائیل سرفہرست ہے۔

یوں فال ویل کی Moral Majority کے اقتدار کی بنیاد وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔ وہ ووٹروں کی رجسٹریشن میں خاص دلچسپی لیتے ہیں۔ اس طرح سینیٹ اور کانگریس میں Jepsen اور Siljander جیسے کئی نمائندے منتخب ہو کر آجاتے ہیں جو کہ اسرائیل کے حق میں سیاسی حمایت کی مذہبی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

بیشتر قدامت پرست عیسائی اس حمایت کو مذہبی بنیاد پر دیکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ عیسائی مذہبی نظریات میں یہودیوں کا رول بہت نمایاں مانتے ہیں۔ ایک جانب یہ کہا جاتا ہے کہ عیسائیوں کو اسرائیل کی حمایت کرنی چاہئے کیونکہ یہ بائبل میں کی گئی پیشین گوئی کی تعبیر کا مظہر ہے۔ اس نظریہ کی دلیل کے طور پر عموماً عہد نامہ قدیم کے اکتسابات پیش کئے جاتے ہیں اور دوسری جانب بیشتر عیسائی اسرائیل کی حمایت اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں یقین ہے کہ یہودی بائبل کے زمانہ کی طرح آج بھی خدا کی منتخبہ قوم ہیں۔ اس کی وکالت کرنے والا اکثریہ دونوں دلیلیں ایک وقت پیش کرے گا۔ اس میں سے پیشین گوئی کا نظریہ تو صرف بہت ہی قدامت پرست اور بنیاد پرست گروپ مانتا ہے' جیسا کہ Moral Majority جبکہ منتخبہ قوم کا نظریہ امریکہ کے ۴۰ ملین قدامت پرست عیسائیوں کی اکثریت کا نکتہ نظر ہے۔

اپنی ایک کتاب ۱۹۷۸ء Prophecy and Prediction میں Dr. Dewey Beegle

آف Wesley Theological Seminary امریکی عیسائیوں کے اسرائیل کے بارے میں مختلف نظریات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سب عیسائی فرقے سچائی کی اجارہ داری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ ان میں سے کئی نکات نظر سچ نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ کئی ایسی دوسری تاویلات کی نفی کرتے ہیں جو کہ جانچی اور پرکھی جا سکتی ہیں۔

کئی بائبل ماہرین کی مانند Beegle بھی اسی نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جدید اسرائیل کا قیام کسی مذہبی' الہامی پیشین گوئی پر مبنی نہیں جیسا کہ صیہون نواز عیسائی بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ ان کے اخذ کردہ نتائج کو ہم دو بنیادوں میں مجملاً بیان کر سکتے ہیں۔

(۱) اسرائیلی قوم کی واپسی کی پیشین گوئی" جب یہ لوگ بائبل کے زمانے میں بابل سے واپس فلسطین پہنچے تو یہ پوری ہو چکی۔ اس کا بیسویں صدی کے اسرائیل سے کچھ واسطہ نہیں۔

(۲) وہ عہد نامہ 'میثاق جس کے تحت بنی اسرائیل کو ارض کا وارث مقرر کیا گیا تھا ایک مستقل نہیں بلکہ مشروط وعدہ تھا۔ یہ ازمنہ بائبل میں منسوخ ہو چکا ہے کیونکہ انہوں نے خدائے تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی کی تھی۔

اب یہاں مسئلہ یہ نہیں کہ Moral Majority کی مہارت زیادہ اعلیٰ ہے یا ڈاکٹر بیگل کی' بلکہ مسئلہ تو ان نازک معاملات پر کھلے عام بحث کا ہے۔ اس بارے میں بیگل کا تجربہ خاصہ چونکا دینے والا ہے۔ چونکہ اس کی کتاب میں جدید اسرائیل اور اس کے ازمنہ بائبل سے رشتوں جیسا نازک اور اختلافی موضوع زیر بحث تھا' لہٰذا متعدد ناشروں نے اس کو شائع کرنے سے معذوری کا اظہار کیا حالانکہ وہ ماضی میں اس ماہر کی کئی کتاب شائع کر چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا کہ آپ کے پہلے ابواب جن میں بائبل کی پیشین گوئیاں اور الہامات کا ذکر ہے وہ خوب ہیں۔ جو باب ہمارے لئے خاص طور پر تشویش کا باعث ہے وہ باب نمبر ۱۵ ہے۔ یعنی جدید اسرائیل ماضی اور حال۔ بیگل کو بتلایا گیا کہ گو وہ اسرائیل کی ریاست کے قیام کو جائز اور قانونی تسلیم کرتا ہے لیکن بائبل کی بنیاد پر نہیں۔ یہ نکتۂ نظر بیشتر قارئین کو برافروختہ کرنے کا سبب ہو گا لیکن کم از کم ریاستہائے متحدہ میں کسی نقطۂ نظر یا کتاب کا متنازعہ ہونا اس کو رد کرنے کی بنیاد نہیں بنایا جاتا۔ ڈاکٹر بیگل اپنے سے اختلاف رکھنے والے عیسائی اور یہودی حضرات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں یہ علم ہے کہ ان لوگوں کے خیالات اور احساسات یکساں ہیں اور یہ ایک دوسرے کی حمایت بھی کریں

گے لیکن میری صرف اتنی سی گذارش ہے کہ دوسری جانب ہمیں بھی آزادی اظہار رائے ہونی چاہیے۔ ہمیں بھی اپنا نکتہ نگاہ پیش کرنے دیا جائے۔اس کی کتاب آخر کار این آر بر' مشی گن میں واقع ایک چھوٹی سی فرم Pryor Pettengill نے شائع کی۔

کئی عیسائی حضرات جو نہ تو انجیلی ہیں اور نہ بنیاد پرست۔ وہ بھی اس مفروضہ الہامی پیشین گوئی کو اسرائیل کی مشرق وسطیٰ میں اس غالبانہ پالیسی کا جواز مانتے ہیں۔ امریکہ کے صدر بھی ان لوگوں میں شامل دکھائی دیتے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۸۳ء میں صدر ریگن نے AIPAC کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھامس' اے ڈائن کے ساتھ فون پر بات کرتے ہوئے لبنان کے موجودہ مسائل پر بحث کا رخ بائبل کی الہامی پیشین گوئی کی طرف موڑ دیا "میں تمہارے عہد نامہ عتیق کے پرانے پیغمبروں کی طرف رجوع کرتا ہوں اور آخری قیامت کی نشانیوں کی طرف تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ ہماری نسل میں ہی ظاہر ہو گی۔ یہ تو مجھے علم نہیں کہ آپ نے ان الہامی پیشین گوئیوں کو حال ہی میں پڑھا ہے یا نہیں۔ سچ مانئے' جو کچھ آج کل ہم پر گزر رہی ہے وہی درج ہے وہاں۔"

اوول آفس میں یہ خیالات صرف ریگن تک محدود نہیں ہیں۔ اس کے نظریات اس وسیع تر اعتقاد کا ایک پرتو ہیں جو ان الہامی پیشین گوئیوں کو اسرائیل کے قیام کا جواز جانتا ہے۔

اک معمہ... سمجھنے کا نہ سمجھانے کا!

اگر ہم اسرائیل کے وجود کو الہامی پیشین گوئی کا پورا ہونا تسلیم کر لیں تو عیسائی بلکہ اس سے بھی زیادہ یہودی کئی محال خیالات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ قدامت پرست اور Premillennial پروٹسٹنٹ نے روایتی طور پر یہودیوں کو عیسائیوں میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے اور ان دونوں فرقوں کے درمیان تعلقات میں کچھ زیادہ ہم آہنگی نہیں ہے۔ یہودیوں نے جبلی طور پر ۱۹۷۶ء میں جنوبی امریکی Baptist صدر جمی کارٹر کا اعتبار نہ کیا۔ کیونکہ بقول ایک یہودی مصنف Roberta Feverlicht کے یہودی تاریخ میں Cossacks (قازق) بنیاد پرستوں کے پیچھے پیچھے ہی تھے۔

ستم ظریفی دیکھئے کہ جو فرقہ الہامی پیشین گوئیوں کی بنیاد پر اسرائیل کی حمایت کرتا ہے وہی

فرقہ یہودیوں کو تبدیل مذہب کے بعد عیسائی بنانے میں گہری دلچسپی رکھتا ہے اور یہ اسرائیلیوں کے لئے ایک انتہائی حساس معاملہ ہے۔ اسرائیل کی وزارت مذہبی امور میں شعبہ عیسائی فرقہ جات کے ڈائریکٹر Dan Rossing نے اس مسئلے پر جامع تبصرہ کیا ہے۔ یہ انجیلی مذہبی اسکیم اپنے اندر یہ بات سموئے ہوئے ہے کہ اگر آج نہیں تو کل...... کسی نہ کسی دن یہودیوں کو عیسائی بننا ہے۔

بہت سی انجیلی تنظیمیں مشرق وسطیٰ خصوصاً اسرائیل میں اپنی تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں جس کے بہت سے اسرائیلی سخت مخالف ہیں۔ انجیلی کھلے عام تبلیغ کرتے ہیں اور ان کے خیال میں یہودیوں کا مذہب تبدیل کرلینا اسی الہامی پیشین گوئی کا پیش خیمہ ہے جو ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے بعث کا سبب بنی۔

بین الاقوامی مسیحی سفارت خانہ واقع یروشلم ایسی ہی ایک تنظیم ہے جو کہ بین اقوام میں اسرائیل کے لئے حمایت کا پرچار کرتی ہے۔ حال ہی میں اسرائیل کے اندر اس کی مشنری سرگرمیوں پر سخت اعتراضات کئے گئے۔ یہ سفارت خانہ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں یروشلم میں کھولا گیا تھا۔ اس کا مقصد اسرائیلی دارالحکومت تل ابیب کے تبادلہ کے متنازعہ معاملہ پر بین الاقوامی مسیحی حمایت بہم پہنچانا تھا۔ یہ بین الاقوامی مسیحی سفارت خانہ اسرائیل کی ریاست کی سیاسی حمایت کا اظہار کرنے کے باوجود بہت سے اسرائیلیوں کی نظر میں متنازع حیثیت اختیار کر گیا ہے کیونکہ اس نے تھوڑی سی کوشش یہودیوں کو عیسائیوں میں تبدیل کرنے کے لئے بھی کی۔

اسرائیل میں قدامت پرست یہودی اس بات پر زور دیتے رہتے ہیں کہ غیر ملکی مشنریوں کو بذریعہ قانون کام کرنے سے روکا جائے۔ وہ ان کے کام میں روڑے اٹکاتے رہے ہیں حالانکہ یہ تنظیمیں اسرائیل کے لئے اقتصادی مدد اور خیر سگالی بہم پہنچاتی ہیں۔ وہ انہیں عموماً Trojan Horses خیال کرتے ہیں۔ ان کے ممبران پر جسمانی حملے بھی ہو چکے ہیں۔

اسرائیلی حکومت کو بین الاقوامی کرسچین سفارت خانہ جیسے عیسائی گروپوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں جو مشکل در پیش آتی ہے وہ بعینہٖ ویسی ہی ہے جو امریکن یہودی گروپوں کو امریکہ میں قدامت پرست عیسائی گروپوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں پیش آتی ہے۔ ایک طرف تو اسرائیل کے اندر ربی Moshe Berliner جیسے ترجمان ہیں جو کہتے ہیں کہ تبلیغی بنیاد پرست عیسائیوں سے یہودیت کو خطرہ در پیش ہے۔ کیا ہم اس قدر بھولے ہیں کہ دوستی کی خاطر بڑھایا گیا ہر ہاتھ تھام

لیں؟ اور دوسری طرف اسرائیلی حکومت Begin اور Shamir دونوں کے ماتحت زوردار لہجے میں کہہ رہی تھی کہ اسرائیل اپنی سچی جدوجہد کی مدد میں بڑھایا گیا کوئی بھی ہاتھ ہرگز نہ جھٹکے گا۔

نومبر ۱۹۸۰ء میں جیری فال ویل کو اسرائیل کی حمایت میں ثابت قدم رہنے پر ایک تمغے سے نوازا گیا۔ یہ تمغہ صیہونی لیڈر Vladimir Jabotinsky کی نیویارک میں منعقدہ سویں پیدائش کی سالگرہ کے موقع پر دیا گیا۔ یہ وزیراعظم بیگن کی فرمائش پر دیا گیا تھا۔ اس کی شدومد سے مخالفت کی گئی۔ امریکی جیوش کانگریس کا ایگزیکٹوڈائریکٹر Henry Siegman اس بات پر معترض تھا کہ فال ویل کا مذہب کا استعمال کرنے کا طریقہ درست نہ تھا۔ اسرائیل کے جریدے یروشلم پوسٹ میں Alexander M. Schindler (سابقہ چیئرمین کانفرنس آف صدور آف میجر امریکی جیوش آرگنائیزیشنز) کا بیان نقل کیا گیا کہ اگر یہودی وائیں بازو والے انجیلی حضرات کو جو امریکن یہودیوں کے لئے خطرہ ہیں اسرائیل کی حمایت کرنے پر عزت افزائی کرتے ہیں تو یہ پاگل پن اور خودکشی کے مترادف ہے۔

Schindler کی مراد فال ویل کے اس تبصرے سے عیاں ہوجاتی ہے جو اس نے Lynchberg ورجینیا میں اپنے Liberty Baptist Church میں اتوار کی سروس کے درمیان کیا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ خدا نے یہودیوں کی دعائیں نہیں سنی تھیں۔ بعدازاں اس نے اس بیان پر تاسف کا اظہار کیا لیکن بہت سے یہودیوں کے لئے یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ فال ویل کو اسرائیل کی سلامتی سے زیادہ ان کی تبدیلی مذہب سے دلچسپی تھی۔ اس کا یہ احتجاج کہ ساری دنیا میں امریکہ اور اسرائیل سمیت تمام یہودیوں کا فال ویل سے بہتر دوست موجود نہیں' یہودی لیڈروں کو یہ فراموش نہ کرا سکا کہ وہ یہودیت کے خلاف بنیاد پرستانہ تعصب رکھتا ہے۔ اس کے باوجود وہ پھر بھی امریکی انجیلیوں کو اسرائیل نوازی کی دعوت دیتے رہتے ہیں۔ یہ عجیب قسم کا معمہ ہے۔

بڑے بڑے گرجوں کا نیا نکتہ نظر

امریکی یہودیوں اور قدامت پرست پروٹسٹنٹوں کے درمیان اسرائیل نواز گٹھ جوڑ عین اس وقت ہو رہا ہے جب بڑے بڑے چرچوں کے ممبران اور جیوش کیمونٹی کے مابین ناچاقی موجود ہے۔ یہ ناچاقی اسرائیل کے لبنان پر حملہ آور ہونے کے بعد مزید بڑھ گئی ہے۔ ستمبر ۱۹۸۱ء میں جیمز آر مسٹرانگ

(یونائیٹڈ میتھوڈسٹ بشپ) نے انڈیانا کے یونائیٹڈ میتھوڈسٹ پادریوں کو ایک خط جاری کیا۔ اس نے Falwell Gospel اور Moral Majority Mentality پر تند و تیز تنقید کی اور کہا:

خدا کا اسرائیلیوں کو منتخب شدہ لوگ خدمت کے معنوں میں کہا گیا تھا۔ اسرائیل کو دوسرے لوگوں کا استحصال کرنے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ خدائے تعالیٰ جانب داری نہیں برتتا۔"

کچھ عرصہ سے عیسائیوں کو مشرق وسطیٰ کے حالات خصوصاً فلسطینی پناہ گزینوں کے مصائب پر تشویش ہے۔ اور یہ بات یہودی اور عیسائی فرقوں کے درمیان ناچاقی کا سبب ہے۔ گو امریکی یہودیوں اور عیسائیوں کے بڑے فرقوں کے درمیان تعاون بڑھانے کے لئے مذہبی سطح پر کوششیں جاری ہیں۔ جیسا کہ امریکن جیوش کانگریس کے حال ہی میں اعلان کردہ اس حقیقت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک نیا جیوش' کرسچین تعلقات کمیشن قائم کیا جا رہا ہے جو ان دونوں فرقوں کے مشترکہ الہامی ورثہ کا مطالعہ کرے گا لیکن ان بڑے فرقوں نے حال ہی میں مشرق وسطیٰ کو ایک نئی سمت سے دیکھنا شروع کیا ہے۔ ان سواد اعظم گرجوں نے زیادہ سے زیادہ توجہ فلسطینی پناہ گزینوں کے انسانی حقوق کے احترام پر مرکوز کرنی شروع کی ہے۔ ان گروہوں کے پالیسی بیانات جس حد تک ان پناہ گزینوں کی حالت زار سے ہمدردی کا اظہار کر رہے ہیں وہ اغلباً یہودی گروہوں سے ہضم نہ ہو گی۔ مندرجہ ذیل تنظیموں نے فلسطین میں یہودیوں اور فلسطینیوں دونوں کے حق خود ارادی کی باہمی رضامندی کے لئے آواز اٹھائی ہے۔

یونائیٹڈ اسٹیٹس کیتھولک کانفرنس' یونائیٹڈ پریزبٹرئین چرچ' یونائیٹڈ میتھوڈسٹ چرچ' امریکن بپٹسٹ چرچ' یونائیٹڈ چرچ آف کرائسٹ اور کئی دیگر۔ ان کا مطالبہ ہے کہ فلسطینیوں کو امن مذاکرات میں شامل کیا جائے اور اسرائیل ۱۹۶۷ء کی جنگ میں فتح کئے گئے مقبوضہ علاقے خالی کرے۔

ان میں سے کئی تنظیموں نے .P.L.O کو فلسطینی عوام کی نمائندہ تسلیم کیا ہے۔ Graymoor Ecumenical Inst. کے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر فادر Charles Angell کے مطابق امریکی گرجوں کا اپنی پوزیشن اور حکومت اسرائیل کی خارجہ پالیسی کے ساتھ ساتھ ملک میں موجود مختلف یہودی تنظیموں کے مابین اپنا رویہ متعین کر لینے سے جو تصادم پیدا ہوتا ہے اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ اس کے خیال میں بنیادی تبدیلی ۱۹۷۳ء کی جنگ کے بعد پیدا ہوئی جب عیسائیوں نے عربوں کی طرف سے امن قائم کرنے کی خواہش کی ہمدردانہ پذیرائی کی۔

یہودیوں نے عموماً ان گرجوں کے بیانات کو اپنے مذہبی حقوق کے لئے خطرہ تصور کیا' باوجود اس کے کہ پچھلے بیس سال سے زائد عرصہ سے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ تنظیموں نے چالیس سے زائد باقاعدہ بیانات جاری کئے جن میں Anti Semitism کو Anti Christian قرار دیکر مذمت کی' لیکن اسرائیلی لابی ان عیسائیوں کو جو صرف اکیلے اسرائیل کے لئے نہیں بلکہ سب فریقین کے لئے علاقائی سلامتی اور موزوں معیار زندگی کے حق پر اصرار کرتے ہیں Anti Semitic قرار دیتی ہے۔

جب یہ عیسائی گرجے Anti Semitism اور اسرائیلی حکومت کی ان پالیسیوں پر جن سے فلسطینی پناہ گزینوں کے حقوق کم ہوں یا انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہو' بیک وقت مخالفت کرتے ہیں تو انہیں خود فریبی کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ مسلمہ انسانیت نواز اور امن پسند گروپوں مثلاً Quackers تک کو Anti Semitic گردانا گیا ہے کیونکہ وہ مشرق وسطیٰ کے متحارب فریقین کو زیادہ صبر و ضبط اور باہمی افہام و تفہیم کی ہدایت کرتے رہتے ہیں۔ Ernest Volkmann صحافی نے تو یہ لیبل یعنی Anti Semitic عزت مآب ولیم ہاورڈ (جو نیشنل کونسل آف چرچز کا صدر تھا) پر بھی چسپاں کرنے کی کوشش کی کیونکہ انہوں نے جون ۱۹۸۱ء میں اسرائیل کے عراق میں Osirak کے جوہری ری ایکٹر پر ہوائی حملہ کی مذمت کی تھی۔

یہ بات معمہ در معمہ ہو جاتی ہے

عام عیسائی جو یہودی مذہب کو جائز تصور کرتے ہیں لیکن اسرائیلی حکومت کی کچھ پالیسیوں پر معترض ہوتے ہیں انہیں Anti Semitic کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ لیکن ان انجیلی عیسائیوں کو جو اسرائیل کی حمایت کرتے ہیں لیکن یہودی مذہب کی مذہبی بنیاد پر شک کرتے ہیں انہیں بطور اتحادی سراہا جاتا ہے۔

نیشنل کونسل آف چرچز کا تجربہ خاصا آنکھیں کھول دینے والا ہے۔ NCC کے ایک اندرونی ممبر کا کہنا ہے امریکی یہودیوں اور کونسل کے درمیان تعلقات یہودی اثر و نفوذ کا قدیم ترین کیس ریکارڈ ہے یعنی حکومت میں اثر و نفوذ سے بھی زیادہ۔ سالہا سال تک یہودی فرقے میں سے کسی کو اس کونسل سے کوئی خاص شکایت نہیں ہوئی۔ جب بھی کوئی اختلاف رائے ہوا تو یہودی لیڈر شپ کو عین توقع کے مطابق فوری ردِ عمل ملا۔ NCC کے ایک سابقہ اہلکار کا کہنا تھا کہ یہودی لیڈر

تقریباً نصف درجن یہودی تنظیموں کے صدور شعبہ کے ہمراہ پرا باندھ کر حاضر ہوتے تھے اور کھل کر اپنی شکایات پیش کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں کونسل کی لیڈر شپ کو بلاواسطہ اپنی شکایات سنانے کا حق حاصل تھا۔ اس کونسل کی یہودی' عیسائی تعلقات کمیٹی عرصہ دراز سے قائم تھی اور امریکہ میں یہی کام سرانجام دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور کمیٹی Inter Faith کے نام سے قائم تھی لیکن یہ NCC کے انسانی ہمدردی کے پروگراموں والی ڈویژن تھی۔ نام تو اس کا مذہبی تھا لیکن یہ صرف عیسائیوں اور یہودیوں کے گروپوں پر مشتمل تھی۔

یہ عیسائی' یہودی تعلقات کمیٹی روایتی طور پر وہ تمام معلومات اور نیا مواد جو اس کو مہیا ہوتا ہے' امریکن جیوش کمیٹی کے ساتھ Share کرتی ہے۔ کونسل کے کچھ اہل کاروں کو اس رویہ پر تشویش تھی کیونکہ امریکن جیوش کمیٹی ایک مذہبی تنظیم نہیں ہے۔ گو یہ ایک شعبہ مذہبی معاملات کا رکھتی ہے لیکن یہ عمومی طور پر ایک Lobbying Organisation ہے۔ یہودیوں کی خالص مذہبی تنظیمیں جیسے امریکہ کی Synagogue Council اس کونسل کے کاروبار سے زیادہ علاقہ نہیں رکھتیں۔ لیکن چونکہ NCC کے اعلیٰ سطحی حکام اسرائیل مخالف ہونے کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتے لہٰذا NCC اپنے اشاعتی مواد اور لٹریچر میں AJC کی نکتہ چینی کو اہمیت دیتی ہے۔

پروٹسٹنٹوں کے ایک غالب افراد والے فرقہ کے اہل کار نے یہ دیکھا کہ AJC کا کونسل کے شائع شدہ مواد پر اثر انداز ہونا اس سے کہیں زیادہ ہے جو خود اسے حاصل ہے۔ حالانکہ اس مواد کے تقریباً تین چوتھائی حصہ کو وہ خریدتے اور تقسیم کرتے ہیں۔

سالہا سال کی یہودی نکتہ چینی جس کے دوران کونسل نے فلسطینی پناہ گزینوں کی حالت زار پر بحث و مباحثہ تو کیا لیکن قرارداد ایک بھی پاس نہ کی۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں NCC نے اپنی مشرق وسطیٰ پالیسی جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ بقول Allan Solomonov کے تند و تیز یہودی نکتہ چینی کی وجہ سے یہ عیاں ہو گیا تھا کہ NCC کی مشرق وسطیٰ کے بارے میں کوئی پالیسی نہ تھی لیکن اب ہونی چاہئے۔ اس خیال پر سب کا اجماع تھا کہ نکتہ چینی کو حدود کے اندر رکھنے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ ان معاملات کے بارے میں بے لاگ رائے کا اظہار کر دیا جائے۔ اس کے باوجود جو مشرق وسطیٰ پالیسی بیان آخر کار جاری کیا گیا بہتیرے یہودی گروپوں کے لئے نا قابل قبول تھا۔

اس اعلان میں تمام مشرق وسطیٰ میں امن' انصاف اور باہمی رواداری کا حصول NCC کا

مطمع نظر قرار دیا گیا۔ آخری متنازعہ حصہ میں مشرق وسطیٰ میں اسلحہ کے پھیلاؤ کو کنٹرول کرنے اور باہمی طور پر ایک دوسرے کا حق خود اختیاری تسلیم کرنے کے لئے حکومت اسرائیل اور P.L.O. دونوں کو اپیل کی گئی تھی۔ B'nai B'rith کی اینٹی ڈی فیمیشن لیگ نے اس بارے میں کھلے عام بحث میں حصہ نہ لیا تھا۔ اس نے فوراً اس بیان کی مذمت کی اور کہا کہ یہ عرب اسرائیل تنازع میں ملوث قوتوں اور مسائل کا ایک احمقانہ تجزیہ ہے جس کے نتائج مضحکہ خیز ہو سکتے ہیں۔

اسرائیل نواز حلقوں اور تبصرہ نگاروں نے فوراً اس پالیسی بیان کو اچک لیا کہ NCC اب مزید Anti Semitism پر اتر آئی ہے۔ حالانکہ اس بیان میں واضح طور پر سب لوگوں کے لئے محفوظ امن پر زور دیا گیا تھا اور ہر طرف سے جارحیت کے ارتکاب کو قابل مذمت کہا گیا تھا۔

صحافی E.Volkmann نے اپنی کتاب Anti Semitism in America, Legacy of Hate میں پھر بھی یہ کہا کہ یہ پالیسی بیان امریکہ کے یہودیوں کو نظرانداز کرنے کی کوشش جو کبھی کبھار واضح طور پر Anti Semitism کا روپ دھار لیتی ہے' کی ایک مثال ہے۔

AIPAC نے کتابچے "The Compaign to Discredit Israel" میں جو فہرست دشمناں جاری کی اس میں درج تھا کہ NCC کے کچھ اندرونی حلقے امریکہ میں اسرائیل کے Image پر حملہ کرنے میں ایک باقاعدہ کوشش کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔

ایک اعلیٰ NCC عہدے دار نے اسے یوں سمیٹا "سالہاسال سے یہودی فرقے کے کسی بھی فرد کو NCC سے کوئی خاص شکایت نہ تھی۔ جونہی انہوں نے کچھ ایسے فیصلے کئے جو روایتی طور پر اسرائیل نواز حلقوں میں ناپسند کئے گئے تو یہ ایک دم Anti Semitic اور مشکوک نظر آنے لگے۔"

ان نکتہ چینوں کو ہرگز یہ نظر نہیں آتا کہ اس پالیسی اعلان میں اسرائیل کے بطور "ایک خودمختار یہودی ملک" نہ کہ صرف "خودمختار ملک" قائم رہنے کے حق کا ذکر درج تھا۔ حالانکہ کونسل کے کچھ ممبران مؤخرالذکر نام چاہتے تھے۔ Butler نے اسے پالیسی بیان میں سب سے زیادہ زیر بحث آنے والی ترکیب قرار دیا کیونکہ ڈرافٹنگ کمیٹی کے کچھ ممبران نے تکمیل شدہ دستاویز کے حق میں ووٹ ڈالنے سے انکار کر دیا جب تک کہ اس میں اسرائیل کی یہودی شناخت کا ذکر نہ ہو۔

اسی دستاویز میں بے لاگ اور صاف طریقہ سے NCC اور AJC کے درمیان قدیمی اور قریبی روابط کا ذکر بھی ہے۔

خدائی سلطنت کا انتقام

جوں جوں امریکہ کے تمام مذہبی حلقوں میں مشرق وسطیٰ کے بارے میں دلچسپی اور فلسطینی پناہ گزینوں کے انسانی حقوق کا چرچا بڑھتا جاتا ہے' توں توں اکثر یہودی گروپ اور ان کے اسرائیل نواز ہمدرد ایک وسیع البنیاد عوامی مفاہمت کی خاطر کھلے عام بحث و تمحیص کرنے کی زیادہ شدومد سے مخالفت کرتے ہیں۔ یہ اسی دباؤ کا نتیجہ ہے کہ سرگرم مذہبی گروپ بھی جو معاشرتی انصاف اور عالمی امن کے لئے سرگرمی سے کوشاں رہتے ہیں مشرق وسطیٰ کے زیر بحث آتے ہی منقار زیر پر ہو جاتے ہیں۔

"The Sacramento Religious Community for Peace" نے اکتوبر ۱۹۸۳ء میں ایک بڑے سمپوزیم کا انعقاد کیا جس کا عنوان تھا "ایمان' جنگ اور امن: جوہری زمانہ میں!" یہ گروپ مذہبی تعاون برائے معاشرتی انصاف اور عالمی امن کا پرچارک ہے۔ یہ جلسہ ساکرامینٹو کنونشن سینٹر میں ہوا۔ اس میں ساکرامینٹو جیوش ریلیشنز کونسل کے علاوہ کئی اور مذہبی تنظیموں نے بھی حصہ لیا۔ اوائل ستمبر میں جب اس سمپوزیم کی تشہیر کے انتظامات کئے جا رہے تھے تو ایک مقامی معروف سرگرم گروپ نے ساکرامینٹو پیس سینٹر (SPC) سے کہا کہ اس سمپوزیم کے اشتہار سپرد ڈاک کرتے وقت اس کا ایک چھوٹا سا نوٹ برائے دعائے خیر بحق ہلاک شدگان لبنان' رفیوجی کیمپ بھی اس میں ملفوف کر دیا جائے۔ چونکہ امن تنظیموں میں ایسی باتوں کے لئے باہمی تعاون عام بات ہے۔ لہٰذا امن مرکز کی (Co-Director) Peggy Briggs کو شدید صدمہ ہوا جب اسے یہ اطلاع ملی کہ یہ نوٹ اس اشتہاری ڈاک میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

SRCP نے Briggs کو مطلع کیا کہ اس سرگرمی کے سب سے بڑے مقامی اور طاقتور یہودی گروپ یعنی جیوش کمیونٹی ریلیشنز کونسل (JCRC) کا کہنا ہے کہ اگر یہ نوٹ اس اشتہار میں ملفوف ہوا تو اس سمپوزیم میں یہودی حصہ نہ لیں گے۔ اس کا مطلب نہ صرف مقامی یہودیوں کی حمایت سے دستبرداری ہوتا بلکہ ایک یہودی پادری کے کلیدی خطاب سے بھی محرومی تھا۔

SRCP کے Co-Director ہیلن فیلے نے امن مرکز کو یہ بھی بتلایا کہ اس سمپوزیم کے دوران ساکرامیسو امن کونسل کی Mid East Task Force کا بنایا ہوا کوئی بھی لٹریچر نمائش کے لئے نہ رکھا جائے گا۔ بعد ازاں اس معاملے پر بحث کے دوران فیلے نے زور دے کر کہا کہ مشرق وسطیٰ ٹاسک فورس نے تو یہاں کے یہودیوں کو بالکل بھڑکا دیا ہے۔ کیونکہ وہ اسرائیل کے قیام کے

حق کو نہیں مانتے' یہ مواد تو بیحد دل جلانے والا ہے۔ SPC مشرق وسطیٰ ٹاسک فورس کے سربراہ Greg Degier نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ اس کا گروپ تو اسرائیل کے قائم رہنے کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔ SPC تو مشرق وسطیٰ میں جنگ کے خاتمہ' انسانی حقوق کے احترام اور اسرائیل اور PLO کے ایک دوسرے کو باہمی طور پر تسلیم کرنے پر زور دیتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ پر بحث کی ممانعت اور امن مرکز کے اطلاعات تقسیم کرنے کے حق پر پابندی کی قیمت پر سمپوزیم میں یہودیوں کی شرکت قبول کی گئی۔ یہودی پادری Lester Frazen جس نے کلیدی تقریر کرنی تھی اور جو اس تمام ہنگامے کا سبب تھا۔ آزادیٔ اظہار رائے کے سلسلے میں نہایت عجیب و غریب اہلیت کا حامل تھا۔ اس نے نہایت بیباکی سے اپنا حق آزادی اظہار رائے ۱۹۸۲ء کے اوائل میں استعمال کیا تھا جب اسرائیل نے لبنان پر چڑھائی کی۔ وہ ساکرامینٹو کے ان بنیاد پرست لیڈروں کے مارچ میں پیش پیش تھا جو اس حملے پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور جو جھنڈا اٹھا رکھا تھا اس پر درج تھا "خدائی سلطنت کا انتقام" اس کے باوجود Frazen اور اس کے چیلے ساکرامینٹو امن مرکز کو یہ حق دینے پر تیار نہ تھے کہ وہ اس حملے کے شکار لوگوں کو یاد کریں یا طرفین کو ہلاکتوں سے باز رہنے کی تلقین کریں۔

اس پس منظر میں یہ امر قطعاً باعث حیرانی نہ تھا کہ گو اس جلسہ کا عنوان "ایمان' جنگ اور امن: جوہری زمانہ میں" تھا لیکن مشرق وسطیٰ کے تنازعات ایجنڈے پر عنقا تھے۔ حالانکہ یہی وہ علاقہ ہے جہاں مبصروں کے خیال میں سب سے زیادہ جوہری جنگ کا امکان مرکوز ہے۔

نیوانگلینڈ کی امریکن فرینڈز سروس کمیٹی کے امن سکریٹری Joseph Gerson کا کہنا تھا کہ جوہری جنگ کا سب سے خطرناک Trigger مشرق وسطیٰ ہی رہا ہے۔ ٹرومین' آئیزن ہاور' جانسن اور نکسن سبھی نے وہاں جوہری ہتھیار استعمال کرنے کی دھمکی دی تھی۔

پام سنڈے کا ہنگامہ

بنیاد پرستوں اور یہودیوں کے باہمی گٹھ جوڑ اور جو بھی کھلے عام مشرق وسطیٰ میں مذاکرات اور صلح جوئی کی بات کرتے ہیں ان پر دباؤ ڈالے جانے کے باوجود کچھ مذہبی لیڈر ایسے بھی تھے جنہوں نے آواز اٹھانے کی ہمت کی۔ ان میں سب سے آگے بہت ہی عزت مآب Francis B. Sayre

تھے جنہوں نے ۱۹۷۲ء کے "پام سنڈے" کے موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکن عیسائیوں کے سامنے چند ایسے سوالات اٹھائے جن کے جواب کے لئے اب تک بحث جاری ہے۔

نیشنل کیتھڈرل واشنگٹن کے ڈین کے طور پر اپنے ۲۷ سالہ دور میں ہنس مکھ اور ڈرامائی Dean Sayre نے کئی عوامی پالیسی معاملات پر متنازعہ موقف اختیار کیا۔ پانچویں دہائی کے اوائل میں اس نے میکارتھی ازم کی مذمت میں سب سے پہلا پتھر مارا تھا۔ اس نے Wisconsin کے سینیٹر کے پیروؤں کو ڈرپوک' ڈھلمل یقین' غلامانہ ذہنیت' مارکہ حب الوطنی رکھنے والے قرار دیا۔ Sayre کو نفرت بھری ڈاک کے طوفان کا سامنا کرنا پڑا لیکن نکتہ چینی کے ڈر سے اس نے ایسے معاملات پر بے لاگ تبصرے سے کبھی پہلو تہی نہیں کی جو اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ رہے ہوں۔ وہ سیاہ فاموں (حبشیوں) کے لئے شہری حقوق کی وکالت میں پیش پیش رہا اور چھٹی' ساتویں دہائی میں ویتنام جنگ کی مخالفت میں بھی۔ Dean Sayre پوتا ہے Woodrow Wilson کا' اس کا والد ایک سفارت کار' قانون کا پروفیسر اور ایک ممتاز Episcopalian Layman تھا۔ Sayre نے لیڈر شپ کی یہ خاندانی روایت جاری رکھی۔ وہ کیتھڈرل کی بااثر مجلس کا لیڈر تھا۔ ۱۹۶۰ء میں جب صدر کینیڈی کی نئی انتظامیہ میں انہیں ایک حکومتی عہدہ پیش کیا گیا تو ان کا فوری جواب تھا "جی نہیں! شکریہ' میرے پاس پہلے ہی واشنگٹن کی بہترین پوسٹ ہے۔"

اس نے ایک دفعہ بطور ڈین اپنے رول کو چرچ اور حکومت کے درمیان رابطہ اور حکومتی لیڈروں کے لئے اخلاقی رہنمائی کا پلیٹ فارم قرار دیا تھا۔ اس نے اپنی سرگرمیوں کو اپنے مخصوص بے لاگ انداز میں بیان کرتے کہا "جو کوئی بھی کیتھڈرل کا ڈین تعینات ہوتا ہے تو اسے ایک حیرت انگیز ہتھیار حاصل ہوتا ہے۔ اسے استعمال نہ کرنے والا بزدل ہے۔"

۱۹۷۲ء کے پام سنڈے کو Dean Sayre نے اس پرشکوہ ممبر سے اپنے دور ملازمت کا اغلباً سب سے زبردست اور یقیناً سب سے زیادہ متنازعہ وعظ دیا۔ اس نے یروشلم کا ذکر کیا۔ اس قدیم شہر کو اس نے انسان کے دل میں موجود سچی ترین خواہش اور عمیق ترین اندھیرے' دونوں کی علامت قرار دیا۔ بقول اس کے تاریخی تناظر میں یہ دونوں مخالف سرے ایک واحد ہفتے کے اندر کے واقعات میں مجسم تھے جب حضرت عیسیٰ فاتحانہ شان سے اس شہر میں داخل ہوئے اور ان کو مصلوب کیا گیا۔

پام سنڈے کے جوش و خروش اور طمطراق میں یروشلم ساری انسانیت کے خوابوں کی علامت

تھا۔ایک بادشاہ جو کسی دن آ کر ہمیں تمام غلامانہ بندھنوں سے نجات دلائے گا۔امن کا ایسا خواب جو ہر جارحیت پر فتح پائے گا۔ آسمان کی لطافت جو دنیا کی کثافت کو نیست و نابود کر دے گی۔ لیکن جس طرح یروشلم "انسان کی خدائی صداقت" کے لئے خواہش کی علامت بن گیا تھا ویسے ہی وہ اس کی "قابل نفرین بدی" کا بھی مظہر بن چکا تھا۔اس کے سنہرے گنبد "مقام کھوپڑی" کہلاتے ہیں۔ یروشلم اپنی ساری درد بھری تاریخ میں ہمارے لئے ندامت کی علامت رہا ہے۔ہماری تمناؤں کی اوج ثریا جسے بے لگام تنگ دل انسانوں نے پاتال میں دے مارا ہے اس لئے کہ وہ اس میں اپنے ساتھیوں کو حصہ دار نہیں بنانا چاہتے۔وہ خدا کے احکامات ماننے کے بجائے قتل و غارت پسند کرتے ہیں۔

یروشلم کی سچائی' اپنی ذات اور خدا کی ہستی کے بارے میں بنی آدم کی بدترین بے یقینی کا مظہر قرار دیتے ہوئے Dean Sayre نے انتہائی گہرے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اسرائیل میں آباد لوگوں کے یروشلم کے بارے میں احساسات کی ترجمانی کرتے کہا کہ اس چھوٹے سے ملک کی تمناؤں سے یقیناً ہر ایک کو ہمدردی ہو گی۔انہیں ایک علامت بلکہ اور بھی زیادہ یعنی مجسم پاک قومیت بننے کی تمنا ہے۔ان کے لئے یروشلم ایک قدیم دارالحکومت ہے۔ اس معبد کا شہر جس میں وہ مقدس عہد نامہ کی تختی رکھی تھی وہاں حکومت حاصل کر لینا گویا عرصہ دراز کی دعاؤں کی تکمیل ہے جو انہوں نے آہ وزاری سے جاری رکھیں۔اس کے نوجوانوں کے عمدہ ہنر اور جرنیلوں کی مہارت کا ثمرہ ہے۔دنیا بھر میں Hosannah کی گونج سنائی دی جب اسرائیلی فوجوں نے عرب یروشلم کو اسرائیلی علاقے سے جدا کرنے والی رکاوٹ کو روند ڈالا۔اس کے باوجود Dean Sayre کا وعظ ایک احساس تشویش کا غماز تھا کہ ۱۹۶۷ء کی فوجی فتح کے بعد جسے پانچ سال گزر چکے' کچھ نہ کچھ انتہائی قسم کی گڑبڑ ہو چکی ہے۔

۱۹۷۲ء تک یروشلم پورے طور پر اسرائیل کے کنٹرول میں آ چکا تھا لیکن Dean Sayre کے بقول اسرائیلیوں کا یروشلم کی عرب آبادی سے سلوک انسانیت کے لئے ایک عظیم اخلاقی المیہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ خواب کی بے حرمتی ہو چکی ہے اب مظلوم ظالم بن چکے ہیں۔ عربوں سے ان کے گھر اور زمین کے وراثتی حقوق چھین لئے گئے ہیں۔ان کے رشتہ دار آ کر یروشلم میں نہیں بس سکتے۔انہیں اس شہر میں نہ تو کوئی دخل حاصل ہے اور نہ ہی خوشی' یہ ان کی مذہبی عبادتوں کا بھی تو قبلہ ہے۔

یروشلم کے اسرائیلی ادغام کے اخلاقی نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے Dr. Israel Shahak کا حوالہ دیا۔ یہ نازیوں کے Belsen میں قائم کردہ عقوبت خانے سے زندہ بچ نکلنے والا

عبرانی یونیورسٹی کا پروفیسر تھا جسے اسرائیلی پالیسی سے اختلاف تھا۔ اس نے ادغام کو ایک غیر اخلاقی اور ناجائز عمل قرار دیا تھا۔ اس کی پکار تھی کہ ایک فرقے کے دوسرے فرقے پر ظلم والی حالت سب کے تعلقات میں زہر گھول دے گی اور ہم یہودیوں کے لئے تو سب سے پہلے۔ Sayre نے کہا کہ عربوں کے ساتھ اسرائیلیوں کا سلوک یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان کے سینے میں وہ بنیادی تضاد موجود ہے جو ختم تو ہمیشہ خدا کی ثناء پر ہوتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے وہ خدا کی رضا کو اپنی رضا میں ڈھال لیتا ہے۔

اس روز وہ واشنگٹن کا واحد پادری نہ تھا جس نے اسرائیل پر نکتہ چینی کی ہو۔ Dr. Edward Elson نے بھی جو نیشنل Presbytrian چرچ کا Pastor اور امریکی سینیٹ کا Chaplain تھا' سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ وہ عیسائی جو اسرائیل کے یروشلم مین کئے گئے عمل کو اس بنیاد پر جائز کہتے ہیں کہ یہ ایک الہامی پیشین گوئی کی تکمیل ہے حق پر نہیں۔ واشنگٹن پر آرتھوڈکس چرچ کے قانونی نمائندے بشپ Papken نے اسرائیل پر زور دیا کہ وہ یہ تسلیم کرلے کہ یروشلم سب انسانوں کی ملکیت ہے۔

لیکن Sayre کو اس کی شہرت اور امریکن مذہبی حلقوں میں ممتاز پوزیشن کے باعث اس نکتہ چینی کا سب سے زیادہ سامنا کرنا پڑا۔ واشنگٹن کی عبرانی مجلس کے ربی Joshua O. Haberman نے Sayre کو مطلع کیا کہ یہ وعظ اسرائیلی حکومت کے لئے اس قدر پریشان کن تھا کہ اس موضوع پر کابینہ کی میٹنگ ہوئی ہے کہ اس پادری کے بارے میں کیا کیا جائے جو پیش ازیں ہمیشہ یہودیوں کا طرفدار رہا ہے لیکن اب اس قدر گمراہ ہے۔ اس کا رد عمل جلد ہی سامنے آ گیا۔ واشنگٹن جیوش کمیونٹی کونسل (WJCC) کے دو لیڈروں نے ایک اعلان جاری کر کے ان تینوں پادریوں خصوصاً Dean Sayre کے وعظوں کی مذمت کی۔ Dr. Harvey H. Ammerman اور Dr. Isaac Frank نے دعویٰ کیا کہ یہودی' عیسائی اور مسلمان اس متحدہ شہر میں آزانہ میل جول رکھتے ہیں اور امن سے کاروبار زندگی انجام دیتے ہیں۔ انہوں نے Sayre کے وعظ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اسے قابل نفرین الزام تراشی قرار دیا۔

اس بات کو واشنگٹن پوسٹ کے اس ادارایہ سے بھی شہ ملی جس میں Sayre کے وعظ کو یروشلم میں اسرائیل کی موجودہ پالیسی پر نہایت غیر مناسب مذمت قرار دیا گیا تھا۔ واشنگٹن پوسٹ کے ایڈیٹروں نے اس کے اس دعویٰ پر اعتراض کیا کہ جہاں اسرائیلی قسمت کے مہربان ہونے پر اپنے خدا کی حمد کرتے ہیں لیکن بیک وقت وہ اسے ہلاک بھی کر دیتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ بیان

انہیں ایک بیحد قدیم لیکن بہت جانی پہچانی متعصبانہ بات کے بہت قریب لگتا ہے۔

واشنگٹن پوسٹ میں ایک غصہ بھرے اداراتی خط میں Sayre کے اس وعظ کو "جھوٹ پر مبنی کچرا" کہہ کر رد کیا گیا:

"یہ پادری یہودیوں کے بارے میں مخصوص آزاد خیال غیر یہودی رویہ کا مظاہرہ کر رہا ہے جن کے دل خون کے آنسو رو رہے ہوتے ہیں کہ ہمیں آپ سے ہمدردی ہے جب تک کہ آپ کو اپنی بقا کے لئے ہماری خیر سگالی درکار ہے۔ اور ہم آپ کے لئے آنسو بہائیں گے جب ہر چند سال بعد ہمارے ہم مذہب آپ کا قتل عام کریں گے۔ لیکن عالم پناہ! آپ فتح حاصل کر کے اپنی قسمت کو خود کنٹرول کرنے کا خواب نہ دیکھیں۔ ہمارا جواب ہے کہ آپ جہنم میں جائیں۔"

اس پام سنڈے کے بعد کئی ہفتوں تک واشنگٹن پوسٹ میں ایسے خطوط کی اشاعت کا تانتا لگا رہا لیکن چند ہی خطوط میں Sayre کے بنیادی خیال کو چیلنج کیا گیا کہ اسرائیلی پالیسی کے تحت یروشلم میں رہائش پذیر یہودیوں اور عربوں کو یکساں حقوق حاصل نہ تھے۔ یروشلم کی یہ صورت حال درحقیقت نہایت آسانی سے تحقیقات کے ذریعے رد یا ثابت کی جاسکتی تھی۔ لیکن Sayre کے ناقدین نے پوسٹ کے ایڈیٹروں کی طرح اپنی تنقید کو زیادہ تر اس کے وعظ میں اعتدال کی کمی اور لہجہ تک محدود رکھا۔ Sayre کو بے تحاشہ تنقید کا سامنا کرنا پڑا اس لئے نہیں کہ وہ غلطی پر تھا بلکہ اس لئے کہ وہ اسرائیل کی غلط پالیسیوں پر کھلے عام تنقید کر بیٹھا تھا اور یوں کچھ ناقدین کی نگاہ میں Anti Semitic ٹھہرا۔ Sayre کی طویل عرصہ کی انسانی ہمدردی کی وکالت کے باوصف وہ اسرائیل کے حامیوں کے لئے غیر معتبر تھا کیونکہ وہ اس کی پیش کردہ دلیلوں کو غیر معتبر ثابت نہ کر سکے۔ Ernes Volkman نے لکھا کہ Sayre نے لاپرواہی سے عرب نوازی کی ہے جس سے اس کی سالہا سال پر محیط صبر سے کی گئی عیسائی، یہودی باہمی مفاہمت کی کوششیں رائیگاں ہوگئیں۔

ساؤتھ کرسچین لیڈر شپ کانفرنس کے David A. Clarke نے Sayre کے دفاع میں لکھا کہ میں کسی اسرائیلی اقدام کے درستگی کے بارے میں سوال کے جواب میں جذباتی تردیدوں کو قدرے شک کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اس نے کہا کہ یہ جذباتیت بالکل ویسی ہی نظر آتی ہے جیسے کہ نسلی برتری کے قدیم اعتقادات، مشرق وسطیٰ میں امریکن پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے اس نے شکر کا

اظہار کرتے لکھا کہ Dean Sayre جیسے ایماندار دانشور نے قدرے مختلف زاویہ نظر پیش کیا تاکہ ہمارا نکتہ نظر بالکل ہی یکطرفہ نہ رہ جائے لیکن ممتاز عیسائیوں میں اس تقریر کے بارے میں پھوٹ ہی رہی۔ کچھ نے تو Sayre کی اس اسرائیلی پالیسی پر نکتہ چینی کو سراہا اور کچھ نے Anti Semitic کا ہوا کھڑا کیا۔

ایک بلند بانگ بنیاد پرست پروٹسٹنٹ عزت مآب Carl McIntire نے واشنگٹن اسٹار میں شائع کردہ ایک خط کے ذریعے Sayre کے وعظ پر اعتراض وارد کیا۔ ان دونوں کا پہلے بھی ایک مرتبہ جھگڑا ہو چکا تھا۔ McIntire نے واشنگٹن کیتھڈرل میں ویتنام کی جنگ کے خلاف ایک ریلی کو تتر بتر کرنے کی کوشش کی تھی اور Dean Sayre نے بذات خود اسے نرغے میں سے نکالا تھا۔ بقول McIntire ڈین جن آزاد خیال لوگوں کی نمائندگی کر رہا ہے وہ عرصہ بعید سے اسرائیل اور یروشلم کے بارے میں تاریخی نکتہ نظر ترک کر چکے ہوئے ہیں۔ اس نے ۱۹۶۷ء کی جنگ کو کمیونسٹوں کی پشت پناہی والی قوتوں اور حملہ آوروں کے ساتھ برتاؤ کا ایک دل خوش کن واقعہ قرار دیا۔ اس نے الہامی صحیفوں سے اسرائیل کے مفتوحہ علاقوں پر قبضہ کے حق میں دلیل دی۔ ہم میں سے جو بھی بائبل کو اللہ کا کلام سمجھتے ہیں ان پر اس وقت اپنے یہودی ہمسائیوں کی امداد لازم ہے جو انہیں خدا نے عنایت کیا وہ ان کا حق ہے۔ انہیں اس سارے مفتوحہ علاقہ سے قطعاً دستبردار نہیں ہونا چاہیے۔

سواد اعظم کے کچھ اور پادری بھی پام سنڈے کے اس وعظ کے خلاف بنیاد پرستوں کے شور و غوغا میں شامل ہو گئے۔ عظیم تر واشنگٹن کی کونسل آف چرچز کے دو ممبران نے ایک عوامی بیان جاری کر کے کہا کہ یہ تشویشناک اور حیرت انگیز بات ہے کہ خیر سگالی رکھنے والے دونوں فرقوں یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کے لوگ اس مقدس ہفتے کے آغاز کو ایسے بیانات جاری کرنے کے لئے منتخب کریں جو لامحالہ یہود مخالف سمجھے جائیں۔

دو کیتھولک پادری بھی' ایک تو کیتھولک جیوش ریلیشنز کے انتظامیہ کارکن اور دوسرا یونائیٹڈ اسٹیٹس کیتھولک کانفرنس کا ڈائریکٹر Sayre کو نامعتبر ٹھہرانے میں شامل ہو گئے۔ پہلے تو انہوں نے اسرائیل کے باغی یعنی Israel Shahak کا حوالہ دے کر اسرائیل کی یروشلم میں ناانصافی ثابت کرنے کے عمل کو ناجائز گردانا۔ کیا یہ عین وہی Anti Semitic حیلہ نہیں ہے کہ عبرانی پیغمبروں کے قول استعمال کر کے یہودیوں پر لعن طعن کی جائے؟ اور دوسرے یہ کہ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ان کی حالیہ

اسرائیل یاترا میں انہیں یروشلم میں اسرائیلی جبر کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔

"Christianity Today" میں عین اسی وقت یونائیٹڈ چرچ آبزرور کے ایڈیٹر کا ایک بالکل مختلف تبصرہ شائع ہوا۔ یہ جریدہ کینیڈا کے متحدہ چرچوں کا سرکاری ترجمان ہے۔ عزت مآب A.C. Forrest نے Dean Sayre کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے دنیا کی موجودہ تشویشناک ترین صورت حال کے بارے میں الہامی اعلان کر کے بہت ہمت، علم اور گہری نظر کا مظاہرہ کیا ہے۔ یروشلم کے بارے میں اقوام متحدہ کی رپورٹوں کا حوالہ دیتے ہوئے اس نے کہا کہ Sayre کے الزامات ہر اس فرد کے لئے جس نے اپنا ہوم ورک کیا ہوا ہے یا مشرق وسطیٰ میں کافی سفر کیا ہے، ایک پرانی داستان ہے۔

جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے ایک Jessuit معلم Joseph L. Ryan نے بھی Sayre کی حمایت میں آواز بلند کی۔ اس نے کہا کہ وہ پوپ جان پال کے اس مقولے یعنی "اگر امن چاہتے ہو تو انصاف کے لئے کام کرو" کے ماتحت اپنا بیان دے رہا تھا۔ فادر Ryan نے پوپ اور کئی کیتھولک لیڈروں کے مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک میں دئے گئے بیانات کے حوالے دیئے جس میں انہوں نے اسرائیل کے یروشلم میں کئے گئے اقدامات اور فلسطینی پناہ گزینوں کی حالت زار پر تشویش اظہار کیا تھا۔ اس نے توجہ دلائی کہ یروشلم میں عیسائیوں اور مسلمانوں پر جبر و تشدد کا ذکر اسرائیل کی انسانی حقوق کی لیگ اور اقوام متحدہ کی دستاویزات میں درج ہے۔ شہادت کی کوئی کمی نہیں۔ اگر ان اقدامات کے بارے میں عوام کا احتجاج تشویشناک ہے تو حقیقت حال اس سے کہیں بڑھ کر تشویشناک ہے۔

فادر Ryan نے عیسائیوں کی یہودی پالیسیوں کے لئے آنکھیں بند کر کے حمایت کرنے کو آڑے ہاتھوں لیا۔ مزید بر آں کچھ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ صیہونی مخالفت یعنی اسرائیل پر نکتہ چینی کو Anti Semitic قرار دیتے ہیں۔ نسل پرستی کو معدوم کرنے میں یہ اپنی تشویش کو ہر حد سے پار لے جاتے ہیں۔ ان کی یہ الزام تراشیاں عیسائیوں اور یہودیوں کے باہمی تعلقات کو بہتر کرنے کی بجائے بدتر کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ اس سے وہ آزادانہ بنیادی بحث نہیں ہو پاتی جو امریکنوں کے بطور امریکی شہری اور بین الاقوامی برادری کے فرد کے طور پر فرق کو ظاہر کرے جو کہ انصاف اور امن کی تلاش میں ناگزیر ہے۔

Dean Sayre خود عام طور پر اس شور و غوغا سے الگ تھلگ رہا جو اس نے پام سنڈے کو

پیدا کیا تھا۔ صرف ایک ترجمان کے حوالے سے اس نے یہ شائع کیا کہ وہ اپنے بیان کے کسی بھی حصہ کو واپس نہیں لے گا۔ سالوں بعد اس نے یہ تسلیم کیا کہ گو وہ فلسطینی پناہ گزینوں کے بارے میں پیشتر بھی کئی وعظ کہہ چکا تھا لیکن ۱۹۷۲ء والا پام سنڈے کا یہ وعظ اس کی پہلی براہ راست نکتہ چینی تھی اسرائیل پر۔ "مجھے یہ احساس تھا کہ اس پر بڑا ہنگامہ ہوگا' لیکن اگر میں پہلے ہی کی طرح نرم رویہ رکھتا تو اس کا ذرہ بھر اثر نہیں ہوتا۔ تو پھر کیا کرنا چاہئے؟"

اس متنازعہ وعظ سے پہلے امریکی یہودیوں میں اس کی بڑی قدر تھی۔ ایک مقامی یہودی آبادی واشنگٹن کیتھڈرل میں اپنی عبادت کرتی تھی حتیٰ کہ ان کا اپنا معبد تعمیر ہو گیا۔ یہ Sayre کی دعوت پر تھا۔ اس نے امریکہ کی کمیٹی برائے پناہ گزینان کے لئے جو کام کیا تھا اس کے لئے وہ اس کی تعظیم کرتے تھے۔ اپنی اس حیثیت میں اس نے اردن' شام اور لبنان سے نکالے گئے یہودی پناہ گزینوں کو امریکہ میں بسانے کا کام کیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں Cleveland کے Episcopal Minister کے بطور وہ اس مذہبی کمیٹی کا صدر تھا جو پناہ گزینوں کی آباد کاری پر مامور تھی اور ان میں سے بیشتر مشرقی یورپ سے نکالے گئے یہودی تھے۔

اس وعظ کے براہ راست ذاتی نتائج بھی نکلے۔ Sayre اور اس کے خاندان کو خطوط اور فون کالوں کے ذریعے براہ راست انتہائی ناخوشگوار ڈرانے دھمکانے کی مہم کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی مواقع پر جب اس کے بچوں نے فون اٹھایا تو انہیں ترش روئی اور گالیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آدھی رات کو فون کی گھنٹی بجتی لیکن جونہی گھر کا کوئی بھی فرد فون اٹھاتا' کال ڈراپ کردی جاتی۔ Sayre جب بھی کہیں باہر ہوتا تو عموماً کوئی نہ کوئی اس کا پیچھا کرتا اور بلند آواز سے برا بھلا کہہ رہا ہوتا۔ بقول Sayre یہ ایذا دہی کوئی چھ ماہ جاری رہی حتیٰ کہ مجھے فون پر جان سے مار دینے کی دھمکیاں بھی ملیں۔ مجھے کچھ عرصہ کیتھڈرل کے گارڈ بھی گھر کے اردگرد لگانے پڑے۔ اس وعظ کے چھ ماہ بعد یہودی ربیوں اور Sayre کے درمیان مذہبی جذبات پھر کشیدہ ہو گئے۔ یہ اس وقت ہوا جب Munich میں ۱۹۷۲ء کے اولمپکس کھیلوں کے دوران "سیاہ ستمبر" انتہا پسند چھاپہ مار تنظیم نے اسرائیلی کھلاڑیوں کو اغوا کیا اور ان میں سے گیارہ مارے گئے۔ Dean Sayre نے بھی اس رنج و غم اور نفرت کا اظہار کیا جو ساری دنیا میں محسوس کی گئی۔ اس نے فوراً ربیوں اور دوسرے یہودی لیڈروں کے تعاون سے واشنگٹن کیتھڈرل میں ایک میموریل سروس کا پلان بنانا شروع کر دیا۔

اس سانحہ کے تین دن بعد اسرائیلی جنگی جہازوں نے شام اور لبنان میں فلسطینی کیمپوں پر حملہ کر کے ۴۰ افراد کو ہلاک کر دیا تب Sayre نے ربیوں کو اپنی نیت سے آگاہ کیا کہ وہ اس سروس کو کچھ زیادہ عمومی بنا دے گا تاکہ فلسطینی ہلاک شدگان کے لئے بھی دعا شامل کر لی جائے۔ جب اس حقیقت کا سامنا ہوا تو ربیوں نے شرکت ہی نہ کی۔ پھر بھی اس میموریل کے ۵۰۰ حاضرین میں کئی یہودی بھی موجود تھے۔ انہوں نے Dean Sayre کو یہ کہتے سنا کہ عرب چھاپہ مار گمراہ اور بے راہ رو ہو چکے ہیں۔ یہ اس بغض اور عداوت کا ثمر ہے جس میں وہ پیدائشی طور پر گھرے ہوئے ہیں۔ یہ ان حالات کی وجہ سے ہے جن کو بین الاقوامی ضمیر بے رحمی سے بھلا چکا ہے۔

اس نے اسرائیلی انتقام کی بھی مذمت کی کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت اس تشدد کا بنیادی فلسفہ ہے۔ مجھے انتہائی دکھ ہے کہ اسرائیلی حکومت نے اپنے زخمی معصومیت کے اخلاقی رویہ کو فلسفہ کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ Sayre نے وسیع تر انسانی اور تاریخی پس منظر کا سہارا لیتے ہوئے اور اپنے پام سنڈے کے انہی جذبات پر مبنی جو الفاظ کہے وہ مشرق وسطیٰ کے تشدد کے شکار ہر فرد کے لئے دہرائے جا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں جس تشدد کے شکار کا ہم آج یہاں ماتم کر رہے ہیں وہ صرف جرمنی کی لہولہان سرزمین پر ماضی قریب کا یہودی ہی نہیں اور نہ ہی وہ عرب قیدی جو کہ اس طرز کے پر تشدد ورثہ کا شکار ہے۔ یہ ہم سب ہیں' دنیا میں بسنے والے سبھی بنی آدام۔

اس غیر معمولی مسیحی پیغام کے باوجود Sayre کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا گویا وہ انتہا پسندی کا پرچار کر رہا تھا۔ مشرق وسطیٰ پر یہ کھری کھری سنانے کے بعد اس کا کیریئر پہلے کی مانند بے داغ نہ رہا۔ اب Cape Cod کے سامنے والے جزیرہ Marthas Vineyard پر وہ تقریباً ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہے۔ مقامی ہسپتال کے Chaplain کے علاوہ اس کے پاس چرچ کی کوئی باقاعدہ ذمہ داری نہیں ہے۔ ۱۹۸۳ء کی ایک صبح میں نے اس کے پراجیکٹ یعنی گھونگھے کھودنا کے درمیان اس سے پوچھا کہ اس متنازعہ پام سنڈے وعظ نے اس کے کیریئر پر کچھ اثر ڈالا؟ Sayre نے جو کہ ابھی چاق و چوبند تھا بغیر کسی ہچکچاہٹ کے معاً جواب دیا: "جی ہاں یقیناً' مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہو گا۔ صاف گوئی کو کون پسند کرتا ہے۔ میں اس پر سوچ بچار نہیں کرتا کیونکہ کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں کہ کیا کچھ ہو سکتا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ اس لمحہ سے مجھے خطرناک قرار دے دیا گیا جو بشپ یا کسی اور عہدہ کے لئے موزوں نہیں۔"

مجھے یوں لگا کہ کچھ تو کرنا چاہئے

امریکہ کے مذہبی حلقوں نے Dean Sayre سے زیادہ صاف گو فرد نہ دیکھا ہوگا جو مشرق وسطیٰ کے سبھی باشندوں کے بارے میں اتنے زور سے امن اور انصاف کا پرچار کرے۔ ۱۹۷۲ء کے پام سنڈے وعظ تک وہ امریکہ کے ممتاز ترین مسیحی نمائندوں میں سے ایک تھا۔ وہ ایک طاقتور اور عظیم دانشور تھا جسے واشنگٹن کیتھڈرل جیسے اہم ادارے کی منبر کی پشت پناہی میسر تھی۔ Sayre کو اس پر عزم اظہار رائے کی جو قیمت چکانا پڑی اس کے باوجود ویسی ہی پر عزم اور مقصد سے گہری وابستگی والی مزید نوجوان آوازیں ابھر رہی ہیں۔

شکاگو کے ایک Presbytrian عزت مآب Don Wagner ان لوگوں میں سے ہیں جو اس مذہبی محاذ کے صف اوّل میں جلد ہی نمایاں مقام حاصل کر گئے ہیں۔ ان کا مقصد لوگوں کو مشرق وسطیٰ کے بارے میں حقیقت بتلانا اور ان مذہبی تعصبات کی دھند ہٹانا ہے جو ان حقیقتوں کو دھندلائے ہوئے ہیں۔ اسے بھی اس چیز کا تجربہ حاصل ہوا ہے کہ ایسے کام کرنے والوں کو کس قسم کی دھونس کا سامنا ہوتا ہے۔

مشرق وسطیٰ کے بارے میں عوامی بحث میں ملوث ہونے کا موقع Wagner کو پہلی مرتبہ تب ملا جب وہ Evenston' الی نوائے کے Presbytrian گرجا گھر کا ایسوسی ایٹ Pastor تھا۔ بقول اس کے وہ ان دنوں بہت ہی اسرائیل نواز تھا۔ ۱۹۷۴ء کے پہلے تیل کے بحران کے دنوں میں اس نوجوان پادری نے گرجامیں تقاریر کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ اس میں باری باری اسرائیل نواز اور عرب نواز نکتہ ہائے نظر پیش کئے جاتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سلسلہ اس کے مریدوں کو اس لاثانی (انتہائی غیر معمولی) واقعہ کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ Wagner کو بہت حیرت ہوئی جب اس سلسلہ کے وسط میں اس پر اس سلسلہ کو بند کر دینے کے لئے دباؤ ڈالا گیا۔ گمنام فون کالوں کا تانتا بندھ گیا کہ اگر یہ سلسلہ بند نہ کیا گیا کہ گرجا گھر کے باہر پکٹنگ کی جائے گی' یہاں تک کہ اگر سلسلہ جاری رکھا گیا تو غیر متوقع انتقام لیا جائے گا۔

Wagner نے کام جاری رکھا۔ آخر میں البتہ یہ بدمزگی ضرور ہوئی کہ سلسلہ کی فائنل پینل کے دو یہودی ممبران نے حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ اس پینل کی بحث کے شائع شدہ وقت سے صرف نصف گھنٹہ پہلے انہوں نے اعلان کیا کہ عرب ماہر کی اس میں موجودگی نے اس کو Anti Semitic

رنگ دے دیا تھا لہٰذا وہ اس میں شرکت کر کے اعزاز نہ بخشیں گے۔ ان کا مطلب تھا کہ Wagner نے انہیں اس بحث کی نوعیت اور پینل کی ساخت کے بارے میں دھوکے میں رکھا۔ حالانکہ موضوع بحث اور شرکاء کے ناموں کا بہت پہلے اعلان ہو چکا تھا۔

Wagner کو شک تھا کہ ان دونوں نے اپنے رَبی کے کہنے پر اس کانفرنس سے کنارہ کشی کی ہے۔ اس شک کو مزید تقویت بعد میں اس بات سے ملی جب پتہ چلا کہ بیشتر فون کالیں مقامی یہودی آبادی کی طرف سے تھیں۔ ایک نے تو صاف کہا کہ میں یہودی ہوں اور اس قسم کی سرگرمی انتہائی Anti Semitic ہے۔ ایک عیسائی کا یوں کرنا ناقابل فہم ہے۔ یہ تجربہ Wagner کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی تھا۔ اسے بھی ان بہت سارے دوسرے لوگوں کی طرح جو بغیر لگی لپٹی رکھے بات کرتے ہیں۔ یہ پتہ چل گیا کہ Anti Semitic کا لیبل چسپاں کرانے کے لئے ہرگز یہ ضروری نہیں کہ یہودی قوم یا اسرائیلی حکومت پر واقعی نکتہ چینی کرے۔ بس صرف اتنا ہی کافی تھا کہ آپ مشرق وسطیٰ کے بارے میں کوئی سوال اٹھائیں اور یہ فرض کریں کہ اس کا جواب پہلے سے گھڑا گھڑایا موجود نہیں ہے۔ الزام لگانے کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔

Wagner ۱۹۷۷ء میں پہلی مرتبہ مشرق وسطیٰ گیا۔ وہ گیا تو فلسطینی انسانی حقوق کے کمیشن (PHRC) کے نمائندوں کے ہمراہ لیکن اپنا کرایہ خود ادا کیا۔ بیروت' مغربی کنارے اور یروشلم میں پناہ گزینوں اور دوسرے باشندوں کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد اس کی فلسطینی پناہ گزینوں کے بارے میں پہلے سے موجود ہمدردی ایک گہرے ذاتی احساس میں بدل گئی۔ "مجھے یوں لگا کہ کچھ تو کرنا چاہئے۔"

امریکہ واپس آکر اسے پتہ چلا کہ یہ "کچھ کرنا" کس قدر دشوار ہوگا۔ مشرق وسطیٰ روانگی سے ذرا پہلے Wagner نے اپنے گرجا گھر میں اسرائیلی حکومت کے ایک ممتاز نکتہ چین Israel Shahak کی تقریر کا بندوبست کیا تھا۔ واپسی پر اسے معلوم ہوا کہ اس کے گرجا گھر کے سینئر پادری نے بغیر اس کو یا Shahak کو مطلع کئے یہ تقریر مقامی ربیوں کے دباؤ کے تحت منسوخ کر دی ہوئی تھی۔ اس سینئر پادری نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مقامی ربیوں نے اسے قائل کر دیا تھا کہ یہ چرچ اور یہودی فرقے کے درمیان تعلقات کے بہترین مفاد میں ہوگا کہ اسرائیلی پالیسی کے اس مشہور نکتہ چیں کی تقریر منسوخ کر دی جائے۔

Wagner نے ہمت نہ ہاری اور فلسطینیوں کی حالت زار اور حقوق کے بارے میں اور شدومد سے بولنا شروع کر دیا۔ اتوار کی صبح ان کے لئے دعائیں کی جانے لگیں۔ زیادہ سے زیادہ تعلیمی سرگرمیاں اختیار کی گئیں حتیٰ کہ فلسطینی عیسائیوں کو آکر منبر پر بولنے کا موقع دیا گیا۔ ان تمام سرگرمیوں سے نہ صرف عوامی نکتہ چینی اور دباؤ میں اضافہ ہوا بلکہ اس کے اپنے گرجا گھر کے اسٹاف میں بھی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک ساتھی پادری تو اس کو PLO پادری کہہ کر پکارتا۔ جوں جوں First LaGrange Conference کے نام پر اس کا نام پڑ گیا۔ یہ ۱۹۷۹ء میں وہاں ہوئی) (LaGrange کا وقت قریب آتا گیا' اسٹاف کے اختلافات بڑھتے گئے۔ LaGrange-2 (مئی ۱۹۸۱ء) کی طرح اس کانفرنس کا مقصد بھی امریکہ کے چرچ گروپوں اور لیڈروں میں فلسطینی پناہ گزینوں کی حالت کے بارے میں آگاہی پیدا کرنا تھا۔ ان دونوں میں عیسائیوں کی مذہبی برادری نے کھل کر حصہ لیا۔ انجیلی' پروٹسٹنٹ' رومن کیتھولک اور آرتھوڈکس سبھی شامل تھے۔ پہلی کانفرنس PHRC نے شکاگو Presbytry کی مشرق وسطیٰ ٹاسک فورس کے ہمراہ مل کر کی اور دوسری میں اسے عیسائی امن گروپوں "Pax Christi" اور "Sojourners" کا تعاون حاصل تھا۔ ان دونوں کانفرنسوں کا مقصد LaGrange-II کے اس عنوان سے ظاہر تھا "ارض مقدس میں سچے امن کی بائبلی بنیادوں کی طرف۔"

ان دونوں کانفرنسوں سے عوام کی آگاہی اور مذہبی ہم آہنگی برائے مشرق وسطیٰ میں کافی اہم پیش رفت ہوئی' لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ مفاہمت اور افہام و تفہیم کے دشمن بھی موجود تھے۔

LaGrange-I کے انعقاد سے پیشتر اینٹی ڈی فیمیشن لیگ کی مقامی شاخ نے اپنے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر ربی Yechiel Eckstein کی سربراہی میں شکاگو Presbytry پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس کانفرنس کی اسپانسر شپ سے دستبردار ہو جائیں۔ پہلے فون کالیں آئیں پھر خطوط کا تانتا بندھ گیا اور آخر کار یہودی لیڈروں اور گرجا گھر کے اہل کاروں کے درمیان ملاقات ہوئی۔

گرجا کے سینئر اہل کار Wagner کی حمایت میں ثابت قدم رہے لیکن یہودیوں نے فوراً کانفرنس کے بارے میں فیصلہ صادر کر دیا۔ کانفرنس کے انعقاد سے ایک یوم پہلے ADL نے ایک اخباری بیان جاری کر کے اس کے Anti Semitic تعصب کی مذمت کی۔

کانفرنس کو بدنام کرنے کی کوششیں یہیں پر ختم نہ ہوئیں۔ مقررین کی فہرست میں فادر John Polakowski کا نام بھی شامل تھا۔ یہ ایک سرگرم صیہونی اور Helocaust کے بارے میں لکھنے والا

ممتاز لکھاری تھا۔ جس صبح کانفرنس شروع ہوئی عین اسی دن اس نے Wagner کو بذریعہ ایک رجسٹرڈ خط اپنی دستبرداری سے مطلع کیا۔ اسے پورے طور پر آگاہ رکھا گیا تھا کہ کانفرنس کس موضوع پر ہے اور بیشتر دوسرے شرکاء کے نام بھی بتلادیئے گئے تھے لیکن اس نے پھر بھی اس کانفرنس کی یہ کہہ کر مذمت کی کہ یہ اسرائیلی نکتہ نظر کے خلاف ناجائز طور پر تعصب بھری ہے۔ اس نے اپنی ہی پیشین گوئی سچ کر دکھائی یعنی اس کانفرنس میں اس کی عدم شرکت سے Lagrange-I میں صیہونی نکتہ نظر پیش کرنے والا کوئی نہ رہا۔

LaGrange-II میں بھی اسی حکمت عملی کا اعادہ کیا گیا۔ رَبی Arnold Kaiman نے کانفرنس کے ایک سیکشن کو "مذہبی لوگوں کا بیان اپنے نکتہ نظر سے" کے موضوع پر خطاب کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ اس کو تقریر کی دعوت اس کے دیرینہ دوست Ayoub Talhami نے دی تھی۔ وہ اس کانفرنس کے منتظمین میں سے ایک تھا۔ اس نے رَبی Kaiman کو اس کانفرنس کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔ اسے اس کانفرنس کی دستاویزات بھی بھجوائیں اور مزید بر آں اسے پہلی کانفرنس کے احوال کا علم تھا۔ عین کانفرنس کے انعقاد والے دن اس نے Talhami, Wagner اور دیگر لوگوں کو بذریعہ اسپیشل ڈیلوری خط کانفرنس سے اپنی دستبرداری سے مطلع کیا۔ اس نے خط میں Talhami اور دوسروں کی اس بات پر مذمت کی تھی کہ اس کو دھوکا دیا گیا ہے اور اس کانفرنس کے بارے میں گمراہ کیا گیا تھا۔ Talhami کا خیال تھا کہ یہ خط خاص طور پر Kaiman کے Congregational Board کی توجہ کے لئے لکھا گیا تھا۔ اولاً تو اس لئے کہ اس دن بورڈ کا Co-Chairman اس کا ساتھی مقرر تھا اور ثانیاً یہ دھوکا دہی کا الزام بیحد مضحکہ خیز تھا۔

وجہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن Kaiman نے صرف کانفرنس سے لاتعلقی کا اظہار اور ذاتی طور پر تقریر سے انکار ہی نہ کیا بلکہ نامہ نگاروں کو اپنے خط کی نقول بھی فراہم کیں' تاکہ کانفرنس کے جواب دعویٰ سے پیشتر ہی اپنا بطور ایک صیہون نواز اس سے دستبردار ہونا ظاہر کر سکے۔

Wagner کے لئے Polakowski اور Kaiman کی عین وقت پر دستبرداری یہ ظاہر کرتی تھی کہ تاخیر کے باعث کوئی متبادل اسرائیل نواز مقرر نہ لایا جاسکے یعنی انہیں مخالف نکتہ نظر کو بیچ ثابت کرنا مقصود تھا نہ کہ اپنے نکتہ نظر پر کھلی اور آزاد فضاء میں تبادلہ خیالات۔ ان دستبرداریوں سے ADL کو بعد ازاں یہ کہنے کا موقع ملا کہ یہ LaGrange کانفرنسیں درحقیقت اسرائیل مخالف یا

PLO نواز اجتماع تھے۔ یہ اس کے باوجود تھا کہ ان کانفرنسوں کے اختتام پر نہایت متوازن اعلامیے جاری کیے گئے۔ بہرحال ان دونوں کانفرنسوں کا سب سے تشویشناک پہلو ان کی مذمت نہ تھا بلکہ شرکاء میں سے ایک پر جھوٹے الزامات لگانا تھا۔

کیتھولک راہبہ سسٹر مریم وارڈ جو Vermont کے Trinity College میں Humanities کی پروفیسر تھی۔ اس کا فلسطینی پناہ گزینوں کی خدمت کا دیرینہ ریکارڈ تھا۔ خود بقول اس کے LaGrange-II میں اس کا رول مختصر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مجھے شک تھا کہ میں شرکت کے لئے خرچ کا دفاع کر سکوں گی۔ سسٹر مریم نے ایک بحث و مباحثہ پینل کے لئے Moderator کے فرائض انجام دیئے۔ اسے اس کی انسانی ہمدردی کی خدمات پر ایک ایوارڈ دیا گیا۔ Wagner کی طرح اسے بھی علم تھا کہ فلسطینی معاملے پر بولنے کی اسے کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ اسے بھی اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے نفرت بھرے خطوط اور ذاتی لعن طعن کا سامنا تھا' اس کے باوجود اس کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ LaGrange-II میں شرکت اس کے لئے کس الزام کا باعث بنے گی۔

"Jewish Week-American Examiner" جریدے میں (نیویارک کی ایک ممتاز یہودی اشاعت) سسٹر مریم پر چن کر ذاتی حملہ کیا گیا۔ ۲۱ر جون ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں نمایاں طور پر شائع کیا گیا کہ سسٹر مریم نے اس کانفرنس میں اسرائیل کی مقبوضہ مغربی کنارے کی حکمت عملی میں خلل ڈالنے کے لئے مبینہ طور پر ایک اسکیم پیش کی ہے۔ اس مضمون میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ اس نے کہا کہ گرجے ایک ایسا پراجیکٹ فنانس کریں جس کا اسٹاف تو امریکہ میں ہو لیکن فیلڈ ورکر اسرائیل اور مغربی کنارے پر ہوں تاکہ اسرائیلیوں کی مخبری کی جا سکے۔ بقول اس جریدے کے اس نے کہا تھا کہ پیشتر اس کے کہ اسرائیلیوں کو پتہ چلے کہ کیا ہو رہا ہے اور وہ اس فیلڈ ورکر کو خارج کریں۔ وہ لوگ (سسٹر مریم اور اس کے سازشی ساتھی) اس کا بدل تیار رکھیں گے۔ آرٹیکل میں لکھا تھا کہ یہ تجویز بغیر کسی مخالفت کے منظور ہوئی اور گرجوں سے مالی امداد حاصل کرنے کے طریقے وضع کئے گئے۔

یہ رپورٹ سو فیصد جعلی تھی۔ ایسی کوئی اسکیم وہاں پیش نہیں ہوئی تھی اور جب شکاگو سے Wagner نے سسٹر مریم کو اس شائع شدہ الزام سے مطلع کیا تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس نے ہمیشہ اپنی انسانی ہمدردی والی سرگرمیوں کی پبلسٹی سے احتراز کیا تھا۔ اس طرح اکیلے چن کر الزام تراشی کرنا اس کے لئے باعث خوف تھا' بقول اس کے وہ کچھ دیر تو جسمانی طور پر بیمار رہی حتیٰ کہ اس معاملے میں

اپنے مذہبی ساتھیوں سے بھی تبادلہ خیال نہ کر سکی۔

کافی سوچ بچار کے بعد کہ اسے کیا کرنا چاہئے اس نے Trinity College کے ایک مہمان لیکچرار (بائبل کا ممتاز ماہر) سے صلاح لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کسی قانونی ماہر سے مشورہ کرے تاکہ قانونی چارہ جوئی کر سکے۔ اٹارنی نے بطور ہمدردی ابتدائی ایکشن مفت کر دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ جب اس اٹارنی کے متعدد خطوط کا جواب موصول نہ ہوا تو پھر اُسی بائبل کے ماہر نے (جو کہ نیویارک کے یہودی فرقے کا ایک ممتاز رکن تھا) ذاتی طور پر اس ایڈیٹر کو فون کیا۔ سسٹر مریم کا خیال ہے کہ اسی فون کال نے ایڈیٹر کو جواب پر مجبور کیا۔

جنوری ۱۹۸۲ء میں جب الزام تراشی کو چھ ماہ گذر چکے تھے تو "The Jewish Week-American Examiner" نے آخر کار اس کی تردید چھاپ ہی دی۔ ایڈیٹر نے تسلیم کیا کہ پڑتال پر یہ ثابت ہوا کہ سسٹر مریم کی جانب منسوب کئے گئے الفاظ بے بنیاد تھے۔ انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ اسٹوری ایک سروس نے فراہم کی تھی اور ادارے کے کسی رکن نے Jewish Week کی طرف سے اس کی رپورٹنگ نہیں کی تھی۔ اس تردید میں ایڈیٹروں نے کہا کہ انہیں سسٹر مریم کے بارے میں تردید سے بیحد خوشی ہوئی تھی۔

پھر بھی سسٹر مریم پر عیاں تھا کہ یہ شائع شدہ تردید تمام قاریوں کے ذہن سے الزام کو محو نہ کر سکے گی۔ اسی سال کے آخر میں نیویارک سے ایک یہودی فزیشن Trinity College کے کیمپس پروگرام میں حصہ لینے کے لئے Burlington آئی۔ اس محترمہ اور سسٹر مریم کی مذہبی جماعت کے ایک دوسرے رکن کے درمیان بات چیت میں اسی بائبل ماہر کا ذکر آ گیا جو سسٹر مریم کے کیس سے متعلقہ تھا۔ اس راہبہ نے ذکر کیا کہ اس نے سسٹر مریم کی دعوت پر اس کالج کا حالیہ دورہ کیا تھا۔

اس نام کو Jewish Week کے آرٹیکل کے حوالے سے پہچان کر اس فزیشن نے سسٹر مریم کے بارے میں پھر وہی تمام الزامات دہرا دئے۔ اس نے تردید نہیں پڑھی تھی' اسے فوراً بتلایا گیا کہ یہ الزامات جھوٹے تھے۔ سسٹر مریم نے اس واقعے کے حوالے سے کہا کہ اسے امید نہیں کہ کہ اس کے نقصان کی کبھی تلافی ہو سکے۔ اصل نقصان تو پہلی والی شے سے ہو جاتا ہے۔ میں نہیں چاہوں گی کہ کسی کے ساتھ کبھی ایسا ہو۔

باب دہم

سبھی یہودی اس میں شامل نہیں

اسرائیل کے خلاف نکتہ چینی کو ختم کرنے کے لئے اسرائیل نواز کمیونٹی کا پہلا ہدف یہودی ناقدین کو خاموش کرانا ہوتا ہے۔ اسرائیل کی حکومت اس میں ان کی پرزور حمایت کرتی ہے۔

اسرائیل کی ہر حکومت امریکی یہودیوں میں ایکا رکھنے کو بہت زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ یہ یک جہتی اسرائیل کا دفاعی حصار ہے۔ صرف اسرائیلی فوج ہی اس سے پہلے ہے اور امریکن گورنمنٹ سے جو امداد اسرائیل کو ملتی ہے وہ اس پر منحصر ہے۔

امریکی یہودیوں میں یہ احساس ندامت ابھارا جاتا ہے کہ وہ امریکہ میں پرتعیش اور محفوظ زندگی گزار رہے ہیں جبکہ ان کے اسرائیلی یہودی ہم قوم قلعہ سنبھالے ہوئے ہیں۔ اونچے ٹیکس ادا کرتے ہیں اور جنگیں لڑتے ہیں۔ بقول رَبی Balfour Brickner کے ہم اس دلیل کی پناہ لیتے ہیں کہ ہمیں اپنی رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس کا بدلہ اسرائیلیوں کو چکانا پڑتا ہے۔

بیشتر یہودیوں کے لئے اسرائیل پر نکتہ چینی کا تصور کرنا بھی ناممکن ہے۔ قصہ وہی بچانے کا ہے۔ صیہونیت کے خواب کو بچانا' Judaism کو بچانا' خود یہودیوں کو اپنا بچ جانا۔ اگر حالیہ برسوں میں امریکی یہودیوں نے 'مسئلہ مشرق وسطیٰ' پر کوئی خاص بحث و تمحیص نہیں کی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ سب یکساں رائے رکھتے ہیں۔

ذاتی طور پر کئی امریکی یہودی اسرائیل کی سرکاری پالیسیوں کے ساتھ واضح اور حیران کن اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ ۱۹۸۳ء کے ایک AJC کے استصواب رائے سے ظاہر ہوا تھا کہ تقریباً نصف امریکی یہودی فلسطینیوں کے لئے غربی کنارے اور غزہ پر مشتمل ایک وطن قائم کرنے کے حامی ہیں۔ ان کا یہ بھی مشورہ تھا کہ یہودی بستیوں کا پھیلاؤ روک دیا جائے تاکہ امن مذاکرات کی حوصلہ افزائی ہو۔ تین چوتھائی کی یہ خواہش تھی کہ اسرائیل PLO کے ساتھ مذاکرات شروع کرے اگر وہ

اسرائیل کو تسلیم کر لیں اور دہشت گردی کو ترک کر دینے کا اعلان کریں۔ صرف ۲۱ فیصد کی یہ رائے تھی کہ اسرائیل کو مغربی کنارے پر قبضہ برقرار رکھنا چاہئے۔ ان تمام مسائل پر امریکی یہودیوں کا اسرائیلی حکومت کی پالیسیوں اور اعلانات سے اختلاف ہے۔

ان میں بیشتر کا یہ بھی خیال ہے کہ امریکی یہودیوں کو انفرادی اور منظم گروپوں کے طور پر اس بات کی آزادی ہونی چاہئے کہ وہ اسرائیلی پالیسی پر کھلے عام نکتہ چینی کر سکیں۔ سروے کئے گئے افراد کی ستر فیصد اکثریت کا خیال تھا کہ یہودی تنظیموں کو نکتہ چینی کی آزادی ہونی چاہئے۔ اس پر تو یہودی لیڈروں تک کا کہنا ہے کہ وہ نکتہ چینی کا خیر مقدم کریں گے۔ ۴۰ فیصد نے کہا کہ تنظیموں کو نکتہ چینی کی آزادی ہونی چاہئے جبکہ صرف ۳۷ فیصد نے کہا کہ نہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ صرف ایک تہائی یہودی لیڈر ان تنظیموں کی اسرائیل پر نکتہ چینی کو دبا دینے کے حق میں ہیں۔ انفرادی طور پر یہودیوں کا آزادی اظہار رائے کے حق میں ووٹ تو اور بھی زیادہ ہے۔ صرف اکتیس فیصد کا کہنا تھا کہ امریکی یہودیوں کو انفرادی طور پر اسرائیل کی پالیسی پر کھلے عام تنقید نہ کرنی چاہئے اور ستاون فیصد اس سے متفق نہ تھے۔ اس مسئلے پر لیڈروں اور غیر لیڈروں میں قطعاً اختلاف نہیں۔

اس سروے کے نتائج کو کھلے عام اختلاف رائے کے حقائق پر منطبق کرنا کچھ آسان نہیں' حالانکہ امریکن یہودی یہ کہتے ہیں کہ وہ بعض اسرائیلی پالیسیوں کی بھرپور مخالفت کرتے ہیں اور ان کا ایمان ہے کہ انفرادی اور تنظیمی سطحوں پر انہیں ان پالیسیوں پر کھلے عام تنقید کی آزادی ہونی چاہئے لیکن سیدھی سی بات ہے کہ کھلے عام تنقید بالکل عنقا ہے۔ اس سروے میں جو آراء ظاہر کی گئی ہیں ان کو صرف ''ایک فہرست خواہشات'' کے طور پر دیکھنا چاہئے نہ کہ ان اصولوں کا بیان جو سروے کے لئے لوگ بتانا چاہتے ہیں۔

یہودی تنظیمیں امریکہ میں اسرائیلی پالیسیوں کے ساتھ کھلے عام جس اتفاق کا مظاہرہ کرتی ہیں اس میں دراڑ پڑنا بہت ہی نایاب واقعہ ہے۔ وہ یا تو خاموشی اختیار کرتے ہیں یا پھر حمایت کرتے ہیں۔ B'nai B'rith کے لیڈروں اور AIPAC نے ستمبر ۱۹۸۲ء کی صدر ریگن کی اعلان کردہ مشرق وسطیٰ پالیسی کی بیحد محتاط انداز میں حمایت کی تھی۔ لیکن یہ صرف اس وقت تک تھا کہ اسرائیلی حکومت نے اپنی پالیسی کا اعلان ابھی نہ کیا تھا۔ جونہی اسرائیل نے اپنے اختلافات کو ظاہر کیا تو ان تنظیموں نے منہ میں گھنگھنیاں ڈال لیں۔

کچل کر ختم کردینا

تقریباً ۲۲۰۰ سے زائد ایسی یہودی تنظیموں میں سے جو قومی سطح پر کام کرتی ہیں صرف New Jewish Agenda اور اس کی پیشرو Breira نے اسرائیلی حکومت کی مسلمہ پالیسیوں کو چیلنج کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیوں نے ان دونوں کا حقہ پانی بند کر دیا۔ Breira صرف پانچ سال ہی رہی۔ یہ ۱۹۷۲ء میں قائم ہوئی تھی اور عین اوج پر اس کے تقریباً ۱۰۰۰ ممبر قومی سطح پر بنے تھے۔ اس کا نام عبرانی زبان میں متبادل کے معنی رکھتا تھا اور اس نے کھلے عام سنجیدہ بحث و مباحثہ کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ عرب ممالک اور اسرائیل کے درمیان فلسطینیوں کے ایک وطن کے بارے میں جامع امن کا سمجھوتہ ہونا چاہیے تاکہ فلسطینی اور اسرائیلی مل کر امن اور چین سے رہیں۔ اس کے سرکردہ لیڈروں میں رَبّی Arnold Jacob Wolf ' رَبّی David Wolf Silverman ' رَبّی Max Ticktin ' رَبّی David Saperstein اور رَبّی Balfour Brickner شامل تھے۔

جوابی حملہ بڑا شدید تھا "The National Journal" نے لکھا کہ Breira پر یہودی نظامت کے لیڈروں کی طرف سے تند و تیز حملے کئے گئے۔ ایک Breira میٹنگ پر تشدد پسند جیوش ڈیفنس لیگ نے حملہ کر کے تہس نہس کر ڈالا۔ اس کے کچھ ممبران پر شدید دباؤ ڈالا گیا کہ وہ یا تو اس کی رکنیت سے کنارہ کشی کریں یا اپنی ملازمت سے ہاتھ دھوئیں۔ یہودی لیڈروں کو انتباہ کیا گیا کہ وہ Breira سے واسطہ نہ رکھیں ورنہ ان کی مالی امداد معدوم ہو جائے گی۔ ربیوں کے ہمراہ اسرائیلی اہلکار بھی مذمت میں شامل ہو گئے۔ سابقہ رکن بورڈ آف ڈائریکٹرز برائے Breira اور حالیہ نامہ نگار شکاگو ٹریبون نے ایک رَبّی کا حوالہ دیتے ہوئے بتلایا کہ میری واپسی کا راستہ معدوم ہے۔ ایک مرتبہ اگر ایسا نکتہ نظر اختیار کر لیا جائے (یعنی اسرائیلی پوزیشن کو چیلنج کرنا) تو پھر منظم یہودی فرقہ آپ پر اپنے دروازے بند کر دیتا ہے۔ بوسٹن اور فلاڈلفیا کے اسرائیلی قونصل خانوں نے یہودیوں کو انتباہ کیا کہ وہ Breira کی کانفرنس میں شامل نہ ہوں۔

Breira پر یہودیوں کے دائیں اور بائیں دونوں بازوؤں کی طرف سے حملہ کیا گیا۔ ایک پمفلٹ میں جو بعد ازاں AIPAC نے بھی شائع اور نشر کیا' ان کے لیڈروں کو انقلابی کے لقب سے نوازا گیا۔ یہ پمفلٹ تمام یہودی تنظیموں نے حوالے کے لئے استعمال کیا۔ اس کو امریکہ کی انقلابی لیبر پارٹی کے حامی ہونے کا الزام دیا گیا۔ ایک غیر دستخط شدہ حقیقت نامہ میں اس کو ان یہودی

انقلابیوں کا گروہ قرار دیا گیا جو PLO کے حمایتی تھے۔ "The Seattle Jewish Transcript" نے اسے اسرائیل مخالف بائیں بازو کے انقلابی دھڑے کا نام دیا۔

۱۹۷۷ء میں Breira کی آخری نیشنل کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے Irving Howe نے کہا کہ اس تنظیم پر کیچڑ اچھالنے کے لئے جو حربے استعمال کئے گئے وہ ہم نے یہودیوں میں ایک عرصہ دراز سے نہیں دیکھے۔ اسی اجلاس میں ایک ریٹائرڈ اسرائیلی جرنیل Mattityaho Peled نے کہا کہ یہاں (یعنی امریکہ میں) منحرفین پر جو دباؤ ڈالا جاتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جس کا ہمیں اسرائیل کے اندر سامنا ہوتا ہے۔ میں تو کہوں گا کہ اسرائیل کے اندر ہمیں زیادہ برداشت کیا جاتا ہے بہ نسبت یہاں کی یہودی آبادی کے۔ اس جرنیل کے امریکہ میں لیکچروں کا یہاں کے یہودی گروپ اکثر مقاطعہ کرتے تھے۔ Breira اس کے تھوڑے دنوں بعد تحلیل کر دی گئی۔

دسمبر ۱۹۸۰ء میں ۷۰۰ یہودی واشنگٹن ڈی سی میں جمع ہوئے کہ یہودی منحرفین کی ایک اور تنظیم قائم کریں۔ یعنی "The New Jewish Agenda" یہ زیادہ تر آزاد خیال نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ اس نے فلسطینی قوم اور عرب ہمسائیوں کے ساتھ بذریعہ مذاکرات تصفیہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور مغربی کنارے اور لبنان میں اسرائیلی پالیسیوں کی مخالفت کی۔

جلد ہی اسے دوسرے یہودی گروپوں کے ساتھ ملنے سے منع کر دیا گیا۔ جون ۱۹۸۳ء میں اس کی واشنگٹن ڈی سی شاخ کو AJC کی ممبر شپ دینے سے انکار کر دیا گیا۔ حالانکہ اس کونسل میں ۲۶۰ مذہبی، تعلیمی، برادرانہ اور سماجی تنظیمیں شامل تھیں۔ کونسل کے ممبران نے ۹۸ ووٹ مخالفت اور ۷۰ حمایت میں دے کر اپنے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے اس فیصلے کو رد کر دیا جس میں انہوں نے ۲۲ بمقابل ۵ کی اکثریت سے اسے ممبر بنانے کی حمایت کی تھی۔ امریکہ کی صیہونی تنظیم کی واشنگٹن شاخ کے صدر Irvin Stein نے یہ الزام عائد کیا کہ یہ گروپ بیحد آزاد خیال بلکہ عرب نواز تھا نہ کہ اسرائیل نواز۔ اس گروپ کی نمائندگی کرتے ہوئے Roe Rodenstein نے کہا کہ ہمارا گروپ بحث کا حصہ بننا چاہتا ہے اور جو ہم کر رہے ہیں اس پر ہمیں ناز ہے۔

یہ میکارتھی ازم کی ایک قسم ہے

یہودی تنظیموں کی مانند انفرادی یہودی بھی اسرائیلی پالیسیوں کے خلاف کھلے عام تنقید شاذ

ہی کبھی کرتے ہیں، حالانکہ ان میں بنیادی اختلافات موجود ہیں۔ جن مٹھی بھر افراد نے کبھی نکتہ چینی کی ہے ان کے حمایتی کم اور ان کا دفاع کرنے والے کمتر ہیں۔ Carolyn Toll کے بقول نکتہ چینی کے خلاف مناہی بیحد طاقتور اور وسیع ہے۔ میرے خیال میں یہودی آبادی سے باہر رہنے والے یہودیوں پر بھی اس بحث سے مناہی کا اثر ہے۔ اگر کسی کو بعض امور پر اختلاف رائے ظاہر کرنے سے یہودی آبادی کے اندر منع کیا جاتا ہے تو بھلا سوچئے دوسروں کے درمیان یہی کرنے کو کس قدر غداری سمجھا جائے گا۔

Toll نے افسوس ظاہر کیا کہ امریکن یہودی تنظیموں میں آزادی رائے کو دبا دیا جاتا ہے۔ یہی دباؤ صلح پسند اور منحرف یہودیوں کو Synagogue جیوش کمیونٹی سینٹرز اور بڑی بڑی قومی یہودی تنظیموں کے اجلاس میں شامل ہونے سے روکتا ہے۔ امریکن فرینڈز سروس کمیٹی کے نمائندوں کو Anti Semitic کہا جاتا ہے۔ اگر وہ یہ کہیں کہ امن تبھی قائم ہوگا جب فلسطینیوں کے لئے ایک معقول وطن کا قیام عمل میں آئے گا تو انہیں PLO کے دیوانے کہا جائے گا۔

ایک کامیاب یہودی مصنف کو ایک مختلف طرح کے مقاطعے کا سامنا ہوا۔ اس نے اسرائیل پر ایک تنقیدی کتاب لکھی تھی "The Fate of the Jews" نامی کتاب میں اس نے امریکی یہودیوں کی درد بھری داستان اور موجودہ الجھن کا بے لاگ ذکر کیا تھا۔ اس کا نام Roberta Straves Feverlicht تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ بہت سے یہودیوں کا مذہب اب صیہونیت بن چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صیہونیت یا اسرائیل پر تنقید اب بدعت شمار ہوتی ہے اور مقاطعے کا باعث بنتی ہے۔ اسرائیل کے بارے میں Idealism اب وطن پرستی، قومیت پرستی، شاونزم اور توسیع پرستی سے متاثر اور آلودہ ہو چکی ہے۔ اسرائیل اپنے ناقدین کو Anti Semitic قرار دے کر جائز نکتہ چینی سے بچتا ہے۔ یہ میکارتھی ازم ہی کی ایک قسم ہے اور بہت تیر بہدف۔

۱۹۸۳ء میں جب اس کتاب کی اشاعت (Times Books) کو سال بھر گذر چکا تھا تو پھر بھی اسے نظر انداز ہی کیا جا رہا تھا۔ صرف The Los Angeles times ہی ایک بڑا اخبار تھا جس نے اس پر تبصرہ شائع کیا۔ ناشر نے بالکل اشتہار بازی نہ کی اور نہ کوئی اشتہار بازی دورہ کیا۔ Feverlicht (جو کہ پندرہ کامیاب تصنیفات کا خالق تھا) کے بقول ایک یہودی صحافی Mark A. Bruzonsky کو نظر اندازی اور الزام تراشی کر کے نشانہ بنایا گیا۔ اس کتاب کی کاپیاں آزاد خیال

یہودیوں' عیسائیوں' شہری آزادی کے پرچار کوں اور سیاہ فاموں کو بھجوائی گئیں لیکن "کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی"؟ Feverlicht کو ماننا پڑا کہ ایسا لگتا ہے کہ اس کتاب کو عالمی پیمانے پر منظوری کے بعد سنگسار کیا جا رہا ہے۔

کئی دوسرے یہودیوں کو جو ڈھکے چھپے انداز میں اسرائیل پر نکتہ چینی کرتے ہیں ایسی دھمکیوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے جو کہ زیادہ ڈھکی چھپی نہیں ہوتیں۔ فلاڈلفیا کی Gail Pressbeg کے لئے دھمکی آمیز فون کالیں ایک معمول بن چکی ہیں۔ وہ American Friends Svc. Committee کے پیشہ ورانہ عملے کی ایک یہودی رکن ہے۔ وہ اپنے کام میں فلسطینیوں کے مقصد کی سرگرم حمایت کرتی ہے بقول اس کے گالیوں بھری کالیں اب اتنی زیادہ ہیں کہ اس نے توجہ دینی چھوڑ دی ہے۔ ایک شام جب اسے متعدد کالیں اپنے خفیہ نمبر پر آئیں جن میں اسے جان سے مار دینے کی دھمکیاں دی گئیں کیونکہ اس نے اسرائیل سے فرار اختیار کر لیا تھا تو اس نے اپنا فون اٹھا کر رکھ دیا۔ چند منٹوں بعد ہی وہی آواز اسے اس کے ساتھی کے فون پر دھمکیاں دے رہی تھی حالانکہ وہ نمبر بھی خفیہ تھا۔

اپنے کانگریس کے ۲۲ سال قیام کے دوران میں نے Congressional Record میں ایک بھی ایسی تقریر کا ریکارڈ نہیں دیکھا جو سینیٹ یا ہاؤس کے کسی یہودی ممبر نے کی ہو اور اس میں اسرائیلی پالیسی پر تنقید ہو۔ یہودی ممبران ہو سکتا ہے کہ نجی محفلوں میں اختلاف رائے کا اظہار کرتے ہوں لیکن عوامی طور پر کبھی ایسا نہیں کرتے۔ صرف چند ہی یہودی دانشور مثلاً Noam Chomsky (مایہ ناز ماہر لسانیات) ایسے ہیں جو لگی لپٹی رکھے بغیر بات کرتے ہیں۔ Chomsky کی طرح ان میں سے بیشتر ایک محفوظ کیریئر رکھتے ہیں لہٰذا وہ اپنی پوزیشن کو خطرہ میں ڈالے بغیر متنازعہ حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔

اختلاف رائے یا غداری؟

صحافت ہی ایک ایسا شعبہ ہے جس میں یہودی سب سے زیادہ اسرائیل پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔ Richard Kohen (واشنگٹن پوسٹ) اس کی نمایاں مثال ہے۔

۱۹۸۲ء کے لبنان پر اسرائیلی حملے کے وقت کوہن نے انتباہ کیا تھا کہ انتظامیہ کو چاہئے کہ وہ بیگن کو پیغام بھیجیں کہ امریکہ اس کو لامتناہی ادھار فراہم نہیں کر سکتا۔ ہم معصوم شہریوں پر بمباری

کی ہرگز حمایت نہ کریں گے۔ بعدازاں ایک کالم میں اس نے اپنی اس اسرائیل پر تنقید کے ردّعمل کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا کہ آج کل میرا فون ایک اذیت دہ شے بن چکا ہے۔ جواباً اٹھاتے ہوئے بے عزتی ہونے کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ ڈاک میں بھی یہی کیفیت ہے۔ خطوط زہر بھرے ہوتے ہیں اور کچھ ان میں سے ذاتی بھی ہوتے ہیں۔ اس نے تبصرہ کرتے کہا کہ اسرائیلی پالیسیوں پر اعتراض کرنے کے بارے میں امریکی اور اسرائیلی یہودیوں پر الگ الگ معیار نافذ کئے جاتے ہیں۔

یہاں اختلاف رائے کو غداری سمجھا جاتا ہے اور غداری بھی کسی نصب العین (صیہونیت) یا ملک سے نہیں بلکہ ایک قوم سے 'یکسانیت پر انتہائی زور دیا جاتا ہے۔ ایک متحدہ محاذ رکھنے پر زور ہے اور اس نکتہ نظر کا پرچار ہے کہ اسرائیل کے لئے کیا بہترین ہے یہ صرف اسرائیلی حکومت ہی جانتی ہے۔ ایک ایسے سنسار میں جہاں یہودیوں سے نفرت کرنے والے بہتیرے لوگ موجود ہیں۔ یہ بات بالکل مضحکہ خیز ہوگی کہ صرف بگین حکومت پر تنقید سے ایک بالکل نیا مسئلہ کھڑا کیا جائے۔ اسرائیل کے لئے آخرکار اس سے بدتر چیز کوئی اور نہ ہوگی کہ اس کے دوست اسرائیل کے غلط اور صحیح ہونے کے درمیان تمیز نہ کریں۔

بقول Mark Bruzonsky (اسرائیلی زیادتیوں کا ایک بااصول نقاد): "اگر کسی یہودی کی نیت ہو کہ وہ بامعنی اور سچی آپ بیتی لکھے تو پھر اس کے لئے اس دنیا میں ذاتی اور بھرپور انتقام سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں۔"

Hearst Newspapers کے غیرملکی ایڈیٹر کو اس کا یہودی ہونا ذرا بھی کام نہ آیا۔ ۱۹۸۱ء کے اوائل میں John Wallach نے فلسطین اور اسرائیل پر ایک دستاویزی ٹی وی پروگرام تیار کیا۔ "کیا ہوش مندی جیتے گی؟" اس کا خرچہ واشنگٹن کے ایک وکیل Merle Thorpe نے "فاؤنڈیشن برائے امن مشرق وسطیٰ" کے ذریعے اٹھایا تھا۔ یہ ایک رفائی ادارہ تھا' اس کا مقصد ایک متوازن اور حقیقت پسندانہ پیشکش تیار کرنا تھا جس میں غزہ اور مغربی کنارے کے فلسطینیوں کے بارے میں اسرائیل کو پیش آمدہ مسائل کا جائزہ لیا جاتا۔ واشنگٹن ڈی سی نیویارک اور دوسرے بڑے شہروں میں اس کو عوامی ٹی وی پر بغیر کسی مشکل کے دکھایا گیا لیکن لاس اینجلز کے یہودی لیڈروں نے اسے پیشگی دکھلائے جانے کا مطالبہ کیا اور جب یہ فلم دیکھ چکے تو اس قدر پرزور احتجاج کیا کہ KTC اسٹیشن نے یہ اعلان ساتھ نشر کیا کہ وہ اس دستاویزی فلم کی ذمہ داری قبول کرنے سے قاصر ہیں۔

Wallach کو اس کے طرز پیشکش پر بہت سے اعتراضات موصول ہوئے۔ بیشتر یہ تھے کہ فلسطینی بچوں کو زیادہ مؤثر پیرایہ میں دکھلایا گیا ہے۔ کچھ گورے اور نیلی آنکھوں والے اور پرکشش! یہ اس روش سے روگردانی تھی جس میں فلسطینیوں کو اکثر منفی انداز میں دکھلایا جاتا ہے۔ اس فلم کو بنانے سے پیشتر اسرائیلی سفیر Dinitz Simcha نے Wallach کو کہا تھا کہ وہ یہ پراجیکٹ ترک کر دے۔ جب اس نے بات نہ مانی تو اسے سفارت خانے سے جو دعوتیں برائے ڈنر وغیرہ ملتی تھیں وہ معاً بند ہو گئیں۔ کچھ عرصہ تو اسے پریس بریفنگ کے بارے میں بھی اطلاع نہ دی جاتی رہی۔

۱۹۸۲ء میں Wallach کو پھر دشواریوں کا سامنا ہوا۔ اس مرتبہ اس نے جو تعارفی ڈنر لبنان میں سفیر فلپ حبیب کی مساعی کو سراہنے کے سلسلے میں دیا تھا وہ متنازعہ بن گیا۔ اس میں کابینہ کے کئی ممبران اور سفارتی حلقے کے لوگوں نے شرکت کی۔ اس پروگرام کے دوران کئی سربراہان مملکت کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔ Wallach نے فارن ریلیشنز کمیٹی کے چیئرمین سینیٹر چارلس پرسی سے کہا کہ وہ اسرائیلی وزیر اعظم Menachem Begin کا پیغام پڑھ کر سنائیں۔ پرسی نے مندرجہ ذیل دو فقرے Wallach کے مشورہ پر نظر انداز کر دیئے: "Galilee کے امن آپریشن کے معابعد فلپ حبیب نے بیروت اور لبنان سے دہشت گردوں کے معتدبہ حصہ کو نکالنے میں بیحد کوششیں کیں۔ اس نے یہ منزل پالینے کے لئے سخت محنت کی اور اسرائیل کی دفاعی افواج کی فتح کے بعد اس بین الاقوامی دہشت گردی کے گڑھ کو مسمار کرنے میں اس کی سفارتی مساعی کا بڑا حصہ تھا جس سے تمام آزاد اقوام کو درپیش خطرہ ٹل گیا۔"

اسرائیلی سفیر Moshe Arens بیحد پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس نے پرسی کو ایک جلا بھنا خط لکھا کہ مجھے یہ احساس ہے کہ آپ شاید اس کے مندرجات سے متفق نہ ہوں۔ اس نمایاں فروگذاشت کی پیشگی مثال نہیں ملتی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ ایک بیحد مثال بدتمیزی تھی اور اس نے اس نظر اندازی کو بعض عرب سفیروں کے شترمرغ نمارویہ کی حمایت قرار دیا۔ Arens نے برسٹ کارپوریشن کو بھی احتجاجی خطوط لکھے جس نے اس ڈنر کا خرچہ اٹھایا تھا۔

Wallach نے اگلے روز ایک صحافی کو بتلایا کہ اس نے کیوں یہ فقرے نظر انداز کروائے تھے۔ میرے خیال میں یہ (سامنے بیٹھے) عربوں کے لئے بے عزتی تھی کہ جنگ اور دہشت گردی کا ذکر اس محفل میں ہو جو فلپ حبیب اور امن کے حوالے سے منعقد کی گئی تھی۔ بقول اس کے ستم

ظریفی تو یہ تھی کہ مجھے بگن کے حامیوں سے بہت سارے درشت اور تنقیدی خطوط موصول ہوئے لیکن دوسری جانب سے ایک بھی حمایت یا تعریف کا لفظ نہ ملا۔ حیرت تو اس بات پر ہے جب ہم اپنا کیریئر داؤ پر لگا رہے ہوتے ہیں تو ہمیں صرف نکتہ چینی اور مخالفت کا سامنا ہوتا ہے۔ موافقت اور شاباش کہیں سے بھی نہیں ملتی۔

"Village Voice" جریدے میں لکھنے والے ایک یہودی کالم نگار Nat Hentoff نے بھی کچھ اسی قسم کے سوالات اٹھائے ہیں۔ وہ اکثر اسرائیل پر تنقید کرتا رہتا ہے اور ساتھی یہودیوں کے ضمیر جھنجھوڑتا رہتا ہے۔ ۱۹۸۲ء کے لبنان پر اسرائیلی حملے کے دوران اس نے لکھا تھا:

> "وزیراعظم بگن کے یہاں (امریکہ میں) دورے کے دوران کبھی بھی یہ عندیہ نہ دیا گیا کہ یہاں ہم کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اور Ariel Sharon مل کر اسرائیل کو اندر سے تباہ کر رہے ہیں۔ بڑی امریکن یہودی تنظیموں کے صدور کی کانفرنس کو بھول جائیں اور ان کے ہم خیالوں کو بھی۔ ان لوگوں نے مدت مدید سے یہ طے کر رکھا ہے کہ وہ کھلے عام اسرائیل پر تنقید نہ کریں گے۔"

Hentoff نے اس ڈرانے دھمکانے کی مذمت کی جو اکثر یہودیوں کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ "میں امریکن جیوش کانگریس اور امریکن جیوش کمیٹی کے ان اہل کاروں سے واقف ہوں جو اسرائیلی بے انصافیوں کے بارے میں اپنی صاف گوئی بروئے کار نہ لانے پر پشیمان رہتے ہیں۔ یہ وہ اس لئے نہیں کر سکتے کہ انہیں برطرفی کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔"

۱۹۸۲ء کے لبنان کے دورے کے دوران چند امریکی یہودی تنظیموں کے ملازمین کو برطرفی کا ہوا دکھایا گیا۔ اسرائیلی حملہ اس وقت اپنی انتہا پر تھا۔ نیشنل جیوش فنڈ (ایک قومی تنظیم جو اسرائیلی زمین کی خرید اور ترقی کے لئے رقوم جمع کرتی ہے) کے کچھ ملازمین لبنان کے محاذ جنگ بنے علاقوں کا دورہ کر رہے تھے۔ اچانک JNF کے ایگزیکٹو وائس پریزیڈنٹ نیویارک کے Dr. Sam Cohen نے اٹھ کر ایک حیرت انگیز اعلان کیا۔ اس دورہ میں شامل (اس وقت وہ واشنگٹن دفتر کا ایگزیکٹو تھا) ایک ممبر Charles Fishbein نے یاد کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے ہمیں کہا کہ جب ہم واپس امریکہ پہنچیں گے تو ہمیں لبنان میں کیے گئے اسرائیلی اقدامات کا دفاع کرنا ہوگا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر ہم نے تنقید کی تو ہمیں فوراً برطرف کر دیا جائے گا۔

بقول Fishbein یہ دورہ ان چند عجلت میں ترتیب دیے گئے دوروں میں سے ایک تھا جن کا مقصد اس حملے کے خلاف یہودیوں میں ابھرتی ہوئی نکتہ چینی کو دبانا تھا۔ کل ملا کر تقریباً ۱۵۰۰ ممتاز امریکی یہودیوں کو محاذ جنگ اور ہسپتالوں کا دورہ کرنے کے لئے بذریعہ ہوائی سفر اسرائیل بھجوایا گیا۔ یہ دورے چار سے سات دن تک کے تھے۔ جو گروپ جتنا ممتاز اور اہم ہوتا اتنا ہی اس کا دورہ مختصر اور محدود ہوتا۔ ان میں چونکہ صرف اسرائیلیوں کی ہی مشکلات کے نظارے کرائے جاتے تھے لہٰذا یہودی لیڈروں کی صفوں میں نکتہ چینی کو دبانے میں ان کا رول اہم رہا بلکہ کئی تو سرگرمی سے اسرائیل کی جنگی پالیسیوں کا دفاع کرنے لگے۔

وہ دن دور نہیں جب . . .

یہودی آوازوں کو دبانے میں ان کے لیڈران ہمیشہ ہی کامیاب نہیں ہوتے۔ ایک شخص جس نے اسرائیل کے قیام میں بنیادی حصہ لیا اور پھر USA میں اس کے لئے حمایت پیدا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا وہ بعد ازاں اسرائیلی پالیسی کا نقاد بن گیا تھا۔

Nahum Goldmann صیہونیت کی تاریخ میں ایک نہایت قد آور شخصیت ہے۔ اسرائیل کے قیام میں اس کا کردار انتہائی اہم تھا۔ اس نے ابتدائی مالی امداد مہیا کی۔ اس کے لیڈروں پر اثر انداز ہوا اور امریکہ میں اسرائیل کے لئے ایک طاقتور حلقہ اثر قائم کیا۔ صیہونیت کے لئے اس کی خدمات کا عرصہ تقریباً پچاس سال پر محیط ہے۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران جب فلسطین ابھی سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا تو اس نے ترکوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ یہودیوں کو وہاں آ کر آباد ہونے دیں۔ ۱۹۳۰ء میں اس نے لیگ آف نیشنز میں صیہونیت کی وکالت کی۔ صدر ٹرومین کی انتظامیہ کے دوران اس نے اقوام متحدہ میں فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل کے قیام کے لئے کوششیں کیں۔

۱۹۴۷ء میں جب اقوام متحدہ نے تقسیم کی قرارداد منظور کی تو بیشتر یہودی اسرائیل کے قیام کے اعلان پر مصر تھے لیکن گولڈمین نے تاخیر کا مشورہ دیا۔ اسے امید تھی کہ یہودی پہلے عربوں کے ساتھ کسی مفاہمت پر پہنچ جائیں گے تاکہ جنگ سے بچا جا سکے۔

جنگ چھڑ جانے پر اس نے تاسف کا اظہار کیا۔ اس نے لکھا کہ اس غیر متوقع شکست نے عربوں کو ہلا کر رکھ دیا اور ان کے فخر کو مٹی میں ملا دیا۔ یہ گہرا زخم کھانے پر انہوں نے اپنی تمام تر توانائیاں

اپنے نفسیاتی چرکے کو مندمل کرنے پر مرکوز کر دیں۔ لیکن اسرائیلیوں کے لئے اس فتح نے صدیوں کی ذلت' مفاہمت اور خجالت کے برعکس اس قدر شاندار تقابل پیش کیا کہ اب ان کو صرف یہی راستہ نظر آتا تھا۔ کسی بات کو خاطر میں نہ لانا' کسی حملہ کو برداشت نہ کرنا' مشکلات کو ڈھانا اور خود ساز حقیقتوں کے ذریعے تاریخ سازی اس قدر آسان' اتنی جبری اور اتنی تسکین آور لگی کہ یہ عربوں کے ساتھ ان کی محاذ آرائی میں اسرائیلیوں کی پالیسی بن گئی۔ جب یہ نوزائیدہ مملکت اپنی اقتصادیات کو قائم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی تھی تو گولڈ مین نے مغربی جرمنی کے چانسلر Konrad Adenauer کے ساتھ گفت و شنید کر کے یہ معاہدہ کروایا جس کے تحت جرمنی نے اسرائیل اور انفرادی طور پر یہودیوں کو ۳۰ بلین ڈالرز سے زائد ادا کیے۔

اس کے باوجود بعض اسرائیلی اس کی کوششوں کی پرزور مذمت کرتے تھے۔ Philip Klutznick (شکاگو) اس کا ایک ایسا ہی قریبی ساتھی تھا جس نے اسرائیل کے بارے میں کوششوں میں ہاتھ بٹایا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں بے انتہا مخالفت کا سامنا تھا' خاص طور پر Menachem Begin جیسے انتہا پسند قوم پرستوں سے۔ وہ جرمنی سے کچھ بھی نہ لینا چاہتے تھے۔ اس وقت بیشتر یہودیوں کا خیال تھا کہ کوئی بھی ایسی بات جو جرمنوں کو دوبارہ مہذب دنیا میں واپس لانے کا باعث ہو' وہ یہودی قوم کے خلاف تھی۔ اس بارے میں گہرے جذبات تھے' اس کی فکر کا بنیادی پہلو گولڈ مین کا وہ اختلاف رائے تھا جو اسے اسرائیلی پالیسی برائے عرب عوام سے تھا۔ فلسطینی مملکت کے قیام کی وکالت پر اس کے خلاف تنقید کرنے والوں کو اس نے کہا: "اگر انہیں اس بات پر ایمان نہیں ہے کہ کسی نہ کسی دن عربوں کی مخاصمت ختم ہو سکتی ہے تو پھر ہمیں اسرائیل کو ابھی ابھی ختم کر دینا چاہیے تاکہ وہاں بسنے والے لاکھوں یہودیوں کو بچایا جا سکے۔ ایک ایسی یہودی مملکت کے لئے کیا امید ہو سکتی ہے جسے اگلے پچاس برسوں کے لئے عربوں کی دشمنی کا سامنا ہو۔"

گولڈ مین اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم David Ben Gurian کی یہودی قوم کے ساتھ گہری وابستگی کو سراہتا تھا لیکن اسے افسوس تھا کہ بن گوریان مفاہمت کے قطعاً ناقابل تھا اور اس کی قوت غالبہ اس کی خواہش اقتدار تھی۔ گولڈ مین اپنے معاصرین میں اپنی رجائیت پسندی' قدرتی طور پر نفرتوں کو گھٹانے کی جبلت اور مفاہمت پسندی کی وجہ سے امتیازی حیثیت کا مالک تھا۔ وہ عربوں اور اسرائیلیوں میں یکساں مقبول تھا۔ Stanley Karnov نے ۱۹۸۰ء میں لکھا کہ گولڈ مین اسرائیل کا

وزیر اعظم بن سکتا تھا لیکن اس نے یورپ میں رہ کر سفارتی رابطہ کار کا کردار ادا کرنا پسند کیا۔ وہ اکثر اپنے ابتدائی پیشگی اقدامات سے اسرائیلی حکام کی ناراضگی کا سبب بنتا تھا۔ عرب اسرائیل محاذ آرائی ختم کروانے کے لئے اس نے ۱۹۷۰ء میں مصر کے صدر ناصر کی دعوت پر قاہرہ جانے کا فیصلہ کیا لیکن اس کے اس اقدام کی راہ مسز گولڈا میئر کی اسرائیلی حکومت نے مسدود کر دی جو ایسی سوچ ناپسند کرتی تھی۔

گولڈ مین اسرائیل کی Menachem Begin حکومت کا بھی کڑا نقاد تھا۔ جب اس نے اسرائیل کو اصلی صیہونیت کے مقصد سے روگردانی کرتے دیکھا تو صدائے احتجاج بلند کی۔ اس نے اسرائیلیوں کے دعوے کو رد کر دیا کہ انہیں ہر حال میں عظیم تر اسرائیل پر قبضہ کرنا ہے' کیونکہ یہ خدا کا وعدہ تھا۔ اس نے اس دعویٰ کو لغو قرار دیا۔

گولڈ مین کو امریکی امداد کی ضرورت کا احساس تھا' وہ بیس سال سے زیادہ عرصہ سے امریکہ میں آباد تھا اور امریکن یہودیوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ۱۹۶۹ء میں اس نے امریکہ میں صیہونی سیاسی عمل کی حمایت میں لکھا کہ صرف صیہونیت کے دباؤ ہی کی مذمت کرنا مبنی بر انصاف نہیں۔ جمہوریت تو نام ہی کئی مختلف گروپوں کے دباؤ کے عمل کا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو منوانا چاہتا ہے۔ بہرحال اپنی زندگی کے آخر میں اس کی رائے اسرائیل نواز لابی کے بارے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں اس نے خبردار کیا کہ:

> "بیگن حکومت کی اندھی حمایت اسرائیل کے لئے عربوں کے حملے سے بھی زیادہ مہلک ہو سکتی ہے۔ امریکن یہودی دوسرے تمام گروہوں سے زیادہ سخاوت پسند ہیں اور بڑا شاندار کام کر رہے ہیں۔ لیکن سیاسی اثر و نفوذ کا غلط استعمال اور واشنگٹن میں لابی کا جارحانہ رویے کو بڑھا چڑھا کر دکھانا' بیگن حکومت کو یہ تاثر دینا کہ یہودی اس قدر طاقتور ہیں کہ امریکی انتظامیہ اور کانگریس کو ہر اسرائیلی خواہش کے سامنے سر خم کرنا ہوگا۔ یہ سب کچھ اسرائیل کو تباہی کے راستہ پر لے جائے گا' اگر یہ جاری رکھا گیا تو سنگین نتائج کا حامل ہوگا۔"

اس نے مشرق وسطیٰ میں ایک جامع سمجھوتہ کروانے میں امریکہ کی ناکامی کے لئے اسرائیلی لابی کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ اس کی بہت بڑی وجہ انتخابات کی مصلحتیں' اسرائیل نواز لابی کا خوف اور یہودی ووٹ ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر لابی نے یہی لائحہ عمل جاری رکھا تو آئندہ مشکلات در پیش آئیں

گی۔اب یہ ایک منفی عمل بن رہا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ نہ صرف اسرائیل کی توقعات اور سیاسی اندازوں کو مسخ کر کے رکھ دے گا بلکہ وہ وقت زیادہ دور نہیں جب امریکی عوام اسرائیل کے مطالبوں اور امریکی یہودیوں کی جارحیت پسندی سے اکتا جائیں گے۔

اسرائیلی لابی کے بارے میں یہ چونکا دینے والی رائے لکھنے سے دو سال قبل یعنی ۱۹۷۸ء میں جریدہ نیویارک نے یہ خبر دی تھی کہ گولڈمین نے کارٹر انتظامیہ کو ذاتی سطح پر کہا تھا کہ وہ اس لابی کی کمر توڑ دیں۔ گولڈمین نے انتظامیہ کو کہا کہ وہ ثابت قدمی سے یہودیوں کے منظم دباؤ کا ڈٹ کر مقابلہ کریں جیسے کہ کئی دوسری انتظامیہ نے کیا ہے۔ جب تک ایسا نہ ہو گا صدر کارٹر کا مشرق وسطی تصفیہ کا منصوبہ قبل از پیدائش مرگ کا شکار ہو گا۔ اس کے یہ الفاظ الہامی ثابت ہوئے۔ صدر کارٹر کا جامع تصفیہ پلان اسرائیل اور اس کی امریکی لابی کی ہٹ دھرمی کے آگے ڈھیر ہو گیا۔

گولڈمین کی وفات سے صرف چار یوم پہلے ستمبر ۱۹۸۲ء میں صدر رونالڈ ریگن نے مشرق وسطی میں ایک جامع تصفیہ کی تجویز کو از سر نو زندہ کیا۔ اسرائیل میں سرکاری تدفین عمل میں آئی۔ جب اس عظیم صیہونی لیڈر کو Mount Herzl (اسرائیل) پر World Zionist Organs. کے پانچ سابقہ صدور کے پہلو میں دفن کیا جا رہا تھا تو انتظار میں کھڑے Klutznick' اسرائیلی لیبر پارٹی لیڈر Yitzhak Rabin, Shimon Peres اور دیگر لیڈروں کے درمیان موضوع گفتگو ریگن پلان تھا جسے وزیر اعظم بیگن پیشتر ازیں ہی مسترد کر چکا تھا۔

اسرائیلی حکومت کا گولڈمین کی موت پر ردّ عمل یہودیوں کا اس کی زندگی کے بارے میں احساس کا عکاس تھا۔ بیگن نے تدفین کی اجازت تو دے دی لیکن خود شرکت کی نہ کی۔ ایک ایسے شخص کے بارے میں جو اسرائیل کو وجود میں لانے اور اسے طاقتور بنانے کا بڑی حد تک ذمہ دار تھا۔ ایک نہایت ہی کھوکھلے قسم کا تبصرہ کرتے ہوئے قائم مقام وزیر اعظم Simcha Ehrlich نے صرف اتنا کہا کہ ہمیں افسوس ہے کہ اتنی خوبیوں اور اہلیتوں والا انسان غلط راستہ پر چلا گیا۔

اسرائیل کے عظیم مجاہدوں میں سے ایک کے لئے یہ بڑا عبرت ناک مرثیہ تھا۔

"میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو"

صبح 7.45 کا عمل ہو گا جب شکاگو کے مرکزی علاقے میں بلند و بالا John Han-Cock

Bldg. میں زندگی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ چالیسویں منزل پر Philip Klutznick کے دفاتر تھے...... اٹارنی' ڈویلپر' سابقہ سکریٹری تجارت ریاستہائے متحدہ امریکہ اور B'ani B'rith کا President Emeritus آرگنائیزر اور سابقہ چیئرمین برائے Conference of Presidents of Major Jewish Organisation عالمی یہودی کانگریس کا President Emeritus' اس وقت صرف Philip کام میں مصروف تھا۔ وہ اپنے وسیع و عریض دفتر کے ایک سرے پر صوفہ پر دراز فون کر رہا تھا۔ اس کی پشت پر سڑک کے پار اس کا گھر تھا' دیواروں پر ان سات امریکی صدور کی تصاویر آویزاں تھی جن کے ماتحت وہ کام کر چکا تھا۔ ۱۹۸۳ء کا موسم خزاں تھا۔ صبح وہ اشرف غربال سے بات کر رہا تھا جو کہ امریکہ میں مصر کا سفیر اور سالوں پرانا دوست تھا۔ غربال اپنے لیڈر حسنی مبارک کی امریکہ یاترا کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے ملاقات کے لیے موزوں شخصیات دستیاب ہوں۔ ان موزوں اشخاص میں فلپ شامل تھا۔

فلپ کا بھرپور سراپا اور کام کی انتھک رفتار اس کے ۷۶ سالہ ہونے کی غماز نہ تھی۔ اس کا تقریباً خالی دفتر اس کی آواز سے گونج رہا تھا۔ آنکھیں موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے مسکرا رہی تھیں اور اس کا مضبوط' پراعتماد رویہ بالکل نوجوانوں جیسا تھا' لیکن امریکی یہودیوں کے بارے میں لچکدار رویہ اس کے ۶۰ سالہ رفاقت کار (اندرونی اور بیرونی) تجربہ کی نفی کرتا تھا۔ ایک ملاقاتی اس کے سات کافی پیتے اور بات چیت کرتے' کبھی یہ اندازہ نہ لگا سکے گا کہ یہ شخص جس کی استقامت اور جذبہ نے اسرائیل کو قیام میں امداد دی' جو ان کے ہتھیار فراہم کرتا اور اخراجات ادا کرتا ہے...... بہت سے یہودیوں کی نگاہ میں اب فالتو اور بیکار محض شے ہو چکا ہے۔

اس نے جو عہدے سنبھالے اور یہودی نظامت کی جو خدمات سرانجام دیں اگر ان کو دیکھا جائے تو آپ اس پر حرف گیری نہیں کر سکتے۔ لیکن یہودی لیڈروں کی ایک بہت بڑی تعداد کی نظروں میں وہ ایک ناقابل معافی گناہ کا ارتکاب کر چکا ہے۔ یعنی "کھلے عام اسرائیلی حکومت کی پالیسی کو چیلنج کرنا" اس نے اسے انہی یہودی تنظیموں کے خلاف کھڑا کر دیا جس کو قائم کرنے میں اس کا اس قدر حصہ تھا۔

اس کی گفتگو سے وہ اعتماد جھلکتا تھا جو تجارت میں کامیابی' ڈیموکریٹک اور ریپبلکن دونوں انتظامیہ میں عوامی آفس پر فائز رہنا اور یہودی کمیونٹی میں اونچے درجے کی عزت رکھنا جیسے عناصر کی

وجہ سے ہے۔ Great Depression (۱۹۲۹-۳۰ء کے لگ بھگ) میں اپنی تمام بچت کو ٹھکانے لگتے دیکھنے کے بعد اس نے سنبھالا لیا اور آخر کار ایک کامیاب ڈیویلپر 'لکھ پتی' یہودی قوم کا لیڈر اور سفارت کار بنا۔

شروع کے سالوں میں اس نے یہودیوں میں قوت اور اتحاد پیدا کرنے کے لیے کام کیا۔ یہ کام ۱۹۴۲ء میں اور بھی زیادہ اہم ہو گیا جب یہ پتہ چلا کہ ہٹلر انتہائی ظالمانہ طریقہ سے یورپی یہودیوں کا صفایا کرنے کے درپے تھا۔ Pittsburgh میں B'nai B'rith کے صدر Henry Monsky (Omaha کا ایک وکیل تھا) نے اکتالیس یہودی تنظیموں کو میٹنگ کی دعوت دی۔ یہ اجتماع جسے "امریکن جیوش کانفرنس" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ امریکی یہودیوں کی پہلی سنجیدہ کوشش کہا جاتا ہے جس نے انہیں Holocaust کے خلاف متحد کیا۔

Klutznick نے ہنستے ہوئے کہا "تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہم لوگ ایک غیر معمولی گروپ ہیں۔ ہم ہر چیز پر جھگڑتے ہیں۔" اس مرتبہ جھگڑا اس بات پر تھا کہ یہودی اپنا ایک قومی وطن قائم کریں یا نہیں۔ صیہونیت کے اولیں علمبرداروں میں سے یہودی اپنا ایک قومی وطن قائم کریں یا نہیں۔ صیہونیت کے اولیں علمبرداروں میں سے ایک یعنی Monsky جو کہ B'nai B'rith کا صدر بھی رہ چکا تھا' اس بارے میں اپنی تنظیم کو غیر جانبداری سے حمایت کی طرف کھینچ لایا تھا۔ جب یہ کانفرنس ۱۹۴۳ء میں منعقد ہوئی اور صیہونیت کے حق میں اپنا فیصلہ دیا تو یہودی تنظیموں میں سے دو سب سے بڑی یعنی AJC اور JLC نے بطور احتجاج واک آؤٹ کیا تھا۔ بہر حال یہ تحریک چار سال تک زندہ رہی' اس میں وہ پہلی مرتبہ گولڈمین سے ملا۔

Klutznick اور گولڈمین یہ چاہتے تھے کہ AJC کو دوامی حیثیت دی جائے' اس کے لیے Klutznick نے B'nai B'rith کی حمایت حاصل کرنے کی سر توڑ کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

دس سال بعد جب Klutznick خود B'nai B'rith کا صدر بنا تو زخم ابھی مندمل نہ ہوئے تھے۔ اس کے پہلے ہی فیصلہ سے گولڈمین کے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ Klutznick امریکن جیوش کانگریس کے احیاء میں اس کی مدد کرے جبکہ Klutznick کے خیال میں ایسا کرنا تفریق پیدا کرنا تھا۔ اس نے کہا: "میں نے اس وقت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے اس وقت کوشش کی تو B'nai B'rith اوپر سے لے کر نیچے تک دو حصوں میں منقسم

ہو جائے گی۔ یہ اس وقت بہت ہی کمزور ہے۔ میں ان لوگوں کو متحد رکھنا چاہتا ہوں۔

Klutznick نے اسے کہا کہ وہ ''یہودی قومی وطن'' کے پروگرام کے بارے میں ''آخری حد تک'' ساتھ دے گا لیکن اس کے ذہن میں امریکی یہودیوں کے ربط و ضبط بڑھانے کے لیے ایک بہتر تجویز موجود ہے۔ یعنی ایک ایسی تنظیم جو صرف تمام یہودی تنظیموں کے صدور پر مشتمل ہو۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ لیڈروں کو آپس میں ایک دوسرے سے واقف ہونا چاہیے۔ ان میں سے کئی ان اونچے عہدوں پر پہنچ چکنے کے باوجود دوسری تنظیموں کے صدور سے ملے نہ تھے۔ اس نے گولڈمین کو کہا: ''اگر ہم واقعی کچھ کرنا چاہتے ہیں تو یہ صدور قوت کا خزینہ ہیں۔'' گولڈمین مان گیا۔

Klutznick نے تبدیلیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا: ''حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۵۰ء میں لوگ اس قدر شدت پسند نہ تھے جتنے کہ آج کل''۔ مثلاً اس نے Eisenhower Doctrine کا حوالہ دیا کہ اگر مشرق وسطیٰ کے کسی بھی ملک کو بین الاقوامی کمیونزم سے خطرہ ہوا تو امریکہ اس کی مدد کو آئے گا۔ اسرائیلی وزیر اعظم David Ben Gurion نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ اس قدر وسیع ذمہ داری سے تو امریکہ کو اسرائیل کے کسی دشمن ملک کی بھی مدد کرنی پڑ جائے گی۔ The Conference of Presidents of Major Jewish Organisations نے امریکی نکتہ نظر کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا۔

Klutznick نے اس مقابلے کو یاد کرتے ہوئے کہا: ''میں اس میٹنگ میں صدارت کر رہا تھا ہم نے یہ پوزیشن اختیار کی کہ ہمیں امریکہ کے صدر کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی ہم نے کی۔ ان دنوں ہم ایسا بحث و مباحثہ کر سکتے تھے کیونکہ باہمی رواداری موجود تھی۔''

اسرائیلی اہل کاروں کے ساتھ معاملہ کبھی کبھار Klutznick کی رواداری کا امتحان بن جاتا۔ ۱۹۵۵ء میں غازہ کے حملے کے دوران عرب شہریوں کے قتل عام پر امریکہ ہیبت زدہ رہ گیا تھا اور Klutznick نے بحیثیت صدر B'nai B'rith یہ ردّعمل یروشلم پہنچایا۔ اس نے اسرائیلی وزیر اعظم Moshe Sharett کو بتلایا کہ ''موشے! یہ بہت ہولناک تھا۔ یہ تو کوئی اسرائیل کے دفاع میں کاروائی نہ تھی۔ یہ احساس سب پر حاوی تھا' یہ تو انسانی زندگی کو حقیر سمجھنا تھا!''

کچھ توقف کے بعد وزیر اعظم نے جواباً کہا: ''فل! میری مانو تو مجھے یہ ہرگز علم نہ تھا کہ ایسا ہو رہا ہے۔ یہ اس (ڈیوڈ بن گوریان -- وزیر دفاع) نے اپنی طرف سے کیا۔ مجھے امید ہے کہ تم

اسے بھی یہ بتلادو گے جو تم نے مجھ سے کہا ہے۔"...اگلے دن Klutznick بن گوریان سے ملا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے پوچھا: "فل! غازہ پر حملہ کے بارے میں کیا تاثرات تھے؟" یہ عین وہی سوال تھا جو Sharett نے پوچھا تھا اور میرا جواب بھی ہو بہو وہی تھا Klutznick بن گوریان کے ردّ عمل پر ہکابکا رہ گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ بائبل کے ناراض پیغمبر جیسا نظر آیا:

"میں کسی کو بھی، چاہے وہ امریکی یہودی ہو یا کوئی بھی اور، کبھی یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ مجھے بتلائے کہ مجھے اپنی قوم کی سلامتی کے لیے کیا کرنا ہے۔"

جب وزیر اعظم اٹھ کھڑا ہوا تو Klutznick بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ بن گوریان نے پوچھا کہ آپ کیوں اٹھ کھڑے ہوئے؟ Klutznick نے جواب دیا کہ "صاف ظاہر ہے کہ میں نے آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ میرا خیال ہے ہمارا تبادلہ خیال اب ختم ہوا۔" بن گوریان بولا: "بیٹھو! چلیئے ہم کسی اور موضوع پر بات کریں۔" Klutznick نے یاد ماضی کرتے کہا: "یہ اسی طرح ہوا، خدایا میری مدد فرما! یہ عین اسی طرح ہوا اور ہماری گفتگو بہت شاندار رہی۔" اس کا کہنا تھا کہ بن گوریان تو بیگن جتنا یا اس سے بھی زیادہ سخت گیر ہو سکتا تھا، لیکن اپنا نکتہ نظر واضح کر دینے کے بعد وہ دوبارہ "دوستی" کی طرف واپس ہو سکتا تھا۔

برسوں بعد وزیر اعظم بیگن کے ساتھ بھی Klutznick کو ایسا ہی تجربہ پیش آیا۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کے معاً بعد صدر کارٹر نے Klutznick اور سات دیگر یہودی راہنماؤں کو مدعو کیا۔ صدر نے کہا: "بھئی دیکھئے! مجھے کچھ مدد درکار ہے...... میرا خیال ہے کہ میں (مصری صدر) سادات کو سنبھال سکتا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں لیکن مجھے یہ یقین نہیں کہ میں (وزیر اعظم) بیگن کو قائل کرسکوں گا۔" گروپ میں سے ایک نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا "جناب صدر! اسرائیل اس لئے پریشان ہے کہ کچھ عرب ممالک کو ہتھیار بھجوائے جا رہے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ایسا ایک مسودہ قانون غور و خوض کے لیے پیش کیا جا چکا ہے۔" تب ایک دوسرے نے کہا: "کیا آپ اسرائیل کے لیے کوئی مزید آسانی پیدا نہیں کر سکتے؟" بیشتر شرکاء نے یہی اسلوب اختیار کیا۔

Klutznick نے کارٹر کی جھلاہٹ کو بھانپ کر صلح جوئی کا رویہ اختیار کیا:

"جناب صدر! ہم پوری طرح آپ کی بات نہیں سمجھے۔ ہتھیاروں کے لیے بہت سی درخواستیں ہیں۔ اگر مجھے اجازت دیں تو میں عرض کروں گا کہ میرے ساتھی یہ کہنے کی

کوشش کر رہے ہیں کہ کیا کوئی ایسا طریقہ ممکن نہیں کہ ان درخواستوں کو مذاکرات کے مکمل ہو جانے تک مؤخر کر دیا جائے۔ میرے خیال میں ہمیں اپنے محدود علم کی بناء پر آپ کو یہ بتلانے کا حق نہیں کہ کس کو ہتھیار ملیں اور کسے نہ ملیں۔" اس کا مزید کہنا تھا کہ "اگر کیمپ ڈیوڈ مذاکرات کے دوران ہتھیاروں کی فروخت کا سوال اٹھا تو صدر کا جواب ہر صورت میں مشکل ہوگا اور میں یہاں سوائے آپ کے کسی بھی اور کی نمائندگی نہیں کر رہا۔ جناب صدر! ہمارے ملک کو جہاں تک ممکن ہو آپ کی حمایت کرنی چاہیے۔"

Klutznick کے ان خیالات نے بحث کو دوبارہ صحیح رخ کی طرف موڑ دیا جیسا کہ صدر کارٹر چاہتے تھے۔ لیکن دوسرے ہی دن اسرائیل میں اس کو بطور خبر توڑ مروڑ کر شائع کیا گیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ Klutznick نے صدر کارٹر کو بتلایا تھا کہ وہ اس وہائیٹ ہاؤس میٹنگ میں بطور مصر کے نمائندے کے شرکت کر رہا تھا نہ کہ اسرائیل کے۔ اس نے ہرگز ایسا کچھ نہ کہا تھا اور بیگن کو تار بھیج کر اس کی تردید کی۔ اگلے دن جب رپورٹروں نے اس واقعہ کے بارے میں پوچھا تو بیگن کا جواب تھا: "مجھے ورلڈ کانگریس کے صدر Klutznick کی جانب سے ایک تار موصول ہوا ہے۔ اس نے ایسے کسی بیان دینے کی تردید کی ہے۔ بس معاملہ ختم۔"

لیکن معاملہ یہیں ختم نہ ہوا۔ Klutznick چند روز بعد پیشتر سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اسرائیل پہنچا' ان میں بیگن سے ملاقات بھی طے تھی۔ Klutznick نے اس سرد مہری والی ملاقات کا حال یاد کرتے ہوئے کہا کہ یہ پہلا موقعہ تھا کہ بیگن نے بغیر کھڑے ہوئے اور معانقہ کیئے میرا استقبال کیا۔ پہلے Klutznick مخاطب ہوا: "Menachem! سنو' مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو حالانکہ تم سے خفا ہونے کا حق میرا ہے۔ جب تم نے پریس والوں کو بتلایا کہ تمہیں میرا تار مل گیا ہے اور میں نے تردید کی ہے اور بس معاملہ ختم' کیا یہ ٹھیک بات تھی؟ ہرگز نہیں' اگر کوئی آپ کے بارے میں مجھے اسی طرح کی بات کہتا تو میرا جواب ہوتا "مجھے وزیر اعظم کی طرف سے تار ملی ہے۔ وزیر اعظم اس کی تردید کرتے ہیں اور میں چونکہ وزیر اعظم کو عرصہ دراز سے جانتا ہوں لہٰذا ان کا کہنا میرے لئے کافی ہے۔"

Begin نے اپنے معاون کو کہا "ذرا وہ تار لانا۔" اس نے امریکہ میں اپنے اسرائیلی سفیر کی تار پڑھ کر سنائی جس میں صدر کارٹر کو جو کچھ Klutznick نے کہا تھا وہ غلط طور پر درج تھا۔ بیگن

نے پوچھا "میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟" Klutznick نے جواباً کہا "میں سفیر کو برطرف کر دیتا۔ وہ اس تار میں Phil Klutznick کے بارے میں نہیں لکھ رہا تھا۔ وہ ورلڈ جیوش کانگریس کے صدر کے بارے میں لکھ رہا تھا۔ اگر اس تک کوئی ایسی بات پہنچی تھی تو اس کا پہلا فرض یہ تھا کہ وہ مجھے مطلع کرتا نہ کہ آپ کو۔ اس نے مجھ سے تو رابطہ کیا ہی نہیں۔" بیگن فرط جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے ملاقاتی سے اٹھ کر بغل گیر ہو گیا۔

ایسی گرم جوشی کے اظہار کے بعد بھی Klutznick نے بیگن کی بعد ازاں والی پالیسیوں پر نکتہ چینی جاری رکھی۔ وہ اپنی سفارشات کہ امریکی حکومت کو کیا کرنا چاہئے' پیش کرتا رہا۔

۱۹۸۱ء میں اس نے عراق کی جوہری تنصیبات اور پھر لبنان میں اسرائیلی فضائی حملوں کی مذمت کی' اسی سال کے اواخر میں اس نے چند امریکی سفارتی ماہرین کے ہمراہ مشرق وسطیٰ کا دورہ کیا۔ واپسی پر Klutznick نے اس گروپ کے نتائج کو صحیح قرار دیا کہ صرف کیمپ ڈیوڈ سمجھوتہ ہی کافی نہیں۔ .P.L.O کو بھی مذاکرات میں شامل کرنا چاہئے۔

اسی سال کے آخر میں جب سعودی عرب نے اپنا آٹھ نکاتی امن پلان پیش کیا تو Klutznick ٹس سے مس نہ ہوا۔ ۱۹۸۲ء کے وسط میں Klutznick نے لاس اینجلیز ٹائمز اور دوسرے بڑے اخبارات میں لکھا کہ:

> "یہ ریگن انتظامیہ کا کام ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ کی حقیقتوں کا اسی پامردی سے سامنا کرے جیسے کہ کارٹر انتظامیہ نے کیا تھا۔ پہلا قدم تو یہی ہے کہ لبنان میں جاری جھگڑا ختم کر دیا جائے اور اسرائیلی فوجوں کا انخلاء عمل میں آئے۔ اس کے بعد امن کا عمل شروع کیا جانا چاہئے جس میں سبھی فریقین بمع فلسطینیوں کے حصہ لیں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ امریکہ بغیر کوئی معذرت پیش کئے اور ثابت قدمی سے اپنے بہترین مفاد میں کام کر سکے۔ اسرائیل کے طویل مدتی مفاد کو بڑھاوا دے سکے اور عالمی امن محفوظ رکھ سکے۔"

ان اعلانات کے بارے میں امریکن یہودی راہنماؤں کے عوامی مذمت کرنے کے باوجود Klutznick کو ذاتی طور پر تعریف بھی ملی۔ اس کا کہنا تھا کہ "جب میں نے عراقی حملے کی مخالفت کی تو مجھے یہودیوں کے چار گنا خطوط حمایت میں ملے بہ نسبت مخالفت میں۔ اور .P.L.O سے براہِ راست بات چیت کی تجویز پر انہوں نے بہ نسبت مخالفت کے تین گنا حمایت کی۔ بقول اس کے کچھ

حمایت کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہودیوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو مجھے غلطی پر جانتے ہوئے بھی میری حمایت کریں گے۔

بیشتر دوسروں نے بھی اس کو غلطی پر جانا اور اسی طرح کہا۔ شکاگو میں اینٹی ڈی فیمیشن لیگ کے Mid-west کے ڈائریکٹر نے P.L.O. کو امن مذاکرات میں لانے اور فلسطینیوں کے لیے ریاست قائم کرنے کے منصوبے کو "دیوانے کا خواب" قرار دیا۔ شکاگو سن ٹائمز جریدے میں اس نے لابی کی یہ تھکی ہوئی دلیل دہرائی کہ موجودہ سیاسی حالات میں اسرائیل اور اردن کے متصل ایک اور الگ فلسطینی ریاست تو روس کو مزید پاؤں جمانے کا اڈہ فراہم کرے گی۔

جیوش یونائیٹڈ فنڈ' میٹرو پولیٹن شکاگو کی پبلک افیئرز کمیٹی (PAC) کے چیئرمین Robert Schrayer نے بھی احتجاج میں حصہ لیتے ہوئے ایک "در فنطنی" چھوڑی: "کیونکہ ایک آزاد خود مختار ریاست اپنی ہی تباہی پر مذاکرات نہیں کرسکتی' اس لئے اسرائیل پر P.L.O. سے مذاکرات کے لیے دباؤ نہ ڈالنا چاہیے۔"

AIPAC کے ایک ہفتہ وار "نیوز لیٹر" میں Klutznick کے نظریات کے خلاف اداریے لکھے گئے۔ اس پر ایک "جھوٹی کہانی" پھیلانے کا الزام دہرایا گیا کہ وہ فلسطینیوں کو اسی طرح عربوں میں خاص اور الگ قوم کہتا ہے جیسے کہ یہودی دوسری عالمی جنگ کے بعد مغرب میں تھے۔

اگلے سال Klutznick اپنی جدوجہد کو پیرس لے گیا جہاں وہ اپنے پرانے اور بیمار ساتھی Nahum Goldman اور Pierre Mendes France (ایک یہودی جو فرانس کا سابقہ وزیر اعظم تھا) کے ساتھ متحد ہوگیا تاکہ یہ سب مل کر اسرائیل کو لبنان میں جنگ ختم کرنے پر آمادہ کریں۔

Klutznick ورلڈ جیوش کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لیے پیرس گیا تھا۔ اس کے وہاں پہنچتے ہی گولڈ مین نے اسے کہا "ہمیں دنیا کے پچاس ممتاز ترین یہودیوں سے ایک اعلامیہ پر دستخط کرانے ہیں جس میں لبنان کی جنگ بند کرانے کو کہا جائے۔" گولڈمین ان دونوں پیرس میں رہ رہا تھا اور شدید بیمار تھا۔" Klutznick نے جواباً کہا "لیکن پہلے ہم یہ تو دیکھ لیں کہ آیا ہم بیان تیار بھی کر سکتے ہیں۔" گولڈمین راضی ہوگیا اور اگلے دن لنچ پر Mendes, France نے "Le Monde" کے نامہ نگار Ericrouleau اور اس کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کی۔ یہ طے پایا کہ اعلامیے کا متن اگلے دن لنچ پر زیر بحث آئے گا۔

اسی شب Klutznick نے اپنے مددگار Mark Brozonsky کے ساتھ مل کر ایک مختصر بیان لکھا جو اگلے دن بحث کی بنیاد بنا۔ اس کا حاصل بہت زوردار تھا:

"اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ فلسطینیوں کو ان کے حقوق ملنے چاہئیں بلکہ یہ ہے کہ یہ مقصد کیسے حاصل کیا جائے کہ علاقائی توازن قائم رہے اور اسرائیل کی سیکورٹی یقینی رہے۔ مبہم تصورات مثلاً حکومت خود اختیاری اب کافی نہیں ہے کیونکہ یہ اکثر الجھانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں نہ کہ سلجھانے کے لیے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اسرائیل اور فلسطین وطنیت کے مابین سیاسی مفاہمت طے پا جائے۔

لبنان کی جنگ کو ختم ہونا چاہیے۔ اسرائیل کو بیروت کا محاصرہ اٹھا لینا چاہیے تاکہ P.L.O. کے ساتھ مذاکرات کیے جاسکیں اور کوئی سمجھوتہ ہو سکے۔ ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرنے پر پورا زور دیا جانا چاہیے۔ اسرائیلی اور فلسطینی عوام کے درمیان حق خود اختیاری کی بنیاد پر بقائے باہمی (Co-existance) تسلیم کرنے کے لیے گفت و شنید ہونی چاہیے۔"

جب یہ تیاری ہو گئی تو Klutznick نے کہا "اب اس کا کیا کیا جائے؟" تو گولڈمین کہنے لگا کہ "اب دوسروں کو ڈھونڈنے کا کام رہ گیا۔ جاؤ گھیر کر لاؤ۔" Klutznick نے کہا کہ اس بات کا وقت نہیں رہا۔ میرا مشورہ ہے کہ یہ آپ اور Mendes France اپنے ناموں سے جاری کر دیں۔ سابقہ وزیر اعظم کہنے لگا "میں نے تو کبھی ایسا نہیں کیا۔ میں دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر اعلامیے دستخط نہیں کرتا۔" گولڈمین اور Rouleau نے شہہ دی اور آخر کار Mendes France نے کہا "اگر آپ یاسر عرفات سے فوراً جواب حاصل کر لیں تو میں دستخط کر دوں گا۔"

"عرفات کا ایک قریبی ساتھی Isam Sartawi اس وقت پیرس میں موجود تھا۔ اس نے P.L.O. لیڈر سے یہ جواب حاصل کر کے دیا "تین عظیم یہودی شخصیات جن کی دنیا بھر میں عزت ہے اور ہر سطح پر ان کا خاص اثر و نفوذ ہے۔ بین الاقوامی سطح پر بھی اور اپنی قوم میں بھی۔ ان کا عین اس وقت ایسا بیان جاری کرنا خاصی اہمیت رکھتا ہے۔"

Klutznick نے ورلڈ جیوش کانگریس کے پیرس میں جاری اجلاس کے منبر پر آ کر اس اعلامیہ کی وضاحت کی۔ ماحول کافی کشیدہ تھا' بقول اس کے:

"گرما گری صحیح لفظ نہیں ہے۔ اگر گرما گری ہی ہوتی تو بہتر تھا۔ ماحول آزردہ' سنجیدہ اور

ترش تھا۔ میں نے کوشش کی کہ مندوبین کو سمجھا سکوں کہ ہم کیوں اس طرح کہہ رہے ہیں؟ انہیں بتلایا کہ یہ Mendes France کا اولین اس قسم کا اعلامیہ ہے جو اس نے دستخط کیا ہے۔ یہ بھی بتلایا کہ Nahum Goldman وہی کہتا ہے جسے وہ حق سمجھتا ہے۔ اسے ایک مرتبہ ہی سرزنش نہیں ہوئی بلکہ کئی مرتبہ ہوئی ماضی میں۔ لیکن پھر انہی لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی۔"

اس اعلان کا دنیا بھر میں بہت چرچا ہوا۔ اخبارات میں شہ سرخیاں لگیں اور کچھ ادارتی تعریفیں بھی ہوئیں لیکن یہودی لیڈروں میں اس کی پذیرائی نہ ہوئی اور اکثر یہودی تنظیموں نے اسے نامنظور کر دیا۔ انہوں نے اسے "غیر نمائندہ اور غیر سود مند" قرار دیا۔ یہ گولڈمین کا آخری عوامی اعلان تھا۔ مہینہ بھر کے اندر وہ وفات پا چکا تھا اور اگلے ہی ماہ Mendes France بھی رحلت کر گیا۔

چند ایک یہودیوں نے Klutznick کو اس اعلامیے کے دفاع میں امداد دی۔ کینیڈی انتظامیہ کے ایک ممتاز سابقہ اہلکار شکاگو کے یہودی N. Minow Newton نے Klutznick کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ "اس نے اسرائیل اور یہودی مقاصد کی عمر بھر مثالی خدمت کی تھی" اور ہمیشہ "بامقصد نکتہ چینی" کی۔ یہ شکاگو کے Sun-times میں ایک کالم شائع ہوا۔ "بطور ایک امریکی یہودی کے اپنے ماضی کی فاش غلطیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم امریکی یہودیوں نے پچھلے چند سالوں میں یہ بہت فاش غلطی کی ہے کہ اسرائیلی حکومت کی پالیسیوں کے ساتھ اختلاف رکھتے ہوئے بھی خاموش رہنے کو ترجیح دیتے رہے۔"

پیرس میں اعلامیہ کے تھوڑے عرصہ بعد بیروت کے فلسطینی کیمپوں یعنی صابرہ اور شطیلہ میں ہزاروں شہریوں کے قتل عام کے ہولناک مناظر دنیا کو دیکھنے کو ملے۔

چار ماہ کی خاموشی کے بعد فروری ۱۹۸۳ء میں نیویارک کے ایک لنچ میں تقریر کرتے ہوئے Klutznick نے ایک نیا صلیبی حملہ شروع کیا کہ یہودیوں کو اختلاف رائے کا حق ملنا چاہیے۔ بقول اس کے یہودیوں کی اصل قوت اپنے مقاصد پر ایمان اور حق کی راہ میں لڑائی چاہے وہ آپس میں ہی کیوں نہ ہو' میں ہی پوشیدہ تھی۔

نومبر میں Klutznick نے یہ تنازعہ یروشلم تک پہنچا دیا۔ وہ چالیس دوسرے یہودیوں کے ساتھ "انٹرنیشنل سنٹر فار پیس" کی چار روزہ میٹنگ میں شرکت کے لئے آیا تھا۔ یہ لوگ امریکہ کے

علاوہ پندرہ دیگر ممالک سے آ رہے تھے۔ جب Klutznick نے یہ کہا کہ "جب آپ ہمیں اسرائیل کی تعریف کرتے سنتے ہیں تو پھر اسرائیل کی تنقید کرتے بھی سننا ہو گا' بصورت دیگر ہمارا اعتبار جاتا رہے گا۔ اور امریکی حکومت ہماری بات پر قطعاً کان نہیں دھرے گی۔" تو حاضرین سے تحسین ملی۔ ان میں کئی اسرائیلی بھی شامل تھے۔

اسرائیل کے ساتھ مصدقہ وابستگی' یہودیوں کی راہنمائی اور مسلمہ راست بازی کے باوجود Klutznick کو اپنے انتظامی ہم عصروں میں کوئی پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔ اس کی کہیں شنوائی نہیں' یہودی فرقے میں کوئی حیثیت نہیں۔ وہ اسے یہودی قوم کا دشمن گردانتے ہیں۔ جیوش نیشنل فنڈ کا ایک ایگزیکٹو جو گیارہ سال تک فنڈ جمع کرتا رہا۔ یعنی Charles Fish bein اس سلوک کی ایک جزوی سی تشریح کرتا ہے:

> "جب تم یہودی فرقے میں بغیر کوئی مناسب Forum بتائے بے لاگ بات کرو گے تو تمہیں کھڈے لائن لگا دیا جائے گا۔ تمہیں یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے گا کہ تم "بک چکے" ہو۔ یہ ہے تو نامعقول بات لیکن بیحد مؤثر ہے۔ جن یہودی رہبروں کی بات آپ کو سنائی دیتی ہے وہ صرف وہی ہیں جو بہت دولت مند سخی ہیں۔ کچھ لوگ یہودی مقاصد میں رقم سرمایہ کاری کے نکتہ نظر سے لگاتے ہیں تاکہ عمدہ تجارت ہو اور معاشرتی تعلقات فروغ پائیں۔ ایسے لوگ Klutznick جیسے غیر مقلد کے حق میں آواز نہیں اٹھا سکتے کہ مبادا ان کی سرمایہ کاری ڈوب جائے۔"

Klutznick کے اپنے خیالات بھی اسی کی باز گشت ہیں: "سمجھنے کی کوشش تو کرو' ان کے نکتہ نظر سے دیکھو۔ وہ کیوں کھلے عام آواز بلند کریں؟ وہ کوئی مصیبت سمیٹنا نہیں چاہتے۔ وہ فرقے کا ایک حصہ ہیں' ان کے ہمسائے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں' چندہ دیتے ہیں۔" وہ مزید کہتا ہے: "ان کی کچھ حیثیت ہے اور وہ اسے برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔" وہ مجھے کہتے ہیں: "تم بالکل حق پر ہو لیکن ہم یہ نہیں کر سکتے۔ ہم آپ کی طرح آواز نہیں اٹھا سکتے۔" کچھ وقفہ کے بعد وہ بولا:

"شاید میں بھی ایسا ہی ہوتا' اگر یہودی فرقہ نے مجھے اس اس قدر اعزازات سے نہ نوازا ہوتا۔"

اس کی نظر میں واشنگٹن کی پالیسی ہی اس لابی کے حربوں میں اصلاح کے لیے سب سے بڑا روڑہ ہے۔ "ہماری اپنی حکومت جو نقصان پہنچا رہی ہے ہمیں اس کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ ہماری

حکومت مدت سے اسرائیل کو سادہ چیک دیتی چلی آ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیگن یہاں دورہ کرنے آتا ہے اور واپس جا کر کہتا ہے' آپ کس بات کی شکایت کر رہے ہو؟ میں جب امریکہ جاتا ہوں تو وہاں حکومت میری حمایت کرتی ہے اور یہودی فرقے کے سبھی لیڈر میری تعریف کرتے اور حمایت کا دم بھرتے ہیں۔

ہماری آزاد خیال روایت میں بڑھتی ہوئی خلیج

امریکہ کے ایک معزز ترین یہودی صحافی I.F. Stone جو اپنے آپ کو انقلابی کہتا ہے' کا کہنا ہے: "یہودیوں کے لیے امریکہ سب سے زیادہ سازگار رہا ہے۔" وہ اپنے جریدے I.F.Stones Weekly کے باعث مشہور تھا۔ ۱۹ سال تک اس نے یہ شائع کیا۔ اس کی آزاد خیالی کی قدر تھی۔ وہ اپنے اوپر ہنستے ہوئے کہتا ہے کہ یہ اس نے اس لئے بند کیا کہ وہ ہر ہفتے "ساری دنیا کے مسائل حل کرتے کرتے تنگ آ چکا تھا۔"

وہ ۷۶ سالہ بوڑھا جس کی نظر اس قدر کمزور ہے کہ وہ جلی حروف والی تحریر بھی نہیں پڑھ سکتا اور کچھ ہو تو ہو' ریٹائرڈ ہرگز نہیں ہے۔ وہ اب بھی ملک بھر کی یونیورسٹیوں میں بطور ہیرو دیکھا جاتا ہے اور ماسوائے مشرق وسطیٰ سبھی موضوعات پر اس کی رائے کی آزاد خیال حلقوں میں بڑی وقعت ہے۔ ان موضوعات پر اس کے بہت سے مرید ہیں۔ حال ہی میں سقراط کے مقدمہ کے بارے میں اس کا لیکچر سیریز بیحد کامیاب ہوا۔

وہ اپنی عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے جھانکتے ہوئے کہتا ہے: "اسرائیل غلط راہ پر ہے۔ یہ یہودیوں کی تاریخ کا سیاہ ترین دور ہے۔ عربوں کے ساتھ بنی آدم والا سلوک ہونا چاہئے۔ میں مستقبل کے بارے میں سخت مایوس ہوں۔" وہ کسی ایسے لیڈر کا نام نہیں لے سکتا جو اسرائیل کو تباہ کن پالیسیوں سے نکال لے جائے۔

گفتگو ان امریکی یہودیوں کے بارے میں چل پڑی جو اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ Stone نے ماضی میں جھانک کر وہ دن یاد کیا جب ایک ناشر نے اسے لنچ پر مدعو کیا اور اپنی کتاب میں سے وہ پیراگراف حذف کرنے کو کہا جس میں اسرائیلی پالیسی میں بڑی بڑی تبدیلیاں کرنے کا مشورہ درج تھا۔ اسٹون کی کتاب کا نام تھا "Underground to Palestine" اس میں اس نے زیادہ تر اپنے وہ

تجربات بیان کئے تھے جب وہ نازی کیمپ سے دوسرے یہودیوں کے ہمراہ برطانوی محاصرے سے بچتے بچاتے موجودہ اسرائیل پہنچتے تھے۔ جس حصہ پر اعتراض تھا اس میں اسٹون نے سفارش کی تھی کہ "دو قومی حل اختیار کیا جائے۔ ایک ایسا ملک جس کے دستور میں دو قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے یعنی عرب اور یہود۔" اور وہ سارے فلسطین پر محیط ہو۔ اسٹون نے یہ حذف کر دینے سے انکار کر دیا اور یوں "لنچ بلکہ ایک طرح وہ کتاب ختم ہوئی اسے گویا ممنوع قرار دے دیا گیا۔" اسٹون نے یہ New York Review of Books میں کیا۔

یہودی صحافی Carolyn Toll کے مطابق "تب سے اسٹون کو کسی بھی یہودی اجتماع میں حصہ لینے سے منع کر دیا گیا' حالانکہ وہ یہودی عبادت گاہوں کے لیکچر ٹور میں بطور ہیرو حصہ لے سکتا تھا کیونکہ وہ پہلا امریکی نامہ نگار ہوتا جو قتل عام سے بچ نکلنے والے یہودیوں کے ہمراہ شامل ہوتا۔ یہ ان لیڈروں نے کیا جو دو قومی نظریہ اور مملکت کے بارے میں بحث کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔

> "اسرائیل میں جہاں یہودی اپنی شناخت بذریعہ پیدائش حاصل کرتے ہیں نہ کہ کسی تنظیم کی ممبری سے' اسٹون ایک پکا منحرف شمار ہوتا' لیکن امریکہ میں صورت حال مختلف ہے۔ یہاں یہودی غیر یہودی اکثریت کے نظریات میں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔ یہاں پر وہی یہودی جو دوسروں کے آزادانہ رائے دینے کے حق کو شدومد سے منواتے ہیں وہ اپنے ان بے قاعدہ وفاداری کے امتحانات کے بارے میں چپ رہتے ہیں۔"

دو سال بعد اسٹون کی کتاب عبرانی زبان میں شائع ہوئی لیکن اسرائیل میں اس میں وہ پیراگراف سارے کا سارا موجود تھا۔ مشرق وسطیٰ میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ اسٹون کو گولابی کی "زیادتیوں" پر اعتراض ہے لیکن وہ ان کے محرکات کو جانتا ہے:

> "یہودی قوم خوف زدہ اور اندیشناک ہے۔ وہ مستقبل سے خوف زدہ ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ حالت جنگ میں ہیں۔ ان میں سے بیشتر یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں جنگ جاری رکھنی ہے......
> جب اقوام حالت جنگ میں ہوں تو شہری آزادیاں عام طور پر قربان کر دی جاتی ہیں۔"

بقول اسٹون ان کی آزاد خیال روایت میں ایک خطرناک دراڑ پڑ رہی ہے:

> "بہت سے امریکی دانشوروں...... یہودی اور غیر یہودی...... کی طرح مجھے بھی مقاطعے کا سامنا ہوتا ہے۔ جبکہ سودیت روس میں جو منحرفین مشرق وسطیٰ پر زبان کھولتے ہی

(یہودی اور غیر یہودی دونوں) اُن کا ہیرو کا درجہ حاصل ہے۔"

امریکہ میں البتہ ان کو اور کچھ درجہ حاصل ہو سکتا ہے سوائے ہیرو کے:

"ہمارے جیسے مشرق وسطیٰ کے بارے میں منحرفین کو امریکن پریس میں ایک لمحہ بھر ہی آواز اٹھانے کا موقعہ ملتا ہے۔ ایک ایسا امریکن ناشر تلاش کرنا جو اسرائیل کی معیاری پالیسی سے اختلاف کرنے والی کتاب شائع کرنے پر تیار ہو اتنا ہی آسان ہے جتنا ویٹیکن سٹی میں 'Osservatore Rmano' کو دہریت پر ایک خیال انگیز مضمون فروخت کرنا۔"

بقول اسٹون ہر بے لاگ رائے دینے والے کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے' جو صحافی مدت سے اسرائیلی مقاصد کی آبیاری کرتے چلے آ رہے تھے ان کو اب "Anti-Semitism" کے الزام کے تحت نفرت بھری ڈاک کے طوفان کا سامنا ہے' کیونکہ انہوں نے فلسطینی عرب پناہ گزینوں کے حق میں ایک بھی لفظ کیوں کہا؟

واشنگٹن پوسٹ کے ۱۹/ اگست ۱۹۷۹ء کے شمارے میں اسٹون نے 'بائبلی سیاست' پر فکر کا اظہار کیا۔ خاص طور پر اسرائیل کے مغربی کنارہ پر قبضہ جاری رکھنے کے جواز میں بائبل کا حوالہ دینے پر:

"ہر کسی کو معلوم ہے کہ ازمنہ وسطیٰ میں بائبل کو تالے میں رکھا گیا تھا۔ پروہتوں نے اسے عوام کی پہنچ سے باہر رکھا کہ کہیں یہ انہیں پراگندہ خیال کر کے تفرقہ یا بغاوت نہ پیدا کر دے ...... وقت آ گیا ہے کہ مقدس کتاب کو دوبارہ مقفل کر دیا جائے۔ کم از کم اس وقت تک کہ عرب اسرائیل تنازعہ طے ہو جائے۔"

"صیہونیت۔ مخالف" یہودی

دو امریکی یہودیوں یعنی Elmer Berger اور Alfred M. Iilienthal, Jr. میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ وہ شروع ہی سے صیہونیت کے خطرہ سے آگاہ کرتے رہے ہیں۔ ان کی پیشین گوئی تھی کہ یہودی مملکت بننے سے یہودیت کو شدید خطرہ لاحق ہو گا۔ انہوں نے بلاخوف و خطر اپنے آپ کو یہودی طرز فکر کی بڑی رو سے الگ تھلگ کر لیا۔ انہوں نے یہ متنازع' اکیلے پن اور یاس سے بھرا عمل اس لئے اختیار کیا کہ وہ اسرائیلی حکومت کی پالیسیوں کو تبدیل کرنے کی جدوجہد کریں۔ اسرائیل کے قیام اور اقوام عالم کی طرف سے تسلیم کئے جانے اور امداد دیئے جانے کے مدتوں

بعد تک وہ یہودی مملکتوں کے قیام کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔ دونوں کو اکثر بطور تضحیک "خود سے نفرت کرنے والے یہودی" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

Lilienthal اور Berger نے حملوں کے باوجود اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ دونوں لگاتار لیکچر ٹور کرتے، تحریریں لکھتے اور مختلف اداروں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ وہ عرب دنیا اور امریکہ بھر میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اوّل الذکر میں ان کی عزت امریکہ سے زیادہ ہے۔

دونوں کی ظاہری شخصیت میں کچھ بھی مشترک نہیں۔ Lilienthal نے وکالت سے آغاز کیا جبکہ Beger رَبّی تھا۔ Lilienthal اپنے طور طریقوں میں درشت گو اور متلون مزاج ہے۔ وہ دم بھر میں متفکر اور دھیمے پن سے وہ جارحانہ انداز میں بدل سکتا ہے لیکن اس کے برعکس Berger صبر سے بات سننے والا، خاموش طبع اور سنجیدہ مزاج رکھتا ہے۔ جب اس کے الفاظ طوفان خیز ہوں تب بھی اس کا طرزِ ادائیگی ایک شائستہ پادری والا ہوتا ہے۔

دونوں کے اپنے اپنے حلقہ سامعین تو ہیں لیکن آزاد خیال مرید کم ہی ہیں۔ Lilienthal کے نیوز لیٹر "Middle-East Perspective" کو پڑھنے والے اور اس کی سرگرمیوں کی پیروی کرنے والے تو کم ہی ہوں گے لیکن اس کی کتب امریکہ بھر میں ذاتی اور پبلک لائبریریوں میں ملیں گی۔ ان کے اقتباسات اکثر تقاریر و مضامین میں بطور حوالہ شامل ہوتے ہیں۔

رَبّی Elmer Berger کا حلقہ اور بھی چھوٹا ہے۔ بین الاقوامی سامعین تو شاذ ہی ہوں گے لیکن جو پیرو ہیں وہ وفادار لگتے ہیں۔ مئی ۱۹۸۳ء میں جب اس نے Madison Hotel واشنگٹن ڈی سی میں دو روزہ سیمینار منعقد کیا تو تقریباً ۲۰۰ شرکاء تھے۔ ان میں بیشتر صحافی، دانشور، مذہبی عالم، عوامی اہل کار اور سفارت کار تھے۔ ان سب میں دو چیزیں مشترک تھیں۔ ایک عرب اسرائیلی مناقشے میں دلچسپی اور دوسرے ایلمر کے لیے محبت کے جذبات۔

Elmer نے اپنی جدوجہد اسرائیل کے قیام کے فوراً بعد ہی ۱۹۴۸ء میں شروع کی تھی اور جب ۱۹۸۴ء میں وہ ۷۰ سال کا تھا تو یہ جاری تھی۔ میں نے اس کا انٹرویو ۱۹۸۴ء میں کیا۔ اس کے بعد اپنے ریڈرز ڈائجسٹ کے ۱۹۴۹ء کے مضمون میں بعنوان "اسرائیل کا جھنڈا میرا نہیں ہے۔" صیہونیت کے نتائج سے آگاہ کیا تھا۔ اس کی پہلی کتاب "What Price Israel?" تھی جو ۱۹۵۳ء میں چھپی۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں "There goes the Mid-East." آئی اور اس کے آٹھ

سال بعد The other side of the Coin چھپی۔

۱۹۷۸ء میں Lilienthal نے اپنا سب سے بڑا اور انتہائی جامع مقالہ "The Zionist Connection" شائع کیا۔ اس میں اس نے صیہونیت کی U.S.A. میں ترویج و ترقی اور سرگرمیوں پر توجہ مرکوز کی ہے۔ یہ ۸۷۲ صفحات پر مشتمل ایک شاندار دستاویز ہے جس میں حقائق' حوالہ جات اور دلچسپ حکایتیں درج ہیں۔

"فارن افیئرز" کے سہ ماہی مجلّہ میں اسے "Lilienthal کے صیہونیت مخالف کردار کی معراج" قرار دیا گیا۔ ۱۹۸۴ء تک اس جدوجہد کے سلسلے میں Lilienthal اسرائیل کے ۲۲ عدد اور امریکہ بھر کے ۲۶ عدد چکر لگا چکا تھا۔ اس کی ان تمام طویل اور انتھک کوششوں کے باوجود Lilienthal ایک تنہا شخص ہے۔ امریکہ میں اکثر لوگ اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں بلکہ وہ بھی جن کا جھنڈا اس نے سب سے بلند کر کے تھاما ہوا ہے۔ Lilienthal کا کہنا ہے کہ لوگ اکثر یہ کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ وہ "Man from La Manchia" ہے اور وہ بھی اپنے کردار کی مناسبت سے Don Quickxote کی نظم "Reaching for the un-Reachable Stars" کا حوالہ دے کر حاضرین کو گرما دیتا ہے۔

بقول اس کے اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ "کچھ عیسائیوں نے بھی اس مسئلہ پر بے لاگ تنقید کا حوصلہ کیا۔" ۱۹۸۲ء میں نیویارک ربیوں کے ایک گروہ نے حسب ضابطہ' حسب دستور اسے عاق کر دیا تھا۔ Lilienthal نے استہزاء حقارت سے کہا "یہ صرف خدا کا کام ہے۔ میں اب بھی پورا یہودی ہوں۔"

باب یازدہم

دریائے پوٹومیک کے ساحلوں سے ماوراء

اسرائیل نواز لابی کی امریکی رائے عامہ اور پالیسی پر اثر انداز ہونے کی کوششوں کا خاص مرکز اکثر قومی تنظیمیں' خاص طور پر وفاقی حکومت ہوتی ہے۔ لیکن یہ لابی مختلف روپ میں امریکی زندگی میں حکومتی اداروں کے باہر بھی Potomac دریا کے کنارے کنارے پھیلی ہوتی ہے۔

مقامی سیاسی لیڈروں' تجارتی اداروں' تنظیموں اور بہت سے میدانوں میں افراد تک کو ناجائز نکتہ چینی کا تجربہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مشرق وسطیٰ کی بحث میں کیوں ٹانگ اڑائی۔ "Main St." کے کئی باسیوں کو بے لاگ تنقید کی قیمت چکانا پڑی۔ عرب نژاد امریکیوں کے خلاف تعصب کی مثالیں خاص طور پر بہت تکلیف دہ ہیں۔

عرب نژاد ہونے کی تہمت

اسرائیل نواز PAC نے صرف ۱۹۸۲ء میں سینیٹ کی مختلف انتخابی مہمات میں تقریباً دس لاکھ ڈالر خرچ کئے اور کانگریس کے بہت سے ممبران AIPAC کی امداد کی قدر کرتے ہیں جو کہ ڈالروں میں گنے جانے سے ماوراء ہے۔ ان گروپوں کی سیاسی سرگرمیوں کو امریکہ میں جائز اور سیاسی عمل کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے لیکن اگر امریکی عرب انتخابی عمل میں حصہ لینا چاہیں تو ان پر دروازے بند پائے جاتے ہیں۔

۱۴/اکتوبر ۱۹۸۳ء کو W. Wilson Goode ایک سخت انتخابی معرکے میں مصروف تھا کہ وہ فلاڈلفیا کا پہلا سیاہ فام میئر بن جائے۔ وہ ایک ہر دلعزیز شخصیت تھی۔ شہر کے ہر حلقہ رائے دہندگان میں اس کی قدر تھی۔ اس نے نائم ایوب کے گھر چندہ جمع کرنے کے لئے ایک میٹنگ میں شرکت کی۔ یہ ایک مقامی تاجر تھا جس نے کئی دوستوں کو بلا رکھا تھا۔ ان میں ممتاز تعلیم دان' سائنس دان' طبی

پیشہ ور افراد اور تجارتی لیڈر شامل تھے۔ مقصد ان کو Mr. W.W. Goode سے ملوانا اور انتخاب کے لیے چندہ حاصل کرنا تھا۔

تھوڑی دیر گپ شپ کے بعد، جس دوران اسے بتلایا گیا کہ عرب نژاد لوگوں کو اکثر کیسے امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا جاتا ہے، Goode نے ہمدردی کے لہجے میں کہا کہ:

"میں پھر اعادہ کرتا ہوں اپنی قسم کا کہ میں سب لوگوں کا میئر بنوں گا۔"

ایوب اور اس کے مہمانوں نے Goode انتخابی مہم کے لیے چیک پیش کیے۔ Goode شکریہ کا اظہار کر کے رخصت ہوا۔ ان تمام چندوں کی مجموعی رقم صرف -/2,275 $ (دو ہزار دو سو پچہتر ڈالر) تھی جو کہ اس کی انتخابی مہم کے اخراجات کا معمولی سا حصہ تھی، لیکن اس کے باوجود یہ ایک گرما گرم بحث کا شاخسانہ بن کر رہی کہ عربوں کا اثر و نفوذ کتنا ہے اور اسرائیل کا اس مہم میں کیا کردار ہے۔

اس معرکے کے آخری فیصلہ کن ہفتوں میں Goode کے بڑے مخالف نے اس چندہ کو بڑھا چڑھا کر اسکینڈل بنانے کی کوشش کی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ایوب "امریکن عرب اینٹی - ڈسکرمنیشن کمیٹی" کا ریجنل منتظم تھا۔ یہ ملکی تنظیم عرب نژاد لوگوں کے خلاف امتیازی سلوک ختم کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ Goode جو کہ یہودیوں کے ایک بڑے گروپ کے ووٹوں کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگاتار اسرائیل کے بارے میں اپنی حمایت کا ان کو لگاتار یقین دہا رہا تھا۔ اس نے ایوب کے دوستوں کے چیک واپس کر دینے کا اعلان کیا۔ بقول اس کے "میں یہ یقینی بنانا چاہتا تھا کہ کوئی بھی میری اسرائیل نوازی پر انگشت نمائی نہ کر سکے۔"

یہودی ووٹر اس کی اس "تلافی مافات" پر مطمئن ہو گئے اور وہ بالآخر یہودی اثر و نفوذ سے ایک بڑے مارجن سے منتخب ہو گیا لیکن ایک فلاڈلفین یہودی کا کہنا تھا کہ:

"ہمیں Anti-Discrimination Committee کے سارے پروگرام کی حمایت کی ضرورت نہیں کہ ہم اس صدمہ اور غم کو محسوس کریں جو اس کے حمایتوں اور دوستوں کو ہوا۔ کیونکہ ان کے ایک لیڈر کے ذاتی حیثیت سے کیے گئے عمل کی کھلی کھلی بے عزتی کی گئی تھی۔ سیاسی عمل میں حصہ لینے کے دروازے صرف ان کے لیے محدود طور پر کھلے نہیں رکھنے چاہیں جو مقبول عام مسائل ہی کی حمایت کریں۔"

Wilson Goode کا قصہ ایسی ہی دوسری داستانوں کا پیشرو تھا جو سینیٹر گیری ہارٹ اور سابقہ

نائب صدر والٹر موڈیل کو اس ملک کے سب سے بڑے عہدہ کے لیے انتخابی مہم کے دوران پیش آئے۔

ان امریکی عربوں کو جو اپنے ورثہ سے رابطہ رکھنا چاہتے ہیں' غیر معمولی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ بقول انیسہ مہدی کے (بوسٹن کے ٹی وی اسٹیشن WBZ میں نیوز ایڈیٹر) امریکہ میں عرب ہونا ایک "خطرہ سے بھرپور" چیز ہے: "میں نیویارک میں پلی بڑھی جہاں میرے والد صاحب ایک سرگرم سیاسی کارکن تھے۔ اگر Deir Yassin قتل عام کی برسی کی یادگاری تقریب ہوتی تو اکثر یہ تاریخ اسرائیل کی سالگرہ پریڈ سے منطبق ہوتی۔ یہودی ففتھ ایونیو پر ہوتے اور ہم Madison Ave پر۔ "ففتھ ایونیو پر تو لاکھوں کا مجمع ہوتا لیکن میڈیسن ایونیو پر ہم شاید دس لوگ ہی ہوتے۔ قابل غور نکتہ یہ ہے کہ نیویارک میں کم از کم ایک لاکھ امریکن عرب رہتے ہیں۔ کہاں گئے وہ؟ وہ باہر آنے سے خوف زدہ تھے۔"

عرب نژاد ہونا سیاست کے علاوہ بھی کشتی کا پتھر ثابت ہو سکتا ہے۔ ادویات حیوانات کے ایک ماہر (یونیورسٹی آف میساچوسیٹس) ڈاکٹر George Faddoul بھی اس کی شہادت دیں گے۔ Dr. Faddol لبنانی الاصل ہیں لیکن وہ Maine میں پیدا ہوئے۔ انہیں کبھی بھی سیاست یا بین الاقوامی امور سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ۱۹۷۴ء میں Faddoul والتھم کے مضافاتی تجرباتی اسٹیشن پر کام کرتا تھا۔ یہ ادارہ یونیورسٹی نے ریاست کی کاشتکاری طبقہ کی امداد کے لیے قائم کیا تھا۔

جب اس کے ڈائریکٹر کا عہدہ خالی ہوا تو اس نے درخواست دینے کا سوچا۔ ۲۵ سال شاندار خدمات انجام دینے کے بعد وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ انتظامی عہدہ اس کے اسٹیشن پر کام میں ایک دلچسپ نئے پہلو کا اضافہ کرے گا۔

صرف ایک اور امیدوار سامنے آیا۔ فیکلٹی کمیٹی نے ۱۳ میں سے ۷ کی اکثریت سے Faddoul کو منتخب کیا۔ یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط کے ماتحت سادہ اکثریت درکار تھی لیکن ڈین نے اس کا تقرر نہ کیا۔ Faddoul نے خود ذاتی طور پر پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ کمیٹی کی کاروائی کے دوران اس کے عرب پس منظر کی وجہ سے اس پر کئی بہتان طرازیاں کی گئی تھیں۔ عربوں کو "فضول' بیکار" کہا گیا۔ Faddoul کے ایک ماتحت کو جو صرف بیچلر کی ڈگری رکھتا تھا' قائم مقام منتظم ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ Faddoul کو سات برس تک اپنے کیس پر زور دیتے رہنے کے بعد کہیں جا کر یہ عہدہ ملا۔

ایک اور عرب نژاد محمود. اے. ناجی عرصہ ۱۹ برس سے امریکہ میں رہ رہا تھا۔ اس کی بیوی اور تینوں بچے سبھی امریکی شہری تھے۔ شکاگو میں وہ اپنا گھر رکھتا ہے اور اس کا مفید نوکری کرنے اور بطور شہری رہنے کا اچھا ریکارڈ تھا۔ وہ نہ کبھی گرفتار ہوا اور نہ کبھی کوئی الزام لگا اس پر، لیکن اس کے باوجود امریکہ کی "Immig & Naturalisation Service" اس کو امریکہ بدر کرنا چاہتی ہے ایسا کیوں؟ اس کا راز صرف وہی جانتے ہیں لیکن ظاہر نہیں کرتے۔

اردن کا رہنے والا ناجی ۱۹۶۵ء میں ڈومنی کن ریپبلک میں بطور مستقل اقامتی کے رہ رہا تھا۔ جب امریکہ نے وہاں مداخلت کی، اسے دوسرے غیر ملکیوں کے ہمراہ دوران انخلاء امریکہ لایا گیا، تب سے وہ امریکی قوانین کے ماتحت یہاں مستقل اقامتی بننے کی تگ ودو میں مصروف ہے۔ دوسروں کی مانند ناجی کو بھی کئی انتظامی رکاوٹوں اور ناموافق فیصلوں کا سامنا ہوا لیکن اس کی ثابت قدمی ہر مرتبہ آڑے آئی اور وہ قدم بقدم یہ رکاوٹیں عبور کرتا گیا۔ آخر کار ۱۹۸۰ء کے آخر میں اس کا مستقل اقامتی بننے کا حق .I.N.S کے ڈسٹرکٹ ڈائریکٹر نے تسلیم کر لیا۔ لیکن فروری ۱۹۸۱ء میں اس کی درخواست ریجنل کمشنر نے پھر مسترد کر دی اور بنیاد ایک ایسی وجہ کو بنایا گیا جو پہلے نہیں بتائی گئی تھی "اس کو امریکہ کی سلامتی کے لیے خطرہ قرار دے کر نکل جانے کا حکم دیا گیا۔"

ناجی کو اپنے خلاف لگائے الزامات کی نوعیت کا علم نہیں ہو سکا، سوائے اس کے کہ یہ ناموافق فیصلہ "متعلقہ اور ٹھوس خفیہ معلومات پر مبنی ہے جسے قومی سلامتی کے تقاضوں کے ماتحت غیر مجاز افشاء راز سے بچانے کی ضرورت ہے۔"

کئی ہاؤس ممبران بشمول سینیٹرز چارلس پرسی اور James Abdnor اس گرہ کشائی میں ناکام رہے۔ ناجی کا اندازہ ہے کہ کئی امریکی عرب تنظیموں میں اس کی شرکت نے یہ موہوم الزامات پیدا کیے ہیں، حالانکہ نہ اسے اور نہ ہی ان میں سے کسی تنظیم کو آج تک کسی غیر قانونی اقدام یا تخریبی سرگرمی کے الزام کا سامنا ہوا ہے۔

"۸۰ سے ۸۵ فیصد...... دہشت گرد ہیں"

Detroit کے علاقے میں امریکن عربوں کو امتیازی سلوک کا براہ راست تجربہ ہے۔ جون ۱۹۸۳ء میں Detriot میں امریکی کسٹم حکام اور ہوائی کمپنیوں کے حکام کے مابین سفری سامان کے

متعلق کاروائی پر غور کرنے کے لیے ایک میٹنگ ہوئی۔ ایک سینئر کسٹم اہل کار نے کہا کہ ۸۰ سے ۸۵ فیصد عرب جو Detriot Metropolitan علاقے میں رہائش پذیر ہیں' وہ دہشت گرد ہیں اور بقیہ دہشت گردوں کے حامی۔"

یہ سخت الزام ۱۹۸۳ء میں ایک ۲۹ سالہ کینیڈین عرب کے (Heroin) ہیروئن اسمگل کرنے کی کوشش پر گفتاری کے بعد لگایا گیا۔ یہ اس کے سوٹ کیس کی نقلی تہہ میں چھپائی گئی تھی۔ وہ Detriot/Windsor سرنگ کے راستے داخل ہو رہا تھا۔ اس کے بعد ہر "عرب نما" مسافر کو روکنے اور گاڑی کی تلاشی کا انتقامی عمل شروع کر دیا گیا۔ ایک واقعہ میں ایک ۱۸ سالہ لڑکی کی مکمل جامہ تلاشی لی گئی۔

گو بعد ازاں محکمہ کسٹم نے عربوں کو دہشت گرد قرار دیئے جانے والے ریمارک کے بارے میں معافی مانگ لی لیکن ذمہ دار کسٹم اہلکار کو صرف ایک تنبیہ ہی کی گئی۔ ایک مقامی جریدہ نے یہ نسلی راگ الاپنا شروع کر دیا۔ یمن عرب ریپبلک (نارتھ یمن) کے ایک فوجی افسر کو امریکہ سے گنیں (توپیں) باہر اسمگل کرتے ہوئے گرفتار کیا گیا۔ اس کے ایک ماہ بعد ماہنامہ "Monthly Detroit" نے ایک اسٹوری جمائی:

How the Arab Came to Detriot

The Mid-East Connection.

گو اس میں ایک بھی مثال کا ذکر نہ تھا کہ کسی امریکن عرب کو کبھی گن اور ڈرگ اسمگلنگ میں پکڑا گیا ہو لیکن اس اسٹوری سے تقریباً ۲,۵۰,۰۰۰ (دو لاکھ پچاس ہزار) امریکن عربوں کو قانون شکن اور دہشت گرد گروہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

"ہم تمہیں دیوالیہ کر دیں گے"

تعصب اور دھمکیاں بہت سی مختلف شکلوں میں ہوتی ہیں اور ان کی کوئی جغرافیائی سرحدیں نہیں ہوتیں۔ شکاگو کے ایک یہودی اکثریت کے علاقے Skokie میں "Mediterranean House" نامی ریستوران ۱۹۷۳ء میں کھلا اور فوراً ہی مقبول عام ہو گیا۔ اس میں پکوان عربی لیکن گاہک زیادہ تر یہودی تھے۔ مالک کا نام عبدالمجید البار برادی تھا جو کہ فلسطینی نژاد تھا لیکن امریکی قومیت کے حقوق

حاصل کر چکا تھا۔ اس نے اپنے اسٹاف کو کہہ رکھا تھا کہ "سیاست کی یہاں کوئی گنجائش نہیں" اس نے دو ملازموں کو اسی بات پر برطرف کیا تھا کہ وہ گاہکوں سے سیاسی بحث میں الجھے۔

اپنی کامیابی کی معراج پر "Mediterranean-House" کی اکثر اخباری مضامین میں تعریف ہوتی تھی اور شکاگو کی تمام بڑی بڑی ڈائننگ گائیڈوں میں اس کی سفارش کی جاتی تھی۔ بار براوی نے تجارت کے اضافہ کے ساتھ اس کو بڑھاوا دیا اور کئی دوسرے علاقوں میں اسی نام سے ریستوران کھولے۔

۱۹۷۵ء کے موسم گرما کی ایک رات اس کے Morton Grove والے ریستوران میں ایک چھ فٹ پائپ بم کھڑکی کے راستے پھینکا گیا۔ چونکہ یہ بہت گئی رات پھینکا گیا' لہٰذا کوئی زخمی تو نہ ہوا البتہ ریستوران بالکل تباہ ہو گیا۔ ماہرین آگ کا کہنا تھا کہ یہ بم بلڈنگ کو "زمین بوس" کرنے کے لئے پھینکا گیا تھا۔

سال بھر بعد پھر مشکل کا سامنا تھا۔ رات تین بجے جب بار براوی اور اس کے اسٹاف Skokie والے ریستوران سے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بلڈنگ کے ایک پوری طرف پوسٹر آویزاں تھے جن پر درج تھا کہ "Mediterranian-House" کا کھانا آپ کے پیٹ میں بالکل ایسے ہی ہے جیسے یہودی خون آپ کے ہاتھوں پر۔" اور "یہاں جو بھی رقم خرچ کی جاتی ہے وہ فلسطینی دہشت گردی کے کام آتی ہے۔" ان پوسٹروں کا تاثر مزید گہرا کرنے کے لیے سرخ رنگ کا روغن استعمال کیا گیا تھا اور کچی کلیجی کا چھینٹا بھی لگایا گیا تھا دیوار پر۔ گو بدمعاشوں کا دور نزدیک سراغ نہ تھا لیکن بار براوی نے دیکھا کہ "Chicago Jewish Post & Opinion" کا ایڈیٹر اس منظر کی تصاویر لے رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اتفاقاً ادھر سے گزر رہا تھا۔

اگلے ماہ اس جریدہ میں شہ سرخی کے ساتھ یہ آرٹیکل شائع ہوا کہ "Skokie کے یہودی انجانے میں عرب پروپیگنڈہ کو رقم مہیا کر رہے ہیں۔" اس میں مقامی یہودیوں سے کہا گیا تھا کہ وہ اس ریستوران کا مقاطعہ کریں کیونکہ "Mediterranian House" اپنا اشتہار ایک ہفتہ واری ریڈیو پروگرام "صدائے فلسطین" میں دیتا تھا۔ اس آرٹیکل کے مصنف Ted Cohen کا کہنا تھا کہ یہ پروگرام "یہود مخالف پروپیگنڈہ" کا منبع تھا۔

بار براوی کا کہنا تھا کہ وہ چھ ریڈیو اسٹیشنوں پر اشتہار دیتا تھا اور کئی یہودی کمرشیل پروگراموں پر بھی اس کے کمرشیل (اشتہار) آتے تھے بلکہ ایک ہندوستانی پروگرام میں بھی تھے۔ میں مشتہر تھا'

کفیل ضمانتی' اشتہار کا خرچہ دینے والا۔ کسی طالب علم' بچے کا خرچہ اٹھانے والا Sponsor نہیں تھا۔ میں نے کبھی "صدائے فلسطین" کو نہیں سنا کیونکہ میں ان کی ادارتی پالیسی میں ذرہ بھر دلچسپی نہ رکھتا تھا۔"

Cohen کے اس آرٹیکل کا شائع ہونا بار براوی کے انجام کا آغاز تھا۔ ریستوران کے خلاف ایک پروپیگنڈہ محاذ کھولا گیا۔ اشتہار گھر گھر بانٹے گئے کہ "یہودیوں کو عرب پروپیگنڈہ کا خرچہ نہیں اٹھانا چاہیئے۔" فون پر اس قدر جھوٹے آرڈرز اور دلآزار کالیں ملنے لگیں کہ بار براوی کو فون پر آرڈر لینے بند کر دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ ایک نے تو اسے جان سے مارنے کی دھمکی دی۔ ایک دفعہ بار براوی نے دکھ بھرے لہجے میں ایک دھمکی آمیز کال دینے والے کو کہا "تم پہلے کی مانند بم مار کر جگہ کو اڑا کیوں نہیں دیتے؟" اس کا جواب انتہائی دل شکن تھا: "ہم تمہیں یہ قابل اطمینان سلوک نہ دیں گے۔ ہم تمہیں معاشی طور پر تباہ کریں گے۔ تم زندگی میں ہی مر جاؤ گے۔"

"Chicago Sun-Times" کے کالم نگار Roger Simon نے یہ تسلیم کیا کہ "صدائے فلسطین" کی نشریات قطعاً "Anti-Semitic" نہ تھیں جیسا کہ Cohen نے الزام دھرا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ بات سمیٹتے ہوئے اس نے کہا کہ یہودیوں کو چاہیئے کہ وہ بار براوی کو "ذمہ دار بنائیں اس بات کا کہ اس کی رقم کہاں استعمال ہوتی ہے۔" اور اس نے "Jewish Post & Opinion" کی مقاطعے کی رائے سے اتفاق کیا۔ بار براوی کا خیال تھا کہ اس تبصرہ سے اسے جو نقصان پہنچا وہ اور کسی بھی چیز سے زیادہ تھا۔

بار براوی نے مقامی عرب نژاد آبادی سے اپیل کی جو صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ اس نے B'nai B'rith کی "اینٹی ڈی فیمیشن لیگ" کی مقامی شاخ سے بھی یہودیوں کے ساتھ مداخلت کی التجا کی لیکن کچھ نہ ہوا۔ ADL نے کہا کہ وہ اس کے ہرگز خلاف نہیں ہیں' اس کے ڈائریکٹر "Abbot Rosen" نے کہا "یہ بیحد افسوسناک ہے' تمہیں مقدمہ دائر کرنا چاہیئے۔" لیکن اس نے یہودی جریدہ کے نفرت بھرے پروپیگنڈہ یا دلآزار فون کالوں کا کوئی توڑ نہ کیا۔

اس دوران بار براوی کی آمدنی $40,000 ماہوار سے گر کر 7000 $ ماہوار سے بھی کم ہوگئی۔ اس کے باقاعدہ یہودی گاہکوں نے آنا چھوڑ دیا اور کئی غیر یہودیوں نے بار براوی کو بتلایا کہ چونکہ وہ اس کے ریستوران میں آتے تھے' اسی بناء پر ان کے یہودی ہمسائیوں نے ان کے ساتھ بول چال بند کر دی تھی۔

اقتصادی تباہی کو منہ کھولے دیکھ کر بار براوی نے قانونی راستہ اختیار کیا لیکن بھاری اخراجات اور بار بار کی عدالتی تاخیر نے اس کی یہ رہی سہی امید بھی ختم کر دی۔ آخر کار ان اَن دیکھے دشمنوں کے محاذ نفرت نے اس کے ریستوران بزنس کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ ۳۰ لاکھ ڈالر ہار چکنے کے بعد اس کی جیب میں صرف تین ڈالر تھے جب مقامی شیرف (کوتوال) اس کے ریستوران کو سیل کرنے کے لیے آیا۔

شکاگو ٹی وی اسٹیشن "Wmaq" کے رپورٹر Dick Kay نے Mediterranian House اور اس کے مالک کے انجام پر جامع تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

"انہوں نے اچھی طرح اس کا بیڑہ غرق کیا اور یہ یہودیوں کے جارحانہ گروپ کا کام تھا۔"

ایک یہودی تنظیم کے اہلکار کو ایک اور مختلف طرح کے دباؤ کا سامنا ہوا۔ ۱۹۸۳ء کے وسط میں امریکن ڈسکر مینیشن کمیٹی (ADC) کی (Seattle) شاخ نے ایک رسمی گفت و شنید کا آغاز کیا۔ جیوش فیڈریشن آف سی ایٹل کے ساتھ 'اس کا انتظام American Friends Service Committee نے کیا تھا۔ جیوش فیڈریشن کے صدر Anson Saytner نے معاً ان مذاکرات سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کا ADC کے Seattle لیڈر کو یہ کہنا تھا کہ اگر وہ مذاکرات جاری رکھے گا تو اسے اپنے اعلیٰ حکام کی طرف سے برخاستگی کا سامنا تھا۔ اس نے یہاں تک درخواست کی کہ ADC والے اپنی وہ رپورٹ بھی واپس لے لیں جو ان مذاکرات کو شروع کرنے کے بارے میں ان کے قومی نیوز لیٹر میں شائع کی گئی تھی۔

ایسی عدم رواداری پرانی دوستیوں کو بھی ختم کر سکتی ہے۔ ۱۹۸۳ء کے وسط ہی میں مصنف Stephen Green اپنی نئی کتاب بعنوان America's Secret Relations with a Militant Israel. کے جلد میں بندھے پروف ورلڈ جیوش فیڈریشن کے صدر Edgar Bronfman کے پاس لے گیا۔ وہ Green فیملی کا سالہا سال کا دوست تھا۔ پانچ سال قبل ان دونوں نے مل کر Green کے باپ کی فوتیدگی پر اس کی راکھ بکھیری تھی۔ یہ نوجوان مصنف اپنی اس کتاب لکھنے کی وجوہ بیان کرنا چاہتا تھا۔ اس میں امریکہ اور اسرائیل کے خفیہ فوجی گٹھ جوڑ کا پردہ چاک کیا گیا تھا۔ Bronfman نے Green سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے سکریٹری کے ذریعے جواب دیا۔ وہ اس سکریٹری کو بھی سالوں سے جانتا تھا۔ سکریٹری کے الفاظ تھے: "مسٹر ایڈگر آپ کے ساتھ اس کتاب پر گفت و شنید نہیں کرنا چاہتے۔ یہ آپ نے لکھی ہے اور یہ آپ ہی کا مسئلہ ہے۔ وہ

اس بارے میں آپ سے گفت و شنید کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔" گرین انتہائی دل گرفتہ ہوا کہ جس کو وہ مدتوں سے جانتا اور اس قدر عزت کرتا تھا وہ اس سے گفتگو بھی کرنے پر تیار نہ تھا۔ اسے یہ بڑی ستم ظریفی لگی کہ برسوں پہلے Edgar کا باپ اسے اکثر اس بات پر لعن طعن کیا کرتا تھا کہ وہ اسرائیل کے لیے "کافی کام" نہیں کر رہا۔

وانیسا ریڈ گریو!
ایک سرگرم کارکن مناسب وقت کے انتظار میں

مشرق وسطیٰ کے تنازعہ نے ونیسا ریڈ گریو کے کیریئر کو بھی متاثر کیا ہے۔ وہ اپنے زمانے کی مشہور برطانوی اداکارہ تھی، لیکن امریکہ میں اس کی کامیابی محدود تھی۔ اس کی سیاسی سرگرمیوں کی ایک طویل داستان تھا۔ اکثر اداکار متنازعہ امور سے کنارہ کشی کرتے ہیں تاکہ ان کے کیریئر کو نقصان نہ پہنچے لیکن Redgrave نے اپنی زندگی کا تانا بانا ہی اپنے سیاسی جذبات کے ارد گرد بنا ہے۔ اس کا کیریئر اسی وجہ سے نقصان میں ہے۔

میں نے ۱۹۸۳ء کے لیبر ڈے پر بوسٹن کے رہائشی علاقے میں ایک بیک یارڈ اسٹوڈیو میں جب اس کا انٹرویو لیا تو Redgrave کے خدشات نمایاں تھے۔ اس نے ابھی ابھی ایک ایسے پروگرام کی افتتاحی ٹیپ کاٹی تھی جس کے مخاطب امریکی عرب تھے۔ وہ پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس نے تحمل سے ان دھمکیوں کا ذکر کیا جو اس کو جان سے مار دینے کے بارے میں مل رہی تھیں۔ وہ بار بار خوفزدہ نظروں سے کھلے دروازہ کی جانب نظریں اٹھا رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا "مجھے یہاں حفاظت کا احساس نہیں۔ مجھے اس قدر دھمکیاں مل چکی ہیں۔"

وہ ہمیشہ ہی متنازعہ رہی تھی۔ امریکی حکومت نے ۱۹۷۱ء میں اسے ویزہ دینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ بائیں بازو کے مقاصد کی حمایت اور ویتنام جنگ کی مخالف کرتی تھی۔ وہ امریکہ آ کر اپنی سوانح لکھنے کے بارے میں بات چیت کرنا اور اگر ممکن ہو تو ایک فلم بنانا چاہتی تھی۔ اس کے پبلشر اور متعدد عوامی شخصیات کی گزارشات کے باوجود ویزہ نہ دیا گیا۔ اس نے بغیر ہمت ہارے اپنی سرگرمیوں کا رخ فلسطینی قوم کی حمایت کی جانب کر دیا۔

۱۹۷۸ء میں .J.D.L نے اکیڈمی ایوارڈز کی تقریب کی پکٹنگ کی جس میں Redgrave کو فلم

Julia میں اپنے رول پر Oscar دیا گیا۔ .J.D.L اس کے "The Palestinians" نامی فلم میں کیے گئے تبصرہ اور اس فلم کی مالی امداد کے بارے میں احتجاج کر رہی تھی۔ اس میں .P.L.O لیڈر یاسر عرفات کا انٹرویو بھی شامل تھا۔ اپنی شکریہ والی تقریر میں Redgrave نے کہا کہ پکٹنگ کرنے والے "صیہونی غنڈوں کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا جو تمام دنیا کے یہودیوں کے لیے باعث ندامت تھے۔" اس نے اکیڈمی کا شکریہ ادا کیا کہ وہ ان کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوئے۔ حاضرین میں سے بہتیروں نے شور و غوغا کیا۔

۱۹۷۹ء کے موسم گرما میں ایک دوسرا تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اعلان کیا گیا کہ Redgrave بطور ہیروئن CBS-TV ڈرامہ میں کام کرے گی جو نازی قتل عام سے بچ جانے والی Fania Fenelon کے بارے میں تھا۔ وہ Auschwitz کے مشقتی کیمپ کے آرکسٹرا کی رکن تھی اور اسے اس لئے بخشا گیا تاکہ وہ کیمپ کے اہل کاروں اور دوسرے قیدیوں کے لیے موسیقی بجا سکے۔ بہت سے یہودی اسے حقوق کی پامالی تصور کرتے تھے حتیٰ کہ Fenelon نے خود کہا کہ Vanessa Redgave سے میرا رول کروانا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ Ku-Klux-Klan کے کسی ممبر کا مارٹن لوتھر کنگ کا کردار کرنا۔ CBS پر کڑی نکتہ چینی کی گئی کہ وہ اس کے "اسپانسرز کے بارے میں غیر معمولی رازداری سے کام لے رہا ہے۔" جو اس نشریہ کا خرچہ اٹھا رہے ہیں' کیونکہ وہ ان کو اس دباؤ سے بچانا چاہتے تھے جو ان پر اس کی حمایت سے دستبردار ہونے کے لیے ڈالا جاتا۔

ایک کالم نویس کے بقول جو دو شخصیات اس Vanessa معاملہ میں پیش پیش تھیں وہ Bernie Sofronskys (CBS کا ایگزیکٹو انچارج) اور پروڈیوسر Linda Yellen تھیں۔ CBS کا کہنا تھا کہ وہ دباؤ کے آگے نہیں جھکیں گے۔ Yellen نے نکتہ چینی کا زیادہ براہ راست جواب دیا:

> "مجھے وہ ہمیشہ سے بطور اداکارہ پسند تھی۔ وہ اس پارٹ کے لیے موزوں ترین تھی۔ بنیادی طور پر میں اس کی سیاست سے نابلد تھی۔ سیاسی اعتقادات کے لیے اس کو نکال باہر کرنا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ یہ میرے لئے انتہائی نفرت انگیز بات ہوتی کیونکہ مجھے میکارتھی ازم کا زمانہ اور بلیک لسٹنگ یاد تھی۔ میرے خیال میں اس کی اداکاری غیر معمولی اور خود اپنے آپ کو منوانے والی ہے۔"

نقاد Redgrave کی اداکاری کے تقریباً متفقہ طور پر ثناء خواں تھے لیکن اس پروگرام کا اعلیٰ

معیار بھی ان مذمت کرنے والوں کو ٹھنڈا نہ کر سکا۔ اس فلم کا نام "Playing for Time" تھا اور لاس اینجلیز کے "سائمن وائیز نتھال مرکز برائے مطالعہ قتل عام" قتل نے اس فلم کے قومی سطح پر مقاطعہ کی اپیل کی اور کچھ صیہونی تو اس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے ان کے اسپانسرز کی فروخت کردہ مصنوعات کے مقاطعہ کا بھی مطالبہ کیا۔

صاف ظاہر ہے کہ Redgrave اداکاری کا ہنر اصل مسئلہ نہ تھا۔ لاس اینجلیز ٹائمز نے کیا صحیح کہا: "اس نے قتل عام سے ایک بچ جانے والی کا کردار جس شاندار طریقہ سے ادا کیا اس کا اس تنازعے سے کچھ واسطہ نہ تھا...... اس میں ایک سادہ سا اصول کار فرما تھا کہ الگ الگ اشیاء کو الگ الگ رہنا چاہئے ...... اس موقعہ پر اس کا مطلب تھا اسکرین پر آنے والے اداکار کو اس کی اسکرین سے ماوراء کجرو اور نامقبول سیاسی سرگرمیوں سے الگ تھلگ رکھنا تھا۔"

۱۹۸۲ء میں ایک مرتبہ پھر یہ دیکھنے میں آیا کہ یہ امتیاز برقرار رکھنا کچھ آسان نہیں۔ بوسٹن سمفنی آرکسٹرا کے ماہ اپریل کے کنسرٹ کے سلسلے میں Stravinsky کے Oedipus REX میں Redgrave کو مکالمے ادا کرنے کے لیے چنا گیا۔ مقامی یہودی آبادی کے پر شور احتجاج پر آرکسٹرا نے یہ کنسر بغیر کسی وضاحت کے منسوخ کر دیا۔ اس اعلان میں Redgrave کا نام نہیں لیا گیا تھا' لیکن بقول کالم نگار Nat Hentoff اس میں کوئی راز نہ تھا۔ کم سے کمتر لوگوں کو ناراض کرنے کی خواہش میں ...... خاص طور پر موسم بہار کے Fund-Raising سیزن میں ...... بوسٹن سمفنی آرکسٹرا نے اپنا یہ سیاہ فیصلہ کیا کہ وہ Redgrave کے ساتھ شو نہیں کریں گے۔

ہارورڈ لاء اسکول کے ایک پروفیسر Alan Dershowitz کے بقول (جو بطور ایک صیہونی اور شہری آزادیوں کے رکھوالے کی شہرت رکھتا تھا) Redgrave یہ کہنے میں بالکل حق بجانب تھی کہ "کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہونا چاہئے کہ وہ سیاسی رائے رکھنے کی بناء پر کسی آرٹسٹ کا روزگار چھین لے۔"

Redgrave کو بطور ہرجانہ ایک لاکھ ڈالر ملے۔ یہ ایک پیچیدہ کیس ہے کیونکہ اس کے سیاسی نظریات اسرائیل کے حمایتیوں کے علاوہ اور بھی کئی لوگوں کو ناقابل قبول لگتے ہیں۔ Nat Hentoff نے نہایت مناسب طریقہ تجویز کیا ہے کہ امریکنوں کو ایسی صورت حال میں کیا کرنا چاہئے۔ اس نے جسٹس Oliver Wendell Holmes کی فراست کا سہارا لیا ہے۔ "ہمارے دستور میں اگر کوئی ایسی شق ہے جسے کبھی ترک نہیں کرنا چاہئے تو وہ آزادی خیال کا اصول ہے...... صرف انہی خیالات

کے لیے آزادی نہیں جن سے ہم اتفاق کریں بلکہ ان کے لیے بھی جن سے ہم نفرت کرتے ہیں۔

"وہی ایک سانچہ"

مشرق وسطیٰ کے بارے عوامی بحث کا گلا گھونٹنے کی کوششوں کا مرکز ہمارے ملک میں آزادی اظہار کا مرکزی نکتہ یعنی پریس بنتا ہے۔ پچھلے چند سالوں سے صحافت میں معتبری کا معیار اسرائیل کی حمایت ہے۔ جیسے یہ سیاست اور دوسرے پیشوں میں بھی ہے۔

Edmund Ghareeb (ایک دانشور جس نے مشرق وسطیٰ کے بارے میں امریکن میڈیا میں بہت کچھ لکھا ہے) کا کہنا ہے کہ میڈیا (ذرائع ابلاغ) میں "اسرائیل کی نہایت دل فریب منظر کشی کی جاتی ہے کہ یہ مشرق وسطیٰ کے وحشیوں کے سمندر میں جمہوریت کا ایک جزیرہ ہے۔" دوسری طرف فلسطینیوں کو اکثر "عرب دہشت گرد" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ عرب کو بطور ساربان کے دکھلایا جاتا ہے یا کوئی قاتل یا ایسا ہی کوئی شخص۔ ایک دوسرا صحافی Lawrence Mosher بھی اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے: "انہوں نے عربوں کی شناخت ایک بیہودہ کردار بنا رکھی ہے جبکہ اسرائیلی کو بڑھا چڑھا کر بطور ہیرو پیش کیا جاتا ہے۔"

حتیٰ کہ رسالہ Time بھی ایسی شناخت کو دوام بخشنے کا مجرم ہے۔ ۱۹۸۲ء میں اس رسالے میں چہار رنگا اندرونی اشتہار شائع کیا جس میں ایک شیخ کو دکھلایا گیا تھا اور عنوان صرف ایک لفظ "قوت" تھا۔ کالم نگار Richard Broderick شیخ کے تعارف میں لکھتا ہے "جو بھی آپ ایک بدطینت عرب سے امید کر سکتے ہیں...... ضعف معدہ کا شکار، روایتی سعودی لباس میں ملبوس، مجسم بدباطن کی طرح کیمرہ کو گھور رہا ہے۔"

> کارٹونوں میں عرب عام طور پر اسی دکھلائے جاتے ہیں۔ The Minneapolis Star کے ادارتی کارٹون نگار Craig Macintosh کا کہنا تھا "عربوں کو ہمیشہ جبوں میں، فلسطینیوں کو ہمیشہ دہشت گردوں کے لباس میں کلاشنکوف پکڑے دکھلایا جاتا ہے۔"

Journal Harold (Dayton,Ohio) کا ادارتی کارٹونسٹ Robert Englehart بھی صاد کرتے ہوئے کہتا ہے "میں عربوں کو قاتلوں، چوروں اور جھوٹوں کے روپ میں پیش کروں تو کسی کو اعتراض نہیں ہوتا، لیکن یہودیوں کے شناختی روپ پیش کرنا ممکن نہیں۔ میں جب بھی مشرق

وسطیٰ کے بارے میں کچھ لکھنے پہ آتا تو یوں محسوس ہوتا گویا انڈوں پر پاؤں رکھ کر چل رہا ہوں۔"

اسرائیلی لابی بڑی عرق ریزی سے صحافیوں کو اسرائیل نواز قدامت پرستی کے سیلاب کے مخالف جانے سے باز رکھتی ہے۔ یہ مقصد جزوی طور پر "فی البدیہہ" عوامی احتجاج کا خاص طور پر بند و بست کر کے کیا جاتا ہے' جس کا مقصد ڈرانا دھمکانا ہوتا ہے۔

کالم نگار Rowland Evans لکھتا ہے: "جب ہم کوئی ایسا کالم لکھتے ہیں جسے اسرائیل مخالف سمجھا جاتا ہے تو ہمیں ملک کے کونے کونے سے خطوط موصول ہوتے ہیں جن کی زبان و بیان یکساں ہوتی ہے۔ یہ تسلسل سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں۔

Anti-Semitism کا ہر وقت اور ہر جگہ حاضر و ناظر نعرہ فوراً بلند کر دیا جاتا ہے اور اس الزام تراشی کا ثمر ہے کہ مشرق وسطیٰ کے صحافی حالات کی خبریں دیتے وقت اسرائیل کو برابری سے کچھ زیادہ ہی اہمیت دینے پر مجبور ہیں' حتیٰ کہ محکمہ دفاع کا سابق اہل کار Anthony Cordesman بھی اس الزام سے مبرا نہ رہ سکا' جب اس نے ۱۹۷۷ء میں Armed Forces Journal International میں مشرق وسطیٰ کے فوجی توازن پر ایک مضمون لکھا۔ مثال کے طور پر اس نے بتلایا کہ ۱۹۷۶ء سے لے کر تقریباً اتنے ہی ہو جاتے جتنے کہ امریکہ نے پورے NATO میں پھیلا رکھے تھے۔ Cordesman نے اسرائیل کی روز افزوں امریکی فوجی امداد کی ضرورت پر نکتہ چینی کی۔ صرف اتنی سی سیدھی سادی بات پر B'nai B'rith کی اینٹی ڈی فیمیشن لیگ نے اس مضمون کو "اسرائیل دشمن" اور "یہود دشمن" قرار دے کر مذمت کی۔

بے حد متنازعہ اور متعصّب

صحافی Harold R. Piety کا کہنا ہے کہ Anti-Semitism کے غلیظ نعرہ کو صیہونی بطور ایک چابک کے استعمال کر کے غیر یہودیوں کو دنیا کے واقعات کے بارے میں صیہونی نکتہ نظر ماننے یا پھر سکوت اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں Piety نے "Mid-East International" جریدہ میں ایک مضمون بعنوان "امریکی پریس اور صیہونیت" لکھا۔ اس نے اپنے آجر کو کسی خلش سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنا نام ظاہر نہ کیا۔ اس میں اس نے مذمت کی کہ "امریکی ذرائع ابلاغ اپنی عرب' اسرائیل تنازعہ کی رپورٹنگ میں غلط بیانیوں' تحریفات بلکہ اس سے بھی بد ترین اہم خبروں اور پس

منظر مواد کی نا قابل معافی فرو گذاشت سے کام لیتے ہیں۔"

Piety امریکی ذرائع ابلاغ میں مشرق وسطیٰ پر رپورٹنگ میں موجود خامی کو اسرائیل نواز لابی کی زیادہ تر کامیاب کوششوں کا ثمرہ قرار دیتا ہے۔ وہ اپنی انتہائی پیشہ ورانہ پبلک ریلیشنز کی مہم کے ذریعے امریکی ذرائع ابلاغ پر یلغار کر دیتے ہیں۔ ان کو مختلف ذرائع سے ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ آخر کار جب وہ مطیع اور رام ہو جاتے ہیں تو ان پر سنسر شپ مسلط کر دیتے ہیں۔ اس نے جو چیزیں شمار کروائیں ان میں ایڈیٹروں اور شعبہ اشتہارات کو دھمکیاں' منظم ہنگامہ پرور مقاطعہ الزام تراشی' کردار کشی کی مہمات اور ذاتی انتقام شامل ہیں۔ یہ وہ چند ہتھیار ہیں جو متوازن صحافت کے خلاف استعمال کئے جاتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ کی دم مروڑنے والے ان اقدامات کو گنوانے کے باوجود Piety اپنے تجربے کی روشنی میں صحافیوں اور ایڈیٹروں پر موجودہ تعصب کا زیادہ الزام دھرتا ہے کیونکہ وہ اس دباؤ کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ لابی جو یہ دباؤ ڈالتی ہے وہ کم موردالزام ہے۔

Piety کے آجر کے خلاف دباؤ بڑھنا شروع ہو گیا۔ یعنی Daytion, Ohio کے جریدہ Harold Journal پر۔ یہ دباؤ ۶۰ کی دہائی سے شروع ہوا تھا جب مشرق وسطیٰ میں اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی نے اسے کئی ایسے اداریے لکھنے پر مجبور کر دیا جن میں اسرائیل پر تنقید کی گئی تھی۔ اس کے ایڈیٹر کو ایک لمبا خط J.C.C. کی طرف سے دستی طور پر وصول ہوا اور ساتھ ہی مشرق وسطیٰ پر ایک لمبا لیکچر بھی۔ ایک کالم میں کہا گیا تھا کہ امریکی یہودیوں کو صیہونی کیمپ میں ہانکا جا رہا ہے اور وہ بھی ان کی اپنی خوشی سے۔ اس پر امریکن صہیونی تنظیم کا ایک طویل ردّعمل موصول ہوا۔ چھ یہودی لیڈران کا وفد بھی ادارتی مجلس سے ملاقات کے لیے تشریف لایا۔ ۱۹۷۶ء میں غربی کنارے کے فسادات پر ایک کالم کے بعد ایڈیٹروں نے Piety کو حکم دیا کہ وہ اس موضوع پر مزید لکھنا بند کر دے۔

اپریل ۱۹۷۷ء میں اس نے Deir Yassin کے قتل عام (جس میں یہودی دہشت گردوں نے Menachem Begin کی قیادت میں ۲۰۰ سے زائد فلسطینی دیہاتیوں کو قتل کیا تھا) کی برسی پر ایک اور کالم لکھا تو اسے ایڈیٹروں نے سختی سے جھاڑا۔ ایڈیٹر Dennis Shere کا کہنا تھا کہ اسے احکامات ملے ہیں (اغلباً کمپنی کی انتظامیہ سے) کہ "تمہیں بکواس بند کرنے پر مجبور کیا جائے یا برخواست کر دیا جائے۔"

Piety کو بعد میں بتلایا گیا کہ وہ "بے حد متنازعہ اور متعصب" ہے اور اسے "جرنل ہیرالڈ" کے ادارتی صفحہ کی ادارت والی ٹیم میں ترقی نہ دی جائے گی جس کا پہلے وعدہ کیا گیا تھا۔ اس دباؤ پر Piety اپنی نوکری کو خیر باد کہہ گیا۔

ذرائع ابلاغ پیٹھ دکھلا گئے

۱۹۸۲ء کے موسم گرما میں کالم نویس Richard Broderick نے اپنے کالم "Media Watch" میں کئی اقساط لکھیں جس میں امریکی ذرائع ابلاغ کی اسرائیلی حملے کے بارے میں بے انصافی پر مبنی خبریں شائع کرنے کو بے نقاب کیا گیا تھا۔ یہ اس کا ہفتہ واری کالم تھا۔ اس کے نتائج یوں تھے:

> "(یاسر) عرفات کے بنکر اور PLO ہیڈ کوارٹر پر حملہ کی ٹیپ کو بار بار دکھلایا گیا' جبکہ شہری ہلاکتوں والی ٹیپ ایڈیٹنگ روم کے فرش پر ہی جگہ پا سکی...... ! جب اسرائیلی میدانی فوجیں جنوبی لبنان کو روند رہی تھیں تو امریکی پریس لگاتار نرم گوئی سے ناشائستہ بات کو گوارا بنانے کے لئے اس صاف کھلے حملے کا ذکر "دخل اندازی" کہہ کر کرتا رہا۔"

بقول Brodrick اس نے مقامی اخبارات میں جو پایا وہ یوں تھا:

اس وقت جبکہ لبنانی اور فلسطینی شہری ہزاروں کی تعداد میں ہلاک کئے جا رہے تھے تو "Minneapolis Star & Tribune" نے صفحہ اول پر ایک فوٹو میں اسرائیلی ماں کو اپنے ہلاک شدہ بیٹے پر بین کرتے ہوئے دکھلایا۔ اسی روز بعد میں ایک اور تصویر میں کچھ مردوں کو باندھ کر خاردار تار کے جنگلوں کے اندر بیٹھے دکھلایا گیا جبکہ اسرائیلی سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ عنوان تھا "مشتبہ فلسطینی اسرائیلی فوج کی قید میں" گویا صرف فلسطینی ہونا گرفتاری کے لیے کافی تھا!

Brodrick نے اپنے کالم میں وہ ہولناک مناظر بھی بیان کئے جو عزت مآب Don Wagner نے اس وقت ملاحظہ کئے تھے جب اس کے فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں کے معائنہ کے دوران اسرائیلی بمباری شروع ہو گئی۔ Wagner نے غازہ اسپتال کے ایک بازو کو بمباری سے تباہ ہوتے دیکھا اور وہ اس وقت Akka اسپتال میں موجود تھا جب ہزاروں زخمی شہری وہاں لائے گئے۔ Wagner نے اپنے مشاہدات NBC' ABC اور CBS کے بیروت نیٹ ورک بیورو کو بتلائے لیکن ان کی یہ رپورٹیں جو امریکہ ارسال کی گئیں انہیں کبھی نشر نہ کیا گیا۔

گو اس قسم کے تعصب کی مثالیں پریشان کن ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ پریشان کن وہ نتائج ہیں جو ایک صحافی کو بھگتنا پڑے' جس نے ان کو مشتہر کیا۔ Minneapolis کے سب سے بڑے فلم ڈسٹری بیوٹر کے جریدہ Twin Cities Reader میں جونہی یہ Mediawatch کالم اسرائیل کے بارے میں شائع ہوا تو ایڈیٹر Deb Hopp کو دھمکی آمیز فون کال آنے شروع ہو گئے کہ ہم آپ کے اشتہار مستقلاً بند کر دیں گے۔ وہ اس علاقے کے سب سے بڑے مشتہرین میں سے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ Broderick کا کالم کیوں شائع کیا گیا؟ Hopp نے بمشکل ان کو اس وعدہ سے ٹھنڈا کیا کہ ان کا ہزار الفاظ پر مشتمل بیان وہ اس کالم کے جواب میں مفت شائع کرے گا لیکن خلاف حسب دستور Brodrick کو اس تردید کا جواب الجواب دینے کی اجازت نہ دی گئی۔

اسی موسم گرما میں بعد ازاں Brodrick نے اپنے تئیں Minnesota کے سینیٹر Rudy Boschwitz کی رائے عامہ کو ذرائع ابلاغ کے ذریعے اپنے حق میں ہموار کرنے کی ایک کوشش کی نشان دہی کی۔ Boschwitz ایک رابطہ کار اور بطور ممبر امریکن لبنان لیگ نامی تنظیم (.A.L.L) کی پریس کانفرنس میں شامل ہوا۔ اس تنظیم نے لبنان پر حملے کو جائز قرار دیا تھا۔ Boschwitz نے لیگ کے ممبران کی شہادت پیش کی اور کہا کہ لبنان کے عوام نے اسرائیلیوں کو خوش آمدید کہا تھا۔

Brodrick نے اپنے کالم میں American-Arab Anti-discrimination Committee کی ملک بھر میں شائع شدہ رپورٹ کا حوالہ درج کیا جس میں ".A.L.L" کو "فلانجسٹ پارٹی" اور "لبنانی فرنٹ" کا غیر رجسٹر شدہ نمائندہ قرار دیا گیا تھا۔ وہ AIPAC کے ساتھ گہرے رابطہ سے کام کرتے ہیں جو کہ ان کے لیے سیاسی مواقع پیدا کرتی ہے۔ Boschwitz اس خبر کو عام ہوتے دیکھ کر بھنا اٹھا' اس نے Hopp اور Brodrick کو ایک لمبی فون کال کر کے ناراضگی کا اظہار کیا۔ تین ہفتے گزرے تھے کہ Brodrick کو مطلع کیا گیا کہ Reader Twin Citites Reader کو اب اس کی مزید ضرورت نہیں۔

"Frau Geyer" پر لعن طعن

شکاگو کے جریدہ "Sun-Times" نے بھی بزرگ غیر ملکی' سنڈیکیٹڈ کالم نگار Georgie Anne Geyer کو بیرونی دباؤ کے ماتحت ۱۹۸۲ء کی لبنان جنگ کے دوران کئی ماہ کے لیے معطل

رکھا۔ یہ فیصلہ تب کیا گیا جب قاریوں کے بہت سارے خطوط موصول ہوئے جن میں Geyer کے کالم پر تنقید کی گئی تھی۔ Geyer نے ان کالموں میں جنگ اور اسرائیلی پالیسی پر نکتہ چینی کی تھی۔ ان خطوط میں Geyer کو "ایک مشہور زمانہ یہودیوں سے نفرت کرنے والی" ...... "اعلیٰ قسم کی Anti-semitic" "P.L.O. کے حق میں معذرت خواہانہ رویہ کی حامل" وغیرہ کہا گیا تھا۔ Geyer سالہا سال عرب' اسرائیل تنازعہ کے بارے طرفین کی رپورٹنگ کرتے کرتے ان سب کی عادی ہو چکی تھی۔ اسے اکثر لیکچروں کے دوران گڑبڑ کا سامنا ہوتا تھا اور اس کے خلاف مذمت بھرے مضامین چھپتے تھے۔ Geyer (جس کے انٹرنیشنل صحافتی Coup سالہا سال سے شہ سرخیوں کی زینت بنتے رہے ہیں) نے مجھے بتلایا کہ یہ "کبھی نہ ختم ہونے والی زہریلی بہتان طرازی اور گالی گلوچ جو کہ صرف اس لئے کی جاتی ہے کہ آپ وہ تحریر کر رہے ہیں جو کہ حتمی طور پر سچ ہے۔" اس کی صحافتی زندگی کا سب سے زیادہ المناک پہلو ہے۔

"Miami-News" کے ایڈیٹر Howard Kleinberg کو بھی Geyer کے کالم چھاپنے پر ایسی ہی نکتہ چینی کا سامنا رہا۔ اس نے ۱۹۸۲ء کے ایک اداریہ میں لکھا:

> "یاد نہیں کہ مجھے کبھی اس سے زیادہ دباؤ کا سامنا ہوا ہو جتنا کہ Georgie Anne Geyer کے اسرائیل کے بارے میں کالم شائع کرنے پر ہوا۔ Geyer کے مخالفین اسے نہ صرف اسرائیل مخالف بلکہ Anti-Semite بھی گردانتے ہیں۔ بعض اس کو "Frua-Geyer" کہہ کر پکارتے ہیں۔"

اس متشدد ردِعمل سے آگاہ ہوتے ہوئے Geyer نے خود Kleinberg کو یہ تجویز کیا کہ وہ اس کے مشرق وسطیٰ پر کالم کچھ عرصہ کے لیے شائع نہ کرے' لیکن اس نے کہا کہ وہ "ہرگز اس دباؤ کے آگے جھکنے کو تیار نہیں۔" اس کا کہنا تھا کہ "ہم متضاد نکتہ ہائے نظر کے سنڈیکیٹ والے کالم شائع ہی اس لئے کرتے ہیں کہ اخباروں کا یہ کردار ہے کہ وہ آزادی اظہار رائے کے لیے مواقع فراہم کریں۔" گو Sun-times نے بعد ازاں اس کا کالم پھر شائع کرنا شروع کر دیا اور نکتہ چینی بھی معدوم ہو گئی لیکن Geyer کا کہنا تھا کہ مشرق وسطیٰ کے مسائل کا بیان اپنے ذاتی نگاہ سے دینے کے لئے کچھ ذاتی قیمت چکانا پڑتی ہے۔ اسے یہ افسوس تھا کہ اس کے تبصروں نے اس کے یہودی احباب کو مستقل طور پر ناراض کر دیا ہے۔

دشمنوں کی فہرست میں داخل' خارج

ناقدین اور فکر انگیز تجزیہ کاروں پر "دشمن" کا لیبل چسپاں کر دینا بھی اسرائیلی لابی کا ایک جانا بوجھا ہتھکنڈا ہے۔ وہ افراد جنہیں اس "فہرست دشمناں" میں شامل کیا جاتا ہے...... خصوصاً AIPAC کی شائع شدہ "اسرائیل پر کیچڑ اچھالنے کی مہم" اور .A.D.L کی "عرب نواز پروپیگنڈہ امریکہ میں: آوازیں اور محمل"...... شاذ ہی لابی کی نکتہ چینی کو درخور اعتناء سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں براہ راست جوابدہی ان کے معترضین کو معتبر قرار دینے کا موجب ہوگی۔ لیکن دسمبر ۱۹۸۳ء میں "نیویارک ٹائمز" کے ایک یہودی کالم نگار Anthony Lewis نے اس فہرست دشمناں کو چیلنج کیا۔ اپنے باقاعدہ کالم کی دو اقساط میں اس نے پروفیسر ولید خالدی کا نام ۱۹۸۳ء والی فہرست میں شامل کرنے پر احتجاج کیا۔ یہ امریکن یونیورسٹی بیروت کا ایک پروفیسر تھا جو کہ Harvard کا ریسرچ فیلو بھی تھا۔ اسے ممتاز فلسطینی دانشور تسلیم کیا جاتا تھا اور اس نے ہمیشہ ایک ایسی فلسطینی مملکت کے قیام کی وکالت کی جو اسرائیل کے پرامن ہمسایہ کے طور پر اور باہمی تسلیم ورضا کے ساتھ رہے۔ اس نے اپنی پوزیشن ۱۹۷۸ء کے Foreign Affairs والے مضمون میں واضح کی تھی۔ اس پر مشرق وسطیٰ اور کئی دوسری جگہوں کے انتہا پسند گروہوں نے کڑی نکتہ چینی کی تھی۔ Lewis کو پروفیسر خالدی کا نام مبینہ طور پر اسرائیل مخالف سرگرمیوں والے افراد میں شامل دیکھ کر حیرت ہوئی۔

Lewis نے ان حربوں کو بے نقاب کیا جن سے پروفیسر خالدی پر نام نہاد اسرائیل مخالف مہم چلانے کا الزام دھرا گیا۔ پہلے تو AIPAC اس کے ۱۹۷۸ء والے مضمون کا حوالہ دے کر کہتی ہے کہ اس نے کہا کہ اسرائیل کا وجود "بلادِ عرب کے اتحاد اور سالمیت کے اصول کی خلاف ورزی بھی ہے اور (عرب) قوم کے لیے اہانت آمیز بھی۔" خالدی نے دراصل ایک پرانے نظریہ کا حوالہ دیتے ہوئے یہ کہا تھا جو کہ اب ترک کیا جا چکا ہے۔

یہ کتابچہ خالدی کو فلسطینی قومی کونسل (PNC) کا رکن بتاتا تھا جو PLO کے لیے بطور ایک پارلیمنٹ تھا۔ اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ ایک مرتبہ PNC سے اخراج سے "بال بال بچا" جب اس نے جارج حباش کے پاپولر فرنٹ کی حمایت کی۔ خالدی کا کہنا ہے کہ اس نے کبھی بھی PNC کے اجلاس میں حاضری نہیں دی کیونکہ وہ عمر بھر سیاسی تنظیموں سے آزاد رہنے کا عزم رکھتا ہے۔ بقول Lewis خالدین کے نظریات تو جارج حباش کے نظریات کی مکمل نفی ہیں۔" کچھ لوگ اس کی میانہ

روی ہی کو خطرناک سمجھتے ہیں۔ وہ آخر کو تو ایک فلسطینی قوم پرست ہے اور ہمیں ہرگز ایسی چیز کو جائز تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔"

"Times" میں Lewis کے کالم کے خلاف ADL اور AIPAC دونوں کے احتجاجی مراسلے شائع ہوئے۔ ADL نے تو ایک ریسرچ ٹیم ترتیب دی جو Lewis کے پچھلے کالم دیکھ کر اسرائیل مخالف تعصب تلاش کرے۔ ۱۹۸۴ء کے جنوری کے AIPAC نیوز لیٹر "Near East Report" میں بھی Lewis پر کڑی تنقید کی گئی۔

غیر مقلدیت کی راہ میں درپیش خطرات

نیویارک کا ایک تاجر اس "فہرست دشمناں" میں شامل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ وجہ اس کے نظریات کا ذرائع ابلاغ میں احاطہ تھا۔ Fack Sunderland ایک تاجر اور "American for Mid-East Understanding" کا چیئرمین بھی۔ یہ ایک قوی تنظیم ہے جو ماہرانہ تبصرے شائع کرتی ہے۔ فلسطینیوں کے حق خود اختیاری پر زور دیتی ہے اور چند برس پیشتر مقبوضہ غربی کنارے میں یہودی آبادکاروں کی بستیوں کی توسیع کی مخالفت کرتی تھی۔ اس کے یہ خیالات ذرائع ابلاغ اور امریکہ میں وسیع پیمانہ پر شائع ہوئے اور جب وہ امریکہ واپس اپنے گھر نیویارک پہنچا تو تھوڑے عرصہ بعد اسے پتہ چلا کہ ایک شخص نے اس کے کئی ہمسایوں سے ملاقات کر کے اس کے بارے میں ذاتی سوالات پوچھے۔ فیملی کے بارے میں پوچھا اور اس کے بچوں کے اسکول آنے جانے کے راستوں اور نظام الاوقات کے بارے میں بھی معلومات جمع کیں۔ Sunderland نے اپنے خاندان کی حفاظت کے اندیشے کے ماتحت ایک ذاتی سراغ رساں کی خدمات حاصل کرلیں۔ FBI کے تعاون سے کام لے کر اس سراغ رساں نے جلد ہی اس گریجویٹ طالب علم کا سراغ لگالیا' جس نے یہ تسلیم کیا کہ یہ دخل درمعقولات اس نے کی تھی اور یہ بھی کہ اس نے غیر قانونی طور پر Sunderland کے مالی معاملات اور قرضہ کے ریکارڈ کے بارے میں کمپیوٹر معلومات بھی حاصل کیں۔ اس طالب علم نے کہا وہ B'nai B'rith کا ملازم تھا اور Sunderland کے بارے میں یہ تفتیش اس واسطے ہو رہی تھی کہ اس کا نام "فہرست دشمناں" میں شامل کیا جاسکے۔ اس طالب علم کے اقبالی بیان کو دیکھ کر B'nai B'rith نے سندرلینڈ کے نام کا ذکر نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ جب ۱۹۸۳ء میں B'nai B'rith کی کفالت میں یہ "فہرست دشمناں" شائع کی گئی تو

اینٹی ڈی فیمیشن لیگ (جس کا سربراہ Sunderland تھا) کو ایک ایسی تنظیم قرار دیا گیا جو "عرب پروپیگنڈہ" کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اس کے کئی افسروں کے نام درج تھے لیکن Sunderland شامل نہ تھا۔

۱۹۷۷ء میں ایک ہفتے کی صبح پروڈیوسر Debbie Gage کو میناپولیس کے مقامی فلسطین نژاد افراد کا ایک گھنٹہ بھر کا پروگرام میناپولس پبلک ریڈیو پر نشر کرنے پر ایک مختلف انداز کے خطرہ کا سامنا ہوا۔ ریڈیو اسٹیشن کا سوئچ بورڈ فوراً ہی اسرائیل کے لیے برابر کا وقت مہیا کرنے کا مطالبہ کرنے والوں سے اٹ گیا۔ Gage کا کہنا تھا کہ وہ تو یہ پروگرام اس لئے کر رہی تھی کہ مقامی پریس میں اسرائیل کے نکتہ نظر کو بے حد پذیرائی مل رہی تھی اور وہ اس صورت حال کو اپنے اس پروگرام سے متوازن کرنے کی "ایک ننھی سی کوشش" کر رہی تھی۔

اگلے سوموار کو نیوز ڈائریکٹر Gary Eichten نے Gage کو بتلایا کہ تین ہفتہ بعد اس کی ملازمت سے چھٹی ہے اور آئندہ ہفتے کے روز اسرائیلی نکتہ نظر پیش کرنے کے لیے پروگرام نشر کیا جائے گا۔ Eichten نے اس بات سے انکار کیا کہ وہ یہ Follow up پروگرام کسی دباؤ کے تحت ہو رہا تھا لیکن اندرونی اہل کار Yvonne Pearson کا تبصرہ تھا: "اگر درجنوں غصہ بھری کالیں دباؤ نہیں تو اور کیا ہے۔" اگر کبھی ذرائع ابلاغ والے ان خطرات کو خاطر میں نہ بھی لائیں اور اس دباؤ اور تعصب کا مقابلہ کرنے پر ڈٹ جائیں تو کھلے عام نکتہ چینی کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑ سکتی ہے۔

۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں Miami-TV پر ایک لبنانی نژاد شخص James Batal کا انٹرویو کیا گیا۔ وہ اس وقت ۷۲ سال کا تھا۔ بٹال نے کوشش کی کہ وہ اس تنازعہ کا عرب نقطہ نظر پیش کرے جسے بہت کم لوگ جانتے تھے۔ اس انٹرویو کے نشر ہونے کے بعد اسے ایک گمنام دھمکی آمیز کال موصول ہوئی کہ اس TV انٹرویو کا بدلہ اس کے گھر کو جلا کر یا پھر بم مار کر تباہ کر کے لیا جائے گا۔ بٹال نے مقامی پولیس اور FBI سے تحفظ کی اپیل کی۔ لیکن انہوں نے معذوری کا اظہار کر دیا۔" اس نے مایوسی کے عالم میں اپنا گھر بند کیا اور بیمار بیوی کے ہمراہ اپنی سالی کے چھوٹے سے فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔

Grace Halsell بھی ۱۹۸۳ء میں پیش آمدہ ایسا ہی ایک واقعہ سناتی ہے۔ وہ مشرق وسطیٰ پر لکھنے والی ایک ممتاز قلم کار ہے۔ جب وہ یروشلم میں تھی تو اس نے Amal نامی نوجوان فلسطینی عورت سے ملاقات کی۔ اس سے اس کی شناسائی اس وقت ہوئی تھی جب وہ چند سال پہلے یروشلم میں رہائش پذیر تھی۔ ایک امریکن ٹی وی صحافی نے اسے Amal کا انٹرویو کرنے کے لیے کہا تھا' جب وہ امریکہ

کے نائب قونصل، مشرقی یروشلم میں ملازم تھی۔ اس کے امریکی باس (Boss) نے اسے انٹرویو دینے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن جب اس انٹرویو کو نشر کیا گیا تو اسے برخواست کر دیا گیا۔ بقول Amal کے "مجھے بہت فلسطین نواز گردانا گیا۔ میں نے ایک سوال کے جواب میں صرف اس قدر ہی کہا تھا کہ میرا خاندان جس گھر میں رہتا تھا وہاں اب اسرائیلی رہتے ہیں۔"

اس قسم کی غیر ہمدردانہ رپورٹیں شائع کرنے کے نتائج ملازمت سے برخواستگی یا لابی دباؤ سے زیادہ شدید اور تلخ تر بھی ہو سکتے ہیں۔ John Law ایک آزمودہ کار صحافی اور Washingtion Report on Mid-East Affair کا بانی اور مدیر تھا۔ یہ ایک غیر جانبدار نیوز لیٹر تھا جو امریکن ایجوکیشنل ٹرسٹ شائع کرتا تھا۔ جریدے کا مقصد بیان کرتے اس کا کہنا تھا:

> "ہماری خواہش ہوگی کہ مشرق وسطیٰ کے مسائل کو ایسی نظر سے دیکھا جائے جو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے لوگوں کے مفاد میں ہو اور ساتھ ہی ساتھ ان کے معیار انصاف و راستی سے بھی ہم آہنگ ہو۔"

۶ر مئی ۱۹۸۲ء کو Law کو ایک فون کال آئی کہ "ذرا ہوشیار رہنا" تمہیں جسمانی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اگلے ہی روز امریکن ایجوکیشنل ٹرسٹ کے ایک اہل کار John Duke Anthony پر دو افراد نے اس کے گھر کے قریب ہی حملہ کیا۔ ایک نے Anthony کے سر پر لینٹ سے ضرب لگائی۔ ان غنڈوں نے نہ تو اس کی رقم چھینی اور نہ کریڈٹ کارڈ...... صرف اس کی ذاتی پتہ درج کرنے والی ڈائری لے گئے۔ "واشنگٹن رپورٹ" نے اگلے شمارہ میں بذریعہ اداریہ یہ پیغام دیا کہ "جس شخص نے Law کو دھمکی دی اور جن دو نے انطونی پر یہ حملہ کیا انہیں اغلباً یہ امید ہوگی کہ وہ اپنے کام سے باز آجائیں گے۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا۔"

ناؤ میں خاک اڑانا

نیویارک کے ایک صحافی کو ۱۹۸۴ء کے اوائل میں صرف اس بات پر اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے کہ اس نے اسرائیل نواز لائن سے انحراف کیا تھا۔ نیویارک کے جریدہ "Village Voice" میں عرصہ دس سال سے "Press Clips" کا مقبول عام فیچر Alexander Cockburn لکھ رہا تھا۔ گو اس کے موضوع اور نظریات اکثر متنازعہ ہوتے تھے لیکن اس کی انفرادیت اور راست

بازی کا احترام ہر جگہ کیا جاتا تھا۔

اگست ۱۹۸۲ء میں Cockburn نے Belmont (میسا چوسیٹس) میں واقع Institute of Arab Studies کو ایک وظیفہ کے لیے درخواست دی جو اسے مل گیا۔ یہ لبنان کی جنگ کے بارے میں ایک کتاب لکھنے کے لیے اخراجات سفر اور تحقیقی اخراجات کے لیے ضمانت دینے پر مبنی تھا۔ یہ گرانٹ خفیہ نہیں تھی۔ یہ .I.A.S کی پبلک رپورٹ میں درج تھی لیکن جنوری ۱۹۸۴ء میں بوسٹن کے جریدہ "Phoenix" میں ایک طویل مضمون شائع ہوا جس میں Cockburn کے ”دس ہزار ڈالر والے عرب تعلق“ کا پردہ چاک کیا گیا تھا۔ اس مضمون نے "Voice" کے ادارتی دفاتر میں ایک طوفان کھڑا کر دیا۔

ایڈیٹر David Schneiderman نے فیصلہ کیا کہ Cockburn کو بغیر تنخواہ کے غیر متناہی معطلی پر رکھا جائے' البتہ اس کو تحریری جواب دینے کی اجازت دی۔ Cockburn نے اس گرانٹ کا دفاع کیا کہ .I.A.S ایک جائز رفاہی تنظیم ہے جس کے قیام کا مقصد ”لکھاریوں' ماہرین' فنکاروں' شاعروں اور پیشہ ور حضرات کو ایک موقع فراہم کرتا تھا کہ وہ عالمی تاریخ کے عرب تناظر کا پورے طور پر احاطہ و تحقیق کر سکیں جو ان کے اپنے اپنے دلچسپی کے حلقے میں ہو۔“ اس کی دلیل تھی کہ اس معاملے میں وہ ”عرب مخالفت نسل پرستی کا اندازہ لگانے میں ناکام رہا تھا۔“ اس کے خیال میں یہ گرانٹ اس کتاب کے لیے اس وجہ سے قابل اعتراض تھی کہ یہ رقم ”عرب سرمایہ“ تھی لہٰذا ”مشکوک“۔

Schneiderman کے اس سلوک پر جو وہ Cock Burn سے روا رکھ رہا تھا۔ قارئین کو بہت غصہ آیا' بہت سوں نے تحریری احتجاج کیا کہ یہ تو بالکل ”ناؤ میں خاک اڑانے“ والی بات ہوئی۔

”یہ قابل افسوس ہے کہ امریکہ میں آزادی اظہار کی روایت ہونے کے باوجود اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو مشرق وسطیٰ کا مسئلہ آتے ہی' قوت کا استعمال یا اس کے استعمال کی دھمکی سے ایسے خیالات کی تشہیر کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں جنہیں وہ پسند نہیں کرتے۔“

DOW JONE ثابت قدم رہی

بڑے بڑے ذرائع قومی ابلاغ اس دباؤ سے بچ نہیں پائے۔ منظم طور پر خطوط کی مہم چلانا اسرائیل نواز گروپوں کی مرغوب حکمت عملی ہے۔ "National Journal" کے ادارتی نامہ نگار Lawrence

Mosher کے بقول "... ظاہری طور پر کارکنوں کی ایک ایسی فوج جو کبھی بھی تھکتی نہیں۔ کئی صد یا ہزاروں خطوط کانگریس ممبران یا مدیران جرائد وغیرہ کو حسب ضرورت ارسال کر سکتی ہے۔ بعض دفعہ مدیران کو پیشگی ہی ان کے بوجھ تلے دبا دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے وہ کام نہیں کر سکتے جو کہ وہ عام حالات میں کرتے۔ اگر ان خطوط' تاروں اور فون کالوں کے سیلاب کا سامنا نہ ہوتا جو کہ بعض تحریروں کے لکھنے یا مناظر کے دکھلانے پر ہوتا ہے۔"

موشر کو خود بھی بے لاگ تبصرہ پر ایسے دباؤ کا سامنا ہو چکا ہے۔ ۱۸ رمئی ۱۹۷۰ء کے National Observer میں واشنگٹن ڈی سی کے ایک غیر معروف مقدمہ کے بارے میں مضمون چھپا۔ مقدمہ B'nai B'rith کے ایک سابقہ اعلیٰ عہدیدار Saul E. Joftes کا اپنی تنظیم کے خلاف تھا۔ الزام تھا "صیہونیوں نے B'rai B'rith کو بین الاقوامی سیاسی سرگرمیوں کے لیے استعمال کر کے اس تنظیم کے دستور اور وفاقی غیر ملکی ایجنٹ رجسٹریشن قانون اور ٹیکس قانون کی خلاف ورزی کی ہے کیونکہ یہ تنظیم ایک خیراتی' مذہبی' ٹیکس سے مستثنیٰ' امریکی ممبران پر مشتمل تنظیم ہے۔"

Joftes کو خاص طور پر تشویش اس امر پر تھی کہ B'nai B'rith نے ایک ایسی خاتون کو "ملازم" رکھا تھا جس کے عہدہ کی تنخواہ بھی نیویارک کا اسرائیلی سفارت خانہ دیتا تھا اور وہی اس کو کنٹرول بھی کرتا تھا۔ اسے روس جانے والے یہودیوں کو "بھرپور بریفنگ" دینے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ لیکن اس کا اصل کام یہ اطلاعات اسرائیلی حکومت کو فراہم کرنا ہوتا تھا کہ کون کون روس گیا اور کن روسیوں نے ریاستہائے متحدہ کا سفر کیا۔ اس خاتون Mrs. Avis Shulman کا کہنا تھا کہ "یہودی تنظیمیں خاص طور پر B'nai B'rith بطور ایک اڈے کے بیحد کارآمد ہیں" ...... Joftes کو مجبوراً اس کی درخواست پر ایک ذیلی کمیٹی بنانی پڑی جس کی وہ "سکریٹری" تھی تاکہ وہ اس کو ایک غیر معروف لیکن بامعنی ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکے۔

Shulman کا ایک سالہ دور ملازمت ان کئی پہلوؤں میں سے ایک تھا جو Joftes کی نگاہ میں صیہونیوں کا B'nai B'rith پر "قبضہ" تھا' بین الاقوامی سرگرمیوں کے لیے۔ وہ ایسی مجبوری سے نالاں تھا جس کے تحت اسے اپنی تنظیم کو اسرائیلی حکومت کے پالیسی احکامات کے تابع کر کے چلانا پڑے جس کے باعث "کسی غیر ملکی قوت کے مفادات کی حفاظت کو B'nai B'rith کی شناخت پر اوّلیت حاصل ہو جائے۔"

Joftes کے مضمون میں قومی بمقابلہ غیر قومی وفاداریوں کے عمومی مسئلہ پر بحث کی گئی تھی۔
اس نے بہت سارے قومی اور بین الاقوامی یہودی لیڈران کے بیانات کا حوالہ درج کیا تھا۔ اس نے امریکی یہودیوں کے وہ حربے طشت از بام کئے جن کے ماتحت وہ اپنے ٹیکس فری عطیات کو اسرائیل بھیجتے تھے جو کہ مبینہ طور پر "امداد" کے منافی مقاصد کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ اس نے سینیٹ فارن ریلیشنز کمیٹی کی سات سالہ سابقہ سماعتوں کو بھی طشت از بام کیا۔ اس میں "امریکن صیہونی کونسل" نامی تنظیم کے غیر قانونی طور پر اسرائیل نواز پروپیگنڈہ کرنے کا بھانڈہ پھوڑا گیا تھا۔ اس تنظیم کو بند کرنے کے احکامات دیئے گئے تھے۔

اس مضمون کی اشاعت کے معا بعد نیویارک کی ایک سرمایہ کاری فرم کے سینئر حصہ دار Gustave Levy نے "نیشنل آبزرور" کی مالک "Dow Jones" کے دفاتر کا دورہ کیا۔ اس کے ہمراہ دوسرے یہودی لیڈران بھی تھے۔ اس گروپ نے مضمون کی صحت سے تو انکار نہ کیا لیکن اس کی اشاعت پر احتجاج اس لئے کیا کہ یہ ایک ندامت آمیز یہودی مخالف کاروائی تھی۔ انہوں نے "Dow Jones" کے اس وقت کے نائب Phillips Warren کی نیت پر بھی انگشت نمائی کی کہ اس نے Mosher کا مضمون کیوں شائع کیا "عوام کی توجہ اس اطلاع پر کیوں مرکوز کی؟" ...... اس دباؤ کے باوجود فلپ نے مصنف کی حمایت ترک نہ کی۔

"کون ہم پر بھڑے گا؟"

"نیشنل جیوگرافک میگزین" نے اپنے اپریل ۱۹۷۴ء کے شمارہ میں "دمشق" شام کا متذبذب عدن" کے عنوان سے ایک مفصل مضمون شائع کیا۔ اس میں شامی دارالحکومت کی قدیم اور جدید زندگی پر تبصرہ تھا لیکن شہر کی ننھی منی سی یہودی آبادی کے مختصر سے ذکر پر طوفان برپا ہوگیا۔
مشرق وسطیٰ کے ایک کہنہ مشق صحافی مصنف Robert Izzi نے دیکھا کہ "شہر میں یہودیوں کی قابل ذکر آبادی کو برداشت کیا جاتا ہے" اور یہ کہ Sephardic Jews "عبادت کرنے اور مواقع سے فائدہ اٹھانے کی آزادی" سے بہرہ ور ہیں لیکن وہ کئی بلاجواز پابندیوں کا شکار تھے جن میں سفر کرنے یا ہجرت کر جانے کے بارے میں سخت پابندیاں بھی شامل تھیں۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ تقریباً ۵۰۰ یہودی ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد شام چھوڑ کر جا چکے تھے اور یہ کہ "جو چھوڑ کر جا چکے

ہیں ان کے خاندانوں کے خلاف انتقامی کاروائیاں شاذ ہی کبھی ہوئی ہیں۔"

شام میں یہودیوں کی زندگی کی اس تصویر کشی پر جو Izzi نے کی امریکہ کے کئی یہودی گروپ اور رسالے کے قارئین سخت سیخ پا ہوئے۔ نیشنل جیوگرافک سوسائٹی کے دفتر میں ناراض احتجاجی خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ان میں شام میں یہودیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک پر "پردہ ڈالنے" کی کوشش پر اور ایڈیٹران نے Izzi کی اس "تکلیف دہ غلط بیانی" کو صحیح کرنے سے انکار پر غم وغصہ کا اظہار تھا۔سوسائٹی کے صدر Gilbert M. Grosvenor کا کہنا تھا کہ اس کے دفتر کو ۶۰۰ سے زائد خطوط موصول ہوئے۔اس خط وکتابت میں تند وترش الزامات کا آزادانہ استعمال کیا گیا تھا۔ مثلاً "کریہہ المنظر جھوٹ"، "ذلت آمیز"، "غیر انسانی"، "کمیونسٹ پروپیگنڈہ" اور "اتنی ہی برا جتنا ہٹلر کی نفرت یہود سے بری تھی" جیسے الفاظ شامل تھے۔ایک خط میں Grosvernor کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی گئی تھی۔جوں جوں تنازعہ نے شدت اختیار کی تو سوسائٹی کو Kansas کے سینیٹر Robert Dole تک کا خط موصول ہوا۔اس میں موصوف نے اس مسئلہ پر اظہار فکر کرنے کے علاوہ کنساس سٹی کے "جیوش کمیونٹی ریلیشنز بیورو" کا ایک لمبا سا خط بھی ملفوف کیا تھا۔

نیشنل جیوگرافک کے دفتر والے اس شوروغوغا سے بیحد حیران ہوئے کیونکہ دو ایسے جھگڑوں کے عادی نہ تھے۔ان کے خیال میں ایک معیاری مضمون کے اتنے ذرا سے حصہ پر یہ احتجاج مناسب نہ تھا۔

Grosvenor کا یہ کہنا کہ اس مضمون کی صحت کے بارے میں شام میں تعینات مغربی سفارت کاروں کے علاوہ امریکہ کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ڈیسک آفیسر متعلقہ شام بلکہ کئی ربیوں سے بھی۔ مشورہ کیا گیا اور انہوں نے متن میں کسی بھی قابل اعتراض بات کی نشاندہی نہ کی...... بالکل رائیگاں گیا۔

اس تنقید کا نقطہ عروج سوسائٹی کے دفتر واقعہ واشنگٹن کے باہر جون کے آخر میں امریکن جیوئش کانگریس کا ایک عوامی مظاہرہ تھا۔جب سوسائٹی کے اس شاندار عمارت میں واقع دفتر کے باہر پکٹنگ کا اس کے ایک Receptionist کو پتہ چلا تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ "بھئی مذاق مت کرو' کون ہم پر بپھرے گا؟"

A.J.C. کے ایسوسی ایٹ ایگزیکٹو ڈائریکٹر Phil Baum نے Grosvenor سے ملاقات کی

اور کہا کہ پکٹنگ اس لئے ضروری ہو گئی تھی کہ "نیشنل جیوگرافک" نے اپنی "غلطیاں" تحریری طور پر تسلیم نہ کی تھیں۔ نیشنل جیوگرافک سوسائٹی کے ۱۸۸۸ء میں برائے "جغرافیائی علم میں اضافہ اور ترویج" کے مقصد سے قیام کے بعد سے یہ پہلی پکٹنگ تھی۔ جب یہ پکٹنگ کرنے والے قریباً ۱۰۰ درجے کی گرمی میں پکٹنگ کر کے واپسی کے لے پر تول رہے تھے تو ایک نے "نیویارک ٹائمز" کے رپورٹر کو بتلایا "یہ جریدہ ایڈیٹر کے نام خطوط شائع نہیں کرتا۔ یہ ہمارا ایڈیٹر کے نام خط ہے۔"

Grosvenor کے خیال میں یہ پکٹنگ بنیادی طور پر AJC کے لیے چندہ جمع کرنے کا بہانہ تھا۔ "صاف سی بات ہے 'ڈالر آئیں گے' ڈالر جائیں گے۔ اس شہر میں آپ قلیل نوٹس پر پکٹنگ کرنے والے کرایہ پر لے سکتے ہیں۔" گو چند پکٹنگ کرنے والوں نے نیشنل جیوگرافک کے اسٹاف ممبران (جو باہر بات چیت کرنے گئے) سے پرزور بحث کی لیکن زیادہ تر خوش خلقی سے پیش آئے۔ بقول Grosvenor "ہم نے پکٹنگ کرنے والوں کو کافی اور خورد و نوش کی اشیاء تقسیم کیں بلکہ ہم نے کئی نئے ممبر بنالئے اس گروپ میں سے۔" اس کے ساتھ ساتھ Grosvenor نے اس دباؤ کو بھی نظرانداز نہ کیا جو AJC اور Baum نے ڈالا تھا۔ سوسائٹی نے اس واقعے کے بارے میں اداریہ لکھنے کا فیصلہ کیا...... یہ اس تنظیم میں پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔

یہ اداریہ جو Grosvenor نے ذاتی دستخطوں سے شائع کیا اس طرح تھا: "ہمیں اپنے بہت سے یہودی قارئین سے اس مضمون کی اشاعت کے بعد ایسی شہادتیں ملی ہیں کہ ہم نادانستہ طور پر ان مشکل حالات کی عکاسی میں ناکام رہے ہیں جو یہ چھوٹا سا گروپ (دمشقی یہودی) ۱۹۴۸ء سے برداشت کر رہا ہے...... ہمارے ناقدین سچ کہہ رہے تھے۔ ہم سے غلطی ہوئی۔"

پھر بھی سوسائٹی کا یہ "اعتراف جرم" شام میں واقع ہونے والے حالات کی تردید کرتا ہے۔ شام کی حکومت نے یہ متنازعہ مضمون ممنوعہ قرار دے دیا اور مصنف Izzi کو "صیہونی پروپیگنڈہ" پھیلانے کے الزام میں ناپسندیدہ شخصیت قرار دے دیا۔

ایک فوٹو کاپی مشین کا باؤلا ہو جانا

اسی دوران CBS-TV کو بھی اپنے پروگرام "۶۰-منٹ" کے ایک جزو میں جو شام میں یہودیوں کے بارے میں تھا' ایسی ہی صورت حال کا سامنا ہوا۔ یہ پروگرام بعنوان "اسرائیل کا سخت

ترین دشمن" ۱۶ر فروری ۱۹۷۵ء کو Mike Wallace نامہ نگار نے براڈ کاسٹ کیا۔ Wallace نے پروگرام کے آخر میں کہا کہ "شام کی یہودی آبادی کڑی نگرانی میں رہتی ہے۔" اس نے کہا کہ یہودیوں کو نقل وطن کی آزادی نہیں' انہیں خاص شناختی کارڈ رکھنے پڑتے ہیں اور شام کے اندر کہیں بھی سفر کرنے کے لیے انہیں حکام کو اطلاع کرنی ہوتی ہے۔ ان تمام پابندیوں کے باوجود ویلیس کا کہنا تھا کہ "شام کے یہودیوں کی زندگی پچھلے سالوں کے مقابلے میں اب بہتر تھی۔" ویلس نے اس دعوے کی بنیاد ان کئی انٹرویوز پر رکھی جو اس نے شام میں کئی یہودیوں سے کیے جو خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اچنبھے والا انٹرویو ایک یہودی استاد کے ساتھ جو کچھ یوں تھا:

ویلس: یہ تمام داستانیں کہ یہودیوں کے ساتھ شام میں بڑا برا سلوک ہوتا ہے' آخر آتی کہاں سے ہیں؟

ٹیچر: میرا خیال ہے کہ یہ صیہونی پروپیگنڈہ ہے۔

CBS کو غصہ بھرے خطوط کے سیلاب کا سامنا ہوا اور AJC نے اس رپورٹ کو "زیادتی پر مبنی' غیر صحیح اور مسخ شدہ" قرار دیا۔ F.C.C. اور نیشنل نیوز کونسل کو بھی احتجاجی مراسلے بھیجے گئے جب یہ شکایتیں لگاتار جاری رہیں تو ویلس کو احساس ہوا کہ اس کو پہلی مرتبہ "اس نام نہاد یہودی لابی کی دیانت دارانہ (بااصول) مہم سے سابقہ پڑا ہے...... گویا ایک کاپی کرنے والی مشین باؤلی ہوگئی تھی۔" Wallace نے یہ دیکھا کہ "دنیا بھر کے یہودی شام کے یہودیوں کے بارے میں ایک اچھی رپورٹ کو کسی نہ کسی وجہ سے اسرائیل پر حملہ کے مترادف قرار دیتے ہیں' کیونکہ شام' اسرائیل کا سخت ترین دشمن ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت ایک بھی شامی یہودی بطور سیاسی قیدی جیل میں بند نہیں ہے۔"

۷ر جون کو "۶۰۔ منٹ" کا شام کے بارے میں پروگرام جزو دوبارہ براڈ کاسٹ کیا گیا۔ اس مرتبہ وہ نکتہ چینی بھی شامل کی گئی جو موصول ہوئی تھی اور فلم کا مزید پس منظر بھی پیش کیا گیا۔ پروگرام میں ویلس کا یہ وعدہ بھی شامل کیا گیا کہ وہ واپس شام جاکر "مکرر معائنہ" کرے گا کہ شامی یہودی کسی حال میں ہیں؟

۲۱ر مارچ ۱۹۷۶ء کو جو دوسرا پروگرام براڈ کاسٹ ہوا' اسے دیکھ کر ان ناقدین کو مایوسی ہوئی جو یہ امید رکھتے تھے کہ ان کے الزامات صحیح ثابت ہوں گے۔ اس کے بجائے اس سے پہلے پروگرام

کی تصدیق ہوئی۔ ایک شامی یہودی (جو ۱۳ سال کی عمر میں شام سے بھاگ کر نیویارک میں آکر آباد ہو گیا تھا) کا کہنا تھا کہ شامی یہودی "عام طور پر اب جتنے خوشحال تھے، اتنے پہلے کبھی نہ تھے۔"

تب سے ناقدوں نے اپنے حملوں کا ہدف ویلس کی ذات کو بنالیا۔ درحقیقت AIPAC دس سال گزر جانے کے باوجود بھی اس پروگرام کی وجہ سے اس کے خلاف کینہ رکھتی ہے۔ فروری ۱۹۸۴ء کے AIPAC نیوز لیٹر "Near East Report" میں ایڈیٹر M.J. Rosenberg نے ایک ویلس مخالف تبصرہ لکھا۔ اسے ویلس کے ۸ر جنوری ۱۹۸۴ء کے اس اظہار رائے پر جو "۶۰-منٹ" میں براڈ کاسٹ ہوا سخت تشویش تھی کہ "شام کے عزت وافتخار کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی اتنی برملا ہتک آمیز بات نہیں کہ اسرائیل شام کی سرزمین یعنی جولان کی پہاڑیوں پر قابض ہے اور شام ان کو واپس لینا چاہتا ہے۔" Rosenberg کا تبصرہ تھا کہ ویلس "شام کے پروپیگنڈہ کا اس طرح آلہ کار ہے جیسے کہ وہ بعث پارٹی کی نوجوان قیادت کا ممبر ہو۔" ۷۷-۱۹۷۶ء کے تنازعہ کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ "ویلس نے اس قصے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ آخر کار مائیک ویلس بھی یہودی ہے۔ کیا اسے یہ ثابت کرنے کے لیے وہ خفیہ صیہونی نہیں ہے حد سے گزر جانا پڑتا ہے؟

دہشت گردی اور قتل کے بارے دہرا معیار

ویلس کے تنازعے کے دوران CBS ریڈیو بھی ایک طوفان کی زد میں آگیا۔ اس کے پروگرام "فرسٹ لائن رپورٹ" میں وہائٹ ہاؤس کے نامہ نگار Robert Pierpoint کا ایک متنازعہ بیان نشر ہوا، مارچ ۱۹۷۳ء میں جو کہ مشرق وسطیٰ کے بارے میں تھا، اس نے دو حالیہ واقعات پر توجہ مرکوز کرائی۔ ایک تو لبنان کے ۱۳۰ میل اندر واقع فلسطینی پناہ گزیں کیمپ پر کمانڈو طرز کا حملہ اور دوسری ایک لیبیا کے تجارتی ہوائی جہاز کو اس وقت کے اسرائیلی مقبوضہ صحرائے سینا پر مار گرانا جب کہ وہ بھٹک کر غلطی سے ادھر آگیا تھا۔ Pierpoint نے امریکہ کے عرب اور اسرائیلی جارحانہ اقدامات پر مختلف رد عمل ظاہر کرنے پر تبصرہ کیا۔

اس نے یہ کہا کہ ۱۹۷۲ء کے میونخ اولمپک کھیلوں میں اسرائیلی کھلاڑیوں کے قتل عام پر امریکہ نے صدر نکسن سے لے کر نیچے تک "انتہائی سخت مذمت کی۔" جبکہ ان دونوں حالیہ واقعات میں اسرائیل کے اقدامات میں سو سے زائد شہری ہلاک ہوئے، لیکن امریکہ میں کسی کے کان پر جوں تک

نہ رینگی۔ Pierpoint کا بے رحمانہ تجزیہ یوں تھا:

"اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس ملک میں دہشت گردی اور قتل بارے میں دوغلا معیار ہے۔ امریکی اتنے عرصہ دراز سے اسرائیلیوں کو اچھے لوگ اور عربوں کو برے لوگ سمجھتے رہے ہیں کہ ان میں سے اکثر کا جذباتی ردّ عمل ان کے پیچھے تعصبات پر مبنی ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دونوں اطراف نے ناقابل معافی دہشت گردی کی ہے۔ دونوں نے معصوم لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ طرفین کو نہ صرف ایک دوسرے سے جائز شکایات ہیں بلکہ ان کے اظہار کا طریقہ بھی ناجائز ہے۔" Pierpoint کو کچھ حیرانی نہ ہوئی جب اس نشریہ کے بعد CBS کے واشنگٹن اور نیویارک کے سوئچ بورڈ گھنٹوں احتجاجی کالوں سے جام رہے۔ اسے علم تھا کہ اس نے ایک ایسی نایاب رائے نشر کی ہے جو ریڈیائی لہروں پر کبھی بھی سنائی نہیں دی۔

یہ ردّ عمل اس قدر شدید ہوگیا کہ Pierpoint کو CBS انتظامیہ کے رویہ کے بارے میں تشویش ہوگئی۔ وائس پریزیڈنٹ Sandford Socolow نے اسے کہا: "Bob! تم مصیبت میں پھنس گئے ہو۔" ایک دوسرے CBS افسر Gordon Manning نے اضافہ کیا "یہ تمہارے حق میں نیک نہیں لگتا۔" حالانکہ ان دونوں اشخاص نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ یہ کومنٹری پیشہ ورانہ اقدار کی حامل ہے اور اس کا دفاع ہونا چاہئے۔ جب وہ Salant کے دفتر اس معاملے پر تبادلہ خیال کرنے گئے تو انہیں جلد ہی پتہ چل گیا کہ Salant نے پیشتر ہی دباؤ کے آگے سر نہ ڈالنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ Salant کا کہنا تھا "کیا ہی شاندار براڈ کاسٹ کی ہے Pierpoint نے۔" گویا CBS کے پیشوائی نظام میں تو معاملہ طے تھا۔

بہرحال Pierpoint کے لیے یہ تنازعہ جاری تھا۔ اسے اس نشریہ کے بارے میں ۴۰۰ سے زائد خطوط موصول ہوئے۔ کچھ میں اسے "ایک بد طینت Anti-Semite کہا گیا اور اس کی رپورٹ کو "گوئبلز کی پروپیگنڈہ مشین کی مانند" قرار دیا گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس تبصرے نے اسے کچھ امریکی یہودیوں کی نظر میں "عوام دشمن" بنادیا تھا۔

اس "فرسٹ لائن رپورٹ" نشر ہونے کے تھوڑی دیر بعد Ted Koppel نے ABC ریڈیو کی۔ "ورلڈ آف کومنٹری" میں اس Pierpoint مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا۔ Koppel نے اسرائیل لابی کے فوری ردّ عمل کا ذکر کرتے کہا:

"A.D.L. نے فوری ردّ عمل کا مظاہرہ کیا۔ اگلے ہی دن ADL کے علاقائی دفاتر نے خطوط ارسال کر دیئے۔ ان میں Pierpoint رپوٹ کی نقول ملفوف تھیں اور اپنے حلیفوں سے یہ درخواست کی کہ وہ اپنے اپنے مقامی CBS کے ساتھ الحاق رکھنے والے ریڈیو اسٹیشنوں کو اپنے احتجاج روانہ کریں۔

اس طرح کا منظم راگ الاپنے والا "فوری ردّ عمل" جو ADL سے آتا ہے وہ مجھے اسی قدر پریشان کرتا ہے جتنا کہ وہ اگر کسی سیاسی جانبدار گروپ سے آئے۔ یہ ڈرانے دھمکانے کا ایک حربہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ A.D.L. والے Robert Pierpoint کو برخواست کروانے کے پیچھے نہ پڑے ہوں گے۔ کیونکہ وہ ایک شائستہ اور ذمہ دار رپورٹر ہے لیکن مجھے شک ہے کہ وہ آئندہ کسی ایسی کمنٹری کو کرنے سے پہلے جو A.D.L. کو ناراض کرنے کا باعث بن سکے بہت طویل غور و خوض کرے گا...... یہی وجہ ہے کہ میں نے یہ تبصرہ کیا ہے۔ امریکہ کے اخباری نامہ نگار آج کل کسی سے بھی خائف ہونے کے متحمل نہیں۔"

بہرصورت ڈرانے دھمکانے کا یہ حربہ کارگر رہا۔ Pierpoint نے اس دباؤ کے ماتحت اپنے تصنیف "White House Assignment" میں سے وہ باب خارج کر دیا جس میں اس نشریہ اور اس پر ہونے والے شور و غوغا کا ذکر تھا۔ اس باب کے مسودہ میں Pierpoint نے لکھا ہوا تھا کہ "ایک بہت طاقتور یہودی تاجروں اور یہودی قومی تنظیموں کے نمائندوں نے CBS سے ملحق واشنگٹن کے ریڈیو اسٹیشن WTOP سے اس کی تردید جاری کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔"

اس خارج شدہ باب میں Pierpoint نے بے لاگ طریقے سے اپنے اخباری نامہ نگاری کے کام پر اس واقعہ کا اثر بیان کیا تھا۔ "اس کے کئی ماہ بعد تک میں نے مشرق وسطیٰ کا ذکر جان بوجھ کر دورانِ نشریات نظرانداز کیا۔" اس کی کتاب کے ناشر کے ایک بک ایڈیٹر Elisabeth-Jakab کا کہنا تھا کہ یہ متنازعہ باب باقی ماندہ کتاب پر سے توجہ ہٹادے گا۔ بقول اس کے یہودی کتابیں خریدنے میں پیش پیش ہوتے ہیں اور وہ شاید اس کتاب کا بائیکاٹ کر دیں۔ Putnam کے ایک اور اسٹاف ممبر نے بھی ایسی ہی نصیحت کی۔ "Joel Swerdlow" نے مجھے بتلایا کہ اسے وہ باب پسند نہیں آیا۔ گو اس نے یہ تسلیم کیا کہ وہ اس موضوع پر جذباتی ہے کیونکہ وہ بھی یہودی ہے۔ اس نے مشورہ دیا ہے کہ میں متن کو تبدیل یا حذف کر دوں۔" Pierpoint کا کہنا تھا کہ "آخر کار میں نے

ہتھیار ڈال ہی دیئے۔"

Pierpoint یہ تسلیم کرتا تھا کہ یہ دباؤ اس کے خود ساختہ سنسر کرنے کے فیصلہ کے ماوراء اپنے ہدف تک پہنچا۔ "جب سے اس شدید ردّعمل کا سامنا کیا ہے' مجھے سامعین یا ناظرین کے ساتھ بحث میں الجھنے کے امکان کا بیحد خیال رہتا ہے۔ اسی واسطے مجھے جب بھی کبھی اس قسم کے موضوع پر براڈ کاسٹ کرنے یا کسی اور کام کا انتخاب کرنے کا موقع ملتا ہے تو میں وہ دوسرا کام منتخب کر لیتا ہوں۔ کوئی بھی لگاتار بحث و مباحثہ نہیں کرنا چاہتا' خصوصاً جب کہ وہ لوگ جن کے ساتھ آپ اتفاق نہیں کرتے' وہ آپ کو پسند بھی ہوں اور قابل تعریف بھی۔"

"اس ہولناک شی کو ٹھیک کرو"

۱۹۸۱ء کے دوران Seattle میں کنگ براڈ کاسٹنگ کے بورڈ کے چیئر مین Patsy Collins کو شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اس نے اسرائیل اور غربی کنارہ کے بارے میں رپورٹوں کا ایک سلسلہ نشر کیا تھا۔ لبنان پر اسرائیلی حملے سے کچھ ہی دن پہلے اس نے ایک فنی ٹیم کے ہمراہ غربی کنارے کے چند جگہوں کا دورہ کیا جن میں Bir Zeitty University یروشلم میں عبرانی یونیورسٹی اور اسرائیل کنشت (Kenesst یعنی پارلیمنٹ) بھی شامل تھے۔ انہوں نے چار چار منٹ کے ۸ حصے تیار کئے جنہیں شام کی ٹی وی خبروں میں آٹھ روز مسلسل دکھلایا گیا۔ ان رپورٹوں میں اسرائیلی انتظامیہ تلے فلسطینیوں کے رہن سہن کی عکاسی کی گئی تھی۔ اختتامیہ کے طور پر ایک تیس منٹ کی دستاویزی فلم تیار کی گئی تھی۔ گو عوام کا ردّعمل نرم تھا لیکن AJC اور ADL کے مقامی سربراہان نے ریڈیو اسٹیشن کا دورہ کیا تا کہ "اس ہولناک شی کو ٹھیک کر سکیں۔" انہیں ان کے مطالبہ پر یہ فائنل دستاویزی فلم براڈ کاسٹ ہونے سے پہلے نجی طور پر دکھلائی گئی۔ جب وہ اس میں کچھ نقائص تلاش نہ کر پائے تو اس کے "لہجہ اور طرز ادائیگی" پر تنقید کی۔ فون پر جو شکایات ملیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ Collins پر .P.L.O کے تنخواہ دار ہونے کا الزام تھا۔

سان فرانسسکو میں اسرائیلی قونصل جنرل Mordecai Artzielt نے ٹیلی فون کر کے درشت لہجہ میں مطالبہ کیا کہ "اس جھوٹ کی تردید کے لئے" نشری اوقات مختص کئے جائیں۔ Portland اور Seattle کے کنگ ریڈا اسٹیشنوں نے اس پروگرام کے اختتامیہ پر عربوں اور اسرائیلی

نمائندوں کے درمیان تیس منٹ کے مباحثہ کے پروگرام کی حامی بھر لی جس میں اس براڈ کاسٹ کمپنی کے اسٹاف ممبر نے رابطہ کار کے فرائض انجام دینے تھے۔ یہ مجوزہ مباحثہ صرف اس لئے نہ ہو سکا کہ کوئی بھی یہودی نمائندہ ایک امریکی عرب کے ساتھ نشری اوقات میں حصہ لینے کو تیار نہ تھا۔ Collins کا خیال ہے کہ اس انکار میں قونصل Artziel کا ہاتھ تھا۔

اپنے تجربہ کو یاد کرتے ہوئے "Miss Collins" کا کہنا تھا: "میرے خیال میں ذرائع ابلاغ پر کوئی اسرائیلی یا یہودی کنٹرول نہیں ہے۔ یہ ان کا اثر و نفوذ ہے اور لوگوں پر اثر صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ خود اس کو اپنے اوپر طاری ہونے دیں۔"

۱۹۸۲ء کے لبنان پر اسرائیلی حملہ میں یہ سب نکتہ چینی تحلیل ہو گئی۔ اس کے دوران Collins نے خود اس نیٹ ورک میں ایسی خامیوں کی نشاندہی کی جس سے جنگ کے روزمرہ واقعات کی پوری تفصیل نشر نہ ہو پاتی تھی۔ اس حملہ کے شروع میں NBC اس کی خبریں لبنان سے نہیں بلکہ اسرائیل سے بھجوا رہا تھا۔ NBC کی فلمانے والی ٹیموں کی شجاعت کے باوصف جو وہ اسرائیلی افواج کی بیروت کی جانب پیش قدمی میں دکھلا رہی تھیں' "NBC Nightly News" صرف اسرائیلی افواج کا لبنان کی طرف بڑھنا دکھلا رہی تھیں۔ علاوہ ازیں ان رپورٹوں میں اکثر عربوں کے زیر استعمال ہتھیاروں کو "سوویت ساختہ" بتلایا جاتا جبکہ یہ کبھی نہ کہا جاتا کہ اسرائیلی "امریکی ساختہ" F-16 یا "امریکی ساختہ" ٹینک استعمال کر رہے ہیں۔

NBC کا تبصرہ بھی Alexander Cockburn کے ساتھ ساتھ جاری تھا' جس نے اپنے کالم "Village Voice" میں یہ کہا تھا کہ "نیویارک ٹائمز" کے ایڈیٹران نے Thomas Friedman کی ۳ اگست کی رپورٹ میں اسرائیل کی بیروت پر بمباری کی خبر میں سے لفظ "Indiscriminate" خارج کر دیا تھا۔ یہ عمل "Times" کی عمومی پالیسی کی خلاف ورزی تھا۔ فرائیڈمین نے ایک لمبی تار بھیج کر اپنی جھنجھلاہٹ کا یوں اظہار کیا: "میں ایک بیحد محتاط رپورٹر ہوں۔ میں مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتا...... آپ کو علم تھا کہ میں صحیح ہوں اور میری رپورٹ اس لفظ کی تصدیق کرتی تھی' لیکن آپ میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ اسے "نیویارک ٹائمز" میں شائع کریں۔ آپ اپنے قارئین اور ممکنہ معترضین کو یہ بتلانے سے ڈرتے تھے کہ اسرائیلی ایک پورے شہر کو بلا امتیاز بمباری کا نشانہ بنانے میں قطعاً نہیں ہچکچاتے۔"

"NBC پر اسرائیل مخالفت کا الزام"

Patsy Collins کے علاوہ Alexander Cockburn ‘Richard Broderick اور کئی دیگر نامہ نگاروں کے NBC کی اسرائیل نواز تعصب کی مثالیں دینے کے باوجود نیویارک میں اس نیٹ ورک کے آٹھ مجموعی ریڈیو اسٹیشن ۱۹۸۳ء میں اس الزام کے ماتحت دباؤ کا شکار ہوئے کہ "NBC Nightly News" لبنان کی جنگ کی رپورٹنگ میں اسرائیل مخالف تعصب کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ نیویارک کی ایک لابی کرنے والی تنظیم "امریکن برائے محفوظ اسرائیل" (AFSI) نے F.C.C. کو درخواست دی کہ ان آٹھ ریڈیو اسٹیشنوں کے اجازت نامے منسوخ کر دیے جائیں۔ AFSI کے ڈائریکٹر Peter Goldman نے NBC کے خبریں پیش کرنے کے انداز کو "عرب نواز" اور "قصداً خبروں کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا" قرار دیا۔ گولڈمین نے اپنی اس NBC مخالف مہم میں ایک فلم بعنوان "لبنان میں NBC ذرائع ابلاغ کی دروغ گوئی کا ایک مطالعہ پیش کی۔ واشنگٹن کی ایک یہودی کمیٹی نے بھی اس کی حمایت کی جو ایسے تعصب کی "واشنگٹن پوسٹ" میں اشاعت کی روک تھام کے لیے قائم ہے۔

NBC News کے پریزیڈنٹ Lawrence K. Grossman نے AFSI کے ان الزامات کو "جھوٹے اور بے بنیاد" قرار دیا۔ اس فلم میں NBC News کی خبروں کو توڑا مروڑا گیا تھا اور کئی اہم پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کیا گیا تھا۔ بقول اس کے "کولمبیا جرنلزم ریویو" NBC کی خبروں کے "مجموعی توازن" کی تعریف کی تھی اور "واشنگٹن جرنلزم ریویو" نے AFSI کی فلم پر تنقید کی تھی کہ اس میں لبنان جنگ کی خبروں کو "اپنی مرضی کے مطابق ڈھالا" گیا تھا۔ ۱۹۸۴ء کے اوائل میں FCC نے ایسی ہی سات درخواستوں کو مسترد کیا تھا جو نیو انگلینڈ کے مجموعی ریڈیو اسٹیشنوں کے بارے میں دی گئی تھیں۔ اس گروپ نے دباؤ ڈالنا جاری رکھا اور ان درخواستوں پر نظر ثانی کر کے پھر دائر کر دیا۔

ذرائع ابلاغ کا گلا گھونٹنے کی ان کوششوں میں اسرائیل کی طرف سے مہیا کردہ بیس لاکھ ڈالروں سے امداد کی جاتی ہے۔ مقصد یہ ہوتا کہ جن تبصروں، خبروں کو اسرائیل کے غیر موافق سمجھا جائے، ان کا توڑ کرنے اور امریکنوں کو یہ سمجھانے کے لیے کہ "اسرائیلی نفیس اور ملنسار لوگ ہیں نہ کہ خونخوار جنگجو۔" یہ رقم استعمال کی جائے۔

"واشنگٹن پوسٹ" کے Willaim Branigin نے بھی اسی واقعہ کی رپورٹنگ کی لیکن اس

کے ایڈیٹروں نے یہ لفظ "Indiscriminate" اپنی صفحہ اول کی شہ سرخیوں میں سے خارج نہ کیا' البتہ اسی عرصہ کے دوران Post کے نیوز رومز میں ایڈیٹروں کو ڈرانے دھمکانے والے لوگوں کے موجود ہونے کا مشاہدہ ہوا۔

"نیوز روم میں لابی کا نمائندہ"

"واشنگٹن پوسٹ" نے گذشتہ کئی برسوں سے مشرق وسطیٰ کے واقعات کی اشاعت میں ایمانداری برتنے پر خصوصی توجہ مرکوز رکھی۔ اسرائیل نواز گروپوں کی اس شکایت پر کہ وہ لبنان کی خبروں میں جانبداری برت رہے ہیں۔ (خاص طور پر صابرہ اور شطیلہ کے قتل عام پر) ایک ایسا اقدام کیا گیا جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی اور وہ تھا Post کے نیوز روم میں اسرائیل نواز گروپ کے ایک نمائندے کی بطور مبصر تعیناتی۔

یہ خیال اس وقت پیدا ہوا جب Post کے ایڈیٹروں کے ساتھ "عظیم تر واشنگٹن" کی JCC کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر Michael Berenbaum کونسل پریزیڈنٹ Nathan Lewin اور امریکن جیوش کمیٹی کے نمائندے Hyman Bookbinder نے ملاقات کی تاکہ وہ اس کو بتلا سکیں کہ جریدہ کو "یہودی مسئلہ" درپیش تھا۔ یہ میٹنگ Post کے ایڈیٹروں اور یہودی فرقہ کے لیڈران کے مابین طویل خط وکتابت کے بعد ہوئی۔ ایک رعایت کے طور پر ایگزیکٹو ایڈیٹر Benjamin C. Bradlee نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ Berenbaum ایک ہفتہ تک Post کا نیوز آپریشن ملاحظہ کرے۔ لیکن شرط یہ تھی کہ وہ "ادارتی معاملات میں بالکل کوئی مداخلت نہ کرے" اور نہ لابی کرے۔

Post کے عملے کے بہت سارے اراکین اس طرح معائنہ کے ماتحت کام کرنے پر کچھ خوش نہ تھے۔ کالم نگار Nick Thimmesch کو یہ تجربہ بہت "خوفزدہ کر دینے والا" محسوس ہوا۔ بقول اس کے ایک رکن کا کہنا تھا کہ "پیشتر اس کے کہ آپ کو پتہ چلے' کوئی اور بھی یہاں آگھسے گا۔" بیشتر اراکین کی یہی رائے تھی۔ Post کے محتسب کا کہنا تھا کہ یہ ہفتہ ایک "قابل قدر تجربہ" تھا "یہ بے قاعدہ تو ضرور ہے لیکن اخبارات پر جو چاند ماری ہو رہی ہے وہ بھی تو ایسی ہی ہے۔" لیکن تمام دوسرے بڑے بڑے جریدوں کے ایڈیٹران اس سارے قصہ پر جز بز تھے۔ "بوسٹن گلوب" کے ایڈیٹر Thomas Winship کا تبصرہ تھا کہ "Post پر JCC کا جو دباؤ تھا اس کا مجھے ادراک ہے۔ Post پر جو گزری اس

پر مجھے اس کے ساتھ ہمدردی ہے' لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ میں ایسا نہ کرسکتا۔" لاس اینجلیز ٹائمز کے فارن نیوز کے ایڈیٹر Robert Gibson نے Post کے فیصلہ کو نامناسب قرار دیتے ہوئے کہا "سچ پوچھئے تو یہودیوں کے لئے ایسا کرنا اور عربوں کو محروم رکھنا میری سمجھ میں تو نہیں آیا۔"

جب فروری ۱۹۸۲ء میں Moshe Arens واشنگٹن میں بطور اسرائیلی سفیر وارد ہوا تو اس نے امریکن اخبارات میں اسرائیل کے بارے میں جو خبریں شائع ہوتی تھیں ان کی مانیٹرنگ شروع کروادی۔ اس کے حساب سے جہاں تک اسرائیل اور مشرق وسطیٰ ۱۹۸۲ء کے بارے میں خبریں شائع کرنے کا تعلق تھا' واشنگٹن پوسٹ سب سے زیادہ منفی رویے کا حامل تھا۔ Arens کو یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ ۱۹۸۲ء کے موسم خزاں میں صابرہ اور شطیلہ کے ہزاروں پناہ گزینوں کے سفاکانہ قتل عام نے "اس گراف کو نچلی ترین سطح پر پہنچادیا تھا" کم از کم اس سروے کے دوران۔

ان گرافوں اور نقشہ جات سے مسلح ہوکر Arens نے اپنے نتائج کو Post کے ادارتی صفحات کے ایڈیٹر Meg Greenfield کے روبرو پیش کیا۔ وہ امریکہ کے صحافتی حلقوں میں معتبر ترین تھا۔ اس نے ان نتائج کی بنیاد ہی کو غلط قرار دیا۔ اس نے احتجاجاً کہا کہ Post نے اپنی "ایمانداری کے پیمان" کو قائم رکھا تھا کیونکہ اس نے "اسرائیلیوں اور عربوں دونوں کے جس قدر بھی اہم افراد جن کے بارے میں ہم کچھ کہہ سکتے تھے اپنے ادارتی صفحات پر جگہ دی تھی۔" اس متنازعہ اسرائیلی حملہ کے دوران جن حضرات کے تبصرے شائع کئے گئے ان میں اسرائیلی وزیر خارجہ Yitzhak Shamir, Alfred Friendly, Henry Kissinger, Abba Eban, Shimon Peres اور Arens خود بنفس نفیس شامل تھے۔ دو معزز اسرائیلی اخبارات کے اداریے بھی Post میں شائع کئے گئے تھے۔

Arens نے صرف ایک اور اخبار یعنی "بوسٹن گلوب" سے ہی رابطہ کیا۔ اس کے خیال کے مطابق اس اخبار کا اسرائیل اور مشرق وسطیٰ کی خبریں شائع کرنے میں بہت منفی رویہ تھا۔ ایڈیٹر Winship کا کہنا تھا کہ Arens پنجے جھاڑ کر امریکن پریس کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ اسرائیل کے حق میں تعصب برت رہے ہیں' اس کے خیال میں "بقول Arens کے 'گلوب' سب اخبارات میں منفی ترین رویے کا حامل تھا۔" اس نے مقامی یہودی آبادی کو بھی یہی تاثر دیا۔

Greenfield کی طرح Winship نے بھی اس اسرائیلی پیمانہ کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ "میرے خیال میں اس طرح کی فہرست بنانا تو نکسن کے دشمنوں کی فہرست بنانے کے مترادف ہے

اور یہ ذرائع ابلاغ کو خوفزدہ کرنے کی کوشش ہے۔" گلوب کے ایک اور اسٹاف ممبر Ben. Bradlee, Jnr. نے Arens اور اخبارات کے ایگزیکٹوز کے درمیان اجلاس کو "یروشلم کی ایک غیر معمولی بہادرانہ کوشش' امریکن پریس کو مدافعانہ رویہ اختیار کرنے اور رائے بنانے والے افراد کو اپنا پیغام سنانے کی" کوشش قرار دیا۔

"اشتہارات روک لینے" کا دباؤ

اسرائیلی مفادات کے خلاف قیمتاً شائع ہونے والے اشتہارات کو رد کر دینے کے لیے ۱۹۸۲ء کے اواخر میں میری لینڈ' پنسلوینیا اور ڈسٹرکٹ آف کولمبیا کے بڑے بڑے ذرائع ابلاغ پر دباؤ ڈالا گیا۔

The National Association of Arab Americans (NAAA) جو کہ واشنگٹن میں قائم شدہ ایک نجی ممبران کی تنظیم ہے' نے ریڈیو کا وقت خریدا تاکہ وہ ان علاقوں میں حکومت امریکہ کے اسرائیل کو امداد بڑھا دینے کے فیصلہ پر نکتہ چینی کر سکیں۔ یہ پیغامات اس طرح کے تھے جیسے یہ پنسلوینیا میں نشر ہونے والا پیغام:

"ایک طرف ایک کروڑ بیس لاکھ (120 ملین) امریکی بے روزگار ہیں' جن میں سے صرف پنسلوینیا میں ہی اس تعداد کا نصف سے زائد ہے اور دوسری طرف کانگریس نے اسرائیل کو آپ کے ٹیکسوں کے ڈالروں میں سے دو ارب اڑتالیس کروڑ اور پچاس لاکھ ڈالر بطور امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ سینیٹر Arlen Specter (ڈیموکریٹ' پنسلوینیا) جو کہ Senate Appropriations Committee پر تعینات تھا' وہ تو اسرائیل کو اس سے بھی زیادہ عطیہ کرنا چاہتا تھا۔ کیا اسرائیل کو رقوم دینا پنسلوینیا کو رقوم دینے سے بھی زیادہ اہم ہے؟ اپنے سینیٹرز کو فون کال کر کے پوچھیں کہ آیا انہوں نے آپ کے ٹیکس ڈالر کو اسرائیل کے حوالے کرنے کے لیے ووٹ دیا ہے؟"

N.A.A.A. نے پنسلوینیا کے تیرہ ریڈیو اسٹیشنوں پر یہ پیغام نشر کرنے کا معاہدہ کیا۔ یہ اشتہار پانچ دن لگاتار چلانے کا معاہدہ تھا لیکن چار ریڈیو اسٹیشنوں نے تین دن کے بعد یہ اشتہار منسوخ کر دیا۔ ان میں دو اسٹیشنوں کے اشتہار سیلزمین Mike Kirtner نے N.A.A.A. کو مطلع کیا کہ یہ اشتہار اس لئے منسوخ کئے گئے تھے کہ "ان کی وجہ سے بہت سی نفرت بھری کالیں آ رہی تھیں۔ ان اشتہارات کو بند کرنے کے لیے اسٹیشن پر بیحد دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔" اسٹیشن انتظامیہ نے

اس پر تبصرہ کرنے سے گریز کیا کہ یہ دباؤ کن عناصر کی طرف سے ڈالا جا رہا تھا۔ ایک اسٹیشن "ERIE" جس نے یہ اشتہار منسوخ کئے تھے۔ ان کے سیلز مین Mike George نے زیادہ صاف گوئی سے کام لیا۔ اس نے .N.A.A.A کو بتلایا کہ اس اسٹیشن کے مالک سے "یہودی تاجروں کے ایک گروپ نے آکر ملاقات کی اور کہا کہ اگر یہ اشتہار فوراً بند نہ کیا گیا تو وہ اس کے ریڈیو اسٹیشن کو لاکھوں ڈالر کا نقصان پہنچائیں گے۔"

Maryland میں بھی .N.A.A.A نے ایسا ہی اشتہار دیا اور کانگریس کے ممبر Clarence "Doc" Long (D-MD.) کی نشاندہی کی جو اسرائیل کو امداد بڑھانے پر اصرار کر رہا تھا۔ یہ اشتہار واشنگٹن کے چار اور بالٹی مور کے چار ریڈیو اسٹیشنوں پر نشر ہوا۔ پھر بھی کئی ریڈیو اسٹیشنوں نے اسے Anti-Semitic کہہ کر نامنظور کر دیا۔

بعد ازاں .N.A.A.A نے کیلیفورنیا میں بھی سان فرانسسکو' سان ماتیو' برکلے اور سانٹا کلارا کے ریڈیو اسٹیشنوں کو بھی اس اشتہار کو نقد ادائیگی کرنے کے باوجود نشر کرنے پر رضامند نہ پایا۔ یہ اس کے باوجود تھا کہ کئی مقامی اخبارات نے .N.A.A.A کے حق آزادی اظہار رائے کے بارے میں ادارتی تبصرے لکھے۔ ان اسٹیشنوں نے اس انکار کی کوئی وجہ نہ بتلائی۔

.N.A.A.A کے کمیونکیشنز ڈائریکٹر Ron Cathel کے لیے یہ حیران کن نہ تھا:

"یہ ہمارے ساتھ پیشتر بھی ہو چکا ہے۔ لوگوں کو ہمارے اشتہار نشر کرنے یا ہمارے ساتھ "ٹاک شو" کرنے پر مالی نقصان اٹھانے کی دھمکیاں دی گئیں۔ (لیکن) جتنا اب ہو رہا ہے پہلے نہ تھا۔ موجودہ ہفتہ کافی رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔"

Cathell کا مزید کہنا تھا: "(مشرق وسطیٰ) تنازعہ طے کرنے کا واحد راستہ اس بارے میں بات چیت کرنا ہے اور اگر ہم یہاں امریکہ میں اس کے بارے میں بات چیت نہیں کر سکتے تو ان سے مشرق وسطیٰ میں بات چیت کی توقع کیسے رکھیں گے؟"

اختتامیہ

تلافی مافات

اس کتاب کے لیے مواد جمع کرنے کے دوران مجھے کئی پریشان کن سوالات کا سامنا رہا۔ کیا میرا کانگریس کی ممبری کے دوران اسرائیلی لابی کے سامنا کرنے کا تجربہ "صرف سیاست" تھا یا اسرائیلی پالیسی کے خلاف نکتہ چینی کو ختم کرنے کی ایک عمومی کوشش؟...... کیا حکومت کے دوسرے عمال اور کانگریس ممبران کو بھی ایسے ہی دباؤ کا سامنا ہے؟...... دوسرے پیشوں میں مصروف لوگوں پر کیا بیتتی ہے؟...... کیمپس (یونیورسٹی) پر' تجارت میں' منبر پر' نیوز روم میں' روزمرہ زندگی میں؟ مجھے جو جوابات ملے وہ حوصلہ افزا نہیں' انہیں صرف ایک فقرہ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

"ریاستہائے متحدہ امریکہ میں آزادی رائے کو ایک خطرناک بحران کا سامنا ہے"

صاف نظر آتا ہے کہ اکثر امریکی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک بیحد پیچیدہ اور حوصلہ شکن موجودہ مسئلہ یعنی عرب' اسرائیل تنازعہ پر کھل کر بات نہیں کرسکتے۔ جن چند لوگوں نے اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے' انہیں اپنے ایک آزاد اور کشادہ نظر معاشرے کے محبوب تصور کے بارے میں ناامیدی کا سامنا ہوا ہے۔ دوسرے تنازعات کے برعکس۔ اس میں بحث کے ایک فریق کے لیے ایمانداری سے اختلاف رائے کی گنجائش ہی نہیں۔ صرف اسرائیلی نکتہ نظر ہی کی وکالت بغیر کسی خوف کے ممکن ہے۔

جو بھی اسرائیلی پالیسی کو تسلسل سے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں انہیں بے رحم اور تکلیف دہ انتقام کا سامنا ہوتا ہے حتیٰ کہ ان کا روزگار بھی چھن جاتا ہے۔ یہ اسرائیلی لابی کرتی ہے۔ پریزیڈنٹ بھی اس سے خوف کھاتے ہیں۔ کانگریس بے چون وچرا ان کے احکامات بجالاتی ہے۔ بڑی بڑی معتبر

یونیورسٹیاں ان تعلیمی پروگراموں اور گرانٹس سے دامن بچاتی ہیں جن کی یہ مخالفت کرتی ہے۔ ذرائع ابلاغ کے قد آور ممبران اور فوجی لیڈر اس کے دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ان کی آراء اور دلائل کے حسن و قبح کو پرکھا جائے۔ اسرائیل کے ناقدین کو معاً اپنی نیتوں پر شک 'بنیادی اخلاقی اقدار پر شک اور دیانتداری پر حرف گیری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی معتدل نکتہ چینی کریں۔ انہیں تیل کی لابی کے زر خرید غلام...... عرب دہشت گردوں کے حمایتی بلکہ Anti-Semitic کہا جاتا ہے۔

یہ Anti-Semitism کا الزام کافی تشویشناک ہے کیونکہ یہ روز افزوں زیادتی سے استعمال کیا جارہا ہے۔ ذرا Ben Meed کی بات دھیان سے سنئے گا جو کہ "American Gathering of Jewish Holo-Caust Survivors" کا صدر ہے۔

بقول اس کے "برسوں گزرے وہ اسے Anti-Semitism کہتے تھے۔ آج کل وہ اسے Anti-Zionism کہتے ہیں لیکن یہ درحقیقت ایک ہی بات ہے۔" گویا دوسرے لفظوں میں اس تعریف کے لحاظ سے اگر آپ اسرائیل کی مخالفت کر رہے ہیں تو گویا آپ تمام یہودیوں کی مخالفت کر رہے ہیں۔

Anti-Semitism کی اصطلاح اب موجودہ حیثیت میں اپنا نسلی اور مذہبی سراغ گم کر چکی ہے۔ اب اس کا صرف ایک ہی مطلب ہے کہ آپ حکومت اسرائیل کی تمام پالیسیوں کے ساتھ اتفاق کرنے سے انکاری ہیں۔ اب اس کا اطلاق کسی قابل نفرت معاشرتی واقعے پر نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک الزام ہے جو اسرائیل نواز حلقے بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ اب گو یہ لفظ اس نسلی اور مذہبی کٹرپن 'ہٹ دھرمی کا غماز نہیں رہا جس نے اس کو اصل میں وہ معنی عطا کئے لیکن اسرائیل نواز حلقوں نے یہ دیکھا کہ Anti-Semitism کا صرف الزام لگانا ہی اکثر ناقدین کو خاموش کرا دیتا ہے۔ یہ عرب 'اسرائیل تنازعہ کی بحث کا گلا گھونٹنے کے لیے ایک مؤثر ہتھیار کا کام دیتا ہے۔ امریکہ میں یہ بہت سے مذہبی اور لادین دونوں طرح کے لوگوں کو اپنی باتیں خود ہی سنسر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ وہ سچائی کی بنیاد پر نہیں کرتے بلکہ اس بناء پر کہ ان کے الفاظ کو اسرائیلی لابی کیا معنی پہنائے گی۔ یہ وہ خاص گروپ ہے جو کہ صرف ناقدوں کا منہ بند رکھنے میں ہی دلچسپی رکھتا ہے۔

یہ لابی پہلے ہی اپنے ممبران کی تعداد سے کہیں زیادہ اثر و نفوذ حاصل کر چکی ہے۔ اس کی

صفوں میں سرگرم افراد امریکہ کی کل آبادی کا بہت یہ ننھا منا حصہ ہیں لیکن قومی الیکشن میں فیصلہ ساز ریاستوں میں ان کی آبادی کا ارتکاز' اور ساتھ ہی ان کی مہم بازی کے لیے پیسہ جمع کر لینے کی نادر اہلیت کو ملا کر ان کا عوامی رائے پر سیاسی اثر و نفوذ اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا کہ خالی ان کی تعداد سے ہونا چاہیے۔ اس لابی کے اراکین جس قدر خلوص اور صدق نیت سے اپنے مقاصد کے لیے بطور عبادت کام کرتے ہیں وہ اور بھی معنی خیز ہے' وہ بڑی دریا دلی سے اپنا وقت' پیسہ اور قوت صرف کرتے ہیں۔ بہت سے حکومت' اطلاعات عامہ' تعلیم اور سیاست کے شعبوں میں لیڈر ہیں۔ ان کی سرگرمیوں کو کھلے عام امداد تو اسرائیل کا واشنگٹن میں سفارت خانہ اور بڑے بڑے شہروں میں ان کے قونصل خانے مہیا کرتے ہیں اور چوری چھپے امداد MOSSAD کے واسطہ سے امریکہ بھر میں مہیا کی جاتی ہے۔ یہ اسرائیل کا خارجی سراغ رسانی کا ادارہ ہے۔

اس لابی کی اختلاف رائے کا گلا گھونٹنے میں کامیابی بیحد حیران کن ہے خاص طور پر کانگریس میں۔ انتخابات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سے یہودی اور امریکی لوگ مجموعی طور پر اسرائیل کی کئی پالیسیوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ عام حالات میں یہ تقسیم ان کے نمائندوں کے ووٹنگ ریکارڈ اور بیانات سے جھلکنی چاہیے۔ لیکن اس مسئلہ میں ان لوگوں کے خیالات و نظریات کی نمائندگی نہیں ہوتی۔ درحقیقت عرب' اسرائیل تنازعہ پر کانگریس کے ممبران کے بیانات اور نجی افراد کے خیالات و نظریات میں جو خلیج پائی جاتی ہے وہ اغلباً کسی اور موضوع پر نہیں پائی جاتی۔

اس لابی نے ہمارے اداروں کی آزادی کو استعمال کر کے آزادی اظہار رائے کا صفایا کر دیا ہے۔ اکثر معاملات میں وہ قانون کے الفاظ کی تو پاسداری کرتے ہیں لیکن اس کی روح' یعنی ایمانداری اور برداشت کرنے کی صفت کو ملیا میٹ کر دیتے ہیں حالانکہ یہ عوامی بحث و مباحثہ کے لیے کلیدی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ عملی طور پر اپنے مخالفین کو آزادی رائے کے دستوری حق سے محروم کر دیتے ہیں۔ اس بات کا ادراک ہونا کہ آپ کے بے لاگ تبصرہ سے لوگ اختلاف کریں گے' ایک الگ بات ہے۔ لیکن یہ معلوم ہونا کہ وہ آپ پر الزام تراشی کریں گے اور آپ کی شہرت کو تباہ و برباد کر دیں گے ایک بالکل دوسری بات ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح کے انتقام کا خطرہ اس کھلے تبادلہ خیالات کو پنپنے نہیں دیتا جس پر جمہوری نظام میں معقول پالیسی بنانے کا دارومدار ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ تر لوگ مشرق وسطیٰ کے مسائل کو "چاچھ کے جلے کی طرح" پھونک

کر ہاتھ لگاتے ہیں اور اپنے خیالات کو اکثر اپنی ذات تک محدود رکھتے ہیں۔ ان کے بڑبولے ساتھیوں کے ساتھ جو پیش آ رہا ہوتا ہے وہ انہیں اپنی رائے ظاہر کرنے سے باز رکھتا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو سنسر کر لیتے ہیں کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو اسرائیلی لابی ان کی مذمت پر اتر آئے گی۔

امریکہ کے اداروں کو جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ صاف ظاہر ہے' جو چیز صاف ظاہر نہیں وہ یہ ہے کہ آخر یہ لابی معرض وجود ہی میں کیوں آئی؟ اور اس قدر جوش کے ساتھ کیوں اپنی دھونس' دھاندلی کی سرگرمیاں جاری رکھتی ہے؟

اس کی بنیاد اور قوت محرکہ کو ایک لفظ میں جمع کیا جا سکتا ہے: "خوف" اکثر یہودی خوفزدہ رہتے ہیں اور ان کا یہ خوف سمجھ میں بھی آ جاتا ہے۔ جب ہم ایڈولف ہٹلر کے خوفناک پروگرام جس میں ۶۰ لاکھ یہودی نیست و نابود کر دیئے گئے [1]' کے بعد اسرائیل کو ایک جائے پناہ تصور کرتے ہیں۔ اغلباً واحد جائے پناہ۔ اگر پھر کبھی ایسے حالات ہو جائیں تو Potomac میری لینڈ کے ایک مکین Perry J. Saidman نے "واشنگٹن پوسٹ" کے ایڈیٹر کو اس کا خط میں یوں اظہار کیا:

> "تقریباً سبھی یہودیوں کا یہ ایمان ہے کہ اسرائیل کی بقاء میں ہی یہودیت کی بقاء مضمر ہے۔
> اس قتل عام کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے' کیونکہ دنیا بھر میں پراگندہ یہود کو پتہ ہے کہ اگلے کسی قتل عام میں جو ملک انہیں انکار نہیں کرے گا وہ صرف اسرائیل کا یہودی ملک ہو گا۔"

Saidman اور کئی دوسرے یہودیوں کے نزدیک ایک اور قتل عام بالکل ممکنات میں سے ہے۔ خاص طور پر اگر اسرائیل پر تنقید کی سزا نہ ملے تو' ایسے لوگوں کے نزدیک قتل عام صرف ایک تاریخی واقعہ ہی نہیں بلکہ ایک نجی بپتا بھی ہے جس میں رشتہ دار اور خاندانی دوست احباب بے رحمی سے مٹا دیئے گئے تھے۔

مستقبل میں ایسی بپتا کے سامنے کا خوف ان کے دلوں میں جاگزیں ہے۔ جب امریکی سکریٹری آف اسٹیٹ ہنری کسنجر نے مشرق وسطیٰ میں پہلے پہل اپنی "شٹل ڈپلومیسی" شروع کی تھی تو

۱۔ یہ ایک الگ موضوع ہے کہ برطانوی دارالامراء کے ایک معزز رکن کی عرق ریزی سے کی گئی تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ اس وقت کے یورپ میں آباد کل یہودیوں کی تعداد ساٹھ لاکھ سے کہیں کم تھی۔
(مترجم)

ایک موقع پر اپنے ساتھی کے ساتھ تبادلہ خیالات کرنے کے دوران اس نے نجی طور پر اس ممکنہ Anti-Semitism کی لہر کے امریکہ میں پیدا ہونے پر اظہار کیا جو کہ اسرائیل کی عقل سے عاری پالیسی کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ "میں اپنے بیٹے کے بارے میں فکر مند ہوں۔ جب وہ بڑا ہو گا تو وہ...... امریکہ میں ایک یہودی ہو گا۔" ایک یہودی عورت کو اس کے بھائی نے نہایت غصے میں کہا "تم کسی دن گیس چیمبر میں مرو گی۔" وجہ؟ صرف یہ کہ اس نے ۱۹۸۴ء کے مشی گن پرائمری انتخابات میں Jesse Jackson کو ووٹ دیا تھا۔

اسرائیل کے ساتھ یہودیوں کا بندھن اور وجوہ سے بھی مضبوط اور گہرا ہے۔ آخری پناہ گاہ ہونے کے علاوہ اسرائیل یہودیت کی مادی نشانیوں کا ملجی وماویٰ بھی ہے۔ مدتوں کے یہودی خوابوں کی تعبیر بھی ہے۔ ان کی مستقل مزاجی اور شاندار کارناموں کا مظہر بھی۔ یہ بھی اتنا ہی اہم ہے کہ اسرائیل خاندانی رشتوں سے امریکہ کے ساتھ مربوط ہے۔ بہت سوں کے رشتہ دار احباب وہاں ہیں اور جب عربوں کے ساتھ جھڑپوں میں ان کے افراد زخمی یا ہلاک ہوتے ہیں تو وہ اسرائیلی خاندانوں کے غم کو محسوس کرتے ہیں۔

یہ رشتے اسرائیل کے اپنے غیر محفوظ ہونے کے احساس کی وجہ سے مزید گہرے ہو جاتے ہیں۔ اس کی جنگی مشین کے بے مثال ہونے اور فوجی اہلیت میں اضافہ کے باوجود اسرائیل ماسوائے مصر کے اپنے تمام ہمسائیوں سے برسرپیکار ہے۔ عام یہودیوں اور اس کے شہریوں کے خیال میں یہ قوم ابھی دشمن عربوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہی ہے۔ یہ ننھا سا ملک ایک جگہ پر صرف ۹ میل چوڑا ہے۔ یہ مشکل حالات اس کی فوج کو ہمہ وقت چوکس رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس سے بہت سارے اسرائیلیوں میں محاصرے کی ذہنیت جنم لیتی ہے' لہٰذا وہ اپنی شہری آزادیوں پر وہ قدغن قبول کر لیتے ہیں جو عام دوسرے حالات میں انہیں ہرگز گوارا نہ ہو۔ اسرائیلی اور عرب' دونوں پریس ہی سنسر شپ کا شکار ہیں اور عرب آبادیاں خصوصاً غرب اردن اور غزہ کی پٹی کے مقبوضہ علاقوں میں اپنی آزادی سے محروم ہیں اور اکثر ظلم و ستم کا شکار رہتی ہیں۔

یہ محاصرے کی ذہنیت صرف اسرائیل ہی نہیں امریکہ کے اکثر یہودیوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ چونکہ اسرائیل برسرپیکار ہے لہٰذا بہت سے امریکی یہودی بھی برسرپیکار محسوس کرتے ہیں۔ اسرائیل کی بقاء کے بارے میں فکر مند ہو کر وہ ایسی چالیں قبول کر لیتے ہیں جو ان کی قوم کے اندر اور

امریکہ بھر میں اختلاف کا گلا گھونٹ دیں۔ ان کے خیال میں یہ اسرائیل کے لیے امریکہ کو بطور ایک اہم اتحادی ملک کے قائم رکھنے کا واحد طریقہ ہے۔

یقیناً امریکہ اسرائیل کے لیے Life-Line کی حیثیت رکھتا ہے۔ مبصرین کی اکثریت کا خیال ہے کہ اسرائیل ۱۹۶۷ء کی جنگ امریکی اسلحہ کے بل بوتے پر جیتا۔ ۱۹۷۳ء کی جنگ میں اسرائیل کی بقاء داؤ پر لگی ہوئی تھی حتیٰ کہ امریکہ نے دو نہایت غیر معمولی اقدامات کیے۔ اولاً اپنی افواج کو ساری دنیا میں انتہائی تیاری کی حالت میں رہنے کے احکامات جاری کیے تاکہ روس اس جنگ میں کوئی بڑا رول ادا نہ کر پائے اور ثانیاً اسرائیل میں بڑی مقدار میں اسلحہ اور ٹینک لا اُتارے بذریعہ بین الاعظمی پروازوں کے۔ اس نجات دہندہ عمل نے اسرائیل کے اکیلے پن کو اجاگر کر دیا۔ جب امریکہ سے اسرائیل کے واسطے ان لمبی پروازوں کے لیے دوران پرواز ایندھن بھرنے کا بندوبست کرنے کی ضرورت پیش آئی تو انہیں مغربی یورپ میں اپنے حلیفوں میں صرف پرتگال ہی ایک ایسا ملک ملا جو اپنے اڈے اس مقصد کے ماتحت استعمال کے لیے دینے پر رضامند تھا۔ اگر عربوں کے ساتھ آئندہ کبھی جنگ چھڑی جو کہ بیشتر یہودیوں کے خیال میں صرف وقت کی بات ہے تو یہودیوں کی اکثریت کے خیال میں بغیر امریکہ کی غیر مشروط امداد کے اسرائیل کی بقاء کے امکانات تقریباً معدوم ہیں۔

بہت سے متعلقہ یہودیوں کے لیے ایسے حالات پیدا کرنا کہ انہیں لگاتار امریکی حمایت حاصل رہے ایک اہم ترین معاملہ ہے۔ اس کے لیے غیر معمولی اقدامات کرنا جائز ہے' جان بوجھ کر یا اَن جانے میں۔ اسرائیل نواز لابی امریکہ میں آزادی اظہار رائے کی قربانی کو اسرائیل کی بقا کی قیمت سمجھتی ہے۔

جب بھی اسرائیل مخالف یا عرب نواز خیالات ظاہر ہوتے ہیں' لابی کا رڈِعمل عام طور پر فوری اور جارحانہ ہوتا ہے۔ مقصد اسرائیل کو ہر قسم کی نکتہ چینی سے بچانا ہوتا ہے لیکن ان کے حربے اس دلیل کی جائز ضرورت سے ماوراء چلے جاتے ہیں۔ یہ حربے بہت مختلف طرح کے اور اکثر بہت بھونڈے ہوتے ہیں۔ الزام تراشی اور شور و غوغا' مقامات کار پر بڑوں کو شکایات۔ ''فہرست دشمناں'' میں نام شائع کرنا' حقہ پانی بند کرنا' نفرت بھرے خطوط' گمنام فون کالیں' کسی کی ذات کو نقصان پہنچانے کی دھمکی اور کبھی کبھی جسمانی حملے۔ یہ وہ تمام حربے ہیں جن کا براہِ راست تجربہ بہت کم امریکنوں کو ہے۔ ہم اسے سوویت یونین اور دوسرے مطلق العنان معاشروں کے حوالے سے جانتے

ہیں اور کبھی بھی اس کی مذمت سے تھکتے نہیں' پھر بھی یہ ہمیں ہمارا ایک تاریک باب یاد دلاتا ہے۔

۳۰ سال قبل ہم اس کی ایک زیادہ زہریلی قسم سے واقف تھے۔ اسے ہم "میکارتھی ازم" کہتے تھے۔ ایک شرمناک وقفہ کے بعد آخرکار ہماری ہمت بندھی کہ ہم اس کا پردہ چاک کریں' اس کی مذمت کریں اور اس کا خاتمہ کریں۔ آج کل بھی پہلے ہی کی طرح' جو لوگ سب سے زیادہ خوفزدہ ہیں وہ وہی ہیں جو اختلاف رائے کو برداشت نہیں کرپاتے۔ وہ اپنے نقادوں کی زبان بند کرنے کے جوش میں انتہائی اقدامات کر گزرتے ہیں۔

بہت کم کو یہ علم ہے کہ یہ اقدامات...... اور وہ خوف جس نے ان کو اس قدر متاثر کن بنایا ہے...... ہمارے سیاسی عمل میں واپس راہ پا چکے ہیں۔ اب یہ نو آموز ہاتھوں میں ہیں اور ایک مختلف مسئلہ کے حل کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ یہ ڈرانے دھمکانے کے حربے اب زیادہ غیر مرئی' قدرے کم غیر مہذب انداز میں لیکن اتنی ہی تاثیر سے استعمال ہو رہے ہیں۔ جو لوگ ان حربوں کو استعمال کرتے ہیں وہ ان کی اخلاقی راستی کے قائل ہیں۔

یہ معاملہ زیادہ غیر مرئی اس لئے ہے کہ کل کے سینیٹر میکارتھی کے برعکس' آج کا سیاسی یکسانیت نافذ کرنے والا اکثر شہرت سے گریز کرتا ہے۔ اسرائیل لابی اپنی کامیابیوں کے باوجود بہت کم مشہور ہے۔ اسے عوامی توجہ اور معائنہ سے گریز ہی پسند ہے۔ یہ پس پردہ کام کرتی ہے۔ یہ دوسرے افراد اور اداروں کو پہل کرنے کے لیے قوت متحرکہ فراہم کرتی ہے۔

یہ لابی غلام گردشوں اور برآمدوں میں بڑی عرق ریزی سے کام کرتی ہے تاکہ اسرائیل کو بغیر تنقید کے امداد میسر رہے۔ اسرائیل جو بھی کرے اسے امریکہ کے لیے مفید گردانا جاتا ہے۔ یہ رویہ اسرائیل مخالف تنقید کو "امریکہ مخالف" میں بدل دیتا ہے جسے سوچنا بھی گناہ ہو۔ اس کے حمایتیوں نے مشرق وسطیٰ پر بحث و مباحثہ کی شرائط کو اس قدر جامد بنا دیا ہے کہ بحث و مباحثہ ہی خارج ہو گیا ہے۔ اس کے ممبران کا کہنا ہے کہ "آپ اگر ہمارے حامی نہیں تو پھر آپ ہمارے مخالف ہیں۔" کوئی درمیانی راستہ ہی نہیں۔ معاملات کو سفید یا سیاہ رنگ میں دیکھا جاتا ہے۔ وہ سرمئی حصہ جس میں سچائی اکثر پائی جاتی ہے بیحد خطرناک خیال کیا جاتا ہے۔

گہرے خوف اسرائیل کے لیے سرگرم لوگوں کو دوسروں میں بھی خوف پیدا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کتاب کے لیے انٹرویو کرتے وقت مجھے بار بار اس تشویش اور فکر کا سامنا کرنا پڑا جو

پروفیسروں، سیاستدانوں، تجارتی لیڈروں اور دوسروں میں اس بارے میں پائی جاتی تھی کہ دوسروں کو پتہ نہ چلنے پائے کہ ان معلومات کو مہیا کرنے والی ذات کون تھی؟ ایک کا کہنا تھا "اگر میرا نام اس میں آگیا تو میرا کیریئر ختم سمجھو۔" جب ایک یونیورسٹی منتظم نے مجھے امریکن جیوش کمیٹی کی جاری کردہ ایک دستاویز مہیا کی تو انتباہ کیا: "تم نے کبھی بھی کسی کو...... کسی کو بھی نہیں! یہ نہیں بتلانا کہ یہ تمہیں کہاں سے ملی۔" کئی دوسروں نے کہا: "ہم اس کام کے لیے آپ کی تعریف کرتے ہیں اور آپ کو مدد دینا چاہیں گے لیکن ہم خوف زدہ ہیں۔" ٹیکساس کے ایک پروفیسر نے ایریزونا میں ایک ذریعہ اطلاعات کی نشان دہی کرنے کے بعد منت کی کہ "آپ براہ مہربانی یہ بھول جائیں کہ آپ نے مجھے یہ فون کال کی تھی۔" ایک تاجر نے کہا: "میں آپ کو یہ بتلا کر بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں اس کو صیغہ راز میں رکھنے کے لیے آپ پر بھروسہ کرسکتا ہوں۔" ایک دانشور نے لابی پریشر کے بارے میں تفصیلی آپ بیتی سنانے کے بعد تاسف بھرے لہجے میں فون پر کہا: "میں آخرکار آپ کو یہ تفصیل شائع کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔" ایک معروف ریٹائرڈ سفارت کار نے جو کہ اب واشنگٹن میں جزوقتی Consulting Services انجام دے رہا ہے، میری اس کتاب لکھنے پر ہمت افزائی کی۔ لیکن بعد میں ایک عوامی تائیدی بیان لکھنے سے کنارہ کشی کرلی جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا ایک بڑا گاہک اس بات سے ناراض ہو جائے گا۔ اس نے اداس لہجے میں کہا: "میں یہ تسلیم کرتے ہوئے شرمندہ ہوں کہ میرا فیصلہ اسی ڈرانے دھمکانے کی ایک مثال ہے جو آپ کی کتاب کا مرکزی خیال ہے۔"

مجھے یہ حقیقت جان کر اچنبھا ہوا کہ ان بیباکی سے بولنے والے لوگوں میں بہت سے ایسے تھے جن کی آمدنی کو اس بے لاگ تبصرہ سے کوئی بھی خطرہ لاحق نہ ہوسکتا تھا۔ زیادہ تر اساتذہ جو بیباکی سے بولتے ہیں، ان کے کیریئر میعاد وقت کی وجہ سے محفوظ ہیں۔

مندرجہ ذیل حضرات بھی اس لئے کھلے عام بول سکتے ہیں کیونکہ ان کی اقتصادی بنیاد مضبوط ہے:

J. Williamfulbright, Adlaie Stevenson, George W.Ball, Deanfrancis B. Sayre, Philip M. Klutznick, Rabbielmer Berger, Alfred M. Lilienthal. Jr.

اظہار رائے کی آزادی میں یہ خطرناک کمی کا عوامی ادراک اس وقت اس لئے اور بھی اہم ہے

جبکہ مشرق وسطیٰ سپرپاور ٹکراؤ کا اکھاڑہ بنتا ہوا نظر آرہا ہے۔ آج کے دور میں...... پہلے سے کہیں زیادہ' امریکنوں (یہودیوں اور غیر یہودیوں دونوں کو) کو چاہئے کہ وہ لابی کے طریق کار کا کھلا کھلا معائنہ کریں۔ اس کو اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرائیں اور سب کی بات سنے جانے کے حق پر اصرار کریں۔

اگلے مہینوں میں عرب اسرائیلی تنازعہ میں امریکن رول کے بارے میں زندگی یا موت کے فیصلے ہونے متوقع ہیں۔ یہ فیصلے ایک ایسے شائستہ ماحول سے جنم لینے چاہیں جہاں پر دلائل کو سن کر اور ان کو معیار پر پرکھ کر فیصلے ہوں۔ نہ کہ جذباتی نعروں اور لیبل چسپاں کرنے سے۔ یہ تنازعہ ایک ٹک ٹک کرتا ہوا ٹائم بم ہے جو روز بروز خطرناک سے خطرناک تر ہوتا جارہا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں دوبارہ جنگ چھڑنے سے امریکہ کے فوجی طور پر ملوث ہونے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ اقتصادی اور سیاسی قیمت بھی بڑھ جائے گی۔ مشرق وسطیٰ کے حالیہ تنازعہ میں ۲۶۴ میرین فوجیوں کی جانیں جاچکی ہیں اور لبنان سے ہمارے فوجی انخلاء کے بعد بھی ہمارے ہزار سے زائد فوجی اسرائیل' مصر سرحد پر بطور سلامتی فوج کے تعینات ہیں۔ اسرائیل اور شام اور کئی دوسرے ہمسایہ ممالک بھی نئے تباہ کن اور مؤثر ہتھیاروں کی تیاری میں تیزی لانے میں مصروف ہیں۔ ان سب میں باہمی صلح کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے۔

اگر ہمارے شہریوں کو (نجی یا عوامی زندگی میں) تصویر کا صرف ایک ہی رخ پیش کیا جائے گا تو وہ حالات کا ذہانت سے تجزیہ کرنے اور اپنا مفاد پہچاننے اور دانش مندانہ پالیسیوں پر عمل پیرا ہونے میں خطرناک حد تک معذوری کا شکار ہوں گے۔ ان بندھنوں اور غیر متوازن بات چیت سے جو فیصلے جنم لیں گے وہ بیحد خوف ناک ہو سکتے ہیں۔

جمہوریت میں کسی بھی شہریوں کے بڑے سے گروپ...... جیسا کہ اسرائیلی لابی ہے...... کی رائے کا سنا جانا ضروری ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے لیے اسرائیل کی بقاء کی اخلاقی ذمہ داری کے علاوہ اور بھی جائز وجہ اور ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی خواہشات کے مطابق عمل پیرا ہو۔ جب تک کہ کسی "اسپیشل انٹرسٹ گروپ" کے مفادات ہماری اکثریت کے مفادات کے خلاف نہیں جاتے' لیکن اس سے اندھی تقلید لازم نہیں آتی۔ ہم یقیناً بغیر اسرائیل مخالف ہوئے اسرائیل کی پالیسیوں پر تنقید کر سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم بغیر امریکن مخالف بنے امریکہ کی پالیسیوں

پر نکتہ چینی کر سکتے ہیں۔

آزادیِ اظہار رائے کو زندہ رکھنے کے لیے ہم سب کی طرف سے توجہ' حقیقت پسندی اور پکا عہد درکار ہے۔

اس معاملے میں پہلا قدم یہ ہے کہ ہم اپنے اس پر فریب وہم سے آزادی حاصل کریں کہ یہ لابی "برتر از زندگی" ہے۔ اس کے ممبران نہ تو مافوق الفطرت انسان ہیں اور نہ ان کو سچائی پر اجارہ داری حاصل ہے۔ یہ لابی ایک چھوٹے سے گروپ پر مشتمل ہے۔ اغلباً بیس ہزار سے کچھ ہی زائد اراکین ہوں گے اور مرکزی سرگرم ارکان جو معاملات کو چالو رکھتے ہیں۔ اس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہوں گے۔ مانا کہ اس کے لیڈر بیحد پیشہ ورانہ اہلیت کے حامل اور مقصد کی لگن کے دھنی ہوں گے۔ لیکن کچھ دوسرے شہری بھی انہیں خواص کے حامل ہو سکتے ہیں۔ یہ لابی کافی رقم اکٹھا کر لیتی ہے اور معتد بہ حمایت بھی' لیکن یہ ہماری دھن کی پکی اور باخبر اکثریت کو زیر نہیں کر سکتی۔

"علم ہی قوت ہے"

اور یہ لابی اسے اچھی طرح جانتی ہے ...... اور اس کے ناقابل تسخیر ہونے کے سحر کو توڑنے کے لیے اس کے حربوں کا ادراک ہونا چاہئے۔ یہ اکثر اوقات تعداد کے بارے میں جھوٹا تاثر پیدا کر سکتی ہے۔ کئی برس گزرے سینیٹر ایڈلائی اسٹیونسن (III) کو ایک سو تاریں موصول ہوئیں۔ ان سب کے الفاظ ہوبہو وہی تھے۔ یہ اس قانون کے بارے میں احتجاج تھا جو وہ تجویز کر رہا تھا۔ ان تاروں کے نمبر شمار بالکل ترتیب سے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کسی فردِ واحد نے بھجوائی ہیں حالانکہ تمام پر مختلف نام درج تھے۔ اسی دوران سینیٹر Abraham Ribicoff (Conn.) کو بھی اٹھائیس تاریں ملیں۔ سب پر ایک ہی جیسے الفاظ درج تھے اور وہ ہارٹ فورڈ کے ایک ہی فون نمبر سے بک کی گئی تھیں' لیکن ہر ایک پر بھجوانے والے کا نام الگ الگ درج تھا۔

بعض دفعہ دو یا تین فون کالیں ہی رائے دہندگان میں معتد بہ احتجاج کا تاثر دے سکتی ہیں جبکہ احتجاج کرنے والے کلی طور پر وہی دو تین افراد ہوتے ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں صرف چند کالوں کی بناء پر ہی نئے کانگریس ممبران نے اسرائیل کو امداد والے بل پر اپنے ووٹ تبدیل کر لئے۔ ان کالوں کا اثر بہت ہی کم ہو جاتا' اگر ان کا توڑ کرنے کے لیے ہر کانگریس ممبر کو جو حیض بیض میں تھا صرف ایک ہی فون

کال مخالف نقطہ نظر کی بھی موصول ہو جاتی۔ جب ایک کانگریس ممبر کو بذریعہ ڈاک' تار' فون کال' ذاتی ملاقات یا پھر عوامی بحث و مباحثہ میں تصویر کا صرف ایک ہی رخ دیکھنے کو ملتا ہے تو وہ قدرتی طور پر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ تصویر کا یہی رخ قابل توجہ ہے۔

میری اپنی شکست ۱۹۸۲ء میں اکثر لابی کی قوت کی مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے' لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہر شکست اتنی معمولی تعداد سے ہوئی تھی ...... یعنی کل ووٹ جو ڈالے گئے ان کے ایک فی صد سے بھی کم ہے...... کہ اس کی وجہ ان کئی سیاسی اور اقتصادی حالات میں سے کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً نئی حد بندیاں' جس سے کئی نئے ڈیموکریٹ علاقے میرے حلقے میں شامل ہوئے۔ اقتصادی بدحالی' جس نے بیروزگاری میں ریکارڈ اضافہ کیا۔ خاص طور پر Decatur میں جو ان نئے شامل ہونے والے علاقوں میں سب سے بڑا شہر تھا یا پھر عام اقتصادی گراوٹ جس نے سارے ضلع میں بے چینی کی لہر پھیلائی' خصوصاً کسانوں میں۔

لیکن اسرائیلی لابی نے میری شکست کا سہرا اپنے سر باندھا جو کہ سمجھ میں آتا ہے۔ درحقیقت لابی کا سب سے بڑا کام میرے مخالفین کو غیر معمولی طور سے بڑی بڑی رقوم فراہم کرنا تھا۔ ان حالات میں جتنے ووٹ میں نے حاصل کئے وہ میری اخلاقی فتح تھی۔ اتنی مختلف طرح کی رکاوٹوں کے باوجود بھی تقریباً جیت ہی گیا تھا۔ میرے خلاف یہودی ذرائع سے رقوم آتی رہیں لیکن میرے حامیوں نے بھی ان چندوں کا توڑ کر ہی دیا۔

میرے خلاف ملک بھر میں مہم چلائی گئی کیونکہ میں وہ واحد ممبر کانگریس تھا جو اسرائیلی پالیسی کا ناقد تھا۔ اگر مستقبل میں صرف چند بہادر روحیں ہی کیپٹل ہل پر بے لاگ تنقید بیک زبان اور بیک وقت کریں تو یہ لابی مسائل کی کثرت کا شکار ہو کر کسی ایک ناقد کی شکست پر توجہ اور طاقت مرکوز کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔

اب تک یہ لابی زیادہ تر کامیاب اس لئے ہے کہ اس نے صرف مشرق وسطیٰ کی پالیسی پر اپنے آپ کو محدود رکھا ہوا ہے۔ اسے حکومت کے ایوانوں اور برآمدوں میں کسی سنجیدہ مخالف کوشش کا سامنا نہیں ہے۔ اس کے دلائل کا توڑ کرنے' اس کی تھیوریوں کو چیلنج کرنے اور عوامی سطح پر اس کے جوش و خروش کا جواب دینے کے لیے دوسرے انتہائی پیشہ ور اور مصمم ارادہ رکھنے والے لوگوں کی ضرورت ہے۔

اس لابی کے دیومالائی تاثر کو ایک عام فہم، وسیع البنیاد، تعلیمی پروگرام بہت آسانی سے ختم کرسکتا ہے۔ مثال کے طور پر لابی نے نہایت کامیابی سے یہ فرضی داستان پھیلائی ہے کہ امریکہ میں کوئی "تیل لابی" جسے کبھی "عرب تیل لابی" بھی کہا جاتا ہے موجود ہے اور اس سے ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں کو خطرہ ہے۔ نیویارک A.D.L. کے ریسرچ ڈائریکٹر Jerome Bankst کا انتباہ ہے:

"ہماری بڑی تشویش یہ ہے کہ ہماری جامعی آزادی (Academic Freedom) پر حرف نہ آجائے۔ ہمیں فکر ہے کہ ان یونیورسٹیوں کی تعلیمی سرگرمیوں میں عربوں کا اثر و نفوذ نہ ہوجائے اور یہودی فیکلٹی کے خلاف تعصب نہ در آئے۔" Bankst یہاں پر لفظ عرب کو منفی معانی میں بطور ایک بڑے سانچے کے طور پر استعمال کررہا ہے۔ یہ بھی تنگ نظری کی ایک مثال ہے۔ اگر ہم یہاں لفظ "عرب" کو "یہودی" یا "اسرائیل" سے تبدیل کردیں تو فوراً احتجاج کا طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔

گو عرب حکومتیں اور تیل کمپنیاں تعلیمی پروجیکٹوں کے لیے چندہ دیتی ہیں لیکن یہ رقم کبھی بھی تعلیمی معروضیت کو نقصان پہنچانے کے لیے استعمال نہیں کی گئی۔ اس کتاب کے لیے کی گئی تحقیقات سے ایسا ایک بھی واقعہ سامنے نہیں آیا کہ جس میں تیل کے مفادات نے جامعی آزادی کو نقصان پہنچانے یا فیکلٹی کے چناؤ میں اثر ڈالنے کی کوشش کی ہو۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ یہودیوں کی سرگرمیوں سے ہماری جامعی آزادیوں کو کسی قدر شدید نقصان پہنچا ہے جیسا کہ اس کتاب کے پہلے ابواب میں درج ہے Bankst کی یہ تنبیہ تو اسرائیلی لابی میں اس کے احباب کی جانب تخاطب کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

نہ ہی یہ مبینہ "تیل لابی" مشرق وسطیٰ کے بارے میں امریکی پالیسی کنٹرول کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مرحوم Evan Wilson (مشرق وسطیٰ پر ایک ماہر)، اس نتیجہ پر پہنچا کہ تیل کمپنیوں کا امریکی پالیسی سازوں پر اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ جارج ٹاؤن یونیورسٹی کا پروفیسر Seth Tillman بھی Wilson کی تائید میں کہتا ہے: "اسرائیلی کے حامی کبھی کبھار بڑی بڑی تیل کمپنیوں کو "عرب لابی" کے حصہ کہتے ہیں، لیکن یہ الزام غور سے دیکھنے پر مبنی بر حقیقت نہیں لگتا۔ تیل کمپنیاں لاگت توانائی، استعمال اور ٹیکسوں کے ماسواء مشرق وسطیٰ کے معاملے پر کوئی بھی پوزیشن کھلے عام لینے سے ہمیشہ کتراتی رہی ہیں۔ کجا یہ کہ وہ کانگریس میں ان کے بارے میں دباؤ ڈالیں۔"

یہ لابی دوسری عوامی غلط فہمیوں سے بھی فائدہ اٹھاتی ہے:

۱۔ انہوں نے یہ بے بنیاد شہرت بنا رکھی ہے کہ لابی یومِ انتخاب پر ایک طاقتور یہودی حلقہ انتخاب مہیا کر سکتی ہے۔ کانگریس کے صرف چند ہی حلقہ ہائے انتخاب ایسے ہیں جن میں یہودی ووٹروں کی تعداد ایک فیصد سے زائد ہو۔ صرف بارہ ریاستیں ایسی ہیں جہاں یہودی آبادی کا تناسب تین فیصد تک پہنچتا ہے۔ اگر اس بات کو مدِ نظر رکھ بھی لیا جائے کہ غیر یہودیوں کی نسبت یہودی زیادہ فیصد تعداد میں ووٹ ڈالتے ہیں۔ تب بھی وہ صرف انہیں جگہوں پر کامیابی کے لیے کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں جہاں مقابلہ کانٹے کے تول ہو۔

۲۔ بہت کم لوگوں کو اسرائیل کو دی جانے والی امداد کے حجم کا اندازہ ہے۔ انہیں یہ علم نہیں کہ دنیا بھر کو دی جانے والی کل امریکی امداد کا ایک چوتھائی حصہ صرف اس ایک چھوٹے سے ایک ملک کو جاتا ہے۔ یہ اسرائیل کے تمام مرد، عورتوں اور بچوں کے لیے -/750 $ (سات سو پچاس ڈالر) فی کس بنتا ہے۔[۱] اگر امریکی عوام کی غیر ملکی امداد کے خلاف ناپسندیدگی کو مدِ نظر رکھا جائے تو یہ اور بھی اہم ہے۔

۳۔ زیادہ تر لوگوں کو مشرقِ وسطیٰ میں امریکی پالیسی کا علم ہی نہیں۔ اگر رائے دہندگان اسرائیل کو امداد دینے کے بارے میں اپنے نمائندوں کا کڑا احتساب کریں تو نمایاں تغیرات جلد ہی لائے جا سکتے ہیں۔ ۱۹۸۴ء کے موسم بہار میں ۳۷۹ کانگریس ممبران نے اسرائیل کو ۲۵۰ ملین ڈالر (۲۵ کروڑ ڈالر) کا تحفہ بطور امداد دینا منظور کیا تاکہ اپنی لڑاکا ہوائی جہاز صنعت کو ترقی دے سکے۔ صرف ۴۰ ممبران نے مخالف میں ووٹ دیا۔ امریکہ کی قومی اقتصادیات میں ہوائی جہازوں کی صنعت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور امریکہ کے وفاقی بجٹ میں بھاری خسارہ سے صرف نظر کرتے ہوئے بھی۔ اس طرح غیر ملکی مسابقت کاروں کو معتدبہ براہ راست امداد دینا، بیحد غیر معمولی بات تھی۔ رائے دہندگان کو ان ۳۷۹ ممبران سے دریافت کرنا چاہئے کہ انہوں نے کیوں اس حکومتی مالی امداد کے حق میں ووٹ دیا جبکہ ایسی مثال ماضی میں نایاب ہے۔ رائے دہندگان اس میں حق بجانب ہوں گے۔

۴۔ مشرقِ وسطیٰ کی پالیسی کے میدان پر اس لابی نے تقریباً پورا قبضہ جما رکھا ہے۔ اس غیر متوازن صورت حال میں بہتری لانے کے لیے امریکہ کے عرب نژاد لوگوں کو کامیاب سیاسی

۱۔ ۱۹۸۵ء کے اعداد و شمار! اب اغلباً اور زیادہ بنتا ہوگا۔ (مترجم)

عمل کے گر سیکھنے ہوں گے۔ کیلیفورنیا کے ڈیمو کریٹک کانگریس میں Merwyn L. Dymally کے بقول امریکن نژاد افراد کی کثیر تعداد کسی بھی قسم کی لابی سرگرمی میں حصہ نہیں لیتی کیونکہ انہیں اس کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں۔ نہ ہی ان میں "سیاست سخاوت" کا احساس ہے۔ امریکن یہودی دل کھول کر اپنی قوت اور سرمایہ سے سیاسی امیدواروں کی مدد کرتے ہیں جبکہ امریکی عرب شاذ ہی ان دونوں اشیاء میں سے ایک بھی دیں۔ امریکی عربوں کی تعداد تقریباً بیس لاکھ ہے جو یہودیوں سے تقریباً ایک تہائی زیادہ ہے۔ یہ بنیاد اسرائیلی لابی کے خلاف کافی تعداد میں افراد' سرمایہ اور حرکی قوت بہم پہنچانے اور اس لابی کا توڑ کرنے کے لیے کافی وشافی ہے۔

اسرائیلی لابی کی قوت کا اندازہ لگاتے وقت یہ یاد رکھنا اہم ہے کہ امریکی یہودیوں کی اکثریت اسرائیلی حکومت کی پالیسیوں پر اہم اختلافات کی حامل ہے اور ان کی لابی کے کام پر بھی۔ صرف چند ہزار مقصد کی لگن رکھنے والے شہری اگر متحد ہو کر سیاسی سخاوت کے جذبہ سے سرشار ہو کر کام کریں (بقول Dymally) تو وہ عوامی بحث کا رخ بنیادی اور متاثر کن طریقہ سے موڑ سکتے ہیں۔

National اور American-Arab Anti-Discrimination Committee Association of Arab Americans کی سرگرمیاں صحیح سمت میں پیش رفت ہے۔ لیکن ان میں سے کسی بھی گروپ نے اس نچلی سطح تک اپنا پروگرام نہیں پھیلایا کہ وہ اسرائیلی لابی کا مقابلہ کر سکیں۔ حالانکہ اسرائیلی لابی اس جگہ بھی اپنا اثر و نفوذ بنا لیتی ہے جہاں پر یہودیوں کی ایک قلیل تعداد بستی ہو۔ جون ۱۹۸۴ء میں اس کمزوری کا ایک ڈرامائی مظاہرہ دیکھنے میں آیا جبکہ ان چالیس ممبران ایوان کو (جنہوں نے اسرائیل کی لڑاکا ہوائی جہازوں کی صنعت کو امداد کم کرنے کے حق میں ووٹ دیا تھا) اسرائیل نواز سرگرم کارکنوں کی طرف سے احتجاج کے ایک سیلاب کا سامنا تھا لیکن ان کی حمایت میں موصول ہونے والے خطوط اور فون کال تقریباً صفر تھے۔ اس تجربہ کے بعد یہ چالیس کانگریس ممبران بھی شاید آئندہ ایسی کسی ترمیم کے حق میں ووٹ نہ دیں۔

عرب نژاد لوگ اکثر اپنے مفاد پر زور دینے سے گریز کرتے ہیں۔ ایک دن ایوان نمائندگان کے اندر میں نے James Abdnor (ریپبلکن سینیٹر ساؤتھ ڈکوٹا سے جو لبنانی نژاد ہے) کو کہا کہ وہ میرے اور چند دوسرے ارکان کے ہمراہ مشترکہ طور پر ایک خط پر دستخط کرے جس میں اسرائیل کے امریکی مہیا کردہ اسلحہ کو لبنان میں استعمال کئے جانے پر احتجاج کیا جائے۔ Abdnor نے قدرے

توقف کے بعد جواب دیا "اوہو! میرے لئے یہ مناسب نہ ہوگا...... میری قومیت کی وجہ سے۔" مجھے یہ احساس نہ ہو سکا کہ وہ اپنی قومیت کو ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔ اغلباً وہ اپنے ساتھیوں پر اس کا برملا اظہار نہ چاہتا تھا۔ اس کے برخلاف کانگریس کے یہودی ممبران اسرائیل کے حق میں آواز اٹھانے سے شاذ ہی کبھی باز رہتے ہوں!

امریکہ کے یہودی شہری، خود ہی اکیلے، اگر چاہیں تو آزادی اظہار کو حادثاتی فہرست (Casuality-List) سے واپس نکال سکتے ہیں۔ یہ عمل یہودیوں کی شہری آزادیوں کی حمایت اور ڈرانے دھمکانے اور جبر کی مخالفت کی عظیم الشان روایت کے عین مطابق ہوگا۔ اسرائیل کے بے لاگ ناقد اور سمجھدار نکتہ چیں زیادہ تر یہودی ہی ہیں لیکن وہ انفرادی حیثیت میں آواز بلند کرتے ہیں۔ وہ بطور یہودی لیڈروں کے نہیں پہچانے جاتے۔

مزید آوازیں جو ذاتی ضمیر کی خلش پر مبنی ہوں انہیں خوش آمدید کہا جائے گا لیکن جس چیز کی اشد ضرورت ہے وہ یہودی تنظیموں کے لیڈران کے سچے اور فوری بیانات کی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں Philip M. Klutznick نے ایک لازوال مثال قائم کی تھی۔ بطور چیئرمین Conference of Presidents of Major Jewish Organisations اور بطور B'nai B'rith کے صدر۔ اس نے پریزیڈنٹ آئیزن ہاور کے مشرق وسطیٰ ریزولیوشن کی حمایت کی تھی حالانکہ اسرائیلی وزیراعظم اس کا سخت مخالف تھا۔ لیکن ۱۹۸۲ء میں B'nai B'rith کی قیادت نے پہلے تو صدر ریگن کی تجبر امن پلان کی پرجوش حمایت کی لیکن جونہی وزیراعظم اسرائیل Menachem Begin نے اس کی مخالفت کی تو ان کو سانپ سونگھ گیا۔

امریکہ میں اظہار رائے پر سب سے زیادہ پابندی منظم شدہ یہودی آبادی میں پائی جاتی ہے۔ یہودی لیڈر نہ صرف خود اسرائیل کی پالیسی پر بے لاگ بات کرنے سے ڈرتے ہیں بلکہ وہ دوسروں کے ایسا کرنے کے حق کا دفاع بھی نہیں کرتے۔ جب اسرائیلی لابی کے سرگرم کارکن کسی اسرائیل پر تنقید کرنے والے کی شہرت کو Anti-Semitism کا الزام لگا کر داغدار کر رہے ہوتے ہیں تو وہ اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

A.D.L. اور AIPAC کے ۱۹۸۳ء کے "فہرست دشمناں" شائع کرنے کے فیصلے پر کسی بھی یہودی نے تشویش ظاہر نہ کی اور نہ ہی جب Adlai E. Stevenson-III نے ۱۹۸۲ء میں الی

نوائے کے گورنر کا انتخاب لڑا اور اس کے خلاف سب وشتم کا طوفان اٹھایا گیا تو کسی نے احتجاج کیا۔ ۱۹۸۲ء کے لبنان پر اسرائیل کے سفاکانہ حملے کے خلاف بھی چند ہی ممتاز یہودی لیڈروں نے آواز بلند کی اور وہ بھی ذرا دیر کے لیے اور رُک رُک کر' لیکن جب لابی نے دباؤ ڈالا تو تقریباً سبھی نے اپنا موقف تبدیل کر لیا۔ یا تو انہوں نے اس جنگ کا دفاع کیا یا پھر چپ سادھ لی۔

صابرہ اور شطیلہ میں پناہ گزیں کیمپوں کے اندر فلسطینی نہتے باشندوں ...... عورتوں بچوں سمیت ...... کے سفاکانہ قتل عام کا ذمہ دار اسرائیلی وزیر دفاع Ariel Sharon جب ۱۹۸۳ء میں امریکہ کا دورہ کر رہا تھا تو امریکی یہودیوں نے بڑھ چڑھ کر اس کے لیے کی گئی دعوتوں میں حصہ لیا۔ کوئی بھی یہودی مقبوضہ غربی کنارے کی فلسطینی یونیورسٹیوں میں آزادی اظہار کے حق میں آواز بلند نہیں کرتا' جہاں اسرائیل فوج طلباء کو گرفتار کرتی رہتی ہے اور ذرا ذرا سی بات پر اسکولوں کو جبراً بند کر دیتی ہے۔

جزوی طور پر یہودیوں کی خاموشی لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ بدقسمتی سے اسرائیل اور اس کی لابی امریکی یہودیوں کو اسرائیل یاترا کے دوران تلخ حقیقتوں کے ادراک سے محروم رکھتے ہیں۔ یہ لیڈر چیدہ چیدہ مقامات اور افراد کو دیکھتے اور ملتے ہیں۔ مقبوضہ عرب علاقوں میں عربوں کے ساتھ صاف گوئی سے بات چیت کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا اور وہ بغیر اسرائیلی سفاکانہ قبضہ دیکھے امریکہ واپس آجاتے ہیں۔

امریکہ میں بھی یہودی لیڈران کی ڈوری ہلانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہاں انہیں اسرائیلی اہلکاروں اور دیگر لابی ایجنٹوں سے لگاتار پیغامات اور ملاقاتوں کے سیلاب کا سامنا رہتا ہے۔ یہ امریکی لیڈر اپنے یہودی ساتھیوں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ملک کی بھی۔ ایک عظیم خدمت سرانجام دے سکتے ہیں اگر وہ مشرق وسطیٰ کے دورہ کے دوران اپنا ایجنڈا خود طے کریں۔ عرب لیڈروں کے ساتھ (اسرائیل کے اندر بھی اور باہر بھی) بات چیت بالمشافہ کریں۔ فلسطینیوں کے ساتھ انٹرویو کریں تاکہ انہیں پتہ چلے کہ غربی کنارے میں زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ اس سے اس ہٹ دھرمی سے شاید نجات مل سکے جو طرفین کو ایک دوسرے کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھلا دکھلاتی ہے۔

البتہ اس ملک میں لابی جو زیادتیاں کرتی ہے' ان پر یہودیوں کی خاموشی کو لاعلمی کا بہانہ رکھ کر معاف نہیں کیا جا سکتا۔ ایریزونا یونیورسٹی کے تین سالہ دور عذاب پر (جو کیرل کارش اور TJCC

کے ہاتھوں سرانجام پایا) یہودی خاموش رہے۔ ماسواء پروفیسر Jerrold levy کے' جب اسرائیلی مقصد کی اندھی حمایت ایک تعلیمی ادارہ کو نقصان پہنچارہی تھی تو یہودی خاموش رہے۔ کئی یہودی قومی تنظیموں کے عہدہ داروں نے نجی طور پر کہا کہ Carol Karsch حد سے تجاوز کر گئی تھی' لیکن یہ شکایت انہوں نے باہم محدود رکھی۔ اگر چند لوگ ہی ...... مقامی یا ملکی ...... پروفیسر Levy کے ساتھ عوامی احتجاج میں شریک ہوجاتے تو یہ زیادتیاں روکی جاسکتی تھیں۔

Karsch کی اس "کامیابی" کے اثرات Tuscon کے ماوراء ہیں۔ جو حربے اس نے استعمال کیے وہ مقامی طور پر بنائے اور استعمال کیے گئے تھے۔ لیکن ان کا اطلاق دوسری جگہوں پر بھی ممکن تھا۔ ایک "کامیابی" دوسری کے لیے راستہ استوار کرتی ہے اور جیسا کہ ساتویں باب میں بتلایا گیا ہے۔ اس طرح کی شدت پسندی' جس نے امریکہ کی ابتدائی تاریخ میں Salem Witch-Hundt کو جنم دیا تھا' پھیلنا شروع ہو چکی ہے۔

زیادہ تر امریکی یہودی ان مذہبی جنون کی مثالوں کو (جو اس کتاب میں بیان کی گئی ہیں) پڑھ کر تشویش مند ہوں گے' لیکن اگر ان کا ردِ عمل یہ رہا کہ وہ اپنے خیالات کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھیں تو وہ مذہبی جنونیوں کے اس خیال کو پختہ کرنے میں مدد دیں گے کہ سبھی امریکی یہودی اس سازش میں شامل ہیں کہ ہمارے اسکولوں اور دوسرے معاشرتی اداروں کو اس طرح تبدیل کر دیا جائے کہ اسرائیل پر نکتہ چینی ناممکن ہوجائے اور اس کے عرب ہمسایوں کو برا بنا کر پیش کیا جائے۔

گیارہویں باب میں امریکہ کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے مختلف پیشوں کے افراد کے قصے بیان کیے گئے۔ ان میں سے اکثر میں ایک بات مشترک ہے۔ ان کو نسلی ورثہ کی بناء پر الزام تراشی اور پریشان کیے جانے کا سامنا تھا...... کیونکہ وہ نسلاً عرب تھے۔ اگر یہودیوں کے ساتھ اس جیسا سلوک ہوتا تو قومی سطح پر شور اٹھ کھڑا ہوتا اور ہونا بھی چاہیے۔ سبھی مذاہب کے لوگ اس احتجاج میں شامل ہوتے' اس کے باوجود یہودی ماسواء چند استثناء کے' خاموش رہتے ہیں حالانکہ انہیں اسی طرح کے سلوک کی یاد اب بھی ہے جب عربوں کے خلاف یہ امتیاز بھرا سلوک ہوتا ہے تو زیادہ تر امریکی بھی خاموش ہی رہتے ہیں۔

یہ خاموشی امریکنوں کی اس ناپسندیدگی کا مظہر ہے جو وہ عرب اسرائیل تنازعہ کے پریشان کن مسائل کے بارے میں بات چیت کرنے پر رکھتے ہیں۔ خاموشی کی یہ عظیم سازش امریکہ کی بیشتر

عیسائی آبادی پر حاوی ہے۔ کچھ قدامت پرست عیسائی لیڈران اسرائیل کے سیاسی مقاصد کے لیے قتل و غارت گری کرنے کو نہ صرف صحیح مانتے ہیں بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ جب یہودیوں نے امریکہ کے مہیا کردہ F-16 ہوائی جہاز عراق کے جوہری ری ایکٹر کو تباہ کرنے کے لئے استعمال کئے تو انجیلی پادری Jerry Falwell نے اسرائیل کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ "یہ ایک ایسا مشن تھا جس نے ہمیں یہ فخر دیا کہ ہم F-16 تیار کرتے ہیں۔" اسی طرح انجیلی پادری Mike Evans نے اسے ایک "معجزہ" قرار دیا کہ بیروت کے تجارتی مرکز کے نہتے اڈوں سے تمام اسرائیلی ہوائی جہاز بحفاظت واپس اسرائیل آگئے۔ گو ان حملوں میں بے شمار شہری ہلاک ہوئے۔

بطور اخلاقی لیڈران کے مذہبی اہل کاروں کا فرض ہے کہ وہ مظلوموں کی حمایت اور نسل پرستی کی مذمت کریں' لیکن کسی بھی چرچ لیڈر نے Anti-Semitism کی اصطلاح کا غلط اور اشتعال انگیز استعمال ہونے پر احتجاج نہیں کیا اور نہ ہی فلسطینیوں اور دوسرے عربوں پر ایک برے سانچے کے عام طور پر اطلاق کا۔ وہ تنازعے سے جان بچا کر ان لوگوں کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں جو کسی بھی قسم کا تبادلہ خیالات چاہتے ہی نہیں۔ بہت سے اسرائیل کے تاریخی مطالبات کی حمایت اعتقاد نہیں بلکہ سہل انگاری کی بناء پر کردیتے ہیں۔

صدیوں سے اس علاقے میں کئی نسلیں اور مذاہب کے لوگ آباد رہے ہیں' ان کے اختلافات پیچیدہ نوعیت کے ہیں۔ بائبل کے اصولوں کا اطلاق یقیناً قیام امن کی کوششوں میں مددگار ہوگا لیکن بقول عزت مآب Jesse Jackson کے: "ہمیں بائبل کو بطور ایک اسٹیٹ ایجنٹ کی گائیڈ بک کے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔" مسائل کا حل اتنا آسان نہیں۔ مشرق وسطیٰ کے بارے میں آسمانی پلان کا ادراک حاصل کرنے کے لیے ہمیں مراقبہ اور دعا کی ضرورت ہے' لیکن ہمارے جیسے آزاد معاشرے میں ہمیں آزاد اظہار رائے کے ذریعے حاصل شدہ بصیرت سے فائدہ اٹھانا چاہیے جو ایسے ماحول میں ہو جہاں برداشت کا حوصلہ اور متفقہ مقصد کی پہچان موجود ہو۔

عوامی اہل کار مشرق وسطیٰ پالیسی پر آزادانہ بحث و مباحثہ کے مواقع پیدا کرنے کی ذمہ داری سے دامن نہیں چھڑا سکتے۔ ان میں سب سے اعلیٰ امریکہ کا صدر ہے۔ صدر کارٹر کے قومی سلامتی کے مشیر Zbigniew Brzezinski کی رائے ہے کہ:

"کامیابی کا زیادہ تر دارومدار صدر کی لابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کی خواہش پر ہوتا ہے۔

اگر مسئلہ کو اس طرح بیان کیا جائے کہ صدر کی حمایت کی جائے یا مخالفت' تو زیادہ تر صدور کو کانگریس کی حمایت حاصل رہے گی۔"

ایوان اور سینیٹ کی ذمہ داری یکساں ہے۔ میرے تجربے کے علی الرغم' اکثر کانگریس ممبران اسرائیلی لابی کے لیے اور لگاتار حملے کے باوجود فتح سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ لیکن دوسرے سیاستدانوں کی طرح وہ بھی عوامی تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ صرف انتخاب ہارنے ہی سے نہیں ڈرتے۔ اولاً تو وہ ایک حمایتی کھو دینے کی تشویش میں مبتلا ہوتے ہیں چاہے وہ کچھ بھی ہو۔ لہٰذا جب تک اسرائیل نواز لابی کے سرگرم حضرات تعریف ختم کر دینے کی دھمکی استعمال کرتے رہتے ہیں جبکہ دوسرے لاپرواہ اور لاتعلق رہتے ہیں تو صورتِ حال بدل نہیں سکتی۔ کانگریس ممبران کی بڑی اکثریت کے لیے ایسی کوئی متنازعہ پوزیشن اختیار کرنا جو ان کو الگ تھلگ اور اکیلا کر دے...... چاہے ان کی اپنی ہی حمایت میں!...... کوئی سمجھداری کی بات نہیں اسی لئے میرا خیال ہے کہ عوامی اہل کار صحت مند بحث و مباحثہ کے فروغ میں کوئی کردار ادا کرنے کے قابل نہیں۔ اصلاح شہریوں کی طرف سے کمیونٹی کی سطح پر ہونی چاہئے۔

تمام امریکیوں ...... صرف یہودیوں' عیسائی گرجے کے اہل کاروں' عرب امریکنوں اور سیاست دانوں ہی نہیں ...... کے لیے مشرق وسطیٰ پر کھلے عام بحث ان کے مشترکہ مفاد میں ہے۔ ہماری نوجوان نسل کو ہماری موجودہ پالیسی کے فوجی خطرات سے نمٹنا پڑے گا اور تمام شہریوں کو بقیہ قیمت چکانے میں مشترکہ حصہ لینا چاہئے۔ یہ ہمارے بجٹ کی رقوم ہیں بلکہ زیادہ اہم ہمارے اداروں کا نقصان ہے۔ لہٰذا تمام شہریوں کو وفاقی دفتر میں کام کرنے والے اہل کاروں سے جوابدہی کرنی چاہئے۔ اس بات پر اصرار کرنا چاہئے کہ وہ اپنی حمایت کا تعین کریں اور پھر اس پر ڈٹے رہیں۔

۱۹۸۴ء کے صدارتی انتخابات اور کانگریس کی مہم کے دوران عرب' اسرائیل تنازعہ کوئی قابل ذکر مسئلہ نہ تھا۔ صدارتی امیدواران Jesse Jackson اور George Megovern کے مختصر سے اعلانات کے علاوہ وفاقی عہدہ کے کسی بھی امیدوار نے مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسیوں کو چیلنج نہ کیا...... کم از کم اتنی بلند آواز میں نہ کیا کہ قومی توجہ مبذول ہوتی حتیٰ کہ وہ لوگ بھی بلا مقابلہ منتخب ہو رہے تھے جن کو "دھکے" دے کر بھیجا جا رہا تھا' انہوں نے بھی کسی تبدیلی کا اشارہ نہ دیا۔ مثلاً اسرائیل کو امداد تو دینا لیکن مشروط کر کے تاکہ اس کا بہتر تعاون حاصل ہو سکے۔

بہت حیرانی کی بات ہے کہ عین اس وقت جبکہ امریکہ کے اپنے مقبول عام پروگرام تخفیف کی زد میں تھے۔ اسرائیل کو 2.6 ارب (2.6 Billion) ڈالر اور مصر کو ایک ارب (1 Billion) ڈالر کی امداد (Grant) دی جا رہی تھی اور کسی نے چوں بھی نہ کی۔ عوامی اہل کار اور امیدوار اس پر اس لئے خاموشی اختیار کئے رہتے ہیں کیونکہ ان کے رائے دہندگان ان کو خاموش رہنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ امریکہ کے عام بازاروں' محلوں اور گاؤں میں اصلاح احوال کی ضرورت ہے نہ کہ کیپٹل ہل واشنگٹن میں۔ خوش قسمتی سے امریکہ کے سیاسی سسٹم کا کھلا پن اس چیلنج کرنے کے عمل کو ہر کس و ناکس کی دسترس میں لے آتا ہے۔

کانگریس کے ممبران اور امیدواران کانگریس اس بات کے عادی ہیں کہ وہ لیگ آف وومن ووٹرز' منظم لیبر' تجارتی کونسلیں اور دوسرے دلچسپی رکھنے والے گروپوں کے مخصوص سوالات برائے عوامی پالیسی کے جواب دیں۔ مزید بر آں یہ سوال جواب کھلے عام ہوتا ہے۔ اگر ان سے دوران انتخاب یا عوامی عہدہ داری کے دوران پوچھ گچھ کی جائے تو زیادہ تر سوچ سمجھ کر کسی مسئلہ کے بارے میں پوزیشن اختیار کریں گے۔ آخر وہ کب تک دامن بچائے رکھ سکتے ہیں؟

اسرائیلی لابی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ گہری لگن رکھنے والے لوگوں کا ایک چھوٹا سا گروہ عوامی پالیسی پر گہرا اثر ڈال سکتا ہے۔ اسرائیل کے حامی اکثر بروقت دباؤ ڈالتے ہیں۔ کبھی AIPAC کے ذریعے۔ کبھی سیاسی ایکشن کمیٹی سے۔ کبھی مختلف دوسری تنظیموں کے ذریعے اور کبھی بطور ایک فرد کے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمہ وقت جاگتے رہتے ہیں اور اسرائیل کے مفاد کی چوبیس گھنٹے حفاظت کرتے رہتے ہیں۔

وہ شہری جو مشرق وسطیٰ میں زیادہ متوازن امریکی پالیسی کی حمایت کرتے ہیں جو بین الاقوامی جھگڑوں کی پرامن مصالحت اور انصاف کے بنیادی آدرشوں پر مبنی ہو تو اسرائیل نواز سرگرم کارکنوں کی مانند انہیں بھی مسلمہ تنظیموں کے ذریعے آواز بلند کرنی چاہئے اور اپنی ذاتی کاوشوں سے ان کا ہاتھ بٹانا چاہئے۔ اگر وہ اس مقصد کے لیے مناسب لگن کا مظاہرہ کریں تو امیدوار اور کانگریس ممبران توجہ دیں گے۔ کانگریس ممبران کی اکثریت اسرائیلی لابی کے بھاری ہاتھ والے حربوں پر مجزبزہ ہوتی ہے۔ وہ رائے دہندگان کے ایسے دباؤ کو خوش آمدید کہیں گے جو انہیں ہر دفعہ جو بھی اسرائیل طلب کرے' اسے منظور کرنے کی عادت سے چھڑوانے میں امداد دے۔

چیلنج کرنے کا یہ عمل نہ صرف امریکہ کے حق میں بہتر ہوگا بلکہ اسرائیل کے لیے بھی مفید ہوگا۔ عام طور پر اسرائیل کی طرف سے زیادہ صلح کن پالیسی اختیار کئے جانے کے خلاف یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ان کے پاس غلطی کرنے کی گنجائش بہت ہی کم ہے ...... اگر وہ عربوں ...... اور خصوصاً فلسطینیوں کو ...... کچھ بھی رعایت دیں گے تو ان کی بقاء خطرہ میں پڑ جائے گی۔ لیکن قومی سلامتی کا انحصار صرف اور صرف فوجی امور سے ہی وابستہ نہیں۔ اسرائیل کی بقاء کا انحصار صرف ایک مخصوص ایکڑوں کی تعداد رکھنے والے خطہ زمین کے زیر قبضہ رہنے پر نہیں ہے۔ موجودہ زمانہ میں کوئی دریا یا پہاڑ حملہ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا' جیسا کہ اسرائیل کے اولین خالقوں میں سے ایک اور ورلڈ جیوش کانگریس کے پہلے صدر Nahum Goldman کا کہنا ہے کہ:

"ایسے زمانہ میں جب جنگ آواز سے زیادہ تیز جہازوں اور میزائلوں سے لڑی جاتی ہے۔ سلامتی کے نکتہ نظر سے سرحدوں کی اہمیت بالکل ختم تو نہیں البتہ بیحد کم ضرور ہو گئی ہے۔"

سچی سلامتی تو اخلاقی اصولوں اور اقدار سے آتی ہے۔ کسی ملک کا کردار تو اس کا طرز زندگی ہی اس کو عطا کرتا ہے۔ فوجی پالیسی تو ان اصولوں کی حفاظت ہے جو وہ ملک قائم رکھتا ہے اور جن کے مطابق وہ زندگی گزارتا ہے اور اسرائیل جیسی جمہوریت ...... بلکہ امریکہ بھی' کی سلامتی کا راز تو جمہوری قدروں اور آزادی کے نصب العین کی پاسداری میں پوشیدہ ہے نہ کہ ہتھیاروں کی قوت کے مظاہرہ میں۔ اس طرح امریکہ میں آزادی اظہار رائے والے ماحول کا اچھا اثر اسرائیل پر بھی پڑے گا۔ جہاں حکومت کی پالیسی کے مخالفین کا کہنا ہے کہ امریکہ کا بغیر سوچے سمجھے امداد دیئے چلے جانا صرف ان سخت گیر موقف رکھنے والوں کو تقویت پہنچاتا ہے جو مذاکرات کے مخالف ہیں اور پیچیدہ معاشرتی اور سیاسی معاملات کا حل فوجی فتوحات میں تلاش کرتے ہیں۔

اسرائیل کے مسائل بہرحال اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اس کی اپنے ہمسایوں کے ساتھ شک و شبہ تلخی اور نفرت کی تہیں اس قدر دبیز اور گہری ہیں کہ بغیر کسی بیرونی فریق کی امداد کے وہ ان رکاوٹوں کو عبور نہیں کر سکتے۔ اسی کو ذہن میں رکھ کر میں نے کئی دفعہ کانگریس میں یہ ریزولیوشن پیش کیا کہ حالت جنگ کو ختم کرنے والے جامع معاہدے کی حدود میں رہتے ہوئے امریکہ اسرائیل کی ۱۹۶۷ء والی جنگ سے پیشتر والی حدوں کی ضمانت فراہم کرے گا اور اسرائیلی مقبوضہ علاقوں میں رہنے والوں کو ان کا حق خود اختیاری دیا جائے گا۔ میرا خیال تھا کہ اگر یہ تجویز امریکہ قبول کر لے تو عربوں اور

اسرائیلیوں کو تعاون کے لیے ترغیب ملے گی اور اس علاقے میں ایک مستقل پائیدار امن کی ضمانت ملے گی۔

لیکن مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسی کو ہمیں اپنے قومی مفاد کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ اس عمل میں اسرائیل ایک ضروری جزو تو ہے لیکن اکلوتا جزو ہرگز نہیں۔ کئی معاملات میں امریکہ کے مفادات اسرائیل کے مفادات سے لگا نہیں کھاتے۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات بھی نہیں، اگر ہم دونوں کی تاریخ، علاقے، ثقافت اور بین الاقوامی ذمہ داریوں کو نگاہ میں رکھیں تو۔

مثال کے طور پر جوہری ہتھیاروں کے معاملے میں ہمارے مفادات اور پالیسیاں بالکل مختلف ہیں۔ جوہری ہتھیاروں کا پھیلاؤ روکنے اور معاہدوں کی ذمہ داریوں کے پورے کرنے کے لیے امریکہ بہت سی اقوام کو "جوہری چھتری" کی حفاظت مہیا کرتا ہے۔ وہ مشرق وسطیٰ میں تمام اقوام کی اس بارے میں ہمت افزائی کرتا ہے کہ وہ جوہری معاہدے (Non-Proliferation-Treaty NPP) پر دستخط کر دیں جس کے ماتحت وہ ممالک جوہری ہتھیار تیار نہ کرنے کے پابند ہوں گے۔ اسرائیل نے اس معاہدہ پر دستخطوں سے انکار کیا ہے اور وہ خفیہ طور پر Dimona میں اپنی جوہری تحقیق و ترقی جاری رکھے ہوئے ہے جہاں ماہرین کے خیال میں وہ متعدد جوہری بموں کی چوری چھپے تیاری کر چکا ہوا ہے۔

۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران اسرائیل نے اس امریکی جاسوس طیارے کو مار گرانے کی کوشش کی جو Dimona کے اوپر محو پرواز تھا۔ حالانکہ اس وقت امریکہ اسرائیل کو ہتھیار مہیا کر رہا تھا۔ اس وقت امریکہ کے جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کا چیئرمین ایڈمرل تھامس ایل مورر تھا۔ بقول اس کے اسرائیلی ریڈار نے بطور US-SR-71 اس جہاز کی صحیح شناخت کر لی اور "اپنے جنگی جہازوں کو حکم دیا کہ اسے مار گرائیں۔" جب معاملہ Dimona کا ہو تو اسرائیل رازداری کو اس قدر اہمیت دیتا ہے۔ بقول Moorer: "یہ جہاز اس قدر اونچا اڑ رہا تھا کہ اسرائیلی جنگی جہازوں کی پہنچ سے باہر تھا، لہٰذا یہ بحفاظت واپس آ گیا۔"

ہو سکتا ہے اسرائیل اپنی جوہری تنصیبات کی حفاظت کے لیے اس طرح کے انتہائی اقدامات کو اپنے خیال میں جائز تصور کرتا ہو لیکن یہ اس امریکی پالیسی سے متصادم ہے جس کی رو سے حکومت امریکہ مشرق وسطیٰ میں جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کی پابند ہے۔ جوہری

ہتھیاروں کی پالیسی ان امور میں سے صرف ایک ہے جو اسرائیل اور امریکہ کے درمیان اختلاف کا باعث ہیں۔ دوسرے نمایاں اسباب اس کا فوجی طاقت سے مفتوحہ علاقوں پر قبضہ جاری رکھنا اور ایران وعرب ہمسائیوں کے ساتھ روابط ہیں۔

ہمیں اپنی پالیسیاں برائے مشرق وسطیٰ طے کرتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہم کئی اہم امور میں اسرائیل سے اختلاف کریں گے اور کئی دوسرے امور پر مکمل تعاون کریں گے۔ سابقہ سکریٹری آف اسٹیٹ ڈین رسک کا کہنا تھا: "اسرائیل متعدد بار یہ مظاہرہ کرچکا ہے کہ وہ امریکہ کا طفیلی نہیں ہے۔ سب کو یہ باور کرانا بھی اہم ہے کہ امریکہ بھی اسرائیل کا طفیلی نہیں ہے۔"

ہمارا نصب العین اس علاقے میں سب کے لیے شائستگی' راست بازی اور سلامتی ہونا چاہیے۔ خاص طور پر ہمیں غربی کنارے اور غزہ کے ان فلسطینیوں کا بھی خیال کرنا چاہیے جو سترہ سال سے زائد عرصہ سے اسرائیل فوجی قبضے کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم نے اپنی ساری تاریخ میں حق خود اختیاری کو جمہوریت کی روح مانا ہے۔ یہ ہماری روایات کا مقدس جزو ہے اور ایک سے زیادہ مرتبہ امریکہ نے اس بارے میں انتہائی قدم اٹھایا ہے۔ یعنی مغربی یورپ' کوریا اور ویتنام کے لوگوں کے حقوق کا دفاع خاص طور پر حق خود اختیاری کی خاطر جنگ کی ہے۔ یہ امریکہ کے لیے اپنے اصولوں سے روگردانی ہوگی' اگر ہم سوائے فلسطینیوں کے باقی سب کے حق خود اختیاری کی حمایت کریں۔ ہمیں نہ تو ضرورت ہے کہ فلسطینیوں کی حمایت کے لیے اپنی فوجی قوت استعمال کریں اور نہ کرنی چاہیے۔ لیکن ہمیں اسرائیل کی ان فوجی پالیسیوں' اقدامات کی بغیر سوچے سمجھے تائید نہیں کرنی چاہیے جن سے لوگوں کے انسانی حقوق کی نفی ہوتی ہو اور Judaism کی عظیم اخلاقی روایات کی تحقیر ہوتی ہو...... ایسا نہ ہو کہ ہماری اپنی قوم کی اخلاقی اقدار بھی مجروح ہو جائیں۔

امریکہ یقیناً اسرائیل کے بہترین مفاد میں عمل کرے گا اگر وہ اپنی اس پوزیشن کو دوبارہ حاصل کرلے جو طرفین کے ساتھ انصاف اور برابری کے سلوک پر مبنی ہو۔ بہت سے اسرائیلی اب اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ ان کی جمہوریت صرف امریکہ کی آنکھیں بند کر کے مدد کرنے سے نہیں بلکہ یہودیوں اور غیر یہودیوں دونوں کے خیال انگیز تجزیہ اور کھلے عام بحث و مباحثہ سے پروان چڑھے گی۔ امریکی امداد گو مشرق وسطیٰ کے جامع سمجھوتہ برائے امن کے لیے پیش رفت میں معاون تو ثابت ہوسکتی ہے لیکن یہ مؤثر انداز میں کام نہیں کرسکتی جب تک کہ لابی...... جو کہ امریکی یہودیوں

کی ترجمان ہے...... اپنا یہ مطالبہ جاری رکھتی ہے کہ امریکہ اسرائیل کے موجودہ بانجھ فوجی نظریہ سلامتی کی آنکھیں بند کر کے حمایت کرتا رہے۔

۱۹۸۲ء میں واشنگٹن کے کالم نگار Richard Cohen نے جنگ لبنان کے دوران انتباہ کیا تھا کہ "صدیوں پرانا ایک ایسے اسرائیل کا خواب جو یہودیت کے بہترین جوہر پر مشتمل ہو۔ جس خواب نے میرے جیسے بچوں کو جیوش نیشنل فنڈ کے لیے اپنا گلہ گھر سے باہر لا کر خالی کرنے پر اکسایا تھا...... وہ اب آہستہ آہستہ ایک ڈراؤنے خواب میں تبدیل ہو رہا ہے۔ امریکی یہودیوں کے لیے ناقابل دفاع چیز کا دفاع کرنا انہیں عام امریکی قوم سے کاٹ کر رکھ دے گا۔ یہ اس ملک میں ایک اخلاقی قوت کو صرف ایک لابی میں بدل کر رکھ دے گا۔"

ہمیں اپنے یہودی فرقہ کی اخلاقی قوت کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کے ماوراء بھی فکر کرنی چاہئے' کیونکہ اس میں سبھی کا نقصان ہے۔ تمام امریکیوں کو بڑے خطرے کا احساس ہونا چاہئے۔ یعنی ہمارا دل پسند ادارہ برائے آزادی اظہار رائے!...... کیونکہ اب شہری مشرق وسطیٰ پر آواز اٹھانے سے خوف کھاتے ہیں۔

ہمارے لئے اس سے بہتر راستہ نہیں کہ ہم ایک اسرائیلی لکھاری کے اپنے ملک کو دیئے گئے مشورہ پر عمل کریں: "اگر کچھ لوگ ایسے ہوں جو ہماری مختلف الخیال کا "علاج" کر سکیں اور اپنے مضبوط ہاتھ اور کھلے بازو سے ان سب کی آنکھیں کھول سکیں جن کو وہ کچھ نظر نہیں آتا جو وہ خود دیکھ رہے ہیں۔ تو پھر ایک بھدی بلکہ خطرناک کشمکش کے لیے تیار رہیے۔ لیکن اگر یہ کشمکش لابی کرنے کے لیے رہے جس میں مختلف آراء کو جائز تسلیم کیا جائے۔ قائل کرنے اور ہونے کے لیے رضامندی ہو تب یہ ایک نتیجہ خیز تخلیقی کشمکش ہو گی۔"

ہماری ساری تاریخ میں ہماری سوسائٹی کو ہمیشہ اندرونی خطرہ ہی درپیش رہا ہے۔ یعنی خوفزدہ لوگوں کا اپنے ساتھیوں کے حقوق کو پائمال کر دینا۔ ابراہیم لنکن نے یہ انتباہ کیا تھا کہ جو لوگ قومی سلامتی کے نام پر "اس روح کو تباہ کر دیتے ہیں جو آزادی کو ابن آدم کا ورثہ...... ہر جگہ اور ہمیشہ...... خیال کرتی ہے" تو گویا انہوں نے "آمریت کے بیج آپ کے گھروں کے دروازوں پر بو دیئے ہیں۔"

جمہوریت ایسے ماحول میں نہیں پنپ سکتی جہاں شہری آواز اٹھانے سے خوف زدہ ہوں۔

اگر ایک طاقتور گروہ کسی خاص موضوع پر آزادی اظہار رائے کو دبانے میں کامیاب ہو جاتا

ہے تو لامحالہ دوسرے گروہ بھی اپنے اپنے پسندیدہ مقاصد کو بڑھاوا دینے کے لیے یہی راستہ اختیار کرنے پر راغب ہو سکتے ہیں۔ اگر عظیم تعلیمی درس گاہیں کسی ایک موضوع پر تدریسی آزادی کے چیلنج کو نظر انداز کرنے پر مجبور کی جاسکتی ہیں تو وہ دوسرے موضوعات پر بھی ایک آسان شکار کا درجہ رکھیں گی۔ اگر ایک عظیم اخبار کو دباؤ سے مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ لابی کے ایک ایجنٹ کو اپنے ایڈیٹروں کی نگرانی کرنے دے جب وہ لبنان کی جنگ کی خبریں ترتیب دے رہے ہوں۔ تو پھر یہ دوسری لابیوں کے لئے اسی طرح کے دوسرے مطالبے پیش کرنے کے لیے مثال بن جائے گا۔ اگر ایک کیتھولک نن (راہبہ) اور انجیلی ڈین پر Anti-Semitism کا کیچڑ اس لئے اچھالا جاسکتا ہے کہ وہ مذہبی اصولوں کو مشرق وسطیٰ کے المیہ پر لاگو کرتے ہیں تو پھر یہی اصول سیاسی مقاصد براری کے لیے توڑے مروڑے جاسکتے ہیں۔ پھر تو ہر جگہ مذہبی آزادی کو خطرہ ہے! اگر ایک لابی حکومتی اہل کاروں کو کسی ایک اہم عوامی مسئلہ پر ذلت آمیز خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کرسکتی ہے تو پھر ہمارے بقیہ جسد سیاست کو بھی مفلوج کیا جاسکتا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ . . .

اگر ایک لابی کسی ایک متنازعہ قومی امر پر کھلے عام بحث و مباحثہ کا گلا گھونٹتی ہے۔ یعنی مشرق وسطیٰ پر...... تو خطرہ پورے آزادی اظہار کو ہے۔

ہماری دیگر اہم مطبوعات

☆ **ادراک زوال امت** مصنف: راشد شاز **قیمت: 200 روپے (571 صفحات)**

(جلد اول)

اس کتاب میں بنیادی طور پر انہی مظاہر عمل کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں کس طرح وحی کے بجائے متعلقات وحی کو اس قدر اہمیت ملتی گئی کہ مسلم حنیف ہونا بڑی حد تک ایک تہذیبی شناخت بن کر رہ گیا۔ یہ آفاقی امت جسے سیادت عالم کے منصب پر فائز کیا گیا ہے، فرقۂ محمدی کے نفسیات میں محصور ہوگئی۔ حتیٰ کے ہمارے فقہاء نے دنیا کو اسلامی اور غیر اسلامی سرزمین میں بانٹ ڈالا اور ایسا محسوس ہوا کہ مسلم آبادی کے علاقوں کے علاوہ دنیا کے دوسرے خطوں کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔

☆ **ہندوستانی مسلمان:** مصنف: راشد شاز **قیمت: 250 روپے (360 صفحات)**

ایام گم گشتہ کے پچاس برس

ہندوستانی مسلمانوں کی پچاس سالہ تاریخ مجرمانہ خاموشی کی شرمناک داستان ہے۔ سیکولر دانشور ہوں یا مذہبی علماء، ملی قائد ہوں یا روحانی گدی نشین، یہ سب گذشتہ پچاس سالوں سے مداہنت کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ہم بحیثیت امت یہ بالکل بھول گئے کہ ہندوستان کی سرزمین میں جہاں ۱۹۴۷ء کی نئی سیاسی صورت حال نے ہمیں ایک اجنبی ملک کا باشندہ بنادیا تھا اس میں ہمارے لئے زندگی جینے کا اگر کوئی جواز ہوسکتا تھا تو وہ کیا تھا؟ نئے ہندوستان میں جہاں مسلمان ایک قوم کی محکومی سے نکل کر دوسری قوم کی سیاسی محکومی میں چلے گئے تھے وہاں ہماری اسٹریٹیجی کیا ہونی چاہیے تھی؟ ہم اس مسئلہ پر گفتگو سے گریز کرتے رہے کہ نئے ہندوستان میں ہمارا ملی ایجنڈا کیا ہونا چاہئے۔ گذشتہ پچاس برس ہماری ملی تاریخ میں عہد سیاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک ایسا عہد جسے ہم ایامِ گم گشتہ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

☆ **اسلام: مستقبل کی بازیافت** مصنف: راشد شاز **قیمت: 60 روپے (160 صفحات)**

اب وقت آگیا ہے کہ ہم چودہ صدیوں پر محیط تہذیبی ورثے پر بلاخوف لومتہ لائم تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ خدا کے کلام اور رسول ﷺ کی سنت کے علاوہ ہمارے لئے کوئی چیز تحلیل و تجزیے اور محاکمے سے بالاتر نہیں ہونی چاہئے۔ اس سرزمین پر کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر زباں بندی کو غایتِ دین سمجھا جائے یا جسے سیکورٹی زون قرار دے کر وہاں کسی مناقشے کو داخل ہونے سے روکا جائے۔ وحیٔ ربانی کی روشنی میں جب تک ہم اپنی پوری تاریخ کا تنقیدی محاکمہ نہیں کرتے ہمیں اس بات کا واقعی اندازہ نہیں ہوسکتا کہ پانی مرتا کہاں ہے۔

☆ **مسلم ذہن کی تشکیلِ جدید** مصنف:راشد شاز **قیمت:150روپے (197صفحات)**

ہمیں دیر یا سویر اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ قدماء کی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی ایک عدد دماغ سے نوازا ہے جس کا بنیادی فریضہ غور و فکر اور تدبر و تفکر ہے اور جس سے محض ٹوپی رکھنے کا کام لینا یا تربوش برادری کے لئے اسے استعمال کرنا کفرانِ نعمت، بلکہ بغاوت ہے۔ جب تک ہم پھر سے دل و دماغ کو حرکت میں نہیں لاتے اور وحیٔ ربانی کی تجلیوں سے اپنی راہوں کو منور کرنے کا حوصلہ پیدا نہیں کرتے قدماء کے اقتباسات ہمارا پیچھا کرتے رہیں گے۔

☆ **غلبۂ اسلام اور دوسری تحریریں** مصنف:راشد شاز **قیمت: 140روپے (244صفحات)**

غلبۂ اسلام موجودہ فقہی مسلمانوں کے عروج، ان کے سیاسی جاہ و حشم یا ان کی مادی خوشحالی کا نام نہیں بلکہ ایک ایسی صورت حال کا بیان ہے جس میں تمام ہی انسانوں کی نجات اور ان کی فلاح و بہبود کے امکانات میسر ہوں۔ توحید خالص پر مبنی ایک ایسا معاشرہ جہاں عبودیت کے جملہ ابعاد کا ادراک اور اس اکتساب و انبساط ہر شخص کی دسترس میں ہو۔ زمینی حکمرانیاں، نسل و رنگ کے امتیاز اپنا اعتبار کھودیں، عرب و عجم، مشرق و مغرب کا امتیاز یکسر مٹ جائے اور ایک ایسی صورت حال پیدا ہو جسے بالفاظ قرآن و یکون الدین کلہ للہ پر محمول کیا جا سکے۔

☆ **تاریخ زوال امت** مصنف:میاں محمد افضل **قیمت:180روپے (432صفحات)**

اسلامی تاریخ میں ملت کو پیش آنے والے صدمات و حادثات میں سے ہم نے صرف انہی واقعات کو منتخب کیا ہے جن کے اثرات صدیوں تک محسوس کئے گئے یا کئے جائیں گے۔ یہ وہ دردناک حوادث ہیں جن کے لگائے ہوئے زخموں سے اب تک خون رس رہا ہے۔ ان واقعاتِ عبرت کو غالباً پہلی بار ایک کتاب کی شکل میں قوم کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

☆ **یہودی پروٹوکولز** مترجم:محمد یحییٰ خان **قیمت 150روپے (304صفحات)**

پروٹوکولز کا یہ ترجمہ جسے فاضل مترجم نے بعض ضروری اور انتہائی اہم معلومات کے ساتھ ترتیب دیا ہے موجودہ عالمی نظام کے دجل و فریب کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ اور ہم خیر امت کی حیثیت سے اہل یہود کے گم کردہ قافلے کو صحیح سمت دینے اور انہیں راہ یاب کرنے میں پہلے سے کہیں زیادہ مؤثر ثابت ہوں سکیں گے۔

☆ **سیرت ﷺ ابن اسحاق** مصنف: محمد بن اسحاق بن یسار قیمت:250روپے(504صفحات)

دنیا کو تیرہ سو سال سے جس کتاب کی تلاش تھی وہ بالآخر تلاش بسیار کے بعد دستیاب ہو گئی۔ اس کتاب کو سیرت کے موضوع پر دنیا کی سب سے پہلی باقاعدہ تصنیف کا اعزاز حاصل ہے۔ اہل علم اس کتاب کے تذکرے سے تو واقف تھے لیکن اصل کتاب تک ان کی رسائی اب تک ممکن نہ تھی۔ یہ محض اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس دور کے ایک بڑے اسلامی محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیرس) کو یہ توفیق بخشی کہ وہ اس ناپید کتاب کے اجزاء کو دنیا کی مختلف کتب خانوں سے ڈھونڈ نکالیں۔ گو کہ اس وقت دنیا میں اس کتاب کا کوئی مکمل نسخہ دستیاب نہیں ہے، لیکن اس کی کمی کسی حد تک اس بات سے پوری ہو جاتی ہے کہ سیرت ابن ہشام بڑی حد تک ابن اسحاق کا ہی جدید مدوّن ایڈیشن ہے۔ البتہ ابن ہشام نے جن باتوں کو اپنی کتاب میں شامل کر ضروری نہ سمجھا، ان باتوں کے لیے ابن اسحاق کا یہ نسخہ ایک اہم مصدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ گذشتہ ۱۳ سو برسوں میں فن سیرت نگاری نے ارتقاء کی بہت سی منزلیں طے کی ہیں، لیکن اس موضوع پر اس پہلی تصنیف کو جو اہمیت حاصل ہے وہ یقیناً کبھی کم نہیں ہوگی۔

☆ **اسرائیل کی دیدہ ودانستہ فریب کاریاں** مترجم: سعید رومی قیمت:140روپے(246صفحات)

یہودیوں نے کبھی یوروپ کی حکومتوں کو مالی تعاون کے ذریعے اپنا ہم نوا بنایا تو کبھی مشرقی یوروپ میں معیشت کو یرغمال بنانے کی کوشش کی۔ مشرقی یوروپ اور جرمنی میں انھیں جس نفرت کا سامنا کرنا پڑا اس کے تذکرے سے پوری یہودی قوم آج بھی سراسیمہ ہو جاتی ہے۔ افسوس کہ اس صورتحال کا گہرا تجزیہ کرنے اور اس سے سبق لینے کے بجائے یہودی دانشور اور ربائی اسے محض Anti-semitism کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔ اب دیکھئے دنیا کی سب سے عظیم قوت اور سب سے زیادہ وسائل والی حکومت امریکہ کے پالیسی سازوں کو اہل یہود نے جس طرح شکنجے میں لے رکھا ہے اس کا ردعمل کس طرح سامنے آتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ صرف حال کو ہی نہیں بلکہ مستقبل کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ خدا کرے تمام کھلی آنکھوں والے انسان اہلِ یہود کے اس خطرناک کھیل کے اسرار و عواقب سے آگاہ ہو سکیں۔

☆ **پردہ مگر کس حد تک؟** مصنف: راشد شاز قیمت:30روپے (71صفحات)

اسلام نہ تو عورت و مرد کو الگ الگ خانوں میں رکھنے کا قائل ہے اور نہ آزادانہ اختلاط کی اجازت دیتا ہے۔ یہاں نہ تو عورتوں کو گھروں میں مقفل کر دینے کی کوئی گنجائش ہے اور نہ اس بات کی اجازت کہ اللہ کی بندیاں رقص و سرور کی محفلوں میں حدود اللہ کی پامالی کریں۔

☆ **مسلم سیاسی پارٹی** مصنف: راشد شاز قیمت: 15روپے (47صفحات)

ہندوستان میں مسلم سیاسی پارٹی کا تصور اب عام گفتگو کا موضوع بن چکا ہے۔اس کتابچے میں سیاسی پارٹی کے خدوخال پر بھرپور مدلل گفتگو ملتی ہے،توقع ہے جو لوگ اس ملک میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی صف بندی کے خیال سے خوف کھاتے ہیں انہیں اس کتاب سے حوصلہ ملے گا۔

☆ **ہندوستانی مسلمان: فکری اور عملی ارتداد کی زد میں** مصنف: راشد شاز قیمت: 10روپے (22صفحات)

پہلی بار مسلمانوں میں یہ احساس عام ہو رہا ہے کہ اس ملک میں اب بھی وہ کلیدی رول انجام دے سکتے ہیں۔ اب جب کہ باشعور حلقوں میں نئی مسلم فکر پر بحث جاری ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس بارے میں کتاب وسنت کے احکام کو ہر خاص وعام تک پہنچایا جائے۔

☆ **اسلامی انقلاب کا طریقہ کار** مصنف: راشد شاز قیمت: 10روپے (48صفحات)

جدید دنیا میں اسلامی انقلاب کیسے برپا ہو سکتا ہے؟ اس کا واقعی طریقہ کار کیا ہے؟ دنیا کے سب سے بڑے انقلابی اور اللہ کے آخری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کی روشنی میں عصر حاضر کے لئے ایک انقلابی لائحہ عمل کیسے ترتیب دیا جا سکتا ہے؟ یہ وہ سوالات جن پر اس مختصر سی کتاب میں بحث کی گئی ہے۔

☆ **مسلم مسئلہ کی تفہیم** مصنف: راشد شاز قیمت: 80روپے (120صفحات)

یہ کتاب ہندوستانی مسلمانوں پر بیتنے والے ایک انتہائی دردناک المیہ سے متعلق ہے۔امت کا بڑے سے بڑا دانشور اور بیدار مغز عالم بھی فکری ارتداد کی شدت کو محسوس کرنے سے قاصر ہے۔اس مختصر سی کتاب میں دراصل اسی تکلیف دہ عمل پر مختلف پہلوؤں سے گفتگو کی گئی ہے۔

☆ **پیغمبر اسلام** مصنف: ڈاکٹر حمید اللہؒ قیمت: 300روپے (672صفحات)

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ نے یہ کتاب فرانسیسی زبان میں تحریر کیا۔ اس کتاب کا پورا نام *Le Prophete de l'Islam: Sa Vie et Son Oeuvre.* ہے۔(یعنی پیغمبر اسلام: حیات وکارنامے) اس کتاب کا انتہائی سلیس اور رواں ترجمہ پروفیسر خالد پرویز صاحب (پاکستان)، نے کیا ہے۔سیرت کے موضوع پر یہ ایک انتہائی محقق تصنیف ہے۔

عربی اور انگریزی زبان میں
ہماری چند اہم مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت
محاولة لفهم ازمة المسلين	راشدشاز	350/-
إدراك اسباب تراجع الامة (مطبوعه دارالحكمة لندن)	راشدشاز	£45
فیوتشر اسلام	راشدشاز	100/-
الحجاب ولكن الى اى مدى (مطبوعه دارالحكمة لندن)	راشدشاز	£2.99
الإسلام إعادة اكتشاف المستقبل (مطبوعه دارالحكمة لندن)	راشدشاز	£9.99
Understanding the Muslim Malaise	By Rashid Shaz	110/-
The Social System in Islam	By An-Nabhani	380/-
The Economic System in Islam	By An-Nabhani	490/-
The Islamic State	By An-Nabhani	590/-
Funds in the Khilafah State	By A.Q. Zalloom	450/-
How the Khilafah was Destroyed	By A.Q. Zalloom	450/-
In Pursuit of Arabia	By Rashid Shaz	1650/-
Islam: Negotiating the Future	By Rashid Shaz	395/-
Creating a Future Islamic Civilization	By Rashid Shaz	495/-